سیرت اشرف

منشی عبدالرحمٰن خانؒ

شیخ اکیڈمی۔ بل روڈ۔ لاہور

786

کہیں مدت میں ساقی بھیجتا ہے ایسا مستانہ
بدل دیتا ہے جو بگڑا ہوا دستورِ میخانہ

سیرتِ اشرف

یعنی

سوانعمری حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رح

جلد اوّل

مؤلفہ

منشی عبد الرحمان خاں

ناشر

شیخ اکیڈیمی، ۶ ء ٹبل روڈ ○ لاہور

باراوّل ——— فروری ۱۹۷۷ء
ناشر ——— محمّد طارق
مطبع ——— رینا آرٹ پریس
کتابت ——— محمّد امین بٹ سیالکوٹی
قیمت ——— ۴۵٫۰۰ روپے

ان

کے

نام

— جو —

علم و عمل کے اس دورِ افراط و تفریط میں اِنسانیت کی
مکمل اور صحیح تصویر دیکھنا چاہتے ہیں

فہرست مضامین

حصہ اوّل — آغازِ زندگی

۴ - عہدِ طفولیت

۵ - حصولِ علم

٦ - اساتذہ کرام

۷۔ درس و تدریس

۸۔ شاگردانِ رشید

۹۔ صحبتِ بزرگاں

۱۰۔ دُعا بزرگاں

۱۱۔ وعظ و تبلیغ

۱۲۔ معمولاتِ وعظ

۱۳۔ دورِ سفر

۱۴۔ معمولاتِ سفر

۱۵۔ شرفِ بیعت

۱۶۔ غلبۂ حال

حصّہ دوم ـــــ بہارِ زندگی

۲۰- شمائل

۲۱- اخلاق

۲۲- عادات

۲۳- معاملات

۲۴- معمولات

۲۷- حُسن

۲۸- عبدیّت

۲۹- علم و ادب

۳۰۔ لطافت وظرافت

۳۱۔ خشونت

۳۲۔ محبوبیّت

۳۳۔ مقبولیّت

۳۴۔ عز و شرف

۳۵- مجدّدیّت

ماخذات

سیرت ہذا کی تیاری کے سلسلہ میں حسب ذیل کتب سے امداد لی گئی ہے۔

(ا)

۱۔ اشرف السوانح ہر سہ حصہ	خواجہ عزیز الحسن مجذوبؒ
۲۔ خاتمۃ السوانح	〃
۳۔ حسن العزیز	〃
۴۔ حکیم الامت	مولانا عبدالماجد دریابادی
۵۔ سفرنامہ پاکستان	〃
۶۔ حیاتِ اشرف	مسٹر غلام محمد عثمانیہ
۷۔ طبقاتِ کبریٰ	شیخ ابو مدین مغربی
۸۔ فتوحات	شیخ ابن عربیؒ
۹۔ انوار القلوب	مولانا رشید احمد گنگوہیؒ
۱۰۔ الاعتدال فی مراتب الرجال	مولانا محمد زکریا کاندھلویؒ
۱۱۔ جامع المجددین	مولانا عبدالباری ندویؒ
۱۲۔ تجدید تصوف و سلوک	〃
۱۳۔ یادِ رفتگاں	مولانا سید سلیمان ندویؒ
۱۴۔ مکتوبات امدادیہ	مولانا حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ

۱۵۔ المہند علی المفند	مولانا خلیل احمد مہاجر مدنیؒ
۱۶۔ الشہاب الثاقب	مولانا حسین احمد مدنی
۱۷۔ نقشِ حیات	"
۱۸۔ ہزار سال پہلے	مولانا مناظر احسن گیلانیؒ
۱۹۔ وقایۃ المسلمین	مولانا مفتی محمد شفیع دیوبندی
۲۰۔ آداب الشیخ والمرید	"
۲۱۔ افادات اشرفیہ در مسائل سیاسیہ	"
۲۲۔ اشرف الافادات "	مولانا عبد الاحد سورتی
۲۳۔ کمالاتِ اشرفیہ	مولانا محمد عیسےٰ الہ آبادی
۲۴۔ معمولاتِ اشرفیہ	منشی علی محمد لاہوری
۲۵۔ اشرف المعمولات	"
۲۶۔ تالیفات اشرفیہ	مولوی عبد الحق فتحپوری ہسوی
۲۷۔ مزید المجید	مولانا عبد المجید بچھرایونی
۲۸۔ آثارِ رحمت	مولانا جلیل احمد علی گڑھی
۲۹۔ القول الجلیل	"
۳۰۔ بزمِ جمشید	مولانا وصل گرامی
۳۱۔ ارمغانِ جاوداں	"
۳۲۔ معمولاتِ سفر	مولانا حکیم محمد مصطفےٰ بجنوری
۳۳۔ حسام الحرمین	مولانا احمد رضا خاں بریلویؒ
۳۴۔ "معارف" سلیمان نمبر	مولانا شاہ معین الدین احمد
۳۵۔ حرفِ اقبال	علامہ ڈاکٹر محمد اقبال

۳۶۔ ملفوظاتِ اقبال — مسٹر محمود نظامی

۳۷۔ حیاتِ قائدِ اعظمؒ — چوہدری سردار محمد

۳۸۔ مشاہداتِ واردات — مؤلف سیرت ہذا

۳۹۔ تعمیر پاکستان اور علما ربانی — "

۴۰۔ ملفوظات — حافظ صغیر احمد مظفر نگری

۴۱۔ کلمۃ الحق — حکیم عبد الحق کوٹی

۴۲۔ امپیریل گزٹ — ......

(۲)

متذکرہ صدر کتب کے علاوہ صاحبِ سیرت حضرت تھانویؒ کی مندرجہ ذیل تصنیفات و تالیفات و خطبات سے بھی مدد لی گئی ہے۔

۴۳۔ نشر الطیب

۴۴۔ حیات المسلمین

۴۵۔ معاملۃ المسلمین

۴۶۔ صیانۃ المسلمین

۴۷۔ بوادر النوادر

۴۸۔ قصد السبیل

۴۹۔ تعلیم الدین

۵۰۔ زادِ السعید

۵۱۔ آدابِ معاشرت

۵۲۔ اصلاحِ انقلاب

۵۳۔ اصلاح الخیال

۵۴۔ موائد العوائد

۵۵۔ الصدق الرویا

۵۶۔ خوانِ خلیل

۵۷۔ ذکرِ محمود

۵۸۔ حفظ الایمان

۵۹۔ بسط البنان

۶۰۔ حکایات الشکایات

۶۱۔ الافاضات الیومیہ

۶۲۔ مقالاتِ حکمت

۶۳۔ خیر العبود
۶۴۔ الحج المبرور
۶۵۔ ہفت اختر
۶۶۔ راحت القلوب
۶۷۔ تجارتِ آخرت
۶۸۔ کلمۃ الحق
۶۹۔ ملتِ ابراہیم
۷۰۔ حقیقتِ تصوف
۷۱۔ دعواتِ عبدیت
۷۲۔ الاسعاد والابعاد
۷۳۔ ذم النسیان
۷۴۔ ایوار الیتامی
۷۵۔ مواعظ تبلیغ
۷۶۔ مواعظِ اشرفیہ
۷۷۔ التشرف
۷۸۔ الباطن
۷۹۔ الاسراف
۸۰۔ الخضوع

دو لفظ

حکیم الامت، اشرف العلما حضرت تھانوی نور اللہ مرقدہٗ اِس زمانہ میں ایک آیت من آیات اللہ تھے۔ ایک مستقل مشعلِ ہدایت، چراغِ راہ، بیسیوں کمالات ظاہری و معنوی کے جامع ـــــ ضرورت تھی کہ آپ کی سیرتیں مختلف اور متعدد لکھی جائیں اور آپ کی زندگی کے ہر ہر پہلو کو نمایاں کیا جاتا۔

اشرف السوانح معہ تکملہ، اس میں شک نہیں کہ اپنی جگہ ایک بڑے پایہ کی کتاب ہے نافع، مستند، قابلِ قدر لیکن جدید ضرورتوں کا تقاضا کچھ اور ہی چاہتا تھا۔ اس "کچھ اور" کو پورا کرنے کے لیے مؤلف "سیرتِ اشرف" سلمہٗ نے قلم اٹھایا اور اللہ نے ان کی ہمت میں برکت بھی عطا کر دی۔

کتاب کی پوری قدر و قیمت و افادیت کا اندازہ تو اس کے چھپنے اور پورے مطالعہ کے بعد ہی ہو سکے گا۔ ان سطور کے راقم کی نظر سے اَب تک اس کی خوب مفصل فہرست مضامین نیز اس کے ابتدائی مطبوعہ اوراق گزرے ہیں۔ جو بحیثیت مجموعی قابلِ داد ہیں۔

پوری دیگ کا اندازہ چند چاولوں سے ہو جاتا ہے۔ اسی معیار سے یہ بہ اطمینان کہا جا سکتا ہے کہ کتاب انشاء اللہ دلچسپ جامع و بصیرت افروز ہوگی۔

عبد الماجد

درسِ حیات

اشرف الاولیا قطب الارشاد، شیخ المشائخ، مجدد الملت، حکیم الامت حضرت مولانا شاہ محمد اشرف علی صاحب تھانوی حنفی، چشتی، صابری، امدادی نور اللہ مرقدہٗ کی حیاتِ طیبہ، علمی و عملی کمالات اور ظاہری و باطنی فیوض و برکات کی جامعیت کے اعتبار سے ایک ممتاز اور بے نظیر حیثیت رکھتی تھی۔ جن کا ہر قول و فعل انسانیت کے لیے مشعلِ راہ تھا۔ اس لیے خسروِ دربارِ اشرفیہ خواجہ عزیز الحسن صاحب مجذوب رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ

کہیں نہ دیکھا کہیں نہ پایا جمال ایسا کمال ایسا
دکھائے کوئی اگر ہو دعویٰ جمال ایسا کمال ایسا

خواجہ صاحب موصوف فطری شاعر ہونے کے علاوہ گریجویٹ، حضرت تھانویؒ کے خلیفۂ اعظم اور خادمِ خاص بھی تھے۔ انھوں نے حضرت کی حیات میں ہی آپ کی سوانح "اشرف السوانح" کے نام سے لکھ دی تھی جو صحیح حالات کی جامع اور خود صاحبِ سیرت کی مصدقہ تھی۔ مگر وہ اپنے مخصوص اندازِ بیان و ترتیب کی وجہ سے عوام سے زیادہ خواص کے لیے مفید ثابت ہوئی۔ اس لیے ضرورت تھی کہ تاریخی حیثیت سے جدید طرز پر ایک ایسی سیرتِ اشرفیہ لکھی جائے، جس سے عام تعلیم یافتہ طبقہ بھی استفادہ و استفاضہ کر سکے۔

محبی و محترمی جناب منشی عبد الرحمان خاں صاحب ملتانی سلمہٗ نے اس ضرورت

کا احساس کرتے ہوئے "اشرف السوانح" کی اساس پر جدید اضافوں کے ساتھ ایک ایسی جامع اور مفصل مگر صحیح و مستند "سیرتِ اشرف" مرتب کی ہے، جس کی اہل الرائے کے نزدیک سیرۃ النبی کے بعد اردو ادب میں نظیر ملنی مشکل ہے۔ حسنِ ترتیب نے اسے نقشِ حیات کے ساتھ درسِ حیات بھی بنا دیا ہے۔ جسے پڑھ کر انسان حیران رہ جاتا ہے اور اس کے لیے یہ فیصلہ کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ یہ سیرت

"نور کی بنی ہوئی اور تقدس کے سانچے میں ڈھلی ہوئی کسی مافوق الفطرت ہستی کی ہے؟ یا آب و گل سے ترکیب پائے ہوئے انسانی دل اور بشری جذبات رکھنے والے کی؟"

مؤلف سلمہ نے "سیرتِ اشرف" مرتب کر کے وقت کی ایک بہت بڑی ضرورت کو ہی پورا نہیں کیا بلکہ خدامِ دربارِ اشرفیہ پر خصوصاً اور عام مسلمین پر عموماً احسان فرمایا ہے اور مجھ ایسے ناکارہ و خطاکار کو تیاری کے ساتھ ساتھ حرفاً حرفاً مطالعہ کی سعادت بخش کر مشورہ طلب امور میں مشورہ بھی قبول فرمایا ہے۔ جس سے قلبی راحت نصیب ہوئی اور دل سے دعا نکلی کہ حق تعالیٰ منشی صاحب موصوف کو مزید دینی خدمات کی توفیق عطا فرمائے۔ ان کی تمام دینی تالیفات و تصنیفات کو مقبول و نافع بنائے اور ان کے قال کو حال بنا کر رضا و قرب سے نوازے۔ آمین ثم آمین

خیر المدارس۔ ملتان شہر
۲۶ رمضان المبارک ۱۳۷۴ھ

خادم الطلباء و الفقراء
خیر محمد جالندھری عفا اللہ عنہ

متبرک سیرت

یہ مژدہ جاں بخش معلوم ہو کر کیا بتاؤں کس قدر مسرت ہوئی اور دل سے آپ کے لیے کتنی دعائیں نکلیں کہ آپ حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی سوانح حیات مرتب فرما رہے ہیں۔ سوانح کے کچھ اجزا جو آپ نے اپنے کرم سے بھیجے۔ وہ میں نے بہ شوق و رغبت مطالعہ کیے۔ ماشاءاللہ اسلوبِ بیان اور طرزِ ترتیب بہت خوب ہے۔

پاکستان کے ابتدائی تخیل کے عنوان سے جو کچھ جناب نے تحریر فرمایا۔ نہایت سلیقہ کے ساتھ تحریر فرمایا۔ اس عنوان پر قلم اٹھانا بہت دشوار تھا کہ حقیقت بھی بے نقاب ہو جائے اور مبالغہ بھی نہ ہو۔ گزشتہ داعیان کی دلآزاری بھی نہ ہو اور جو کچھ لکھا جائے دلائل کے ساتھ ہو۔ منتشر موتی خواہ علیحدہ علیحدہ کیسے ہی نادر و نایاب ہوں۔ اس قدر جاذبیت نہیں رکھتے اور نہ اس قدر دیدہ زیب ہوتے ہیں۔ جیسے ایک لڑی میں سلیقہ سے پرونے کے بعد بیش بہا اور خوش نما ہو جاتے ہیں۔ آپ جس کاہش و کاوش سے اس متبرک سیرت کو مکمل فرما رہے ہیں یہ آپ ہی کا حصہ ہے۔

ع :- اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ

مجھے مسرت ہے کہ اس تصنیف میں آپ پوری دیانت سے کام لے رہے ہیں اور خدام حضرت تھانوی رح مطمئن و مسرور ہیں کہ باری تعالیٰ نے سیرۃِ اشرف کی تالیف و تصنیف کا کام اپنے ایسے بندہ سے لیا ہے جو ہر طرح اس اہم ترین خدمت کی انجام دہی

کا اہل ہے۔

مبارک ہے آپ کی ذات کہ اللہ تعالےٰ نے آپ سے ایسا جلیل القدر کام لیا۔ جو دُنیا و آخرت دونوں اعتبار سے عدیم المثال ہے۔ جملہ حلقہ بگوشان حضرت والا آپ کے شکر گزار ہیں۔ کہ آپ نے بروقت یہ کام اپنے ہاتھ میں لیا ہے۔ اللہ تعالیٰ اجرِ عظیم عطا فرمائے اور آپ کی اس دینی خدمت کو قبول فرمائے۔ امین ثُم امین

باغپت، ضلع میرٹھ
۱۸؍ جولائی ۱۹۵۵ء

نیازمند
جمشید

نمونۂ اخلاقِ محمدیؐ

یہ معلوم کر کے بے انتہا مسرت ہوئی کہ آپ نے مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی سیرت قریب قریب مرتب کرلی ہے۔ مجھے مولانا مغفور سے پہلی مرتبہ مسلم لیگ کی تحریک کی ابتدا میں تھانہ بھون میں ملاقات کا موقعہ ملا۔ میں اپنے دوست نواب جمشید علی خاں کے ہمراہ ان کی خدمت میں حاضر ہوا تھا۔ کیونکہ انھوں نے مجھے یقین دلایا تھا کہ حضرت مولانا لیگ کے مقاصد سے ہمدردی رکھتے ہیں اور تحریک کے سلسلہ میں مفصل معلومات حاصل کرنا چاہتے ہیں۔

پہلی ملاقات ظہر کی نماز کے بعد مسجد میں ہوئی۔ جہاں مولانا ایک حلقہ کے درمیان تشریف فرما تھے۔ ہم کو دیکھتے ہی کھڑے ہو گئے اور دوسرے لوگوں کو وہاں سے رخصت کر دیا۔ عصر کی نماز تک ان سے گفتگو جاری رہی۔ اس کے بعد انھوں نے وعدہ فرمایا کہ وہ لیگ سے اپنی ہمدردی کا اعلان اخباروں میں فرمادیں گے۔

رات کو کھانے کی دعوت دی۔ جہاں ایک نہایت دلچسپ صحبت رہی۔ میں یہ بتا دینا چاہتا ہوں کہ مولانا کو دیکھتے ہی میرے دل پر ان کی بزرگی کا گہرا اثر ہوا۔ اور وہ تمام شکوک رفع ہو گئے۔ جو میرے دل میں تحریک خلافت کے دوران میں تھانہ بھون کے بیانات کی وجہ سے پیدا ہو گئے تھے۔

دوسری مرتبہ مولانا نے خود مجھے تھانہ بھون میں طلب کیا۔ اس دن رات کو بھی اپنے گھر کھانے پر مدعو فرمایا۔ جب میں معہ اپنے ہمراہیوں کے وہاں پہنچا۔ تو مولانا

خود ہاتھ دھلانے پر مصر ہوئے جس کو ہم ہرگز گوارا نہ کر سکتے تھے۔ پھر اپنے ہاتھ سے دسترخوان بچھایا اور کھانا لے کر آئے۔ ان کی اہلیہ محترمہ تھوڑی تھوڑی دیر بعد اوٹ کے پیچھے سے گرم گرم روٹیاں لاتی رہیں۔ جب کھانا لگ چکا تو مولانا نے فرمایا "آیئے جنّت کا کام کریں۔" میرے پوچھنے پر کہ وہ کیا؟ فرمایا "کلوا واشربوا"۔

وہ اخلاقِ محمّدی کے پورے حامل تھے۔ جیسا اثر میرے قلب پر ان سے ملنے پر ہُوا۔ ایسا صرف ایک مرتبہ اور ہُوا تھا۔ جبکہ پہلے پہل (شیخ الہند) مولانا محمود الحسنؒ سے نیاز حاصل ہُوا تھا۔ خلافت اور لیگ کی تحاریک کے درمیان بہت سے علماء سے ملنے کے اتفاقات ہُوئے، لیکن کسی کا بھی اتنا اثر نہ ہوا۔ جیسا کہ مولانا تھانویؒ سے ملنے کا۔

ان کے خطوط میرے پاس آتے رہے جو اس وقت میرے لڑکے کے پاس ہیں۔ میں انھیں لکھ رہا ہوں کہ وہ یہ خطوط آپ کو روانہ کر دیں۔

مصطفےٰ کاسل میرٹھ

۱۰ جون ۱۹۵۵ء

نیازمند

محمد اسمٰعیل خاں

چراغِ راہ

مجھے بڑی مسرت ہے کہ آپ حضرت مولانا اشرف علی رحمۃ اللہ علیہ کی سیرت لکھ رہے ہیں یہ ایک بہت ہی ضروری کام ہے اس لیے کہ قوم کے افراد کو ایسے لوگوں کی سیرت جاننے سے خود اپنی سیرت بنانے میں بڑی مدد ملتی ہے۔ ایسے حضرات کے سوانح حیات قوم کے لیے چراغِ راہ کا کام دیتے ہیں۔ قوم کو ایسے حضرات کی سیرت اور کردار کی روشنی میں بُرے اور بھلے کی تمیز کا موقع ملتا ہے اور اچھے کاموں کی ترغیب اور بُری باتوں سے اجتناب کی قوت حاصل ہوتی ہے۔ مجھے حضرت حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں نہ صرف ذاتی طور پر شرف نیاز حاصل تھا، بلکہ خاندانی طور پر ان تمام حضرات کی خدمت کرنے کا فخر ہے اور میرے آباؤ اجداد کو حاصل رہا ہے کہ جن حضرات سے حکیم الامت کو تعلق تھا۔ مثلاً مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ اور مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ حضرت مولانا اشرف علی صاحب مرحوم و مغفور صحیح معنوں حکیم الامت تھے۔ وہ احکام شرعیہ کو اس اسپرٹ میں بیان فرماتے تھے کہ جو تابعین اور تبع تابعین کے زمانہ میں اسلامی دُنیا میں کارفرما تھے مثلاً ایک قصہ عرض کر دوں۔

مولانا مرحوم مغفور کی خدمت میں ایک صاحب حاضر ہوئے اور حج پر جانے کا خیال ظاہر کیا۔ حضرت نے فرمایا کہ تم پر کوئی قرضہ تو نہیں ہے۔ انھوں نے انکار کیا تو فرمایا کہ کوئی جوان بیٹی شادی کو تو نہیں ہے۔ انھوں نے فرمایا کہ ایک لڑکی ہے۔ حضرت نے

ارشاد فرمایا: کہ پہلے لڑکی کی شادی کرو جب حج کو جانا۔ اب ایسے حضرات کہاں ہیں جو اسلام کی صحیح ضروریات کو سمجھیں اور شارع کے مقصد کو بروقت پیشِ نظر رکھیں۔ مجھے اُمید ہے کہ حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی سیرت مسلمانوں کے لیے مشعلِ راہ بن جائے گی۔

راحت منزل۔ علی گڑھ

۱۶۔ مئی ۱۹۵۵ء

نیاز مند

احمد سعید

پیش لفظ

سیرت کی صورت

حق تعالیٰ جلشانہ نے اپنے کلام پاک میں قرآن کا ایک مقصد یہ بھی بیان فرمایا ہے کہ :-

نَحْنُ نَقُصُّ عَلَيْكَ اَحْسَنَ الْقَصَصِ بِمَآ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ هٰذَا الْقُرْاٰنَ وَاِنْ كُنْتَ مِنْ قَبْلِهٖ لَمِنَ الْغٰفِلِيْنَ (یوسف 1/12)	ہم نے آپ کے پاس جو قرآن بھیجا ہے اس کے ذریعے ہم آپ کو سب قصوں سے اچھا قصہ سناتے ہیں - اس سے قبل آپ (اس سے) بالکل بے خبر تھے -

اس لیے قرآن کریم دستورِ حیات کے علاوہ امم سابقہ کی ایک ایسی تاریخ بھی ہے جو ان کے احوال و حوادث کو بصائر و عبر اور علوم و ہدایات کے لیے پیش کرتا ہے - اور یہی تاریخ نویسی کا اصل الاصول ہے۔ اگرچہ عام دستور کے مطابق تذکرہ نویس یا سوانح نگار انقلاب آفریں شخصیتوں کے پُرعظمت کارناموں کو صرف یہ دکھلانے کے لیے پیش کرتے ہیں کہ انھوں نے دُنیا کو بامِ ترقی پر پہنچانے میں کتنا حصّہ لیا۔ مگر یہ اصول اسلام کی مایہ ناز شخصیتوں کو پیش کرنے کے سلسلہ میں چنداں مدد نہیں دے سکتا۔ کیونکہ اسلام کی تاریخ دُنیا کی دُوسری تاریخوں سے بالکل مختلف ہے -

اسلام کا روشن ترین دَور سرورِ کائنات فخرِ موجودات صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے شروع ہو کر خلافتِ راشدہ تک ختم ہو جاتا ہے - قرآن کریم گزشتہ ساری تاریخ اسی دَور کی فضیلت و

تائید کے لیے بیان کرتا ہے اور آئندہ کی تمام تاریخ اسی دور کی روشنی میں مرتب کرنے کی دعوت دیتا ہے۔ اس لیے اسلام کی مایہ ناز اور قابلِ فخر شخصیات کو پیش کرتے وقت یہ دکھانا عبث ہوگا کہ انھوں نے دُنیا کو ترقی کی کتنی منازل طے کرائیں۔ بلکہ یہ دکھانا ہوگا کہ انھوں نے اپنی علمی و عملی جدوجہد سے دُنیا کو آفتابِ نبوت کی روشنی میں لانے میں کتنا حصّہ لیا۔

قرآن کریم کے استقصائے سے معلوم ہوتا ہے کہ ابتدائے آفرینش سے یہی دستور چلا آرہا ہے کہ حق تعالےٰ ہر قوم کے لیے بمنشار وَلِکُلِّ قَومٍ ھَاد ایسے ہادی و رہبر بھیجتا رہا۔ جو اس قوم کو ہدایت کی طرف متوجہ کرتے رہے۔ جب تک سلسلہ نبوّت چلتا رہا۔ نبی آتے رہے جب یہ ختم ہوگیا۔ تو وقتاً فوقتاً ایسے مصلح اور مفکر بھیجے جاتے رہے۔ جو قوم کو اس دینی اور انبیائی راہ پر لانے کی کوشش کرتے رہے۔ جس سے وُہ بھٹک کر رسم و رواج اور بدعات و خرافات کے گڑھے میں جاگری تھی۔

تاریخ ہمیشہ خود اپنی ورق گردانی کرتی ہے۔ جب تک قوم میں کوئی ایسا مصلح موجود رہتا ہے۔ وہ صراطِ مستقیم پر چلنے میں کوشاں رہتی ہے۔ مگر جونہی وُہ اپنا فرض ادا کر کے چل دیتا ہے۔ تو کچھ عرصہ کے بعد اس کی تعلیم و تربیت کا اثر ختم ہونا شروع ہوتا ہے اور وُہ قوم پھر اسی مقام پر پہنچ جاتی ہے۔ جہاں سے اسے راہِ ہدایت پر لایا گیا تھا۔ اس کی بہترین مثال خود اسلام کا دَورِ اولیں ہے کہ

"جو دین قیصریت و کسرائیت کے رنگ کو مٹانے آیا تھا۔ اس کے نام لیوا چالیس برس کے بعد خود ہی قیصریت و کسرائیت کے رنگ میں آہستہ آہستہ ایسے رنگ گئے کہ اس کے امراء و حکام، خلفاء راشدین کی نیابت کی جگہ قیصر و کسریٰ کی جانشینی پر فخر کرنے لگے۔ وہی تعیش، وہی سونے چاندی ریشم و حریر اور طاؤس و رباب کی زندگی مُسلمان امراء و احکام کی زندگی کا مقصد بن گیا۔ بیت المال ان کا ذاتی خزانہ ہوگیا۔ اور سلطنت ان کی موروثی ملکیت، جاگیرداری اور زمینداری سلامی

اصول کی بجائے قیصر و کسریٰ کے طرز کی پیروی جاری ہوگئی ۔"

(جامع المجددین صت۲۹ ملخط)

چنانچہ تاریخ اسلام میں ایسے ادوار آئے ۔ جن کی اصلاح و درستی کے لیے مصلح و ہادی پیدا ہوتے رہے ۔ ماضی قریب کی مشہور شخصیتیں حضرت شیخ احمد سرہندی ۔ حضرت مولانا شاہ ولی اللہ محدث دہلوی ، حضرت مولانا شاہ اسماعیل شہید اور حضرت مولانا سید احمد بریلوی رحمہم اللہ تعالےٰ اسی سلسلہ کی اہم کڑیاں تھیں ۔ جنھوں نے احیائے سنن ور دِ بدعات کیلئے اپنے اپنے وقت کے تقاضوں کے مطابق خدمتِ دین و خلق کے فرائض انجام دیئے ۔ جن پر تاریخ بجا طور پر فخر کر سکتی ہے ۔

مگر ان کے بعد تعلیمِ جدید کا ایک ایسا دَور آیا ۔ جس نے تہذیبِ مغرب کو مسلمانوں کی نظروں میں معزز بنا دیا اور اسلام کو خود اسلام کے نام لیواؤں کی نظروں میں ذلیل ۔ جس کی وجہ سے انھوں نے دین کے اصول و مبادی کو ترک کر کے افرنگی تصوّرات پر قصرِ حیات تعمیر کرنا شروع کر دیا ۔ ہر بات میں مغرب کے تمدن و سیاسیات کی نقالی ہونے لگی ہر جگہ لندن و پیرس کی عریانی و بے حجابی نظر آنے لگی ۔ بدعات و خرافات کو دین سمجھا جانے لگا ۔ رقص و سرور اور چنگ و رباب کی سرپرستی شروع ہوگئی اور قریباً ہر مسلمان کے دل و دماغ سے نقشِ اسلام مٹنے لگا ۔

جب مسلمانوں کی دینی اور اخلاقی حالت اس حد تک گر گئی تو حق تعالےٰ نے اپنی سُنت کے مطابق ایک ایسا حکیم اور مصلح بھیج دیا ۔ جس نے دنیا کو بتلا دیا کہ دین صرف نماز ، روزہ ، حج ، زکوٰۃ ، نوافل یا اوراد کا نام نہیں ، بلکہ اس کے اجزا اخلاق معاشرت اور معاملات بھی ہیں ۔ انھوں نے دینِ کامل کے تمام ابواب و اجزا کو مدِ نظر رکھ کر تعمیرِ ملت کا کام شروع کیا اور دُنیا کو وہی بھولا ہوا سبق یاد دلایا جو دشتِ عرب کے ایک اُمّی (صلی اللہ علیہ وسلم) نے دیا تھا کہ :

"حقیقت میں ترقی جس کی اس وقت دم بدم پکار ہے۔ اُونچے محلوں بھرے خزانوں۔ بیش قیمت لباسوں۔ گراں بہار سامانوں۔ بڑی بڑی تجارتوں۔ اعلیٰ ملازمتوں۔ اُونچی اُونچی تنخواہوں۔ شاہانہ احتراموں، اعزازوں اور خطابوں کا نام نہیں۔ بلکہ اللہ تعالیٰ کے احکام کی تعمیل کے ساتھ بلند اخلاق۔ شریف عادات اور پاک و صاف قلب کا نام ہے۔ جو آب و گل سے وابستہ اور فانی کا طالب نہ ہو۔ اور حبِ مال اور حبِ جاہ کا گرویدہ نہ ہو۔ جس میں اخلاص کے ساتھ خالق کی رضا کے لیے خلق کی خدمت کا جذبہ ہو" (جامع المجددین صـ۲۹)

وہ مصلح اور حکیم حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ تھے وُہ مسلمانوں کی دینی اور دنیوی اصلاح اور انفرادی و اجتماعی بہبود و ترقی کے لیے اتنا نادر علمی خزانہ چھوڑ گئے ہیں جو قیامت تک کام دے سکتا ہے۔ مگر افسوس اس بات کا ہے۔ کہ ان کے نام۔ کام اور پیغام سے دیندار طبقہ تو بخوبی آگاہ ہے۔ مگر موجودہ تعلیم یافتہ طبقہ قریباً ناآشنا۔ جس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ حضرت تھانویؒ کی تعلیمات کی تہذیب و تسہیل اور نشر و اشاعت کا کام اس پیمانہ پر نہیں ہو رہا۔ جس پیمانے پر دُوسرا لٹریچر پھیلایا جا رہا ہے اور نہ ہی ان کے حالاتِ زندگی پر اس انداز سے روشنی ڈالی گئی ہے۔ جس سے نو تعلیم یافتہ طبقہ کو ان کی طرف کشش ہو سکتی۔

خواجہ عزیز الحسن مجذوبؒ نے حضرت تھانویؒ کی جو "اشرف السوانح" مرتب کی تھی اور جس کی خود حضرت تھانویؒ نے نظر ثانی کی تھی۔ وُہ اگرچہ ہر لحاظ سے جامع ہے۔ مگر اس کا اندازِ بیان موٗرخانہ نہ ہونے کی وجہ سے اس کا مطالعہ جدید تعلیم یافتہ طبقہ کے لیے مانع ہے۔ اس لیے میرے دل میں بارہا یہ خیال پیدا ہُوا کہ کوئی صاحبِ قلم اس کی تہذیب و تسہیل ہی کر دے۔ تاکہ ہمارے انگریزی خواں حضرات بھی اس سے مستفید ہو سکیں۔ اس غرض کے

لیے میں نے سب سے پہلے مولانا عبدالباری صاحب ندوی استاذ فلسفہ عثمانیہ یونیورسٹی کی توجہ مبذول کرائی۔ جو حضرت تھانویؒ کے جلیل القدر خلفاء میں سے ہیں انھوں نے اپنے گرامی نامہ مورخہ ۶ اپریل ۱۹۴۷ء میں مطلع فرمایا کہ :۔

"حضرت علیہ الرحمۃ کی سوانح جس طرز کی آپ کے پیش نظر ہے۔ مولانا سید سلیمان ندوی اس کے تحریر فرمانے کا مصمم ارادہ فرما چکے تھے غالباً ابتدا بھی فرمادی تھی۔ خدا کرے مکمل فرمادیں۔

جی احقر کا بھی چاہتا ہے کہ حضرت کی کتابیں ایسی شائع ہوں کہ نیا طبقہ بھی مستفید ہو سکے۔ مگر ظاہر کو موجب رغبت بنانے کے ساتھ باطناً بھی نئی تہذیب و ترتیب و تسہیل کی ضرورت ہے۔ خوشی ہوئی کہ آپ حضرات کو اس طرف توجہ ہے اللہ تعالےٰ قبول فرمائے اور مدد فرمائے"۔

اس اطلاع پر میں نے حضرت مولانا سید سلیمان ندویؒ کی طرف رجوع کیا۔ تو انھوں نے میرے خط کا یہ جواب بھیجا :۔

بھوپال - ۲۸ جون ۱۹۴۷ء

السلام علیکم

مکرم

جواب خط میں تاخیر ہوئی۔ آپ کا خط کاغذوں کے ڈھیر میں مل گیا تھا آج نظر آیا۔ تاخیر کی تکلیف کی معافی چاہتا ہوں۔

بے شبہ "اشرف السوانح" کی تہذیب کا کام میں نے شروع کیا تھا ایک دو جز لکھے تھے کہ میں علیل ہو گیا۔ پھر بھوپال آنا پڑا اور وہ کام رک گیا اور جلد امید نہیں۔ ایسی حالت میں کوئی اور شخص اس کام کو کرنا چاہے تو وہ ضرور کرے۔ اللہ تعالیٰ آپ لوگوں کو حفظ و امان میں رکھیں اور اپنی توفیقات سے

بہرہ ور فرمادیں۔ والسلام

سید سلیمان

اس پر اکتوبر ۱۹۴۷ء میں میں نے محقق اسلام سلطان القلم مولانا سید مناظر احسن صاحب گیلانی صدر شعبہ دینیات عثمانیہ یونیورسٹی کا دروازہ کھٹکایا اور انھیں لکھا کہ میں حضرت تھانویؒ کی یادگار کے طور پر ایک رسالہ "پیغام اسلام" جاری کر رہا ہوں۔ آپ حضرت تھانویؒ کے متعلق مضامین عطا فرمایا کریں اور ان کی سیرت لکھنے کی طرف بھی توجہ فرمائیں۔ اس کے جواب میں اُنھوں نے ایک مضمون بعنوان "حکیم الامت کا جادۂ اعتدال" روانہ فرمایا (جو سیرت ہذا میں درج ہے) اور لکھا :-

جامعہ عثمانیہ

حضرت والا

وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہ'

عدیم الفرصتی کی وجہ سے کوئی مضمون تیار نہ ہو سکا۔ بڑی وجہ یہ تھی۔ کہ مولانا تھانویؒ کی کتابوں کا ذخیرہ اس وقت میرے پاس نہیں ہے تاہم آپ کے تقاضے کے بعد خاموشی گناہ معلوم ہوا۔ مختصر سا مضمون "کمالات اشرفیہ" کی مدد سے تیار کر کے بھیج رہا ہوں اور کیا عرض کروں دعا کیجیے کہ فرصت میسر آئے۔

مناظر احسن گیلانی

بعد میں کچھ ایسا انقلاب آیا کہ نہ رسالہ جاری ہو سکا۔ نہ کہیں سکون و اطمینان کی فضا باقی رہی کہ کسی اور سے تقاضا کرتا۔ مگر یہ خیال بھلایا بھی نہ جا سکا۔

کچھ عرصہ بعد لکھنؤ سے خبر آئی کہ مولانا عبد الباری صاحب ندوی حضرت تھانویؒ کے متعلق "جامع المجددین" تصنیف فرما رہے ہیں۔ جس سے کچھ تسلی ہوئی۔ مگر جب وہ چھپ کر آئی۔ تو اسے حضرت تھانوی کے صرف مجددانہ کارناموں پر مشتمل پایا۔ جس میں بتایا گیا

ہے کہ حضرت تھانویؒ نے "جماعت سازی" کے اس دور میں کس طرح انبیائی طریق پر" افراد سازی کا مہتم بالشان کارنامہ سرانجام دیا۔ مگر یہ سوانح کا کام نہ دے سکی۔ اس کے بعد یہ اطلاع ملی کہ محترم مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی مدیر "صدق جدید" لکھنؤ "حکیم الامت" کے نام سے حضرت تھانوی کی انسانیت کی مصوری کر رہے ہیں۔ اب اس کا انتظار ہونے لگا۔ جب وہ چھپ کر آئی تو اسے مولانا محترم کے ان ذاتی نقوش و تاثرات پر مشتمل پایا۔ جو حضرت تھانویؒ کو اس دور کا "ایک بہترین انسان" ثابت کرتے تھے۔ یہ تصنیف لطیف اگرچہ حضرت تھانویؒ کی زندگی کے بہت سے پہلوؤں کو روشنی میں لے آئی۔ مگر سوانح حیات کی تعریف میں پھر بھی نہ آسکی۔ اس لیے اب اس کے سوائے اور کوئی چارہ کار نظر نہ آیا کہ اپنی علمی بے مائگی کے باوجود حق تعالےٰ کے فضلِ خاص کے بھروسہ پر اس کام کو خود ہی سرانجام دینے کی کوشش کروں۔

میرے اس ارادہ کا جب محترمی مولوی ثناء اللہ خاں صاحب ناشر کتب لاہور کو علم ہوا تو انھوں نے مجھے اس میدان میں قدم رکھنے سے روکنے کے لیے یہ لال جھنڈی دکھائی کہ :-

"حضرت تھانویؒ اس بات کو قطعاً پسند نہ کرتے تھے کہ ان کی سیرت لکھی جائے۔"

اس سے بڑی پریشانی ہوئی۔ جسے رفع کرنے کے لیے حضرت تھانویؒ کے فیض یافتہ محترم حاجی عبدالسلام صاحب ہوشیارپوری نے لکھا کہ :-

"حضرت تھانویؒ کی سیرت اختصار کے ساتھ جدید ندوی طرز پر ضرور مرتب فرمایئے۔ اس کی بڑی ضرورت ہے۔ موجودہ سوانح طویل اور مشکل ہے جس کے عوام متحمل نہیں ہو سکتے۔ حضرت قدس سرہٗ نے جو منع فرمایا تھا وہ اس وجہ سے تھا کہ مؤلفین افراط و تفریط سے کام لیتے ہیں اب جبکہ خود حضرت قدس سرہٗ

کے زمانہ میں حضرت کے سامنے لکھی ہوئی اشرف السوانح موجود ہے۔ تو انہی واقعات کو دوسرے طرز پر مرتب کرنے میں کیا حرج ہے۔ صرف طرز نگارش دوسرا آسان ہوگا واقعات وہی ہوں گے۔ اگر کسی بات کا اضافہ بھی ہو۔ تو وہی جس کو حضرت اپنے ملفوظات میں بیان فرما چکے ہوں۔"

حاجی صاحب کے اس ارشاد کی تائید اشرف السوانح کے دیباچہ "کشف الحقیقت" سے بھی ہو گئی۔ جو حضرت تھانویؒ نے خود لکھا تھا۔ اس میں آپ لکھتے ہیں کہ چونکہ :۔

"اکثر خوش اعتقادوں سے غلو ہو جاتا ہے۔ اس لیے میں نے بتاکید منع کیا ہے کہ میری سوانح عمری نہ لکھی جائے۔"

مگر اس کے ساتھ ہی "اشرف السوانح" لکھنے کی اجازت اس لیے دے دی کہ اپنے سامنے یہ کام کرانے سے :۔

"روایات میں افراط و تفریط کا احتمال بہت کم ہو جاتا ہے۔ کیونکہ صاحب واقعہ اس کی تنقید کر سکتا ہے۔ اور اس کی مصلحت کے اہم ہونے میں شبہ نہیں۔"

اپنی زندگی میں اور اپنی نگرانی میں اپنی سوانح حیات لکھوانے کا ایک فائدہ یہ بھی ہوا کہ ان کے حالاتِ زندگی پر روایات کا کہر نہ چھا سکا اور آنے والے مورخ کے لیے جدید طرز پر ان کی سوانح حیات لکھنا آسان ہو گیا۔ کیونکہ ان کی سوانح حیات اور تالیفات و تصنیفات کے علاوہ ان کے روزمرہ کے معمولات سے لے کر ان کے مواعظ و ملفوظات تک سب کے سب ان کے اپنے تصحیح و تصدیق شدہ موجود ہیں۔ جن میں ان کی زندگی کا ہر پہلو روزِ روشن کی طرح عیاں نظر آتا ہے۔

یہ کام شروع کرنے کے لیے جب حضرت تھانوی کی علمی اور عملی کارناموں کا جائزہ لیا تو انہیں نو سے زائد کتب پر مشتمل پایا۔ علم و عرفاں اور حقائق و معارف کے اس بحرِ ذخار

کی غواصی سے طبیعت گھبرا سی گئی۔ محترم اسعد ملتانی نے مجھے متذبذب دیکھ کر فرمایا کہ:۔

"داستانِ عمل" لکھ لینے کے مقابلہ میں یہ کام اتنا مشکل نہیں۔ جتنا سمجھ رہے ہو۔"

اس سے ہمت بڑھی مگر کام شروع کرنے سے پہلے قطبِ دوراں، شیخ زماں حضرت مولانا مفتی محمد حسن صاحب مدظلہ العالی رئیس الخلفاء، دربار اشرفیہ کی اجازت ضروری سمجھی - اور انھیں اس ارادہ سے مطلع کیا، تو انھوں نے اس دعا سے کہ :۔

"جس بحرِ بے پایاں میں آپ نے قدم رکھا ہے۔ حق تعالےٰ آپ کی ہر قدم پر مدد فرمائے"

ہمت افزائی فرمائی۔ آپ کا دعا فرمانا تھا کہ بمصداق اجابت از درِ حق بہرِ استقبال مے آید قلم حرکت میں آگیا۔ اور دیکھتے دیکھتے غیب سے ایسے سامانِ سہولت پیدا ہو گئے کہ خود صاحبِ دعا بھی حیران رہ گئے۔ یہ ہیں وہ حالات جن میں یہ سیرت لکھنے کی صورت پیدا ہوئی۔

سیرت ہذا لکھنے کے دوران میں عجیب وغریب انکشافات ہوئے۔ صاحب "اشرف السوانح" خسرو دربار اشرفیہ خواجہ عزیز الحسن صاحب مجذوبؒ حضرت تھانویؒ کے پاس مدتوں رہنے کے بعد اس نتیجہ پر پہنچے تھے کہ ؎

ہم جس پہ مر رہے ہیں، وہ ہے بات ہی کچھ اور
عالم میں تم سے لاکھ سہی، تم مگر کہاں

اور انھیں اس پر اصرار تھا بلکہ وہ اس کا تکرار بھی کرتے تھے کہ

ع :۔ بسیار خوباں دیدہ ام لیکن تو چیزے دیگری

حضرت تھانوی کی انسانیت کی مصوری کرنے والے مشہور قلمکار اور فلسفی مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی ایک مختلف المشرب بزرگ کے مرید ہونے کے باوجود بعالمِ وجد یہ نعرہ

لگاتے ہوئے کہ ؎

"اَب نہ کہیں نگاہ ہے - اَب نہ کوئی نگاہ میں"

اور بار بار یہ فرماتے ہوئے کہ ؎

"نہ ٹھہرا جائے ہے - مجھ سے نہ بھاگا جائے ہے مجھ سے"

اس نتیجہ پر پہنچے تھے کہ مَیں نے :-

"اپنے لمبے تجربہ اور سابقہ میں انھیں ایک بہترین انسان پایا"

مگر مَیں اس بحرِ ناپیدا کنار کی غواصی کے بعد اس نتیجہ پر پہنچا کہ جس طرح حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا نطق سراپا وحی تھا اور ان کا خلق قرآن کی عملی تفسیر ؛ اسی طرح حضرت تھانویؒ کا ہر قول و فعل کتاب و سُنت کی تنویر و تفسیر تھا اور اس لحاظ سے حضرت تھانوی ایک "بہترین انسان" ہی نہیں - اس دور کے بے نظیر انسان بھی تھے - جن کی کتابِ زندگی کا ہر ورق درسِ حیات کی حیثیت رکھتا ہے - جس سے مقصود اور طریق دونوں واضح ہو جاتے ہیں جن کا کوئی قول و کردار ایسا نظر نہیں آتا - جس سے زندگی کے کسی نہ کسی گوشہ پر روشنی نہ پڑتی ہو اور علم و عمل کی راہیں نہ کھلتی ہوں -

دُوسری عجیب بات یہ معلوم ہُوئی کہ پاکستان کا تخیل سب سے پہلے حضرت تھانویؒ نے ہی پیش کیا تھا - اس کے حصول و بقاء کا پروگرام اور اس کے نظام کا خاکہ حضرت اُس وقت تجویز فرما چکے تھے - جبکہ پاکستان چاہنے والوں یعنی علامہ اقبالؒ وغیرہ کو ابھی اس کا خیال بھی نہ آیا تھا -

تیسرا راز یہ کھلا کہ حضرت تھانویؒ نے ہی قائدِ اعظم کے پاس تبلیغی وفود و خطوط بھیج کر انھیں مسنون طریق پر پابندِ نماز بنایا - اور ان میں دینی ذوق پیدا کیا - یہ جو قائدِ اعظمؒ پر آخر زمانہ میں اسلامی رنگ غالب نظر آتا تھا - یہ سب حضرت تھانوی کے فیضان کا نتیجہ تھا -

چوتھا سراغ اس بات کا لگا کہ بڑے بڑے جلیل القدر گورنروں ، نوابوں ، رئیسوں ،

بجوں اور وکیلوں کا اصلاحی تعلق بھی دربار اشرفیہ سے رہا جن کے حالات ، نام ظاہر کیے بغیر "اشرف السوانح" میں مذکور ہیں۔ میں نے چاہا کہ ان کے حالات ان کے نام کے ساتھ لکھوں مگر مجھے مولانا شبیر علی صاحب تھانوی نے ایسا کرنے سے روک دیا۔ کیونکہ ان کا خیال تھا۔ کہ جب حضرتؒ نے کسی مصلحت سے ان کے نام ظاہر نہیں فرمائے تو آپ کیوں ظاہر کرتے ہیں ممکن ہے وہ حضرات خود اپنا نام شائع کرانا پسند نہ کریں۔ اس لیے میں نے بھی اتباعاً ان کے نام پردۂ راز میں رہنے دیئے۔

حضرت تھانویؒ کے باقیات الصالحات میں بڑے بڑے صاحبِ علم و قلم ہوئے ہیں جو علم و فضل میں اپنا ثانی نہیں رکھتے۔ اگر وہ اس کام کی طرف توجہ فرماتے۔ تو یقینی طور پر اسے بہتر اور احسن طریق سے سرانجام دیتے اور اپنی ذاتی معلومات ، مشاہدات اور واردات کا بھی اضافہ فرماتے۔ مگر میرے لیے یہ ممکن نہ تھا۔ کیونکہ میرے کان جب حضرت تھانویؒ کے نامِ نامی اور اسم گرامی سے آشنا ہوئے ۔ اس کے ایک سال بعد ہی آپ رحلت فرما گئے اس لیے میں ان کی زیارت سے مشرّف نہ ہو سکا۔ میں نے ان کا جاہ و جلال اور حسن و جمال اسی سیرت کے آئینہ میں دیکھا۔ اور اتنی دلجمعی سے دیکھا کہ اب زیارت کی حسرت ہی باقی نہیں رہی۔ البتہ اس آئینہ میں اپنا دینی سراپا اور اس کا ایک ایک داغ اور دھبہ دیکھ کر بحرِ ندامت میں غرق ہو جاتا ہوں۔

میرے پاس حضرتؒ کے علمی سرمایہ کا اتنا ذخیرہ تھا کہ اس کو سامنے رکھ کر ان کی زندگی کے ہر گوشہ اور ہر پہلو پر ایک مستقل کتاب لکھی جا سکتی تھی۔ اس لیے میں نے ان علمی یادگاروں سے استفادہ نہیں اٹھایا جو حضرت کے خدام کے پاس محفوظ ہیں۔ البتہ مذکور الصدر انکشافات کی وضاحت کے لیے جن کا ذکر تو حضرت کی مطبوعہ تحریرات میں موجود ہے۔ مگر ان کی تفصیل موجود نہیں۔ حضرتؒ کے مخلصین و معتمدین مولانا شبیر علی صاحب تھانویؒ۔ مولانا ظفر احمد صاحب عثمانی، مولانا عبدالماجد صاحب دریا بادی ۔ نواب جمشید علی خان صاحب اور نواب

محمد اسماعیل خاں صاحب کی طرف رجوع کرنا پڑا۔ جو ان سے واقف تھے ۔

علو ومبالغہ کے خوف سے مَیں نے پیش کردہ واقعات پر طویل نقد وتبصرہ ان کی بسیط تشریح وتفسیر سے حتی الوسع احتراز کیا ہے ۔ تاکہ کتاب کا حجم دبڑھ جائے۔ اور اسے حضرت تھانویؒ کی وکالت پر محمول نہ کیا جائے ۔ واقعات وحالات کی ندرت وکثرت کے سبب اخذ واستنباط کے لیے عام سیرتوں کی طرح ان کا اعادہ وتکرار بھی نہیں کیا گیا۔ البتہ آپ کو مختلف ابواب میں ایک ہی نوع کے ضمنی عنوان ضرور ملیں گے مگر ان کے تحت آپ واقعات بالکل مختلف پائیں گے ۔ جو ان کی زندگی کے قریباً تمام گوشوں اور پہلوؤں پر روشنی ڈال رہے ہیں ۔

"سیرتِ اشرف" کا بنیادی سرمایہ چونکہ "اشرف السوانح" ہے۔ اس لیے اس کے اقتباسات بلاحوالہ درج کیے گئے ہیں اور اکثر مقامات پر الفاظ بھی اسی کے مستعار لیے گئے ہیں۔ البتہ حضرت کی یا ان کے مخلصین ومسترشدین کی مطبوعہ کتب سے جو اقتباس لیے گئے ہیں۔ ان کے ساتھ حوالہ درج کر دیا گیا ہے ۔ اگرچہ یہ اضافے حضرتؒ کے قدامت پسند خدام پر گراں گزریں گے لیکن اگر وہ ان کی افادیت پر غور فرما دیں گے ۔ تو وہ لازماً اور انصافاً مجھے حق بجانب پائیں گے۔ مَیں نے حتی الوسع حضرتؒ کے قائم کردہ حصارِ احتیاط کے اندر رہتے ہوئے اس سیرت کو مرتب کیا ہے اور مزید احتیاطِ صحت کے لیے حضرت تھانویؒ کے خلیفۂ ارشد حضرت مولانا خیر محمد صاحب مدظلہ اور فاضل دیوبند مولوی عبدالرشید صاحب نسیم سے اس کی مزید جانچ پڑتال بھی کرالی ہے ۔ اور ان کے مشورہ کو عملی جامہ پہنایا ہے۔ اس کے بعد بھی اگر کوئی صاحب یہ خیال کریں کہ مَیں نے حضرت کی وصیت کا احترام نہیں کیا۔ یا ان کی قائم کردہ حدود سے تجاوز کیا ہے تو جس طرح حضرتؒ نے اُن حضرات سے فرمایا تھا کہ "مجھ کو پہچانا نہیں گیا" اسی طرح مَیں بھی یہ عرض کروں گا کہ انھیں حضرت کے ارشادات کی روح کی معرفت حاصل نہیں ہوئی ۔

مجھ ایسے نااہل کو جن حالات نے اس موضوع پر قلم اٹھانے کے لیے مجبور کیا ہے۔ وہ من وعن قارئین کرام کے پیش کر دیئے گئے ہیں اور جس کاہش وکاوش سے مَیں نے اسے مرتب کیا ہے۔ اس کا اندازہ آپ کو اس کی ترتیب سے ہو جائے گا۔ اس کے بعد اگر آپ اس سیرت کو دلچسپ پائیں۔ تو اسے محض مولا کریم کا فضل سمجھیں۔ اگر اس سے مستفیض ہوں تو اسے حضرتؒ کا فیض جانیں اور اگر اس میں آپ کو کوتاہیاں اور خامیاں نظر آئیں۔ تو ان کے لیے مجھے معاف فرمادیں۔ کیونکہ مَیں نہ مورخ ہوں نہ ادیب اور نہ فی الواقعہ تصنیف کا سلیقہ جانتا ہوں۔ اس لیے میری تحریر کے حسن وقبح پر نظر رکھنے کی بجائے صاحبِ سیرت کے ارشادات وحالات پر نظر رکھیں۔ جن کا تعارف مقصود ہے اور دعا فرمادیں کہ مولا کریم میری اس ناچیز سعی کو قبول ومقبول فرمادیں۔ اور اس کے پڑھنے والوں کو صاحبِ سیرت کی طرح انسانیت کے صحیح مقام پر پہنچائیں۔ آمین ثم آمین۔

اَلسَّعیُ مِنَّا وَ الْاِتْمَامُ مِنَ اللہِ

چہلیک۔ ملتان شہر
۱۴ اگست ۱۹۵۵ء

احقر العباد
عبدالرحمٰن خاں

نه گنجد در بیان وصفِ کمالش
کنم طبع آزمائی با خیالش

تعارف

صاحب سیرت کی کہانی ان کی اپنی زبانی

حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ سے تھانہ بھون میں متعینہ ایک پولیس آفیسر نے بیعت کی درخواست کی تھی۔ جس کے جواب میں آپ نے انھیں اپنا تعارف کراتے ہوئے لکھا:-

"میں ایک خشک طالب علم ہوں۔ اس زمانہ میں جن چیزوں کو درویشی کے لوازم میں سے سمجھا جاتا ہے جیسے محفل میلاد شریف۔ عرس گیارھویں۔ نیاز۔ فاتحہ قوالی وشل ذالک۔ میں ان سب سے محروم ہوں اور اپنے دوستوں کو بھی اسی خشک طریقہ پر رکھنا پسند کرتا ہوں۔

میں نہ صاحب کشف ہوں نہ صاحب کرامت۔ نہ صاحب تصرف ہوں اور نہ عامل۔ صرف اللہ و رسولؐ کے احکام پر مطلع کرتا رہتا ہوں۔

اپنے دوستوں سے کسی قسم کا تکلف نہیں کرتا نہ اپنی حالت۔ نہ اپنی کوئی تعلیم نہ امورِ دینیہ کے متعلق کوئی مشورہ چھپانا چاہتا ہوں۔

عمل کرنے پر کسی کو مجبور نہیں کرتا۔ البتہ عمل کرتا ہوا دیکھ کر خوش اور عمل سے دور دیکھ کر رنجیدہ ضرور ہوتا ہوں۔

میں کسی سے نہ کوئی فرمائش کرتا ہوں نہ کسی کی سفارش۔ اسی لیے بعض اہل الرائے مجھ کو خشک کہتے ہیں۔ میرا مذاق یہ ہے کہ ایک کو دوسرے کی رعایت سے کوئی اذیت نہ دوں۔ خواہ حسی ہی اذیت ہو۔

سب سے زیادہ اہتمام مجھ کو اپنے لیے اور اپنے دوستوں کے لیے اس امر کا ہے کہ کسی کو کسی قسم کی اذیّت نہ پہنچائی جائے۔ خواہ بدنی ہو۔ جیسے مارپیٹ، خواہ مالی ہو جیسے کسی کا حق مار لینا۔ یا ناحق کوئی چیز لے لینا۔ خواہ آبرو کے متعلق ہو۔ جیسے کسی کی تحقیر، کسی کی غیبت، خواہ نفسانی ہو جیسے کسی کو کسی تشویش میں ڈالنا یا کوئی ناگوار رنجدہ معاملہ کرنا اور اگر غلطی سے کوئی بات ایسی ہو جاوے تو معافی چاہنے سے عار نہ کرنا۔ مجھے ان کا اس قدر اہتمام ہے کہ کسی کی وضع خلاف شرع دیکھ کر تو صرف شکایت ہوتی ہے مگر ان اُمور میں کوتاہی دیکھ کر بے حد صدمہ ہوتا ہے۔ اور دُعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ اس سے نجات دے۔ یہ ہے میرا کچا چٹھا ورنہ لوگوں نے تو ؎

منش کردہ ام رستم پہلوان
وگرنہ یلے بود در سیستان

آغازِ زندگی

ذرہ ذرہ میں ہے پنہاں ایک دُنیائے عمل،
خواب سمجھا ہے جسے تُو، ہے وہی تعبیرِ خواب

(رُشدؔ)

تھانہ بھون

وجہ تسمیہ

آئین اکبری میں اس قصبہ کا نام تھانہ بھیم درج ہے۔ جو راجہ بھیم کے زمانہ میں اس کے نام کی نسبت سے رکھا گیا تھا۔ اگرچہ کاغذات شاہی میں اس کا دُوسرا نام محمد پُور بھی ملتا ہے جو یہاں آباد ہونے والے مسلمانوں نے اپنے ایک فرزند فتح محمد کے نام پر رکھا تھا۔ مگر اسے کوئی مقبولیت حاصل نہ ہو سکی اور یہ بدستور تھانہ بھون ہی مشہور رہا۔

امپیریل گزٹ جلد ۲۳ سنہ ۱۹۰۸ء میں اس کی وجہ تسمیہ دُوسری درج ہے اس میں لکھا ہے کہ یہاں کسی زمانہ میں بھوانی مندر موجود تھا جو بڑا مشہور تھا اور اسی کی نسبت سے اس کا نام تھانہ بھون پڑ گیا۔ اور قرینِ قیاس بھی یہی ہے کہ یہ بھوانی سے بھون ہوا ہے۔ بھیم سے بھون نہیں ہوا۔

محلِ وقوع

یہ قصبہ ممالک متحدہ آگرہ و اودھ کے ضلع مظفر نگر کی تحصیل کیرانہ میں مظفر نگر سے ۱۸ میل شمال مغرب میں پختہ سڑک پر واقع ہے۔ جس کے اردگرد مشہور قصبات دیوبند۔ گنگوہ۔ کاندھلہ۔ کیرانہ۔ جھنجانہ اور پانی پت ایسے مردم خیز اور تاریخی مقامات موجود ہیں۔

تاریخی عظمت

سنہ ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی میں یہ قصبہ مجاہدین کا مرکز رہا۔ جبکہ وہاں کے باشندگان قاضی محبُوب علی خاں اور ان کے بھتیجے قاضی عنایت علیخاں کی زیرِ قیادت جنگِ آزادی میں کُود پڑے اور اُنھوں نے بڑی بہادری سے تحصیل اور پھر شاملی

پر قبضہ کرلیا اور جو ۱۱۳ افراد اس کی حفاظت کر رہے تھے۔ ان کو موت کی نیند سلا دیا۔ بعد ازاں سکھوں اور گورکھوں نے مسلسل سات گھنٹے جنگ کرنے کے بعد ایک مجسٹریٹ کی زیرِ سرکردگی اس پر قبضہ کرلیا اور اس کے در و دیوار پیوندِ زمین کر دیئے۔

تاریخ میں یہ تمام علاقہ مردم خیز درج ہے۔ اس قصبہ اور اس کے ملحقہ قصبات میں تعلیم دین کے بڑے بڑے ادارے واقع ہیں جس کثرت سے اس علاقہ میں علماؔ و فضلا اور مشائخ گزرے ہیں۔ اس کی نظیر ہند و پاکستان کے کسی دُوسرے خطہ میں نہیں مل سکتی۔ اس لیے ایک انگریز افسر بندوبست نے اپنی رپورٹ میں اس علاقہ کے باشندوں کی ذہنی قابلیت کو سراہتے ہوئے تھانہ بھون کے لوگوں کو "عاقلانِ تھانہ" کا لقب دیا۔ جس کی تائید قنوج کے دیندار بزرگ اور مردم شناس رئیس شیخ معشوق علی کے ان الفاظ سے ہوتی ہے۔ جو انھوں نے ایک مرتبہ حضرت تھانویؒ سے فرمائے۔

"ان اطراف کے لوگ ہماری طرف کے لوگوں سے ہر بات میں بڑھے ہوئے ہیں۔ چنانچہ یہاں کا عالم وہاں کے عالم سے اچھا یہاں کا جاہل وہاں کے جاہل سے اچھا۔ حتیٰ کہ یہاں کا کافر وہاں کے کافر سے اچھا ہے"

ریلوے لائن

شروع شروع میں اس قصبہ کے پاس سے ریلوے لائن نہیں گزرتی تھی۔ حضرت تھانویؒ کی بڑی خواہش تھی کہ ریل ان کے قصبہ کے پاس سے گزرے تاکہ یہاں آنے والوں کو تکلیف نہ ہو۔ حق تعالیٰ کو چونکہ اپنے اطاعت شعار بندوں کی دلجوئی مطلوب ہوتی ہے اس لیے دعا قبول ہوئی اور سہارنپور سے ایک چھوٹی لائن اس طرف سے گزاری گئی۔ مگر اسٹیشن جو بنا وہ اصل قصبہ جہاں سے شروع ہوتا ہے اس سے کوئی دو میل اُدھر یعنی خواہ آدمی دہلی کی طرف سے آئے۔ خواہ سہارنپور سے۔ اسے قصبہ تک پہنچنے کے لیے دو تین میل کا سنسان غیر آباد جنگل کا راستہ سواری سے طے کرنا پڑتا اس سے بھی لوگوں کو تکلیف ہوتی۔ جو حق تعالیٰ کو منظور نہ تھی۔ اس لیے اس نے حضرت کے دل

میں یہ دُوسرا خیال ڈال دیا کہ اسٹیشن ہی قصبہ کے پاس بنے تاکہ آنے جانے والوں کو تکلیف نہ ہو۔ کیونکہ انسان کچھ نہیں چاہ سکتا جب تک اس کا مالک و مولا نہ چاہے۔ لطف یہ ہے کہ ہوتا وہی ہے جو وُہ خود چاہتا ہے۔ مگر اس کی خواہش انسان کے دل میں پیدا کر کے اور پھر اسے قبولیت کا درجہ بخش کر اس کی تسلی کا سامان کر دیتا ہے۔

تو چنیں خواہی خدا خواہد چنیں
می دھد یزدان مرادِ متقین

جدید اسٹیشن بس اس خیال کا دل میں آنا تھا کہ آپ نے جدید اسٹیشن بنوانے کے لیے سب سے پہلے درِ مولا پر خود دعا سے دستک دی، پھر خانقاہ کے ذاکرین و شاغلین سے باضابطہ دعاؤں کی سفارش کرائی۔ مسبب الاسباب تک عرض معروض پہنچانے کے بعد اربابِ اسباب کی توجہ کے لیے ٹریفک منیجر کے نام خطوط بھجوائے۔ ان پر خود تصدیقی دستخط فرمائے اور اس طرح آستانِ اشرفی تک پہنچنے والوں کی راحت رسانی کے لیے مطابقِ سُنّت دعا اور دوا دونوں سے کام لیا۔ جس کا ثمرہ یہ نکلا کہ ۱۸ نومبر ۱۹۲۸ء کو خانقاہ کے محاذ میں جدید اسٹیشن کھلا۔ حضرت کے ایک مرید نے اس کا نام "تھانہ بھون شریف" تجویز کیا۔ لیکن حضرت نے تبسم کے ساتھ اس سے اختلاف کیا۔ اور "تھانہ بھون" ٹاؤن پر اتفاق فرمایا۔ جو اب اس نام سے موسوم ہے۔

آبادی ۱۸۵۷ء کی پہلی جنگِ آزادی میں یہاں کی آبادی اڑتالیس ہزار کے قریب تھی۔ اس کے بعد قریب چھتیس ہزار رہ گئی اور بعدہٗ گھٹتے گھٹتے چھ سات ہزار تک جا پہنچی۔ مگر اب اس میں پھر اضافہ ہو گیا ہے۔

تازہ اہمیت شروع شروع میں اگرچہ اربابِ کمال کے ساتھ ساتھ اربابِ ثروت و اقتدار کا مرکز رہا۔ مگر انقلاباتِ زمانہ نے اس کی وہ شان و شوکت باقی نہ رہنے دی۔ حضرت تھانوی کے مولد و وطن ہونے کی وجہ سے اس کی عظمتِ رفتہ پھر بحال

ہوگئی اور "خانقاہ امدادیہ" نے اسے تاریخ میں پھر ایک خصوصی مقام دلوادیا۔

نام و نسب

نامِ نامی حضرت تھانویؒ کا دادھیالی نام عبدالغنی تھا مگر اس زمانہ کے مقبول و مشہور مجذوب حضرت حافظ غلام مرتضیٰ پانی پتی رحمۃ اللہ علیہ نے جن کی ان کے ننھیال پر خاص نظرِ التفات تھی۔ ان کا نام "اشرف علی" تجویز کیا۔ جس کی تفصیل آپ کو حضرت کے ذکرِ ولادت میں ملے گی۔ یہ ان کی ہی توجہ و اثر کا نتیجہ تھا کہ آپ کا دادھیالی نام قبول عام حاصل نہ کرسکا۔ اور اس مجذوب کا تجویز کردہ نام زبان زد خواص و عام ہوگیا۔ چونکہ کوئی فعل بدول مصلحت نہیں ہوتا۔ اس لیے دادھیالی نام کی تجویز بھی بلاضرورت نہ تھی۔ اس تجویز کی مصلحت و حکمت کا راز اس وقت کھلا جبکہ حضرت تھانویؒ نے اس نام کو خود اپنے رسالہ الخطوب المذیبہؒ میں ایک ایسے مواقع پر استعمال کیا۔ جہاں عرفی نام سے کام لینا خلافِ مصلحت تھا۔ اگر آپ کا اسم ثانی موجود نہ ہوتا۔ تو آپ کو یقیناً کوئی دُوسرا فرضی نام استعمال کرنا پڑتا اور یہ مسندِ نبوت کے ایک جانشین کی شان کے خلاف تھا۔ اس لیے قدرت کے حسنِ انتظام کے تحت شروع سے ان کا دُوسرا نام تجویز ہوچکا تھا۔

لقب گرامی آپ کا لقب حکیم الامت ہے جو سب سے پہلے مولوی مرزا احمد بیگ مالک مطبع محبوب المطابع دہلی کو القا ہُوا۔ جنھوں نے اسے بعینہٖ اسی طرح حضرت کے پتہ میں تحریر کیا۔ جس طرح مولانا عبدالحکیم سیالکوٹی نے حضرت شیخ احمد سرہندی رحمۃ اللہ علیہ کے نام کے ساتھ "مجدد الف ثانی" لکھ دیا تھا۔ جو خود بخود زبانِ خلق

پر نقارۂ خدا ہو کر رواج پا گیا اور جسے حضرت کے اصلاحی کارناموں نے اسم بامسمّیٰ کر دیا۔

حضرت مولانا خلیل احمد صاحب سہارنپوری قدس سرہٗ جب کسی تحریر میں حضرت کے نام کے ساتھ حکیم الامت لکھا ہُوا نہ پاتے تو بہت ناراض ہوتے اور فرماتے کہ اللہ تعالےٰ نے جیسا قلوبِ رجال میں ان کے لیے ایک لقب ڈال دیا ہے تو اس کو چھوڑنا نہ چاہیئے کہ اس میں حضرتِ حق کے ساتھ سوءِ ادب ہے۔

نسب عالی

حضرت علی کا سلسلہ نسب ان کے اپنے الفاظ میں حسب ذیل ہے:۔

"اشرف بن منشی عبدالحق بن حافظ فیض علی بن غلام فرید شہید بن محمد جلال بن رحمت اللہ بن امان اللہ (جو ۹۸۳ھ میں موجود تھے) ابنِ عتیق اللہ خطیب (صاحب فرمان مصدرہ ۸ جمادی الاول ۲ جلوس عالمگیری) ابن حافظ حبیب اللہ (صاحب فرمان عہدِ جہانگیری) ابن شیخ آدم، صاحب فرمان عہدِ اکبر اول بشراکت برادر خود فرید) ابن مولانا صدر جہاں جد اعلیٰ خطیبان موجود در ۹۷۰ھ بعہد اکبر اول (مطابق ایک فرمان کے جس میں ان کو بہ لفظ تقویٰ شعار لکھا ہے۔" (موائد العوائد)

خصوصیاتِ خاندانی

تھانہ بھون میں فاروقیوں کے چار مشہور خاندان تھے۔ جو خطیب۔ قاضی۔ نائب (نائب قاضی) اور محتسب کہلاتے تھے۔ حضرت تھانوی اسی خطیب خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ گویا آپ وراثتاً خطیب تھے۔ جو اپنے فرمانروا کے الفاظ میں "تقویٰ شعار تھے۔ اس لیے تقویٰ آپ کی خاندانی خصوصیت تھی۔ مولانا صدر جہاں کا شجرہ نسب سلطان شہاب الدینؒ سے ملتا ہے جو اولیاءِ کاملین میں سے تھے۔ فرخ شاہ لقب رکھتے تھے۔ اور والیِ کابل رہ چکے تھے۔ شیوخ تھانہ بھون۔ حضرت شیخ مجدد الف ثانیؒ، حضرت شیخ جلال الدین تھانیسریؒ۔ حضرت فریدالدین گنج شکرؒ یہ سب سلطان شہاب الدین الملقب بہ فرخ شاہ کابلی کی اولاد سے ہیں۔ جن کا تذکرہ "زبدۃ المقامات" میں ان الفاظ میں موجود ہے:۔

مردے ازالہ جلد امراو اعاظم و زرار سلاطین کابل بودہ نخستین نزیل ہندوستان اوست کہ از غزنین و کابل بدیار ہند آمد گویند دے باوصاف خجستہ موصوف بود تہر ویج اسلام و توہین عبدۂ اصنام معروف (منقول از تتمۂ سابعہ تنبیہات وصیت)

اس طرح ولایت بھی آپ کا خاندانی ورثہ تھی جس سے مولانا مفتی عزیز الرحمٰنؒ سابق مفتی دارالعلوم دیوبند کے اس سجع

از گروہ اولیاء اشرف علی

کی تائید ہوتی ہے اور آگے چل کر یہ سلسلہ حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ سے مل جاتا ہے جن کی عقل و فراست مسلماتِ عالم میں سے ہے۔ اس لیے آپ کی فہم و فراست بھی خاندانی تھی۔

آپ کے نانا پیر جی نجابت علیؒ اعلیٰ فارسی دانی، انشاء پردازی، لطیفہ گوئی، حاضر جوابی اور بذلہ سنجی کی وجہ سے بہت مشہور تھے اور ریاست کنجپورہ میں بعہدہ وکیل ریاست ممتاز تھے۔ اگرچہ وہ مولانا شاہ نیاز احمد بریلویؒ کے خلیفہ خاص سے بیعت تھے۔ مگر ان پر نظرِ تربیت حضرت حافظ صاحب مجذوب کی تھی۔ جس کی وجہ سے اُن پر آثار ذکر و شغل کا اس قدر غلبہ ہوا کہ انھوں نے خود کو فکرِ معاش و ادائے حقوق سے بے نیاز کر لیا۔ اس پر حافظ صاحب کو ان کی یہ کیفیت اپنی توجہ سے سلب کرنی پڑی اگرچہ ان کی وفات کے قریب حضرت حافظ صاحبؒ نے ان پر پھر ایک ایسی نظر ڈالی کہ وہ کیفیت عود کر آئی۔ اسی طرح آپ کے حقیقی ماموں پیر جی امداد علیؒ حافظ صاحب کی نظرِ توجہ سے بڑے حال و قال بزرگ بن گئے جن کا سوز و گداز اور عشقِ حقیقی انتہا کو پہنچا ہوا تھا اور خود حضرت تھانویؒ کے قول کے مطابق۔

"اُن کے کلمات سے ایک آگ سی نکلتی ہوئی محسوس ہوتی تھی اور حضرت

حافظ شیرازیؒ کا یہ شعر ان پر صادق آتا تھا۔

غلام آں کلماتم کہ آتشں افروزد

نہ آب سرزند در سخن بر آتش تیز

اسی طرح آپ کے ننھال کے جدِ اعلیٰ حضرت علی کرم اللہ وجہہ ہیں۔ جن پر اکثر سلاسلِ طریقت منتہا ہوتے ہیں۔ اس لیے عشق کی دولت آپ کو ننھال سے اور طریقت کی فضیلت ان کے جدِ اعلیٰ سے آپ کو ملی ہوئی تھی۔

آپ کے والد ماجد منشی عبدالحق تھانہ بھون کے ایک مقتدر رئیس اور صاحبِ نقد جائداد تھے وہ بقول صاحب "اشرف السوانح":۔

"فارسی میں بہت اعلیٰ قابلیت رکھتے تھے اور بہت اچھے انشاء پرداز تھے گو باقاعدہ قاری نہ تھے۔ لیکن مخارج بہت صحیح تھے۔ گو حافظ نہ تھے۔ لیکن ناظرہ ایسا رواں تھا کہ بعض اوقات حافظوں کو بھی لقمہ دیا کرتے تھے۔ میرٹھ کی ایک بڑی ریاست کے مختار عام تھے اور باجازت رئیس کمسریٹ کے ٹھیکے بھی لے لیا کرتے تھے۔ جن میں خدا تعالیٰ نے اتنی برکت عطا فرمائی کہ ہزاروں روپے کی آمدنی ہوئی۔ جس سے بہت سی نئی جائداد بھی خرید لی۔ اور خرچ کے مواقع پر بہت فراخ حوصلگی کے ساتھ روپیہ صرف فرماتے تھے۔"

اس طرح آپ نے دولت۔ ریاست۔ وجاہت اپنے والد سے پائی تھی۔ جس نے آپ میں استغناء پیدا کر دیا تھا۔ جس کی وجہ سے کوئی آپ کو زیرِ اثر نہ لا سکا۔ چنانچہ آپ خود فرمایا کرتے تھے کہ:۔

"بفضلہٖ تعالیٰ میرے اُوپر کسی بڑے سے بڑے رئیس کا بھی محض اس کی ریاست اور وجاہت ظاہری کی بناء پر مطلق اثر نہیں ہوتا۔ کیونکہ یہ خیال ہوتا ہے کہ یہی کیا رئیس ہیں؟ ہم بھی خدا کے فضل سے گھر کے کھاتے پیتے

ہیں۔ ہم کوئی مفلس زادے نہیں۔ الحمد اللہ میں نے ہمیشہ نہایت فراغت کے ساتھ زندگی بسر کی ہے اور ہزاروں روپے اپنے ہاتھوں خرچ کیے ہیں اس لیے اَب کوئی حسرت مال و متاع کے متعلق ایسی باقی نہیں رہی۔ جس کی وجہ سے کسی مالدار کی طرف نظر احتیاج ہو کیونکہ جب چیزوں سے جی بھر جاتا ہے تو اس کا طبعی خاصہ ہے کہ حرص و طمع باقی نہیں رہتی"۔

غرضیکہ آپ کو فراست و حکمت ولایت و طریقت۔ خطابت و وجاہت۔ دولت و ریاست اور عشق و تقویٰ ایسے انعاماتِ الٰہی ورثہ میں ملے تھے۔ جن کی وجہ سے آپ شانِ فاروقی اور شان علوی دونوں کے مظہر تھے اور ایسا ہونا سنت اللہ کے عین مطابق تھا کیونکہ حق تعالےٰ جسے منصب ارشاد پر بٹھاتے ہیں تو اسے شرافتِ نسبی اور اعزاز خاندانی بخشتے ہیں تاکہ وُہ مرجع خلائق بنے اور بڑے سے بڑے آدمی بھی اس کے اتباع سے عار نہ کریں۔

کرامتِ ولادت

مشیّتِ الٰہی میں خواہشاتِ انسانی کو کوئی عمل دخل حاصل نہیں ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ طب اور سائنس کی انتہائی ترقی کے اس دَور میں برتھ کنٹرول کے ماہرین دُنیا کی روز افزوں آبادی کو قاطع النسل ادویات کے ذریعہ روکنے میں ناکام رہے ہیں۔ کیونکہ جس نے دنیا کی ہوا کھانی ہوتی ہے۔ اسے قاطع النسل ادویات اور مانع حمل آلات کے استعمال کے باوجود بھی وُہ منصۂ شہود پر آنے سے نہیں روک سکتے۔

حکمتِ خداوندی کا یہی وہ نقطہ ماسکہ ہے جس پر پہنچ کر بڑے بڑے ملحدین ومنکرین کو بھی عَرَفْتُ رَبِّیْ بِفَسْخِ الْعَزَائِمِ کہنا پڑا۔

قطع نسل کی سعی

آپ کا واقعہ ولادت بھی اسی مادی دُنیا کے لیے دَرسِ عبرت ہے۔ جو نظامِ قدرت میں اپنی عقل وسائنس کے ذریعہ دخیل ہوکر اسے بدلنا چاہتی ہے۔ آپ کے والد ماجد کو خارش کا مرض لاحق ہوگیا تھا۔ کسی دوائی سے افاقہ نہیں ہو رہا تھا بلکہ ؎ :-

مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی

جس کی وجہ سے وہ سخت پریشان تھے بلکہ تنگ آچکے تھے۔ ان کی یہ حالت دیکھ کر ایک ڈاکٹر نے ان کے لیے ایک ایسی اکسیر دوائی تجویز کی جو قاطع النسل تھی انھوں نے بقاء نوعی پر بقاء شخصی کو ترجیح دیتے ہوئے وہ دوائی کھالی کہ "بلا سے اولاد نہ ہو۔ شفا تو ہو" اس واقعہ کا ذکر حضرت تھانویؒ نے خود مقدمۂ حسام عبرت" میں کیا ہے۔

اس واقعہ کا جب آپ کی والدہ ماجدہ کو علم ہُوا تو وہ بہت پریشان ہوئیں۔ کیونکہ پہلے بھی ان کی اولاد نرینہ زندہ نہ رہتی تھی۔ رفتہ رفتہ یہ بات آپ کی نانی صاحبہ کے کان تک پہنچ گئی۔ اتفاق سے ان دنوں افضل المجاذیب حافظ غلام مرتضیٰ پانی پتیؒ بھی آپ کے ننھال سابقہ تعلقات کی بنا پر آئے ہُوئے تھے۔ آپ کی نانی صاحبہ نے اس سلسلہ میں ان سے شکایت کردی۔

ولادت کی بشارت

عادت اللہ یُوں جاری ہے کہ وہ جب کسی کو رشد وہدایت کے لیے منتخب فرماتا ہے تو اِس کو بھیجنے سے قبل اپنے مقبول بندوں کی معرفت اس کی بشارت دیتا ہے۔ حافظ صاحب نے یہ شکایت سُنی تو دعا کی اور فرمایا :-

"یہ عمر وعلی کی کشاکش میں مرجاتے ہیں۔ اب کی بار علی کے سپرد کردینا۔ زندہ

رہے گا۔"

یہ مجذوبانہ معمہ کوئی نہ سمجھ سکا۔ مگر آپ کی والدہ صاحبہ جو غیر معمولی فہم و فراست رکھتی تھیں۔ فوراً سمجھ گئیں اور فرمایا:

"حافظ صاحب کا مطلب یہ ہے کہ لڑکوں کے باپ فاروقی ہیں اور ماں علوی اور اب تک جو نام رکھے گئے وہ باپ کے نام پر رکھے گئے۔ یعنی فضل حق وغیرہ اب کی بار جو لڑکا ہو اس کا نام ننہال کے ناموں کے مطابق رکھا جائے۔ جس کے آخر میں علی ہو۔"

نام و کام کا تعیّن

حافظ صاحب نے ہنس کر ان کی اس معمّہ فہمی کی داد دیتے ہوئے فرمایا:۔

"واقعی میرا مطلب یہی ہے۔ یہ لڑکی بڑی عقلمند معلوم ہوتی ہے۔ انشاء اللہ اس کے دو لڑکے ہوں گے اور زندہ رہیں گے۔ ایک کا نام اشرف علی خاں رکھنا۔ دوسرے کا نام اکبر علی خاں۔ دونوں صاحب نصیب ہوں گے۔ ایک لڑکا میرا ہوگا۔ وہ مولوی ہوگا اور حافظ ہوگا۔ دُوسرا دنیا دار ہوگا۔"

اس طرح آپ کے نام اور کام کا تعین بھی حق تعالیٰ نے اپنے ایک برگزیدہ بندہ کی زبانی استقرار حمل سے قبل کرا دیا۔ جبکہ آپ ابھی عالمِ ارواح میں ہی تھے۔ جس وقت اس بزرگ نے آپ کا نام تجویز کیا اسی وقت ایک اور عورت نے بھی حافظ صاحب سے اپنے پوتے کا نام تجویز کرنے کی درخواست کی تو اُنھوں نے نہایت ترشروئی سے بدیں الفاظ انکار فرمایا کہ:۔

"کیا مَیں بھاٹ ہُوں۔ جو نام رکھتا پھروں۔"

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس بزرگ کا آپ کے متعلق قبل از ولادت پیشگوئی فرمانا اور نام تجویز کرنا بالہام غیبی اور بربناء اختصاص تھا۔

تدبیر و تقدیر کا تصادم

آپ کے والد ماجد تو قاطع النسل دوائی کھا کر مطمئن تھے کہ اب اولاد کی بجائے شفا ہی ملے گی۔ مگر قدرت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ اس لیے اس نے اس دوائی کے استعمال کے فوراً بعد آپ کی ولادت کی بشارت دلائی تھی۔ چنانچہ اس مسبب الاسباب نے اپنے فضل خاص سے قاطع النسل دوائی کو افزائش نسل کا سبب بنا دیا۔ اِدھر آپ عالمِ وجود میں آئے اُدھر آپ کے والد ماجد کو بھی آرام آگیا۔ گویا آپ شکم مادر سے ہی مادی دُنیا کے لیے چیلنج بن کر نکلے۔

تاریخ و مقامِ پیدائش

آپ کی پیدائش ۵ جمادی الثانی ۱۲۸۰ھ کو بروز چہار شنبہ بوقتِ صبح صادق اپنے ننہال کے مکان واقعہ محلہ خیل قصبہ تھانہ بھون میں ہوئی اور اس مجذوب کی ہدایت کے مطابق آپ کا نام اشرف علی رکھا گیا۔ بعدہٗ آپ ان کی بشارت کے مطابق حافظ۔ قاری۔ مولوی۔ متعلم۔ متکلم۔ فقیہ۔ مفسر۔ محدث اور مصلح ہوئے اور آپ کے برادر خورد منشی اکبر علی مرحوم بلدیہ میونسپلٹی کے سیکرٹری بنے۔ اسی لیے حضرت تھانویؒ فرمایا کرتے تھے کہ :-

"یہ جو میں کبھی کبھی اکھڑی اکھڑی باتیں کرنے لگتا ہوں۔ اُن ہی مجذوب صاحب کی روحانی توجہ کا اثر ہے۔ جن کی دُعا سے میں پیدا ہوا ہوں۔ کیونکہ طبیعت مجذوبوں کی طرح آزاد ہے۔ الجھی ہوئی باتوں کی متحمل نہیں۔"

کرمِ عظیم

جس طرح دُعائے خلیل اللہ "رحمۃ للعالمین" کو لانے کا باعث ہوئی۔ اسی طرح اس مجذوب اللہ کی دُعا بھی "کرم عظیم" لائی کیونکہ جس سال آپ کی ولادت ہوئی۔ اس سال کا تاریخی مادہ "کرم عظیم" ۱۲۸۰ھ نکلا۔ جو ہر لحاظ سے کرمِ عظیم ہے۔ اللہ جل شانہٗ کا آپ پر کرم عظیم یہ ہے کہ آپ اصلاح امت کے لیے ایک ایسا نادر اور عظیم علمی و عملی خزانہ چھوڑ گئے۔ جو صدیوں تک نشانِ راہ کا کام دے سکتا ہے۔

عہدِ طفولیّت

حدت کی علت

بچوں کی نشو و نما میں والدہ کے دُودھ کا غیر معمولی اثر ہوتا ہے جو مہد سے لحد تک رہتا ہے۔ آپ کی پیدائش کو ابھی چودہ مہینے ہی گزرے تھے۔ کہ آپ کے چھوٹے بھائی اکبر علی پَیدا ہو گئے۔ چونکہ آپ کی والدہ ماجدہ کا دُودھ دو بچوں کے لیے کافی نہ تھا۔ اس لیے آپ کے لیے دُودھ پلانے والی انّا رکھی گئی۔ جو ضلع میرٹھ کے ایک دیہات کی قصائن تھی۔ بعد ازاں اسی کے دُودھ پر آپ نے پرورش پائی۔

قدرت کا کوئی کام بدوں مصلحت نہیں ہوتا۔ چودہ ماہ کے بعد ماں کے شفقت بھرے دُودھ کا سلسلہ منقطع ہو جانا اور اس کے بعد دُودھ کے لیے ایک قصائن کا مہیّا ہونا بھی بلا وجہ نہ تھا۔ چونکہ قدرت نے آپ سے اصلاحِ اُمّت کا کام لینا تھا۔ جس کے لیے نرمی کے ساتھ ساتھ بسا اوقات گرمی کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ اس لیے آپ کو بچپن میں قصائن کا دُودھ پینا پڑا۔ اس سے مزاج میں حدت پَیدا ہو گئی۔ چنانچہ آپ خود ہی اکثر از راہِ مزاح فرمایا کرتے تھے کہ :۔

"مَیں نے قصائن کا دُودھ پیا ہے۔ اسی لیے بھی میرے مزاج میں حدّت ہے مگر الحمد للّٰہ شدّت نہیں۔ میرا دل اس قدر نرم ہے کہ مجھ سے کسی کی ذرا سی بھی تکلیف نہیں دیکھی جاتی۔ اگر کسی کو ادنیٰ تکلیف میں بھی دیکھ لیتا ہوں

تو دل پگھل جاتا ہے اور پانی پانی ہو جاتا ہے۔"

آپ نے اپنے طبعی تعلق اور اتباعِ سُنت کی وجہ سے اس انا کی اولاد کا پتہ لگانے کی بعد ازاں بڑی کوشش کی ۔کہ اس کے ساتھ سلوک کیا جائے، مگر اس کا کوئی پتہ نہ چل سکا۔

بھائی پر فضیلت

آپ ابھی پانچ سال کے تھے کہ والدہ کا سایہ سر سے اُٹھ گیا اور ماں کی شفقت سے محروم ہو گئے۔ والدہ کے انتقال کے بعد آپ اپنی تائی صاحبہ کے پاس رہنے لگے۔ آپ کے والد کو والدہ سے بھی زیادہ آپ سے محبت تھی۔ غایت محبت کی وجہ سے انھوں نے آپ کو بڑے ناز و نعم میں رکھا۔ تیز طبع ہونے کے باوجود آپ سے بڑی نرمی کا برتاؤ کرتے تھے۔ یہاں تک کہ اگر یہ شوخی بھی کرتے تو انھیں بہت کم مارتے۔ ایک مرتبہ اس ترجیحی سلوک کی آپ کی تائی صاحبہ نے آپ کے والد سے شکایت کی تو انھوں نے فرمایا:۔

"بھابی صاحبہ! اوّل تو یہ چھوٹا ہی بڑے کو شرارت سکھاتا ہے۔ دُوسرے بڑا اپنا سبق یاد کر لیتا ہے۔ اس لیے مجھے اس سے زیادہ محبت ہے اور چھوٹا یاد نہیں کرتا۔"

چنانچہ آپ خود بھی فرماتے تھے کہ:۔

"میں بہت کم پٹتا تھا اور اُستادوں کے ہاتھ سے بہت کم پٹا ہُوں قریب بالکل ہی نہ پٹنے کے۔ کیونکہ سبق یاد کر لیتا تھا۔ اور اَدب کے ساتھ رہتا تھا۔"

غیرت کی تربیت

ماہِ رمضان میں ختمِ قرآن کے موقع پر عام طور پر مساجد میں شیرینی وغیرہ تقسیم کی جاتی ہے۔ محلّہ کے لڑکے ایسے موقعہ پر زیادہ سے زیادہ فائدہ اُٹھانے کی کوشش کرتے ہیں۔ مگر آپ کے والد کو آپ کا سائل ہونا گوارا نہ تھا۔ اس لیے وُہ آپ کو مستغنی المزاج بنانے کے لیے ایسے موقع پر

مسجدوں میں نہ جانے دیتے تھے۔ ایسی قدغن سے بچے پر ناگوار اثر پڑنا لازمی تھا۔ اس کے ازالہ کے لیے انھوں نے ایک عجیب ترکیب نکالی۔ جس کی تفصیل حضرت کے اپنے الفاظ میں یوں ہے :۔

"تراویح میں ختم قرآن کی جو مٹھائی مسجدوں میں تقسیم ہوتی۔ اس میں کبھی شریک نہ ہونے دیتے بلکہ اس روز خود بازار سے مٹھائی منگوا کر اُس سے زیادہ کھلا دیتے اور کہتے کہ مسجدوں میں مٹھائی لینے کے لیے جانا بے غیرتی کی بات ہے۔ اس خوبی کے ساتھ ہم لوگوں کو حرص سے بچاتے اور غیرت سکھاتے۔"

آوارگی سے نفرت

آوارگی کا سنگ بنیاد زیادہ تر بچپن میں ہی پڑتا ہے جبکہ بچوں کو عام میل ملاپ اور کھل کھیلنے کے پورے مواقع حاصل ہوتے ہیں۔ آپ کو طبعاً اس چیز سے نفرت تھی۔ اسی لیے آپ محلہ کے لڑکوں کے ساتھ کھیلنے کی بجائے اپنی ہمشیرہ کے ساتھ گھر کے اندر ہی کھیلا کرتے تھے۔ اس بات کو محلہ کے لڑکے اپنی توہین پر محمول کرتے اور چاقو لے کر پیچھے پھرتے رہتے تھے کہ آپ کو رُعب اور تشدد کے ذریعہ اپنے ساتھ کھیلنے پر مجبور کیا جائے اس لیے آپ کی حفاظت کے لیے مدرسہ جاتے وقت ملازم کو ساتھ بھیجا جاتا تھا۔ جب اس کا بھی ان پر کوئی اثر نہ ہُوا اور وُہ اپنے ارادہ سے باز نہ آئے تو مجبوراً تھانہ پر رپورٹ کی گئی۔ تھانیدار نے سب لڑکوں کو بلا کر آپ کے بید سے جو اتفاق سے اس وقت آپ کے ہاتھ میں تھا خوب پیٹا اور کہا کہ اگر آیندہ کسی نے ان کو اپنے ساتھ کھیلنے پر مجبور کیا تو ایسا مزہ چکھاؤں گا کہ ساری عمر یاد رکھو گے۔ اس کے بعد پھر کبھی نے آپ کو اپنے ہمراہ کھیلنے کی دعوت نہ دی۔

نماز سے محبت اپنی ہمشیرہ کے ساتھ گھر میں بھی آپ کوئی فضول کھیل نہ کھیلا کرتے تھے۔ بلکہ اپنے ساتھیوں کے جوتے اکٹھے کر کے ایک جوتا آگے رکھ دیتے اور باقی جوتوں کے پیچھے صفیں بنا دیتے اور خوش ہو کر ساتھیوں کو زغیباً کہتے کہ دیکھو جوتے بھی نماز پڑھ رہے ہیں۔ یہ نماز کے شوق اور محبت کا اثر تھا کہ

تہجد کی عادت آپ کو تہجد کی عادت لڑکپن ہی میں پڑ گئی تھی۔ ابھی آپ بارہ برس کے تھے کہ تہجد پڑھنی شروع کر دی۔ آپ کی بڑی تائی صاحبہ جن کو آپ سے بہت محبت تھی۔ نصف شب کو نوافل و وظائف میں آپ کو مشغول دیکھ کر بہت کڑھتیں اور اس خیال سے کہ بچہ ہے کہیں ڈر نہ جائے ان کے تہجد کے وقت اٹھ بیٹھتیں۔ آپ کو پیار محبت سے سمجھاتیں کہ بیٹا تم ابھی تہجد پڑھنے کے مکلف نہیں۔ مگر آپ پر کوئی اثر نہ ہوتا۔ آپ سُنی اَن سُنی کر کے تہجد و وظیفہ میں مشغول ہو جاتے اور جب تک آپ اس سے فارغ نہ ہو جاتے۔ وہ پہرہ دیتی رہتیں۔ دین کی اس محبت کا اثر یہ ہُوا کہ حق تعالیٰ

مقبولیت و محبوبیت نے بچپن میں ہی لوگوں کے دلوں میں آپ کے لیے محبت پیدا کر دی آپ نہ صرف بزرگوں یا اپنوں کی نظر میں محبوب بنا دیئے گئے، بلکہ غیر بھی آپ کی ایسی حرکتوں پر سکوت اختیار کرنے لگے جن سے ان کے رسم و رواج کی تنقیص کا پہلو نکلتا تھا۔ چنانچہ آپ خود فرماتے تھے کہ:

"اللہ تعالیٰ کے فضل سے بچپن ہی سے مَیں جہاں کہیں رہا۔ اعزہ و اقربا اپنے اور بیگانے سب کا ہی محبوب رہا۔ حالانکہ مَیں بچپن میں بہت شوخیاں کرتا تھا۔ مگر آج کل کے لڑکوں کی سی گندی شرارتیں نہ ہوتی تھیں اس لیے سب کو بجائے ناگوار ہونے کے بھلی معلوم ہوتی تھیں۔ دیوالی کے زمانہ میں میرٹھ چھاؤنی کے بازار میں سڑک پر دو رویہ چراغ جلائے جاتے تھے۔

دونوں طرف ہم دونوں بھائی چلنا شروع کرتے اور رومال کو حرکت دے کر سب کو ایک طرف سے بھگاتے چلے جاتے۔ مگر کوئی برا نہ مانتا۔ ہندوؤں کو بھی ناگوار نہ ہوتا۔"

گویا آپ بچپن میں ہی سَيَجْعَلُ لَهُمُ الرَّحْمٰنُ وُدًّا کا مظہر تھے۔

مزاج کی لطافت

حق تعالیٰ نے آپ کو ایسا لطیف مزاج عطا کیا تھا کہ بچپن میں ہی کسی کا ننگا پیٹ نہیں دیکھ سکتے تھے۔ کیونکہ ننگا پیٹ دیکھتے ہی آپ کو فوراً قے آجاتی تھی۔ محلہ کے لڑکوں کو اس بات کا علم ہوگیا اور وہ آپ کو ستانے کے لیے پیٹ کھول کر دکھاتے اور آپ قے کرتے کرتے پریشان ہوجاتے۔ قدرت کے انتظامات بھی کتنے عجیب ہوتے ہیں کہ اس نے لطیف المزاجی کو عام لڑکوں سے میل ملاپ نہ رکھنے کا ذریعہ بنا دیا اور اس طرح آپ کو خانہ نشین بنا کر بری صحبتوں سے بچا لیا اور طبیعت میں نظم و ضبط پیدا کر دیا۔ چنانچہ آپ خود فرمایا کرتے تھے کہ :۔

"بچپن ہی سے میرا دماغ اس کا عادی ہے کہ اگر کوئی معمولی سے معمولی بات بھی ہو مگر ترکیب کے ساتھ نہ بیان کی جائے تو میری سمجھ ہی میں نہیں آتی۔ نہ خود الجھی ہوئی تقریر کروں نہ دوسرے کی الجھی ہوئی تقریر سمجھوں۔ کیونکہ بچپن ہی سے میرا دماغ ایک خاص ترتیب کا عادی ہو رہا ہے۔"

یہ اسی لطیف المزاجی کا اثر تھا کہ اگر کوئی شخص الجھا ہوا کلام یا بے اصول کام کرتا۔ جس کا آپ سے تعلق ہوتا تو آپ کو اسی وقت تغیر ہو کر درد سر ہونے لگتا۔ حالانکہ دماغ اتنا قوی تھا کہ بلا تکان سارا دن اور سوتے وقت کام کرتے رہتے تھے اور بالکل نہ تھکتے

سایۂ ابرِ رحمت

یہ عام طور پر مشہور ہے کہ ؎

درجوانی توبہ کردن شیوۂ پیغمبری

مگر جس کے فضلِ خاص سے آپ نے بچپن اور لڑکپن اخلاق و تقویٰ سے گزارا۔ اس کے لیے بوعدہ اِنَّ الْمُتَّقِيْنَ فِيْ مَقَامٍ اَمِيْنٍ راحت رسانی کے غیر معمولی سامان پیدا کر دینا بھی کوئی بڑی بات نہ تھی جس کی وجہ سے گاہے گاہے اس کی رحمتِ خاص ابر کے سایہ کی شکل میں بھی نمودار ہونے لگتی تھی جس کی تفصیل صاحب "اشرف السوانح" نے ان الفاظ میں پیش کی ہے:۔

"آثارِ نیک میں سے ایک یہ امر بھی قابلِ ذکر ہے کہ حضرت والا کی نانی صاحبہ نے جن کے پاس بچپن میں رہے ہیں۔ خود حضرت والا سے بیان کیا کہ لڑکپن میں اکثر دیکھا گیا کہ جب حضرت والا کو کہیں سفر کرنے کا اتفاق ہوا تو اس روز ابر ضرور ہو گیا اور بہت راحت کے ساتھ سفر طے ہوا حضرت فرماتے تھے کہ مجھے خود بھی گاہے گاہے ایسا ہونا یاد ہے۔"

حصولِ علم

حسنِ انتخاب

جس طرح انبیاء علیہم السلام کی ہدایات وحی الٰہی پر مبنی ہوتی ہیں۔ اسی طرح اولیاء اللہ کی بشارات کو بھی تائید الٰہی حاصل ہوتی ہے۔ اور ان کے پورا ہونے کے غیب سے سامان ہوتے رہتے ہیں۔ حضرت تھانویؒ کے متعلق حضرت حافظ

غلام مرتضیٰ پانی پتیؒ نے جو مولوی اور حافظ ہونے کی پیشگوئی فرمائی تھی۔ اس کے پورا ہونے کا غیب سے یوں سامان پیدا ہوا کہ آپ کے والد ماجد نے جو اپنے وقت کے بڑے رئیس تھے۔ آپ کو تو دینی تعلیم کے لیے منتخب فرمایا اور اپنے چھوٹے صاحبزادہ منشی اکبر علی مرحوم کو دنیوی یعنی انگریزی تعلیم کے لیے حالانکہ عام طور پر روساء اپنی اولاد کو دنیوی تعلیم دلانے میں ہی عزت و افتخار سمجھتے ہیں اور دینی تعلیم دلانے میں سبکی دعار اور حضرت کا شاندار اور پاکیزہ بچپن بھی اس بات کا متقاضی تھا کہ آپ کو ایسی پاکیزہ تعلیم دلائی جاتی۔ جس سے وہ خصوصیات عظمت جو قدرت نے آپ کی جبلت میں رکھ دی تھیں۔ روشن و نمایاں ہو جائیں۔

عربی کی تعلیم

آپ کا تعلیمی دور تعلیم قرآن سے شروع ہوا۔ جس کے چند پارے آپ نے کھتولی ضلع میرٹھ کے رہنے والے آخون جی سے پڑھے۔ پھر حافظ حسین علی سے جو میرٹھ کے باشندے تھے۔ اور میرٹھ میں رہا کرتے تھے۔ قرآن حفظ کیا۔

عربی کی ابتدائی کتابیں آپ نے اپنے وطن تھانہ بھون میں ہی مولانا فتح محمدؒ سے پڑھیں، مگر اس کی باقاعدہ تعلیم دارالعلوم دیوبند پہنچ کر مشکوٰۃ شریف۔ مختصر معانی نور الانوار اور ملاحسن سے شروع کی۔ آپ آخر ذیقعدہ ۱۲۹۵ھ میں اس مدرسہ میں داخل ہوئے اور شروع ۱۳۰۱ھ یعنی قریباً پانچ سال کے عرصہ میں جبکہ ابھی آپ ۱۹ - ۲۰ برس کے تھے فارغ التحصیل ہو گئے۔

فارسی کی تعلیم

آپ نے فارسی کی ابتدائی تعلیم میرٹھ کے ہی استادوں سے حاصل کی تھی۔ اس کی متوسطات تھانہ بھون میں مولانا فتح محمد سے پڑھیں۔ جو ادب فارسی کے استاد کامل تھے۔ انتہائی کتب ابوالفضل تک اپنے ماموں واجد علی سے پڑھیں۔ جو ادب فارسی کے استاد کامل تھے۔ دیوبند پہنچ کر پنج رقعہ۔

قصائد عرفی اور سکندر نامہ وغیرہ مولانا منفعت علی دیوبندی سے پڑھ کر اس کی تکمیل کی۔ طالب علمی کے زمانہ میں جبکہ ابھی عمر اٹھارہ برس کی تھی۔ آپ نے فارسی میں مثنوی زیر و بم تصنیف کی اور اسی سے آپ کی تصنیفی زندگی کا آغاز ہوا۔

منطق میں مہارت

منطق میں آپ نے مہارت تامہ حاصل کر لی تھی۔ اس کے متعلق آپ خود ہی اظہارِ تشکر کے طور پر فرمایا کرتے تھے

"الحمد للہ! مجھے منطق میں مہارت حاصل ہے۔ اور میں سچی بات کیوں نہ کہہ دوں۔ کیونکہ نہ میں متواضع ہوں۔ نہ متکبر۔ جو چیز حق تعالیٰ نے عطا فرمائی ہے۔ اس کا کیوں انکار کروں۔ اللہ کی دین ہے میرا کوئی کمال نہیں۔ اور میں اس کو درحقیقت کوئی کمال بھی نہیں سمجھتا۔ کیونکہ بزرگوں کی جوتیاں سیدھی کرنے کی برکت سے یہ اچھی طرح ذہن نشین ہو گیا ہے کہ ؎

فہم و خاطر تیز کردن نیست راہ
جز شکستہ می نگیرد فضلِ شاہ

معقولات سے مناسبت

معقولات سے آپ کو بہت دلچسپی اور مناسبت تھی۔ جس کی وجہ سے صدرا اور شمس بازغہ جیسی مشکل کتابوں کا اکثر حصہ بے ترجمہ پڑھتے چلے جاتے تھے اور مشکل مسائل بھی پانی نظر آتے تھے۔ مگر اس مناسبت کے باوجود آپ لوگوں کی طرح بس معقولات کے ہی ہو کر نہ رہے بلکہ اسے ہمیشہ دینیات کے لیے بطور علوم آلیہ کے ہی سمجھا۔ کیونکہ اعتدال اور سلامتی آپ کی فطرت میں داخل تھی۔ جس کی وجہ سے آپ ہر چیز کو اعتدال پر رکھتے تھے۔ معقولات سے اس قدر مناسبت ہونے کے باوجود منقولات کے مقابلہ میں آپ کو ہمیشہ ان فنون سے نفرت رہی۔ اسی لیے جب فلسفہ کا سبق شروع کرتے تو بجائے بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کے اعوذ باللہ من الشیطان الرجیم پڑھتے۔ جو آپ کی بالغ النظری کی دلیل ہے۔ کیونکہ شیطان

ہمیشہ اسی راستہ سے حملہ کرتا ہے۔ چنانچہ آپ فرمایا کرتے تھے کہ

"الحمد للہ! میں کبھی طبیعت کو عقل پر غالب نہیں آنے دیتا اور کبھی عقل کو شریعت پر غالب نہیں آنے دیتا"

یہ واقعہ اس بات کا شاہد ہے کہ آپ کی بالغ النظری وہبی تھی۔ کسبی نہ تھی۔

قرأت کی مشق

آپ نے قرآن کریم تو شروع ہی میں حفظ کر لیا تھا، مگر قرأت کی مشق شہرۂ آفاق قاری محمد عبد اللہ مہاجر مکی سے بمقام مدرسہ صولتیہ مکہ معظمہ فرمائی تھی۔ جو قراء عرب کے نزدیک بھی نہایت جید اور مسلم ماہر فن قاری تھے۔ قرأت کی مشق کے سلسلہ میں اُستاد نے انہیں ایک نہایت ہی عجیب اصول بتلایا کہ لہجہ کی طرف مطلق التفات نہ کیا جائے۔ بس ساری توجہ مخارج کی تصحیح میں صرف کی جائے۔ کیونکہ تصحیح مخارج کے بعد جو لہجہ بھی پیدا ہو گا۔ مستحسن ہی ہو گا۔ چنانچہ حضرت نے لہجہ کی طرف کبھی توجہ نہ دی۔ حالانکہ عام طور پر قراء لہجہ میں دلکشی پیدا کرنے کی زیادہ کوشش کرتے ہیں لہجہ کی طرف توجہ نہ دینے کا نتیجہ یہ نکلا کہ آواز میں اتنی دلکشی پیدا ہو گئی کہ آپ جب مدرسہ کی بالائی منزل پر قرأت کی مشق کرتے۔ تو راہگیر آواز کی کشش پر رک جاتے اور یہ تمیز نہ کر سکتے کہ اُستاد پڑھ رہا ہے یا شاگرد۔

مناظرہ کی قوت

آپ میں طالب علمی کے زمانہ میں ہی پیدا ہو گئی تھی۔ دیوبند کی تعلیم کے دوران میں جبکہ ابھی لڑکے ہی تھے۔ حاضر جوابی۔ طلاقت لسانی۔ ذہانت و فطانت اور منطق میں کمال مہارت کا یہ عالم تھا کہ وہاں جب بھی کبھی کوئی مذہبی مناظرہ کے لیے آتا۔ آپ فوراً اس کے پاس پہنچ جاتے اور منٹوں میں عاجز اور زیر کر لیتے۔ ادھر اُستادوں کو یہ ڈر لگا رہتا کہ ابھی لڑکا ہے کہیں مرعوب نہ ہو جائے اور آپ پر یہ جوش سوار ہوتا کہ اسے چاروں شانے ہی چت گرانا ہے گویا آپ طالب علمی کے زمانہ میں ہی لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ کی مشق کر رہے تھے

طالب علمی کے زمانہ میں ہی آپ نے عیسائیوں، آریوں، شیعوں، غیر مقلدوں سے بڑے بڑے معرکۃ الآرا مناظرے کیے۔ مگر کسی مناظرہ میں نہ اصول مناظرہ کو ہاتھ سے جانے دیا۔ اور نہ حق بات تسلیم کرنے سے کبھی گریز کیا۔ آپ کی منطقی تقریریں سُن کر راس المناظرین مولانا سید مرتضیٰ احسنؒ وجد میں آجاتے تھے اور فرمایا کرتے تھے کہ

"آپ کو مناظرہ میں اس قدر ملکہ ہے کہ بڑے سے بڑا مناظر بھی مقابلہ میں نہیں ٹھہر سکتا۔"

عظمت کا راز

داناؤں کا فیصلہ ہے کہ

"عظمت ایک فی صدی ودیعت کی جاتی ہے اور ۹۹ فیصدی محنتِ شاقہ سے حاصل ہوتی ہے۔"

حضرت تھانوی بھی دنیا کے ان عظیم المرتبت انسانوں میں سے تھے۔ جن کی عظمت و جلال محنتِ شاقہ کا نتیجہ نہ تھی۔ بلکہ خداداد تھی۔ چنانچہ حضرت خود فرمایا کرتے تھے:۔

"مَیں نے پڑھنے میں کبھی محنت نہیں کی جو کچھ اللہ نے عطا فرمایا ہے۔ اساتذہ اور بزرگوں کے ساتھ ادب و محبّت کا تعلق رکھنے کی بدولت عطا فرمایا اور الحمد للہ میں کہہ سکتا ہُوں کہ مَیں نے اپنے کسی بزرگ کو ایک منٹ کے لیے بھی ناراض نہیں کیا اور جتنا میرے قلب میں بزرگانِ دین کا ادب ہے۔ آج کل شاید ہی کسی کے دل میں اتنا ہو۔"

اساتذہ کی توجّہ

یہ انہی آثارِ عظمت کا نتیجہ تھا کہ آپ پر اساتذہ کی خصوصی توجہ تھی۔ بلکہ آپ کے زمانہ طالب علمی کے حالات و عادات ہی اساتذہ کو خود بخود آپ پر توجہ خاص رکھنے کے لیے مجبُور کرتے تھے اور وُہ اس بات پر فخر کرتے تھے کہ ہزاروں میں کوئی تو ان کی جگہ لینے کو تیار ہو رہا ہے۔ جس کی غمازی مندرجہ ذیل واقعات کرتے ہیں۔

وقت کی قدر

دُنیا میں وقت سے زیادہ قیمتی اور کوئی چیز نہیں۔ وقت ایک ایسی نعمت غیر مترقبہ ہے جو گزر جانے کے بعد دنیا جہاں کی ساری دولتیں صرف کر دینے کے باوجود بھی ہاتھ نہیں آسکتا۔ اور جو اس کی قدر کرتا ہے۔ وہی دُنیا میں قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔

آپ نے طالب علمی کے زمانہ میں ایک منٹ بھی ضائع کرنا گناہ سمجھا۔ آپ کسی سے ملتے جلتے نہ تھے ہر وقت اپنی پڑھائی میں لگے رہتے تھے۔ اگر کسی وقت فرصت ملتی۔ تو اپنے استادِ خاص مولانا محمد یعقوب مدرس اوّل کی خدمت میں جا بیٹھتے۔ ایک دن مولانا کہیں باہر تشریف لے گئے، جس کی وجہ سے آپ کے پاس فارغ رہنے کی ایک معقول وجہ تھی۔ مگر آپ نے فارغ رہنا گوارا نہ کیا ---------- اور اپنے دُوسرے اُستاد مولانا سیّد احمد کی خدمت میں جا بیٹھے۔ وُہ آپ کی خلافِ معمول آمد پر حیران ہُوئے اور وجہ پُوچھی تو آپ نے کمال سادگی سے صحیح بات عرض کر دی کہ :۔

"حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب باہر تشریف لے گئے ہیں۔ اس لیے آپ کی خدمت میں حاضر ہو گیا ہُوں۔ تاکہ وقت بیکار نہ جائے۔"

تضیعِ اوقات سے احتراز

آپ طالب علمی کے زمانہ میں مدرسہ کے دارالاقامہ میں ہی رہتے تھے۔ حالانکہ دیوبند کے اندر آپ کے بعض دُور کے رشتہ دار بھی رہائش رکھتے تھے اور وُہ اکثر حضرت سے تقاضا کرتے رہتے تھے کہ ہمارے گھر آکر کھانا کھا لیا کرو۔ کیوں تکلیف اُٹھاتے ہو، مگر آپ نے کھانا تو درکنار تضیعِ اوقات کے خیال سے میل ملاپ رکھنا بھی بند کر دیا تھا۔ آخر ان کے اصرار پر آپ نے یہ بات اپنے والد ماجد کو لکھی۔ کیونکہ آپ ان کی اجازت کے بغیر کوئی قدم نہ اُٹھانا چاہتے تھے۔ اور ساتھ ہی یہ خدشہ بھی تھا کہ کہیں آپ کے اعزہ شکایتہً اس بات کا والد

صاحب سے ذکر نہ کردیں۔ جس کے جواب میں آپ کو والد صاحب نے ڈانٹ لکھی کہ:۔
"تم وہاں رشتہ داریاں جتانے گئے ہو یا طالب علمی کرنے؟"
بس آپ کو اتنا لکھا کافی ہوگیا اور جتنا عرصہ دیو بند میں پڑھتے رہے کبھی کسی رشتہ دار کو ملنے نہ گئے۔ چنانچہ آپ فرمایا کرتے تھے کہ:۔
"الحمد للہ! میں وہاں جیسا بے داغ گیا تھا۔ ویسا ہی پانچ برس رہ کر بے داغ لوٹ آیا۔ جب فارغ التحصیل ہوگیا۔ اس وقت آزادی کے ساتھ اپنے سب اعزہ سے جاکر ملا اور پھر ان کی دعوتیں بھی قبول کیں۔ اس سے قبل کسی سے میل جول پیدا نہ کیا۔ نہ اعزہ سے، نہ طلبا سے نہ اہلِ قصبہ سے اگر کوئی میل جول بڑھانا چاہتا۔ تو اُس کے ساتھ بے رُخی سے پیش آتا یہاں تک کہ لوگ عموماً دماغ دار سمجھتے۔ حالانکہ یہ بات نہ تھی۔ در اصل مجھ کو اپنا وقت فضول ضائع کرنے سے نفرت تھی۔"

فضولیات سے اجتناب

سکولوں اور کالجوں میں عام طور پر خصوصی اور تفریحی پارٹیاں ہوتی رہتی ہیں جن میں طلبا ذرا آزادی کے ساتھ کھُل کھیلتے ہیں اور اس وقت کو انتہائی خوش طبعی کے ساتھ گزارنے کی کوشش کرتے ہیں۔ مگر آپ ایسے مواقع پر حتی الوسع خود کو بچا کر رکھتے تھے ایک مرتبہ مدرسہ میں طلبا کی آموں کی دعوت ہوئی۔ جس میں آپ اور آپ کے استاد مولانا محمد یعقوبؒ و مولانا محمد قاسم بھی شریک تھے۔ جب آم تھوڑے رہ گئے تو مولانا محمد یعقوب اس خیال سے چل دیئے کہ ابھی ان میں "گٹھلی چھلکا" ہوگا۔ آپ بھی یہ بات بھانپ گئے۔ اور اپنے استاد کے ساتھ ہی اس مجلس سے اُٹھ کر چلے آئے۔ مولانا محمد قاسم ازراہِ تواضع شریک رہے۔ چنانچہ اُستادوں کے چلے آنے کے بعد وہ آپس میں خوب کھُل کھیلے۔ اور

شرارتیں کرنے لگے۔ جن سے باز رکھنے کے لیے مولانا محمد یعقوب کو واپس آنا پڑا۔ وہ مولانا کو آتا دیکھ کر مارے شرم کے بھاگ گئے۔ اس سے بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے کہ آپ اس زمانہ میں فضولیات سے کتنا اجتناب کرتے تھے۔

یکسوئی کی عادت

اس کے ساتھ ساتھ آپ کو یکسوئی کی عادت بھی تھی۔ جو طالب علمانہ زندگی کے لیے ازحد ضروری ہے۔ ورنہ انتشار کی وجہ سے پڑھائی اطمینان کے ساتھ نہیں ہو سکتی آپ جب بھی لڑکوں کو اپنے کمرہ کی طرف بڑھتے دیکھتے۔ فوراً کواڑ بند کر لیتے۔ تاکہ کوئی آپ کی پڑھائی میں مخل نہ ہو۔ اور آپ کا وقت ضائع نہ کرے۔ جسے عام طور پر طلبا برا مانتے۔ چنانچہ اسی آموں کی دعوت والے دن جب آپ اٹھ کر چلے آئے تو لڑکوں نے اسے "آداب تفریح" کے خلاف سمجھا اور دعوت سے فارغ ہونے کے بعد اس بات کا انتقام لینے کے لیے آپ پر گٹھلی اور رس پھینکنے کے ارادہ سے آپ کے کمرہ کا رُخ کیا۔ مگر آپ نے انھیں کچھ کہے بغیر صرف کواڑ بند کر لیے۔ جس پر وہ اپنا سا منہ لے کر رہ گئے۔ غرضیکہ جس طرح آپ بچپن میں خانہ نشین رہے۔ اسی طرح طالب علمی کے زمانہ میں بھی گوشہ نشینی کو ترجیح دیتے رہے۔ جو انسان کو بری صحبتوں سے بچاتی ہے۔

علم کا شوق

یہ اسی گوشہ نشینی کی برکت تھی کہ آپ تحصیل علوم میں ہمہ تن مشغول رہتے تھے۔ آپ کے تحصیل علم کے شوق کا صرف اسی سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ آپ نے بعض خاص کتابیں جن کے لیے مدرسہ میں وقت نہ تھا۔ بعض اساتذہ سے اس طرح پڑھیں کہ وہ حضرات تو نماز کے لیے وضو کر رہے ہوتے اور آپ ان سے سبق پڑھ رہے ہوتے۔ آپ کے اس غیر معمولی ذوق و شوق کی وجہ سے اساتذہ بھی آپ کا خاص طور پر لحاظ کرتے بلکہ ناز برداری بھی کرتے۔

ذہانت وذکاوت

حصولِ علم کے شوق نے جہاں آپ کو اپنے دوسرے ہم سبقوں میں سب سے زیادہ ممتاز کر دیا تھا۔ وہاں آپ کو ذہین و ذکی بھی بنا دیا تھا جس کا آپ کے اساتذہ کو بھی اعتراف تھا۔ چنانچہ جب حضرت مولانا گنگوہی قدس سرہ العزیز طلباء کا امتحان لینے اور دستار بندی کرنے تشریف لائے۔ تو شیخ الہند مولانا محمود الحسن رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت والا کی ذہانت و ذکاوت کی خاص طور پر تعریف فرمائی۔ حضرت شیخ الہند کی زبانی حضرت مولانا گنگوہی نے آپ کی غیر معمولی تعریف سُن کر آپ سے بہت مشکل سوالات کیے۔ جن کے جوابوں سے مولانا بہت خوش ہوئے۔

آپ کے اُستاد مولانا سید احمد نے جب آپ کا سکندر نامہ کا امتحان لیا تو آپ کو ایک شعر کا وہ مطلب یاد نہ رہا۔ جو اُستاد نے بتایا تھا۔ اس لیے آپ نے فوراً اپنی طرف سے اس کا مطلب بیان کیا۔ مولانا نے دریافت کیا کہ کوئی اور مطلب بھی ہو سکتا ہے؟ تو آپ نے اپنی طرف سے ہی دُوسرا مطلب بیان کر دیا۔ مولانا نے پھر پُوچھا اس کے علاوہ بھی کوئی اور مطلب ہو سکتا ہے تو آپ نے تیسرا مطلب بیان کر دیا۔ اس پر مولانا نے فرمایا کہ ان میں سے گو تمہارا کوئی مطلب بھی صحیح نہیں مگر میں صرف تمھاری ذہانت پر نمبر دیتا ہوں۔ طلباً میں آپ کی شہرت زیادہ تر اسی ذہانت و ذکاوت اور حافظہ کی وجہ تھی۔

قوّتِ آخذہ

اس غیر معمولی حافظہ نے آپ میں قوّتِ آخذہ پیدا کر دی تھی جس کی وجہ سے آپ اپنے اساتذہ کاملین سے بدرجہ اتم کمالات اخذ کر لیتے تھے اور ایک اجنبی کے لیے استاد اور شاگرد میں امتیاز کرنا مشکل ہو جاتا تھا۔ جس کی مثال قرأت کی مشق کے ضمن میں گزر چکی ہے اس لیے آپ اپنے اساتذہ کرام کے مظہر اتم بھی تھے اور کیوں نہ ہوتے، جبکہ اساتذہ کرام بھی آپ کو حق تعالیٰ نے ایسے دیئے تھے۔ جو اپنے وقت کے غزالی اور رازی تھے جس کی تفصیل اگلے باب میں آ

رہی ہے۔آپ کے اساتذہ چونکہ ظاہری و باطنی کمالات کے بھی جامع تھے۔ اس لیے ان کی توجہات۔

تصوّف کا ذوق

سے طالب علمی کے زمانہ میں ہی آپ میں ذوق تصوف پیدا ہو گیا تھا آپ نے ظاہری تعلیم کے ساتھ ساتھ باطنی تعلیم کے لیے کتبِ تصوف کا بھی مطالعہ اسی زمانہ میں شروع کر دیا تھا اور طریق تصوّف میں غایت شغف رکھنے لگے تھے۔ جسے اُس زمانہ کے جنیدؒ و شبلیؒ شیخ العرب والعجم حضرت حاجی امداد اللہ قدس سرہٗ العزیز مہاجر مکیؒ نے دیوبند سے ہزاروں میل دُور مکہ معظمہ میں بیٹھے ہُوئے اپنے نور فراست سے تاڑ لیا۔ اور بلا دید و شنید وہاں طلب فرمایا۔ جس کی تفصیل باب بیعت میں آگے گی چنانچہ آپ کے طالب علمی کے زمانہ میں جب میرٹھ کے رئیس شیخ الٰہی بخش (جن کے ہاں آپ کے والد ماجد مختار ریاست تھے) بغرض زیارت مولانا شاہ رفیع الدینؒ مہتمم مدرسہ دار العلوم دیوبند تشریف لائے تو آپ کی وضع قطع اور طالب علمانہ رنگ دیکھ کر حیران رہ گئے اور حضرت مہتمم سے بے ساختہ فرمایا کہ :۔

انتہائی سادگی

یہی وجہ تھی کہ آپ مدرسہ میں انتہائی سادگی سے رہتے تھے۔ اپنے اساتذہ سے صرف علوم ہی حاصل نہ کرتے تھے۔ بلکہ ان کا طرزِ تمدن و معاشرت بھی نقل کرتے تھے۔ جس کی وجہ سے آپ نے حضرات اہلِ مدرسہ دیوبند کو دیکھ کر اپنا قدیم وضع کا غرارہ دار پاجامہ پہننا ترک کر کے تنگ مہری کا پاجامہ پہننا شروع کر دیا تھا۔ وضع و قطع بود و باش۔ غرض ہر باب میں سادگی نمایاں تھی چنانچہ طالب علمی کے زمانہ میں بدورانِ تعطیلات ایک دفعہ آپ ــــ گھر تشریف لے گئے۔ تو آپ نے غایت سادگی سے رضائی لپیٹ رکھی تھی۔ باقاعدہ اوڑھے ہُوئے نہ تھے کہ دونوں پلے برابر ہوں۔ لٹکے ہُوئے نہ ہوں۔ آپ کے والد ماجد یہ ہیئت دیکھ کر بڑے حیران ہُوئے اور آپ سے کہا کہ :۔

"میاں تم کو رضائی اوڑھنا بھی نہیں آتا۔"

اگرچہ آپ والد صاحب سے بڑے ڈرتے تھے مگر ادب بھی بڑا کرتے تھے۔ لیکن اس وقت آپ نے فی البدیہہ جواب دیا:۔

"حضرت اگر آپ کو رضائی اوڑھنا ہی سکھانا تھا تو مدرسہ دیوبند نہ بھیجتے۔ وہاں تو کسی کو بھی

رضائی اوڑھنا نہیں آتا۔ سب ہی الول جلول ہیں۔"

آپ کے والد ماجد نے تیز مزاج ہونے کے باوجود آپ کو کچھ نہ کہا۔ نہ ہی اس کے بعد آپ کو ایسی باتوں پر ٹوکا۔ آپ جب اپنے زمانہ طالب علمی کی سادگی اور اپنے دورِ مشیخت میں طلبا کی خوش لباسی اور بناؤ سنگار پر نظر دوڑاتے تو انتہائی افسوس کے ساتھ فرماتے کہ:۔

"یہ دلیل اس کی ہے کہ ان کی نظر عالی نہیں اور ان کو علم کا چسکا لگا نہیں ورنہ ایسی اوچھی باتوں اور ادنیٰ چیزوں کی طرف کبھی التفات نہ ہوتا۔"

گھر سے تبلیغ

اسی طرح آپ گھر کے دُوسرے معاملات میں بالعموم اور جواز و عدم جواز کے مسائل میں بالخصوص اپنے والد ماجد سے اختلاف فرماتے تھے۔ چنانچہ ایک بار آپ کے والد ماجد نے کسی کی اراضی رہن رکھ لی۔ جبکہ آپ ابھی زیرِ تعلیم تھے۔ جب اس کی خبر آپ تک پہنچی۔ تو آپ نے فرضِ تبلیغ کی ادائیگی کے لیے انھیں لکھ بھیجا کہ یہ ناجائز ہے۔ اس پر آپ کے والد ماجد نے اپنے ایک ملنے والے ہندو سے شکوہ کیا کہ:۔

"ہم نے ایک لڑکے کو عربی پڑھوائی ہے۔ وہ ہمیں ہر بات پر ٹوکتا ہے کہ یہ بات خلافِ شرع ہے۔ یہ بات ناجائز ہے۔ ہمیں رائے دیتا ہے کہ رہن رکھنا چھوڑ دو وغیرہ۔"

یہ سُن کر اس ہندو نے کہا کہ:۔

"منشی جی یہ تو بڑے خوش ہونے کی بات ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ آپ کا لڑکا بڑا لائق ہے آپ کا بڑا خیر خواہ ہے۔ اگر آپ اسے نجوم پڑھاتے تو وہ آپ کو مہوریت کی باتیں بتاتا۔ قانون پڑھاتے تو قانون بتاتا۔ طب پڑھاتے تو نافع و مضر چیزیں بتلاتا۔ آپ نے اس کو دین پڑھایا ہے۔ تو وہ لا محالہ دین ہی کی باتیں بتائے گا۔ شکر کرو بڑا لائق ہے۔ بڑا خیر خواہ ہے۔ آخرت کے عذاب سے بچاتا ہے۔ آپ کو اس بات پر خوش ہونا چاہیئے۔ کہ جو کچھ میں اس کے پڑھانے پر خرچ کر رہا ہوں۔ وہ ٹھکانے لگ رہا ہے۔"

فتوٰی نویسی

طالب علمی میں تبلیغ کا اہتمام اور اپنے گھر کے مفاد کے خلاف! سبحان اللہ یہ آپ کے مرد حق ہونے کی دلیل تھی۔ پھر آپ صرف مبلغ ہی نہ تھے بلکہ اسی طالب علمی کے زمانہ میں مفتی بھی تھے۔ کیونکہ آپ کی غیر معمولی ذکاوت و ذہانت اور علم و تقویٰ کے پیش نظر آپ کے اُستادِ خاص مولانا محمد یعقوبؒ نے فتوٰی نویسی کا کام بھی طالب علمی کے زمانہ میں آپ ہی کے سپرد کر رکھا تھا۔ آپ بڑے بڑے اُلجھے ہوئے اور طویل طویل سوالات کے جوابات نہایت سہولت اور جامعیت کے ساتھ چند لفظوں میں تحریر کر دیتے۔

ایک دفعہ ایک طویل استفتاء کا ویسا ہی طویل اور مفصل و مدلل جواب لکھ کر مولانا کی خدمت میں لائے۔ مولانا نے سارا پڑھا اور دستخط کرتے ہوئے فرمایا کہ معلوم ہوتا ہے۔ تمھارے پاس وقت بہت ہے۔ اس کے بعد آپ نے جامع و مانع جواب لکھنے شروع کر دیئے۔

احساسِ حقیقت

طالب علمی کے زمانہ میں ایسی خداداد صلاحیتیں رکھنے کے باوجود احساسِ حقیقت اتنا بڑھا ہُوا تھا کہ ۱۳۰۰ھ میں جب دیوبند میں شاندار جلسہ ہونا قرار پایا۔ جس میں آپ کی دستار بندی ہونے والی تھی۔ تو آپ دستار بندی کی خبر سُن کر اپنے چند ہم سبقوں کو ساتھ لے کر حضرت مولانا محمد یعقوبؒ کی خدمت

میں پہنچے اور عرض کی کہ :۔

"حضرت سُنا ہے کہ ہم لوگوں کی دستار بندی کی جائے گی اور سند فراغ دی جائے گی۔ حالانکہ ہم اس قابل ہرگز نہیں۔ لہٰذا اس تجویز کو منسوخ فرمایا جاوے۔ اگر ایسا کیا گیا تو مدرسہ کی بڑی بدنامی ہوگی۔ کہ ایسے نالائقوں کو سند دی گئی"۔

یہ سُن کر مولانا کو جوش آگیا اور فرمایا :۔

"تمہارا یہ خیال غلط ہے۔ یہاں چونکہ تمہارے اساتذہ موجود ہیں۔ اس لیے ان کے سامنے تمہیں اپنی ہستی کچھ نظر نہیں آتی اور ایسا ہی ہونا چاہیئے۔ باہر جاؤ گے۔ تو تب تمہیں اپنی قدر معلوم ہوگی۔ جہاں جاؤ گے بس تمہی تم ہوگے۔ باقی سارا میدان صاف ہے۔ اطمینان رکھو"۔

چنانچہ یہ پیشگوئی حرف بہ حرف پوری ہوئی۔ عوام وخاص تو کیا بڑے بڑے علما فضلا آپ کی ہمیشہ قدر ومنزلت کرتے رہے۔

روحانی تربیت

چونکہ حق تعالیٰ نے آپ کو فطرتاً ایسی غیر معمولی صلاحیتیں بخشی تھیں جو خود بخود آپ کی تربیت کر رہی تھیں اور ایسا نورِ فراست عطا کیا تھا۔ جو بچپن سے ہی آپ کو صراط مستقیم دکھا رہا تھا۔ اس لیے بچپن سے لے کر فارغ التحصیل ہونے تک کسی کو آپ کی تربیت خاص کی طرف توجہ دینے کی ضرورت ہی پیدا نہ ہوئی۔ چونکہ ہر کام خود بخود ٹھیک ہو رہا تھا۔ اس لیے کبھی زجر و توبیخ یا ترہیب و تہدید بلکہ ترغیب تک کی نوبت نہ آئی اور اگر کچھ کمی باقی رہ گئی تھی۔ جس پر کسی کی نظر نہ جا سکی تو اس کو پورا کرنے کا بھی قدرت نے خاص انتظام کر دیا۔ جس کی تصدیق اس واقعہ سے ہوتی ہے۔ جو آپ نے خود اپنے رسالہ "صدق الرویا" میں تحریر فرمایا کہ بحالت خواب :۔

"میں نے زمانہ تحصیل مدرسہ عالیہ دیوبند میں ایک بزرگ کو دیکھا۔ مجھ سے

پوچھتے ہیں۔ تمھاری عمر کیا ہے اور تم کو نیا سال کب شروع ہوگا۔ میں نے عمر بتلائی اور کہا کہ ۵ ربیع الثانی کو سال شروع ہوگا۔ وہ بزرگ فرمانے لگے کہ سال شروع ہونے سے پہلے دو روزے رکھ لینا برکت ہوگی۔ میں نے اس پر عمل کیا اور کئی سال تک وہ عمل کرتا رہا پھر کسل ہوگیا۔ ایک بار اس زمانہ میں بھی وہ عمل کیا تھا۔ مگر غالباً ایک روزہ رکھا تھا میں نے اس خواب کو اپنے عزیزوں میں سے ایک بزرگ سے بیان کیا۔ انھوں نے مجھ سے حلیہ پوچھا میں نے بیان کیا سن کر فرمایا یہ حافظ غلام مرتضٰے صاحب قدس سرہٗ تھے۔ جو ایک مجذوب مگر پاکیزہ بزرگ تھے۔ جن کی مدح شیوخ طریقت بلکہ خود حضرت مرشدی حاجی صاحب قدس اللہ سرہٗ نے بھی فرمائی ہے۔"

اسی طرح حضرت مولانا شیخ محمد محدث تھانویؒ جو حضرت میاں جی نور محمد نور اللہ مرقدہٗ کے خلفاء خاص میں سے تھے اور حضرت حاجی امداد اللہ قدس سرہٗ کے پیر بھائی تھے جب آپ کو مکتب جاتے دیکھتے تو فرماتے کہ میرے بعد یہ لڑکا میری جگہ ہوگا۔ اور ایسا ہی ہُوا کہ ان کے بعد اس قصبہ میں آپ ہی کی ذات علوم ظاہری و باطنی کی جامع تھی۔ اور جب وہ وفات پاگئے تو بعد وفات بھی انھوں نے آپ سے عالم رؤیا میں فرمایا کہ

"ہم کو تمھاری طرف اب بھی ویسی ہی توجہ ہے۔ جیسی حیات میں تھی"

غرضیکہ آپ کی طالب علمی کا زمانہ بھی حق تعالیٰ کی عنایات بے غایات کا مظہر تھا۔ ورنہ اتنی خوبیاں ایک شخص میں یکجا دیکھنے کا عموماً اتفاق نہیں ہوتا کہ وہ طالب علمی کے زمانہ میں ہی معلّم بھی ہو۔ مبلّغ ہو۔ مفتی بھی ہو۔ مصنّف بھی ہو۔ متقی بھی ہو۔ مناظر بھی ہو۔ معقول بھی ہو۔ معتدل بھی ہو۔ ماہر بھی ہو اور پھر سب میں منفرد بھی ہو۔

ذالك فضل الله يؤتيه من يشاء

اساتذہ کرام

مولانا محمد قاسم نانوتوی ؒ

ان سے حضرت تھانوی ؒ نے اپنے نصاب کی تو کوئی خاص تعلیم حاصل نہ کی تھی۔ البتہ ان کے درس جلالین میں از راہِ عقیدت و شوقِ تحصیل علم گاہے گاہے شرکت کرتے تھے۔ آپ کے داخلہ کے ایک سال بعد ہی مولانا رحلت فرما گئے تھے۔ مگر مدرسہ کے ایک روشن ستارہ ثابت ہونے والے اس طالب علم کو مولانا نانوتوی ؒ نے طالب علمی کے ابتدائی زمانہ میں ہی تاڑ لیا تھا کہ یہ کچھ قدرتی اور فطری خصوصیات کا مالک ہے۔ اس لیے آپ پر ان کی خاص نظرِ شفقت رہی اور انھوں نے آپ کو صرف ایک ہی سبق پڑھایا۔ جس کے آپ تا زیست مظہر رہے۔

ایک بار مولانا نے حضرت سے دریافت فرمایا کہ کونسی کتابیں پڑھتے ہو؟ آپ پر مولانا کا اس کا اس قدر رعب و ادب غالب ہوا کہ کتابوں کے نام بھول گئے۔ انھوں نے ہیبت کا اثر دُور کرنے کے لیے آپ سے دُوسری باتیں شروع کر دیں۔ جس سے آپ کی طبیعت کُھل گئی اور پھر فرمایا کہ دیکھو ایک تو پڑھنا ہوتا ہے اور ایک گننا۔ محض پڑھنا کافی نہیں۔ گِننے کی بھی ضرورت ہے۔ اس کو مثلاً اس طرح سمجھایا کہ ایک عالم تھے۔ جنھوں نے ہدایہ کو حفظ کر لیا تھا۔ ان سے ایک دُوسرے عالم نے جو حافظ ہدایہ تو نہ تھے لیکن ہدایہ کو خُوب سمجھ کر پڑھا تھا۔ ایک مسئلہ کا ذکر کیا۔ حافظ ہدایہ نے پُوچھا کہ یہ مسئلہ کونسی کتاب میں ہے۔ انھوں نے کہا ہدایہ میں۔ حافظ ہدایہ نے کہا نہیں۔ ہدایہ تو مجھے حفظ یاد ہے۔ اس میں تو کہیں نہیں۔ اس پر غیر حافظ ہدایہ نے کہا کہ یہ مسئلہ ہدایہ ہی کا ہے اور کتاب منگا کر اس کے اندر ایک عبارت نکال کر دکھائی۔ جس میں وُہ مسئلہ بعینہٖ تو مذکور

نہ تھا۔ لیکن اس سے یہ مسئلہ قریب قریب مستنبط ہوتا تھا۔ جس کی تقریر کے بعد حافظ ہدایہ کو ماننا پڑا کہ واقعی یہ ہدایہ ہی کا مسئلہ ہے۔ اور بہت افسوس کے ساتھ کہنے لگے کہ بس جی حقیقت میں تو ہدایہ کو تمھیں نے پڑھا ہے۔ ہم نے تو گویا پڑھا ہی نہیں۔ محض حفظ کر لینے سے کیا ہوتا ہے۔ یہ واقعہ نقل فرمانے کے بعد حضرت نانوتویؒ نے فرمایا کہ بس پڑھنے اور گننے میں یہ فرق ہے۔

مولانا فتح محمد تھانویؒ

یہ ایک بہت بڑے جیّد عالم، کامل درویش، سراپا دین، بہت ہی بابرکت اور صاحبِ نسبت بزرگ تھے۔ یہ پہلے حضرت نواب قطب الدین خاں دہلوی رحمۃ اللہ علیہ سے بیعت ہوئے۔ ان کے انتقال کے بعد تکمیل سلوک شیخ العرب والعجم حضرت حاجی امداد اللہؒ مہاجر مکی سے کی اور مشرف بہ خلافت ہوئے۔ یہ حضرت تھانویؒ کے اُستادِ اوّل تھے۔ جن سے حضرت نے ابتدائی کتب فارسی و عربی پڑھی تھیں۔ حضرت کی خوش قسمتی تھی یا قدرت کا حسنِ انتظام کہ حضرت کو بالکل نوعمری میں جبکہ حضرت کا قلب تمام آلودگیوں سے پاک تھا آپ کو ایسے اُستادِ کامل مل گئے۔ جن کی تعلیم و تربیّت حضرت کے لیے مفتاحِ برکات و سعادات اور کلیدِ خیرات و حسنات ثابت ہوئی اور جن کے فیضِ صحبت سے دل میں دین کی محبّت پیدا ہو گئی۔ چنانچہ حضرت تھانویؒ اعترافاً فرمایا کرتے تھے کہ :-

"جو اصل سرمایہ ہے یعنی دین کی محبّت وہ مجھ کو مولانا ہی کے فیض صحبت سے حاصل ہوا کیونکہ مولانا دین کے عاشق تھے۔ مولانا کی برکت سے دین کا یہاں تک شوق بڑھ گیا۔ کہ میں نابالغی میں ہی تہجد پڑھنے لگا تھا۔"

اُستاد کا اہتمامِ احترام

مولانا رحمۃ اللہ علیہ علوم ظاہری و باطنی میں جس قدر جامع تھے قدو قامت اور جثّہ میں اتنے ہی مختصر۔ علاوہ ازیں منکسر المزاج اور سادہ وضع تھے جس سے بظاہر ان کے مقام کا بآسانی پتہ

نہ لگ سکتا تھا۔ حضرت تھانویؒ کو بھی اُستاد سے خاص رغبت، محبت تھی۔ ایک مرتبہ حضرت کے ہاں ایک صاحب مہمان ہوئے تو آپ انھیں اپنے اُستاد کی زیارت کرانے کے لیے لے گئے۔ مولانا چونکہ صاحبِ نظر تھے اور دیکھ رہے تھے کہ آج کا شاگرد کل کا اُستادِ زمانہ ہوگا۔ اس لیے اُستاد ہونے کے باوجود حضرت کی بڑی تعظیم و تکریم کرتے تھے۔ چنانچہ جب حضرت تھانویؒ اپنے مہمان کے ہمراہ مولانا کی خدمت میں حاضر ہوئے تو وہ اس طرح آپ کو تعظیم و تکریم سے ملے۔ جیسے کوئی اپنے بزرگ کو ملتا ہے۔

اِدھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں اور مغرب کے قریب آپ واپس لوٹے۔ مہمان نے پوچھا کہ آپ نے اُستاد کو ملانے کے لیے کہا تھا۔ وہاں نہیں چلتے؟ حضرت نے فرمایا اپنے استاد سے تو آپ کو ملا کر آرہا ہوں۔ اس پر وہ بہت متعجب ہوئے اور کہا کہ وہی اُستاد تھے۔ وہ تو شاگرد سے بھی معلوم نہیں ہوتے تھے۔

اُستاد کی درخواستِ معافی

زمانہ طالب علمی میں آخر کبھی کبھی اُستاد از راہِ ہمدردی و شفقت شاگرد پر ہاتھ چلا ہی بیٹھتا ہے۔ اس لیے مولانا جو حد درجہ متقی بھی تھے۔ ایک بار اپنے شاگردِ رشید کے پاس چل کر آئے اور فرمانے لگے۔

"جب دو آدمی ایک جگہ رہتے ہیں۔ تو ان میں کچھ تعلقات بھی ہو جاتے ہیں اور ان تعلقات کی وجہ سے کچھ حقوق بھی ہو جاتے ہیں۔ جن میں کچھ کوتاہیاں بھی ہو جاتی ہیں۔ لہٰذا مجھ سے بھی ضرور کچھ کوتاہیاں ہوتی ہوں گی۔ ان کی میں معافی چاہتا ہوں۔"

حضرت فوراً سمجھ گئے کہ طالب علمی کے زمانہ میں مولانا نے جو کبھی شاذ و نادر پیٹا تھا یہ اس کی معافی کی درخواست ہے۔ اور اس لطیف پیرایہ میں پیش کی جا رہی ہے۔ اس لیے فرمایا:۔

"حضرت جس چیز کی معافی چاہی جا رہی ہے۔ اس کو میں سمجھ گیا ہوں۔ تو بہ توبہ حضرت وہ تو عین شفقت و رحمت تھی۔ اس کی معافی کیسی۔ یہ جو دو حرف آ گئے ہیں۔ یہ انہی کی تو برکت ہے۔"

مولانا نے کہا نہیں۔ معاف ہی کر دو۔ حضرت نے بہت عذر کیا مگر وُہ نہ مانے۔ جس پر حضرت نے فرمایا کہ :-

"مَیں نے معاف کیا"

اس پر آپ بہت مسرور ہوئے۔

اُستاد کا جنازہ شاگرد کے گھر

مولانا کا اکثر معمول تھا کہ وُہ ازراہِ تواضع و شفقت خود اپنے شاگرد کو ملنے جایا کرتے تھے۔ جس سے شاگرد کے مقام کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ چنانچہ جب ان کی وفات ہوئی تو اس زمانہ میں طاعون شدید تھا اور بروزِ انتقال بہت زور کی بارش ہو رہی تھی۔ اس لیے حضرت تھانویؒ نماز جنازہ میں شریک نہ ہو سکے۔ مولانا کے اعزہ بھی اربابِ علم و فہم تھے۔ اور وُہ اُستاد و شاگرد کے تعلقات کو بخوبی جانتے تھے۔ اس لیے وُہ حضرت تھانویؒ کو معذور سمجھ کر خود ان کے اُستاد کا جنازہ ان کے پاس لے گئے۔ گویا بوقتِ رخصتِ دُنیا بھی مولانا اپنا معمول پُورا کر گئے۔

عالمِ برزخ سے توجہ

مذکورہ بالا واقعہ سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ عالمِ برزخ سے بھی اُستاد کی شاگرد پر کتنی توجہ تھی۔ اس کی مزید تائید اس واقعہ سے بھی ہوتی ہے کہ ایک بار حضرت سفرِ کانپور سے واپس آئے تو مولانا کے داماد حافظ عصمت اللہ مرحوم نے جو حضرتؒ کے بچپن میں ہم سبق رہے تھے۔ خواب میں مولانا کو دیکھا کہ وُہ حضرت کے متعلق فرما رہے ہیں :-

"وہ کانپور سے آئے ہیں۔ تم ان کو دعوت کیوں نہیں کرتے۔ دعوت کرو

اور یہ جو مرغا گھر میں پلا ہُوا ہے۔ اسے ذبح کر کے کھلاؤ۔"
چنانچہ انھوں نے اسی مرغے کو ذبح کر کے حضرت کی دعوت کی۔

مولانا محمد یعقوب نانوتویؒ

یہ حضرت تھانویؒ کے خاص الخاص اور سب اساتذہ سے زیادہ محبوب اور محترم استاد تھے۔ دارالعلوم دیوبند کے مدرس اوّل فن درس و تدریس اور علوم ظاہرہ میں یگانۂ روزگار اور بڑے صاحبِ باطن اور صاحبِ کشف و کرامات تھے اور اولیاء کاملین میں شمار ہوتے تھے حضرت حاجی امداداللہ قدس سرہ العزیز کے خلفائے عظام میں سے تھے اور قطبِ تکوین کا درجہ رکھتے تھے۔

شاگرد کی عقیدت

مولانا کے انوارِ باطنی کا آپ کے قلبِ مصفّا پر کچھ ایسا عکس پڑا کہ آپ کو مولانا سے نہایت درجہ عقیدت و محبت پیدا ہو گئی۔ یہاں تک کہ جن دنوں حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ نے گنگوہ میں درس حدیث دینا شروع کیا۔ تو بہت سے لڑکے وہاں چلے گئے اور اُنھوں نے آپ کو بھی ترغیب دی کہ چونکہ مولانا کے ہاں ناغے بہت ہوتے ہیں۔ لہٰذا آپ بھی وہیں چلیں۔ آپ نے فرمایا :-

"گو میں سمجھتا ہوں کہ وہاں درسِ حدیث بہتر ہوگا۔ لیکن مجھے تو اپنے اُستاد کو چھوڑنا بے وفائی معلوم ہوتی ہے۔ جب تک مولانا خود یہ نہ فرمادیں کہ بس اب میرا ذخیرۂ علمی ختم ہوگیا ہے۔ اب مجھ سے تمھاری تعلیم نہیں ہوسکتی گو یہاں ناغے بہت ہوتے ہیں۔ مگر جب وہ پڑھاتے ہیں۔ تو سیراب فرمادیتے ہیں"۔

اُستاد کی شفقت

آپ کی اس گرویدگی کا یہ اثر ہوا کہ آپ کے اُستاد بھی دوسرے طلباء کی نسبت آپ پر خصوصی شفقت و توجہ فرماتے تھے اور آپ کے سامنے خصوصیت سے حقائق و معارف اور نکات و دقائق علمیہ زیادہ بیان

فرماتے تھے۔ اس طرح آپ اپنی غیر معمولی قوتِ آخذہ سے دُوسروں کی نسبت زیادہ فیوض و برکات حاصل کرتے تھے اور علوم عجیبہ وغریبہ سیکھتے رہتے تھے۔ چنانچہ مولانا کے درس کی کیفیت آپ یُوں بیان فرمایا کرتے تھے کہ :-

"اُن کا حلقۂ درس کیا ہوتا تھا۔ حلقہ توجہ ہوتا تھا۔ یہ حال تھا کہ تفسیر کا سبق ہو رہا ہے آیات کا مطلب بیان فرما رہے ہیں۔ اور آنکھوں سے زار و قطار آنسو جاری ہیں"

افتاء و امامت کا اعزاز

آپ کی محبت و صلاحیت نے اُستاد کے دل میں اعتماد پیدا کر دیا تھا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ مولانا نے طالب علمی کے زمانہ میں ہی آپ سے افتاء کا کام لینا شروع کر دیا تھا۔ اور کبھی کبھی آپ کو اپنی جگہ امام بھی بنا دیتے تھے۔ ایک بار انھوں نے آپ سے ظہر کی نماز پڑھانے کی فرمائش کی تو آپ نے عذر کیا کہ حضرت میں نے تو ابھی سُنتیں بھی نہیں پڑھیں تو اس پر مولانا نے یہ عجیب و غریب جواب دیا کہ :-

"ہم تو فرض میں تمھاری اقتداء کریں گے۔ سُنتوں میں تھوڑا ہی اقتداء کریں گے۔"

شیخ الہند مولانا محمود الحسن دیوبندی

یہ بھی حضرت کے اساتذۂ خاص میں سے تھے۔ جن سے حضرت نے طالب علمی کے زمانہ میں بہت سی کتابیں پڑھیں مولانا پہلے دارالعلوم دیوبند میں مدرس رابع تھے۔ پھر ترقی کر کے مدرس اوّل ہو گئے۔ یہ حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کے شاگردِ رشید اور حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کے خلیفۂ خاص تھے۔ آپ کو ان سے بھی بڑی عقیدت و محبت تھی۔ اکثر و بیشتر اُن کا ذکرِ خیر فرماتے رہتے تھے۔ بلکہ آپ نے ان کے کمالاتِ علمیہ و عملیہ پر ایک رسالہ "ذکرِ محمودؒ" کے نام سے بھی تصنیف فرما کر شائع کیا تھا۔ سیاسی تحریکات کے زمانہ میں

اگرچہ حضرت کو ان سے اختلاف ہوگیا تھا۔ لیکن ان کا ذکرِ خیر بدستور فرماتے رہتے تھے اور اس میں کسی قسم کا فرق نہ آیا تھا۔

شفقت کی انتہا

مولانا کو بھی آپ سے بڑی انس و محبّت تھی۔ طالب علمی کے زمانہ میں چونکہ آپ کو مناظرہ کا بڑا شوق ہوتا تھا۔ اس لیے اس عرصہ میں آپ کو جہاں بھی مناظرہ کی خبر ملتی۔ فی الفور پہنچتے۔ ایک دفعہ ایک یورپین عیسائی نے مناظرہ کے لیے اسٹیشن دیوبند کے قریب خیمے لگوائے۔ حضرت کو جب علم ہُوا تو بیتابانہ مناظرہ کے لیے دوڑے۔ اتفاق سے اس بات کا مولانا کو بھی پتہ چل گیا تو وُہ اس خیال سے کہ آپ تو نوعمر، نوآموز، ناتجربہ کار ہیں۔ کہیں مرعوب نہ ہوجائیں۔ فوراً اپنے شاگردِ رشید کی امداد کے لیے وہاں پہنچے اور حضرت کو ہٹا کر ان کی جگہ خود مناظرہ شروع کر دیا اور دو چار باتوں میں ہی اس مشنری کو خیمہ اکھاڑنے پر مجبور کر دیا۔

عزّت افزائی کی حد

ذکرِ محمود میں حضرت تھانویؒ بصد حسرت لکھتے ہیں کہ :۔

"یہ میری کوتاہی یا کم ہمتی تھی کہ حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں مکاتبت کا بہت ہی کم اتفاق ہُوا اور بعض اوقات اس کی نوبت بھی آئی۔ اور اس کا جواب بھی بالالتزام عطا ہُوا۔ تو ان کی حفاظت کا کچھ التزام نہیں ہُوا۔ اس وقت کل تین والے نامے محفوظ یاد آتے ہیں۔ ایک تو تفسیر کے متعلق ایک سوال کے جواب میں ہے جو تتمہ جلد رابع فتاویٰ امدادیہ صـ ۳۲۶ میں مطبوع ہوگیا ہے اور دو ذیل میں برکت کے لیے نقل کرتا ہوں جو حضرت کے مذاق تواضع و شفقت پر دلالت کے لیے بھی دو شاہد عدل سے کم نہیں ہیں۔"

ان دو والا ناموں میں حضرت شیخ الہندؒ نے اپنے شاگردِ رشید کو ان الفاظ سے خطاب کیا تھا :۔

۱۔ سراپا فضل وکمال شرفکم اللہ تعالےٰ وجعلکم فوق کثیر من الناس۔

۲۔ معدنِ حسنات وخیرات دام ظلکم

حضرت تھانویؒ کا مولانا نے جن الفاظ میں دُوسرے لوگوں سے ذکر کیا۔ ان کے متعلق حضرت تھانویؒ ذکرِ محمود میں لکھتے ہیں کہ :۔

"حضرت نے بعض الفاظ میری شان سے بہت ارفع فرمائے۔ اس لیے مَیں نے ان کو نقل نہیں کیا کہ چہ نسبت خاک را با عالم پاک۔"

شاگرد کا اختلاف

مولانا کانگرس کے بہت بڑے حامی اور مؤید تھے مگر آپ کے شاگردِ رشید "سراپا فضل وکمال معدنِ حسنات وخیرات" استادِ محترم سے اس مقابلہ میں سخت اختلاف رکھتے تھے۔ یعنی مولانا کانگرس کے جتنے حامی تھے۔ یہ اتنے مخالف اور مخالفت کا بھی یہ عالم تھا کہ ایک طرف تمام اکابر دیوبند اور دُوسری طرف تھانہ بھون کا یہ یکہ وتنہا درویش۔ چونکہ ان دونوں بزرگوں یعنی اُستاد و شاگرد کے درمیان رائے کا اختلاف بالکل اجتہادی قسم کا تھا اور محض اخلاص وللہیت پر مبنی تھا۔ جیسے آئمہ مجتہدین اور سلف صالحین میں شروع سے چلا آتا ہے اس لیے اس اختلاف کے باوجود اُستاد شاگرد کے ذاتی تعلقات میں قطعاً فرق نہ آیا جس پر ان کے ناداں دوستوں اور نافہم مخلصوں میں بڑی کشاکش رہتی تھی۔ حضرت تھانویؒ کے عقیدت مندوں کو تو اس معاملہ میں لب کشائی کی ہمت ہی نہ ہوتی تھی۔ مگر مولانا کے مخلصین ان سے اکثر شکایت کرتے رہتے تھے۔ اور مولانا حضرت کے حسنِ ظن کی تصدیق اور خدماتِ دینی کی تعریف فرما کر ان کوتاہ نظروں کو اعتراضات سے روکتے تھے۔ ایک دفعہ تو ایک پانی پتی عالم سے یہاں تک کہہ دیا کہ :۔

"بھائی اپنی جماعت میں اختلاف تو اچھا نہیں معلوم ہوتا۔ لاؤ پھر مَیں ہی کسی قدر رائے کیوں نہ بدل دُوں اور اس معاملہ میں ان (حضرت تھانویؒ)

کی موافقت کروں۔ کیونکہ میرے اُوپر کوئی وحی تو نازل ہوتی نہیں کہ میری رائے ٹھیک ہی ہو۔"

ایک اور موقعہ پر جب حضرت تھانویؒ مولانا کو ان اختلافات کے باوجود مِلنے دیو بند تشریف لے گئے۔ تو اس موقعہ کو غنیمت جان کر مولانا کے ایک مخلص نے مولانا سے تحریک کی کہ یہ (حضرت تھانویؒ) اس وقت آئے ہُوئے ہیں اگر امورِ اختلافیہ پر ان سے گفتگو فرمالیں تو شاید رائے متفق ہو جائے مولانا نے ارشاد فرمایا :۔

"نہیں مناسب نہیں۔ جو شخص اپنا لحاظ کرتا ہو۔ اس سے ایسی گفتگو کرنا مناسب نہیں۔ نیز گفتگو سے رائے نہیں بدلا کرتی۔ واقعات سے بدلا کرتی ہے۔"

اِن اختلافات کے باوجود اُستاد شاگرد کے درمیان تعلقات بدستور قائم و دائم رہے اور مولانا اپنے شاگرد کو جب بھی خط لکھتے مخدوم۔ مکرم ایسے الفاظ سے خطاب کرتے۔ جس پر حضرت تھانویؒ نے مولانا سے درخواست کی کہ ایسے الفاظ تحریر نہ فرمایا کریں ان سے خجالت ہوتی ہے مگر مولانا نے ایسے ہی الفاظ تحریر فرمائے۔ اس پر حضرت تھانویؒ نے پھر لکھا :۔

"میری درخواست منظور نہ ہونے سے معلوم ہُوا کہ حضرت کو اسی میں راحت ہے گو مجھ کو کلفت ہے۔ مگر مَیں حضرت کی راحت کو اپنی راحت پر مقدم سمجھتا ہوں۔ اب جو مرضی ہو اختیار فرمایا جاوے مَیں گوارا کروں گا۔"

شاگرد کے اَدب اور اُستاد کی رعایت کی ایسی مثالیں صرف مردانِ حق میں مل سکتی ہیں۔ اربابِ اغراض و نفسانیت سے ایسی توقع کہاں ؟

مولانا سیّد احمد دہلوی

یہ بھی آپ کے اساتذہ میں سے تھے۔ اُنھوں نے ریاضی کسی اُستاد سے نہیں پڑھی تھی۔ صرف اپنی خداداد فہم و فراست سے بطور خود ہی مطالعہ کر کے اس فن کو حاصل کیا تھا اور

ریاضیات میں بدرجۂ کمال ماہر ہو گئے تھے۔ یہاں تک کہ راس الاذکیا و مولانا محمد یعقوبؒ ان کے متعلق فرمایا کرتے تھے کہ :۔

"خود اقلیدس بھی اگر ذہین ہوگا۔ تو بس اتنا ہی ہوگا۔ ان سے زیادہ نہ ہوگا۔"

دیگر اساتذہ

ملا محمود و مولانا عبدالعلیؒ کا نام بھی حضرت اپنے اساتذہ کرام میں لیا کرتے تھے۔

قاری محمد عبداللہ مہاجر مکیؒ

ان سے آپ نے مکہ معظمہ میں قرأت کی مشق کی تھی جو قرأ عرب کے نزدیک نہایت جید اور مسلّم ماہر فن قاری تھے اور امامِ فن مشہور آفاق تھے انھوں نے بھی اپنے شاگرد رشید میں کچھ ایسی غیر معمولی صلاحیتیں دیکھیں کہ زمانۂ شاگردی میں ہی حضرت کو عملی تربیت دینے کے لیے اپنے مدرسہ کے طلبہ کو بعض رسائل قرأت کے چند اسباق پڑھانے پر مامور کر دیا۔ تاکہ کتب فن سے بھی مناسبت ہو جائے۔

اعزاز دینی کی بشارت

حضرت مولانا رفیع الدین رحمۃ اللہ علیہ حضرت مولانا شاہ عبدالغنی دہلوی مہاجر مدنی کے خلیفہ تھے۔ اور حضرت شاہ صاحب مولانا رشید احمد گنگوہی اور مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمہما اللہ تعالیٰ کے اساتذہ میں سے تھے۔ جن دنوں حضرت تھانوی دارالعلوم دیوبند میں تعلیم حاصل کر رہے۔ ان دنوں یہ یہ اس کے مہتمم تھے۔ وہ گو عالم نہ تھے۔ مگر بصیرتِ باطنی سے بہرہ ور اور پرلے درجہ کے منتظم تھے۔ ان کی حضرت پر خاص نظرِ عنایت تھی۔ ایک دفعہ حضرت تھانوی انھیں ملنے گئے تو وہ چارپائی پر کچھ اس انداز سے بیٹھے تھے کہ پائنتی کی طرف جگہ بالکل کم بچی ہوئی تھی۔ آپ غایت ادب کی وجہ سے پائنتی کی طرف بیٹھنے لگے تو مولانا نے ہاتھ پکڑ کر سرہانے کی طرف بٹھانا چاہا۔ حضرت عذر کرنے لگے تو فرمایا کہ اپنے بڑوں کا کہنا ماننا

چاہیئے۔ جہاں وہ بٹھائیں وہیں بیٹھنا ادب ہے۔ اس پر حضرت طوعاً وکرہاً سرہانے بیٹھ گئے۔ اس موقعہ پر مولانا نے حضرت کو داراشکوہ اور عالمگیر کی اس بزرگ سے ملاقات کا قصہ سنایا۔ جس کے پاس دونوں باری باری حصولِ تخت وتاج کی دعا کرانے گئے تھے۔ داراشکوہ تو اس بزرگ کے اصرار کے باوجود ان کی مسند پر نہ بیٹھا اور غایت ادب کی وجہ سے نیچے بیٹھ گیا اور جب دعا کی درخواست کی تو انھوں نے فرمایا کہ میں نے تو تمھیں تخت پر بٹھانا چاہا تھا۔ تم خود نہیں بیٹھے۔ جس کا اسے ازحد افسوس ہوا اور اس نے یہ واقعہ عالمگیر سے چھپایا۔ لیکن جب عالمگیر ان کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اس بزرگ نے انھیں اپنی مسند پر بیٹھنے کو فرمایا۔ تو وہ فی الفور اس پر بہ تعمیل حکم بیٹھ گئے اور جب انھوں نے بھی تخت تاج کی درخواست کی تو اس بزرگ نے فرمایا کہ تخت پر تو میں نے بٹھا دیا ہے۔ رہا تاج۔ وہ میرے اختیار میں نہیں۔ وہ تمھارے فلاں خادم کے اختیار میں ہے۔ گویا اس لطیف پیرایہ میں مہتمم صاحب نے حضرت کو اعزازِ دینی کی بشارت دی۔ جو اس دور میں سوائے حضرت کے اور کسی کو نصیب نہ ہوا۔ چونکہ اس صاحبِ فراست بزرگ نے تاڑ لیا تھا کہ یہ طالب علم تو پیدائشی صالح ہے اس لیے وہ آپ کو بسا اوقات سفر میں بھی ساتھ رکھتے تھے۔ بلکہ اکثر آپ کو امام بنا کر خود پیچھے نماز پڑھتے تھے۔ حضرت نے سوءِ ادب سمجھا کہ ایسے بزرگ ان کے مقتدی ہوں اس لیے عذر کر دیا۔ اور اصرار سے بچنے کے لیے دوسری مسجد میں نماز پڑھنی شروع کر دی۔

غرضیکہ جتنا صالح شاگرد تھا۔ اتنے ہی کامل اسے استاد ملے تھے۔

وجہِ احترام

مگر یہ کاملین اپنے شاگردِ رشید کا صرف صالحیت کی بنا پر ہی اتنا ادب احترام نہ کرتے تھے۔ بلکہ اس خصوصیت کی بنا پر کرتے تھے۔ جس کا ذکر باب "مجددیت" میں آئے گا ورنہ ان کے حلقۂ درس میں حضرت تھانوی کے

ایسے ہم مکتب بھی شریک تھے۔ جو بعد میں اپنے علم وفضل اور زہد وتقویٰ کی بنا پر آسمانِ شہرت پر مہر وماہ کی طرح چمکے۔ مگر ان کی طرف انھوں نے کبھی خصوصی توجہ نہ فرمائی تھی۔

درس وتدریس

فیضِ عام کا اہتمام

کانپور میں سب سے قدیمی مدرسہ "فیض عام" تھا۔ اس کے صدر مدرس مولانا احسن رحمۃ اللہ علیہ تھے جو اپنے زمانہ کے مشاہیر علماء سے تھے۔ ماہر معقولات تھے اور طلباء میں بڑے مقبول و مشہور تھے۔ حق تعالیٰ کو چونکہ حضرت تھانویؒ کو اس مسندِ حسن پر بٹھانا منظور تھا۔ اس لیے اس مقلب القلوب نے مولانا احمد حسنؒ کے دِل میں کوئی ایسی بات ڈال دی کہ وہ ناراض ہو کر اس مدرسہ سے چل دیئے اور اپنا الگ مدرسہ "دار العلوم" کے نام سے قائم کر لیا۔ ان کی شہرتِ علم وفضل کی وجہ سے کسی کو اس مسند پر بیٹھنے کی ہمت نہ ہوتی تھی اور حضرت تھانویؒ کو ان حالات کا کوئی علم نہ تھا۔ چنانچہ جب وہاں سے ایک مدرس کی طلبی ہوئی۔ تو اخیر صفر سنہ ۱۳۰۱ھ میں آپ باجازت والد ماجد بارشاد اساتذہ کرام بلا تامل تشریف لے گئے اور درس دینا شروع کر دیا۔ گویا مدرسہ سے فارغ ہونے کے بعد آپ کو سب سے پہلے معلمی کا اعزاز بخشا گیا۔ جو سب پیشوں سے زیادہ معزز ومحترم ہے۔

نور علم کا اثر

حضرت تھانویؒ صرف زیورِ علم سے ہی آراستہ نہ تھے بلکہ جمالِ ظاہری اور کمالِ باطنی کے ساتھ جذبۂ خدمتِ دین اور زبانِ فیض ترجمان بھی رکھتے تھے جس کی وجہ سے بالکل نوجوان اور سبزہ آغاز ہونے کے باوجود آپ کی جملہ

مدرسین اور اہل شہر میں بڑی شہرت ہو گئی اور اتنے ہر دلعزیز ہو گئے کہ جن کی مسند پر کوئی بیٹھنے کی جرأت نہ کرنا تھا وہی مولانا احمد حسنؒ بھی آپ سے بڑی محبت اور وقعت سے پیش آنے لگے۔ اس سے لوگوں کے دلوں میں آپ کی اور بھی قدر و منزلت بڑھ گئی۔

غیب سے ہمت افزائی

پڑھنے اور پڑھانے میں زمین آسمان کا فرق ہوتا اور ایسے اُستاد کے لیے جسے قبل ازیں معلمی کی تربیت حاصل نہ ہو۔ اسے متعلمی سے فوراً معلمی پر بٹھا دیا جائے اور اس کے سامنے پڑھانے کے لیے بڑی بڑی کتابیں رکھ دی جائیں۔ تو اس کا گھبرا جانا لازمی امر ہے۔ چنانچہ حضرت تھانویؒ شروع شروع میں اس کام سے بہت گھبرائے کہ یا اللہ میں ان کتابوں کو کیونکر پڑھا سکوں گا۔ اسی گھبراہٹ کے عالم میں بارگاہِ الٰہی میں دست بدعا ہوئے اور مصداق اجابت از درحق بہر استقبال مے آید" دعا کے بعد جو پڑھانے بیٹھے تو بفضلہٖ تعالیٰ کوئی دقت پیش نہ آئی اور نہایت آسانی کے ساتھ پڑھاتے چلے گئے۔ اس کے علاوہ وقتاً فوقتاً غیب سے بھی آپ کی تسلی اور ہمت افزائی کا سامان ہوتا رہا۔ جیسا کہ آپ کے مندرجہ ذیل رویاء صادقہ سے ظاہر ہے۔ جو خود حضرت تھانویؒ کے الفاظ میں "الصدق الرویا" سے نقل کیے جاتے ہیں۔

۱۔ "احقر نے جب حدیث کا درس شروع کیا تو استاذی حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی زیارت سے اس طرح مشرف ہوا کہ میرے روبرو ایک جماعت صحیح بخاری پڑھنے والوں کی موجود ہے۔ اور ایک نسخہ بخاری کا میرے سامنے ہے۔ جس کو میں دیکھ کر درس دیتا ہوں اور میرے برابر میں حضرت استاذی المحمد وح تشریف رکھتے ہیں اور غالباً آپ کے پاس بھی ایک بخاری شریف کا نسخہ ہے اور میں جو بیان کرتا ہوں۔ مولانا اس کی تقریر فرماتے ہیں۔ الخ

۲۔ ایک مقام ہے۔ جیسے کانپور میں جناب عبدالرحمٰن خاں صاحب بانی مدرسہ جامع العلوم

کانپور کا چھوٹا مطبع - وہاں کنوئیں کے پاس حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کھڑے ہیں اور
مَیں قریب ہُوں اس کے بعد مجھ کو مناسبت تفسیر کا ظن غالب ہو گیا۔"

غیرتِ دینی کا تقاضا

حضرت تھانوی کو مدرسہ فیض عام میں کام کرتے ابھی تین چار ماہ ہی گزرے تھے کہ آپ کی غیر معمولی قابلیت کے پیش نظر منتظمین مدرسہ نے چاہا کہ حضرت اپنے مواعظ میں مدرسہ کی امداد کے لیے چندہ کی تحریک بھی کیا کریں ۔ اسے حضرت تھانویؒ نے غیرت دینی کے خلاف سمجھا کہ مدرس درس دین بھی دے وعظ بھی کرے اور اپنی تنخواہ کے لیے چندہ بھی جمع کرے ۔ اس لیے آپ نے ایسا کرنے سے صاف انکار کر دیا ۔ اراکین مدرسہ نے اس عدمِ تحریک چندہ کی آپس میں بیٹھ کر کچھ شکایت کی ۔جس کی کسی نے حضرت کو بھی اطلاع کر دی ۔ اس پر حضرت نے فرمایا کہ" اگر چندہ ہی کے لیے وعظ کہنا ہے ۔تو مَیں چندہ اپنے ہی لیے کیوں نہ کروں یہ کام میرا نہیں ہے بلکہ خود اراکینِ مدرسہ کا ہے ۔میرا کام تو فقط پڑھانا ہے" مگر اراکینِ مدرسہ پر اس کا کچھ اثر نہ ہُوا اور وُہ اس بات کا چرچا کرنے لگے ۔جو آپ کو سخت ناگوار گزرا ۔ اور آپ نے استعفےٰ دے دیا ۔ بعد میں اُنھوں نے معذرت کی ۔لیکن حضرت نے اس بنا پر کہ یہ ناقدرے لوگ معلوم ہوتے ہیں ۔ ان سے میرا نباہ مشکل ہو گا ۔ وہاں رہنا منظور نہ فرمایا ۔

اس سلسلہ میں حضرت فرمایا کرتے تھے کہ" وُہ ذرا جوانی کے جوش و خروش کا زمانہ تھا ۔ اور اصل وجہ تو یہ تھی کہ نوکری ہی میرے مزاج کے خلاف تھی ۔جب مَیں نے والد صاحب کو یہاں کی شکایت لکھی تو اُنھوں نے ان لوگوں کی سب باتوں کی توجیہات لکھ کر بھیجیں اور لکھا کہ ابھی وہیں رہو ۔ علیحدگی اختیار کرنے میں عجلت مناسب نہیں ۔ کیونکہ ہمیں تو نوکری مقصود ہی نہیں ۔ اللہ تعالیٰ نے سب کچھ دے رکھا ہے ۔ ہم نے تو محض اس لیے تم کو اجازت دے دی تھی کہ اچھا ہے ابھی کتابیں تازہ ہیں ۔ پڑھانے سے پختہ ہو جائیں گی ۔

اگر تم نے نوکری چھوڑ دی تو پھر پڑھانے کا سلسلہ ہی منقطع ہو جائے گا اور سب پڑھا لکھا نسیاً منسیاً ہو جائے گا۔ کیونکہ بدوں پابندی کے تم پڑھاؤ گے نہیں۔ اور اگر مدرسہ میں رہو گے تو پھر پابندی کرنی پڑے گی ۔"

مگر چونکہ وہاں سے آپ کا دل برداشتہ ہو چکا تھا۔ اس لیے مدرسہ فیض عام کا تعلق چھوڑ ہی دیا اور واپسی وطن کا قصد فرما لیا۔

باعزت مراجعت

روانگی وطن سے قبل آپ حضرت مولانا شاہ فضل الرحمٰن صاحب گنج مراد آبادی کی زیارت کی غرض سے گنج مراد آباد تشریف لے گئے کہ مبادا پھر اس طرف نہ آنا ہو وہ آپ کے ہم مشرب و ہم مسلک بزرگ نہ تھے۔ بلکہ نقشبندی سلسلہ سے تعلق رکھتے تھے اور حضرت تھانویؒ چشتی سلسلہ سے۔ چونکہ وہ قطبِ وقت تھے۔ اس لیے اس مردِ حق نے ان کی زیارت ضروری سمجھی۔

اگرچہ جوہر ناشناس اراکین نے حضرت تھانویؒ جیسا گوہر بے بہا ہاتھ سے کھو دیا تھا مگر اہل شہر آپ کے اخلاص فی الدین سے اتنے متاثر تھے کہ ان سے یہ صدمہ مفارقت برداشت نہ ہو سکا۔ اور انھوں نے حضرت تھانویؒ کو واپس لانے کی تجاویز سوچنی شروع کر دیں۔ معززین شہر میں سے عبدالرحمٰن خاں اور حاجی کفایت اللہ کو حضرت سے خاص محبت و عقیدت تھی۔ وہ یہ بھی دیکھ رہے تھے کہ شہر کے تمام مدرسوں میں معقولات پڑھائی جاتی ہے اور دینیات کا کوئی خاص اہتمام نہیں ہے اس لیے انھوں نے کانپور کے محلہ پٹکا پور کی جامع مسجد میں جدید مدرسہ کھولنے کا فیصلہ کیا اور جو پچیس روپیہ ماہوار آپ مدرسہ فیض عام سے تنخواہ پاتے تھے۔ وہ ان دونوں حضرات نے از گرہ خود ادا کرنے کا فیصلہ کیا کہ ایسے مولوی کہاں ملتے ہیں۔ ان کو یہاں

سے جانے نہ دیا جائے۔

چنانچہ جب آپ گنج مرادآباد سے واپس کانپور تشریف لائے تو ان دونوں حضرات نے باصرار روک لیا اور آپ نے بھی ان کے اخلاص اور والد ماجد کے ارشاد کے پیشِ نظر اس مسجد میں بیٹھ کر درس دینا منظور کر دیا اور اس مسجد میں "جامع العلوم" کے نام سے جدید مدرسہ قائم کر لیا جو جامع دینیات و معقولات تھا۔ شروع شروع میں طلبہ کو آپ سے پڑھتے ہوئے شرم آتی تھی۔ کیونکہ آپ ابھی بالکل نوعمر اور سبزہ آغاز تھے۔ جس کی وجہ سے کئی سال تک طلبہ کی تعداد کم رہی اور جب داڑھی بڑھی تو طلبا کی تعداد بھی زیادہ ہونے لگی۔

اگرچہ حضرت کی تنخواہ ان حضرات نے اپنے ذمے لے رکھی تھی۔ مگر بعد ازاں چندہ بھی ہونے لگا۔ لیکن حضرت نے کبھی اپنی طرف سے چندہ کی تحریک نہ کی۔

للّٰہیت کا اثر

حضرت تھانوی شروع سے ہی اخلاص و ایثار کے مجسّمہ تھے۔ ایک طرف نوکری کرنا خلافِ طبع تھا دُوسری طرف تنخواہ لے کر اللہ کا کام کرنا دوست خیال نہ کرتے تھے۔ حالانکہ اس کے جواز میں متاخرین کا فتویٰ موجود تھا۔ مگر تقویٰ کا تقاضا یہ تھا کہ اگر دین پڑھانا ہے تو لوجہ اللہ پڑھایا جائے۔ اس لیے آپ نے دہلی جا کر حکیم عبد المجید خاں مرحوم دہلوی کے مطب میں طب کی تعلیم حاصل کرنے کا فیصلہ کیا تاکہ درس تدریس کے ساتھ مطب کا سلسلہ شروع کر کے بسر اوقات کی جائے۔ مگر وہاں جانے سے قبل آپ نے والد ماجد سے اجازت چاہی اور انھوں نے آپ کی تحریک پر بخوشی اجازت دے دی۔ بلکہ اپنے اس فرزند ارجمند کی سعادت مندی سے متاثر ہو کر اپنے ایک گاؤں گدائے کھیڑہ کی آمدنی آپ کے اخراجات کے لیے مقرر کر دی تاکہ آپ معاشی بے فکری سے باطمینان خدمتِ دین کا فریضہ انجام دے سکیں۔

طبؔ کی تعلیم

چنانچہ آپ لوجہ اللہ تعلیم دین کے شوق سے سرشار ہوکر کانپور سے دہلی پہنچے اور حکیم عبد المجید خاں دہلوی سے تعلیم طب حاصل کرنی شروع کر دی۔ حکیم صاحب صاحبِ ثروت و امارت ہونے کی وجہ سے بڑے مستغنی المزاج تھے۔ مگر اتنے بڑے اور مشہور آدمی ہونے کے باوجود حضرت کے اخلاق و آداب سے متاثر ہوکر آپ پر بڑی شفقت و عنایت کرنے لگے۔ ادھر اہل کانپور آپ کی جدائی میں پھر بے تاب ہونے لگے اور اربابِ مدرسہ آپ کی خدمت میں دہلی پہنچے۔ اور مدرسہ کی اہمیت کا واسطہ دے کر واپسی کے لیے بڑی منّت سماجت کی۔ آپ کے دیوبند کے ہم سبق حکیم مولوی جمیل الدین غازی پوری نے بھی آپ کو مشورہ دیا کہ :-

"طب کا مشغلہ ہرگز اختیار نہ کیا جائے۔ کیونکہ میرا ذاتی تجربہ ہے کہ مطلب سے دین اور علمِ دین کی خدمت ہرگز نہیں کی جاسکتی۔"

اس پر آپ نے مخلصین و محبین کی خواہشات کا احترام کرتے ہوئے واپسی کا قصد تو کر لیا۔ مگر آمدن بہ ارادت رفتن بہ اجازت کے تحت اور حکیم صاحب کی حد سے بڑھی ہوئی محبت و شفقت کے پیشِ نظر خود بخود پڑھائی چھوڑنے کو خلافِ مروّت و تہذیب سمجھا۔ اور جو بلانے آئے تھے ان سے فرمایا کہ اگر حکیم صاحب اجازت دے دیں تو میں چلنے کو تیار ہوں۔ انھوں نے اس بارے میں حکیم صاحب سے درخواست کی۔ حکیم صاحب نے بادل نخواستہ ان الفاظ میں اجازت دے دی کہ :-

"خیر! اگر اپنی ترقی کرنا نہیں چاہتے تو اختیار ہے۔ چلے جائیں۔"

چنانچہ پندرہ طب کی تعلیم حاصل کرنے کے بعد آپ کانپور واپس تشریف لاکر درس و تدریس میں مصروف ہو گئے اور مسلمانانِ کانپور خوشی سے پھولے نہ سمائے۔ جیسے ان کے اجڑے چمن میں پھر سے بہار آگئی۔

مسرّتِ مُرشد

اس امر کی اطلاع جب آپ کے شیخ حضرت حاجی امداد اللہ قدس سرہٗ العزیز کو پہنچی تو انھوں نے اس بازگشت پر ان الفاظ میں اظہارِ مسرت فرمایا :۔

"طبابت کے شغل کو ترک کر کے آپ کے کانپور تشریف لاکر دینیات کے شغل کا حال معلوم ہوا بہت خوشی ہوئی۔ اللہ جل جلالہٗ آپ کی خدمت میں برکت دے اور آپ کے برکات و فیض سے تمام مسلمانوں کو مستفیض و مستفید کرے۔ میں نے قبل ہی آپ کو مشورہ دیا تھا کہ دین کو خوب مضبوط پکڑنا چاہیئے۔ دنیا خود ہی اچھی صورت میں خدمت کو حاضر رہے گی۔ بہر کیف آپ لوگ علماء ورثۃ انبیاء ہیں آپ لوگوں کو اللہ تعالیٰ نے اپنی مخلوق کی ہدایت کے لیے پیدا کر کے بڑے درجے عنایت کیے ہیں۔ پس اپنے مقصود کا خیال سب پر مقدم رکھنا چاہیئے۔" (مکتوب امدادیہ ۳۱)

اس کے بعد آپ نے اطمینان سے اپنا کام شروع کر دیا اور پورے چودہ سال وہاں درس و تدریس میں مشغول رہے۔

طریقہ تعلیم کی نفاست

حضرت تھانوی کا طرزِ تعلیم اتنا سلیس نفیس اور سہل تھا کہ جو طالب علم دو چار سبق بھی حضرت سے پڑھ لیتا تھا۔ پھر اس کی کسی اور اُستاد سے تسلی نہ ہوتی تھی۔ اس کی وجہ حضرت کے خود اپنے اس بیان سے ظاہر ہے کہ :۔

"میں جب پڑھاتا تھا تو اپنے اُوپر بہت تعب برداشت کر کے پہلے سے سبق کی تقریر کو اپنے ذہن میں محفوظ کر لیتا تھا۔ پھر پڑھاتا تھا۔ اس لیے میری ساری تقریر نہایت سہل اور باترتیب ہوتی تھی۔ جس کی وجہ سے مشکل سے مشکل مضامین بھی طالب علموں کے لیے بالکل پانی ہو جاتے تھے اور بآسانی ذہن نشین ہو جاتے تھے۔

گو مجھ کو تو سہل کر کے تقریر کرنے میں بہت تعب ہوتا تھا۔ لیکن طلباء کو کسی مقام کے سمجھنے میں ذرا اُلجھن نہ ہوتی تھی۔ چنانچہ صدرا میں ایک مشہور مقام ہے۔ ثلثاۃ بالتکریر جو بہت ہی مشکل سمجھا جاتا ہے۔ جب کتاب میں وہ مقام آیا تو میں نے قبل اس کے کہ طلباءُ کو اس مقام کی اطلاع دُوں۔ اس کے مضمون کی ایک سلیس تقریر کر دی۔ لیکن یہ نہ معلوم ہونے دیا کہ یہ تقریر کس مشکل مقام کی ہے بلکہ یوُں ہی سرسری طور پر تقریر کر دی۔ چونکہ میں نے بہت ہی سہل کر کے تقریر کی تھی۔ طلبا کی سمجھ میں خوب اچھی طرح آ گئی۔ اور جب اُنھوں نے اس کا اقرار کر لیا۔ تب مَیں نے کہا کہ یہ تو وہی مقام تھا۔ جس کو ثلثاۃ بالتکریر کہتے ہیں۔ تو یہ سُنتے ہی وہ چوکنے ہُوئے۔ مَیں نے کہا کہ بس بس اَب نہ ڈرو۔ اَب تو پار ہو گئے۔ مَیں نے پھر پُوچھا کہ بتاؤ یہ بھی کوئی مشکل مقام تھا۔ انھوں نے کہا۔ ہم کو تو طلباء نے اس سے بہت ہی ڈرا رکھا تھا۔ لیکن یہ تو کچھ بھی مشکل نہ تھا۔

مقام تو واقعی مشکل تھا۔ لیکن مَیں نے اس کی تقریر ایسی بے فکری اور سلاست سے کی کہ نہایت سہولت کے ساتھ ان کی سمجھ میں آ گئی البتہ مجھ کو سہل کر کے بیان کرنے میں بہت تعب اُٹھانا پڑا۔ کیونکہ دُوسروں کا بوجھ مَیں نے اپنے اُوپر لے لیا۔

مَیں پڑھانے میں ہمیشہ یہی کرتا تھا۔ آج کل کے اساتذہ اپنے اُوپر ذرا مشقت نہیں ڈالنا چاہتے۔ بات یہ ہے کہ شفقت نہیں رہی۔ محض ضابطہ پوُری رہ گئی ہے۔

مَیں نے پڑھاتے وقت ضرورت سے زائد کبھی تقریر نہیں کی۔ صرف حل کتاب پر اکتفا کیا۔ زوائد سے طالب علموں کا کبھی وقت ضائع نہ کیا اور مَیں اس کی تاکید اپنے ماتحت مدرسین پر بھی رکھتا تھا۔ بلکہ کبھی کبھی جا کر ان کے پڑھانے کی جانچ بھی کیا کرتا تھا۔

اساتذہ زیادہ تر اپنی قابلیت کے اظہار کے لیے نکات و دقائق کی تقریر کیا کرتے تھے۔ جن سے کتاب کے اصل مطلب میں بھی غلط ہو جاتا ہے۔ بعض یہ عذر پیش کرتے ہیں کہ جب تک اس قسم کی تقریریں نہ کی جائیں۔ اُستاد کی مہارت کے متعلق طلبہ کی

تسلی نہیں ہوتی لیکن طلبہ کی یہ تسلی دیکھنی چاہیئے یا ان کا نفع۔ ان کا نفع تو اس میں ہے کہ اصل کتاب کو اچھی طرح حل کر دیا جائے، کیونکہ استعداد اسی سے پیدا ہوتی ہے اور جب استعداد پیدا ہو جائے گی۔ تو پھر نکات و دقائق خود ہی سمجھ میں آنے لگیں گے۔ لہٰذا اُستاد کا اصل مطمح نظر یہی ہونا چاہیئے۔

یہ جو نئے نئے طریقے ہفتہ وار مشق تقریر و مناظرہ کے نکلے ہیں۔ ان کی ضرورت نہیں۔ بلکہ یہ مضر ہیں۔ اس لیے کہ ہفتہ بھر تک بجائے اسباق کی طرف متوجہ رہنے کے اسی کی تیاری میں رہتے ہیں اول تو اس قسم کی مشق کرانے کی ضرورت ہی نہیں۔ کیونکہ جب کتابیں خوب اچھی طرح سمجھ کر پڑھ لی جائیں گی۔ تو تقریر و تحریر و مناظرہ سب کی استعداد خود بخود ہی پیدا ہو جائے گی اور اگر ایسا ہی شوق ہے تو جو طالب علم جو کتاب پڑھ رہا ہو اسی کے متعلق اس سے تقریر کرائی جایا کرے۔ اس سے تقریر کی مشق بھی ہو جائے گی۔ اور حرج بھی نہ ہوگا۔ بلکہ کتابیں اور پختہ ہو جائیں گی۔"

طلباء کو ہدایت

حضرت تھانویؒ طلبہ کو اپنے تجربہ کی بنا پر ہدایت فرماتے تھے کہ تم تین باتوں کا التزام کر لو پھر میں ٹھیکہ لیتا ہوں اور ذمہ دار ہوتا ہوں کہ تمہیں استعداد علمی حاصل ہو جائے گی۔

۱۔ جو سبق پڑھنا ہو۔ اس کا مطالعہ ضرور کر لیا جائے اور مطالعہ کوئی مشکل کام نہیں ہے کیونکہ مطالعہ کا مقصود صرف یہ ہے کہ معلومات اور مجہولات متمیز ہو جائیں۔ بس اس سے زیادہ کاوش نہ کرے۔

۲۔ سبق کو اُستاد سے اچھی طرح سمجھ کر پڑھ لے۔ بلا سوچے سمجھے آگے نہ بڑھے اور اگر اس وقت اُستاد کی طبیعت حاضر نہ ہو تو کسی دوسرے وقت سمجھ لے۔

۳۔ اس کے بعد ایک بار خود بھی مطلب کی تقریر کرے۔

بس پھر ان تینوں التزامات کے بعد بے فکر رہے۔ چاہے یاد رہے یا نہ رہے۔

انشاء اللہ استعداد ضرور پیدا ہو جائے گی۔

یہ تینوں باتیں تو درجہ وجوب میں ہیں اور ایک بات درجہ استحباب میں ہے وہ یہ کہ کچھ آموختہ بھی روزانہ دہرا لیا کرے۔

اساتذہ بزمرہ طلباء

حضرت تھانویؒ فن درس و تدریس میں ید طولیٰ رکھتے تھے اور یہ علوم ظاہریہ میں مہارت تامہ کا نتیجہ تھا کہ مسندِ ارشاد پر بیٹھنے کے بعد اکثر طلباء بلکہ اساتذہ چھٹیوں میں تھانہ بھون پہنچ جاتے تھے۔ کیونکہ حضرت وہاں بھی اکثر مضامین طلبہ کے کام کے بیان فرماتے تھے اور ایسے ایسے نکات و دقائق علمیہ بیان فرماتے تھے۔ جن سے اساتذہ کی مشکلیں آسان ہو جاتی تھیں۔ تعطیلات کے ایام میں علماء و اساتذہ کی تھانہ بھون کو روانگی دیکھ کر بعض نافہم لوگ اُستادوں سے سوال کیا کرتے تھے کہ :۔

"تم تعطیلات میں تھانہ بھون کیوں جایا کرتے ہو۔ یہیں رہ کر مطالعہ کُتب کیوں نہیں کیا کرتے۔ جس سے تمھاری معلومات علمیہ بڑھیں"

یہ سوال خود ہمارے مفتی اعظم پاکستان مولانا مفتی محمد شفیع صاحب دیو بندی سے بھی ہُوا اور انھوں نے اسے من وعن حضرت سے نقل فرما دیا۔ اس پر حضرت نے سوال کیا کہ :۔

"منافع باطنیہ تو خیر رہنے دیجئے۔ یہ بتلایئے کہ یہاں کے تعلق کے بعد کتابوں کے پڑھانے میں بھی آپ کو بہ نسبت پہلے کے کچھ اعانت ہوئی"

جس کا جواب مفتی صاحب نے یہ دیا۔

"حضرت بہت زیادہ اعانت ہُوئی اور کھلا فرق محسوس ہوتا ہے"

اس پر حضرت فرمانے لگے کہ ایسے لوگوں کو بس اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ :۔

"میں وہاں بھی مطالعہ ہی کے لیے جایا کرتا ہوں"

ایک مفید دستور العمل

دنیوی مدارس کی طرح دینی مدارس میں بھی طلبا کو بعد فراغت درس سندات فراغ دی جاتی تھیں۔ مگر عام دستور یہ تھا کہ جو طالب علم بوجہ عدم مناسبت یا عدم دلچسپی یا قلت کی بنا پر معقولات نہ پڑھے۔ لیکن دینیات کی تمام کتابیں پڑھ چکا ہو۔ اسے سند فراغ میں انھوں نے لفظ درسیات کے ساتھ لفظ دینیات کا بھی اضافہ فرما دیا ۔ وہ ان لفظوں کے لیے سند مطبوعہ میں جگہ چھوڑ دیتے تھے ۔ جو طلباء فارغ دینیات ہوتے ان کے لیے سند میں لفظ دینیات لکھ دیا جاتا۔ اور جو فارغ درسیات ہوتے ان کے لیے لفظ درسیات لکھ دیا جاتا۔ ویسے دونوں کی کی سند یکساں تھی۔

علاوہ ازیں اس زمانہ میں نہ صرف فارغین حدیث کو سند کے ساتھ دستار دی جاتی تھی۔ بلکہ ہر قسم کے فارغین کو دستار ضرور دی جاتی تھی۔ جس پر ریشم سے طالب علم کا نام مع مدرسہ و سن کے لکھا ہوا ہوتا تھا۔ مگر حافظوں اور ناظرہ خوانوں کو اس سے محروم رکھا جاتا تھا۔ حضرت تھانویؒ نے اس دستور میں بھی اصلاح کی غرض سے فرمایا کہ :-

"جب فارغین حدیث کو دستار دی جاتی ہے۔ تو فارغین قرآن کو کیوں نہ دی جائے"۔

بس پھر فارغین قرآن کو بھی دستار ملنے لگی ۔

اس طرح آپ نے پہلی مرتبہ مستحق طلباء کی حق رسی فرمائی اور قدیم دستور کو جس سے بعض طلبا کی حق تلفی ہوتی تھی۔ اس طرح بدلا کہ اس کی نوعیت میں کوئی فرق نہ آیا، مگر نتیجہ پہلے سے بہتر نکلا اور یہی ایک مجدد کا کام ہوتا ہے کہ وہ کام کی نوعیت کو بدلے بغیر درمیان سے مفسدہ کو نکال دیتا ہے ۔

معقولات کی اہمیت

طلباء کے مفاد کے لیے حضرت تھانویؒ اس بات کے زیادہ خواہاں تھے کہ وہ معقولات میں ضرور

مناسبت پیدا کرلیں۔ کیونکہ آپ کا خیال تھا کہ :۔

"اگر منطق کی ایک کتاب بھی مجھ سے پڑھ لی جائے، تو پھر کسی دوسری کتاب کی چنداں ضرورت باقی نہیں رہتی اور منطق سے پوری مناسبت پیدا ہو جاتی ہے۔"

اس لیے ترک تدریس کے بعد قیام تھانہ بھون میں بھی حضرت کا یہ معمول رہا کہ اپنے خاص تعلق والوں کو منطق کی کم از کم ابتدائی کتاب خود پڑھا دیتے تھے۔ جس سے ان کو منطق سے پوری مناسبت پیدا ہو جاتی تھی۔ پھر وہ دوسری کتابوں میں کہیں نہ رکتے تھے۔

کم فرصت طلبا کا نصاب

اسی طرح آپ نے کم فرصت طلباء کے لیے ایک خاص نصاب بعنوان "ضمان التکمیل فی زمان التعجیل" مرتب فرمایا تھا۔ جس کے لیے دس نئی کتابیں بھی تصنیف کرنی پڑیں۔ جن کے مجموعہ کا نام "تلخیصات عشر" ہے اور اس کے مفید ہونے کا تجربہ حضرت نے دوسرے طلباء کی بجائے خود اپنے اعزہ کو اس کے مطابق تعلیم دے کر کر لیا تھا کیونکہ یہاں بھی یہی احتیاط لاحق تھی کہ اگر یہ تجربہ ناکام ثابت ہو تو اپنوں کا وقت ضائع ہو۔ دوسروں کا ضائع نہ ہو۔ حالانکہ اس میں وقت کے ضائع ہونے کی کوئی بات ہی نہ تھی۔ آخر علم میں کچھ نہ کچھ تو اضافہ ہوتا۔

اعترافِ محبت

حضرت تھانویؒ صفر ۱۳۰۱ھ میں کانپور تشریف لائے اور آخر صفر ۱۳۱۵ھ تک یعنی پورے چودہ سال اہلِ کانپور کی خدمت دینی بذریعہ درس و تدریس مواعظ و تصانیف اور ارشاد و تلقین انجام دیتے رہے۔ جہاں حضرت کی محبت و عقیدت نہ صرف اپنوں بلکہ مخالفوں کے دِلوں میں راسخ ہو چکی تھی۔ وہاں اس محبت کے اثر سے آپ اپنے وطنِ عزیز تھانہ بھون کو بھی بھول

بیٹھے تھے۔ فرماتے کہ:۔

"کانپور والوں نے میرے ساتھ ایسی محبت اور تعظیم و تکریم کا برتاؤ کیا کہ میں اپنے وطن کو بھی بھول گیا اور جتنا وہاں جی لگتا تھا۔ اپنے وطن میں بھی نہ لگتا۔ اتنی محبت تھی کہ میں نے اپنے برتنوں پر بھی بجائے اپنے نام کے لفظ "کانپور" کھدوایا تھا۔ اب بھی جو ان برتنوں کو دیکھ لیتا ہوں تو کانپور یاد آجاتا ہے۔ اگر حضرت حاجی صاحب کا ایماء نہ ہوتا تو میں عمر بھر بھی کانپور کو نہ چھوڑتا۔ اور سچ تو یہ ہے کہ میری جو اتنی شہرت ہوئی تو وہ کانپور والوں ہی کی بدولت ہوئی۔ ورنہ میں واقعی اس درجہ کا شخص ہرگز نہ تھا اور نہ اب ہوں۔ مجھے اب بھی کانپور والوں سے بہت محبت ہے اور میں ان کا بہت ممنون ہوں۔ کچھ منجانب اللہ ان کے قلوب میں عام طور سے میرے ساتھ ایسی محبت ہوگئی تھی کہ اختلاف مشرب بھی اس سے مانع نہ رہا تھا"۔

شاگردانِ رشید

فیض یافتگان کی تعداد

حضرت تھانوی کے چودہ سالہ قیام کانپور کے زمانہ میں "جامع العلوم" کے چشمۂ علم سے کس قدر تشنگان علم نے اپنی پیاس بجھائی۔ اس کی صحیح تعداد تو معلوم نہیں ہو سکی۔ مگر ان کی تعداد کثیر ضرور تھی۔ صاحب اشرف السوانح نے حضرت تھانوی کی صدر مدرسی کے زمانہ کے کاغذات سے مرتب کردہ فہرست کی رو سے ایسے ۴۵ طلباء کے نام دے دیئے ہیں۔ جنھوں نے فارغ التحصیل ہونے کے بعد بھی سلسلۂ فیض علم جاری رکھا اور نورِ علم پھیلاتے رہے۔ ان میں سے جو آسمانِ علم پر روشن ستاروں کی طرح چمکے۔

ان کی تفصیل یہ ہے۔

روشن ستارے

۱۔ مولانا محمد اسحٰق بردوانی :۔ بڑے صاحب حافظ اور جید عالم تھے۔ چھ ماہ کے اندر پورا قرآن حفظ کرلیا تھا اور طالب علمی کے زمانہ ہی میں نحو کی مشہور کتاب کافیہ پوری حفظ کرلی تھی۔ حضرت تھانوی کے ترکِ تدریس کے بعد مولانا ہی حضرت کے جانشین اور مدرس اوّل مقرر ہوئے اور بالکل حضرت کی طرح حسنِ انتظام رکھا۔ ایک عرصہ کے بعد مدرسہ عالیہ کلکتہ (یونیورسٹی) میں مدرس دینیات ہوگئے اور وہاں سے مدرس عالیہ ڈھاکہ میں منتقل ہوکر قریباً پانچ سو روپیہ مشاہرہ پر پہنچ کر پنشن پائی۔ اس کے بعد آپ لوجہ اللہ علومِ دینیہ پڑھاتے رہے طریقِ باطن میں حضرت تھانویؒ نے انھیں اپنا خلیفہ مجاز بھی بنا دیا تھا۔

۲۔ مولانا محمد رشید کانپوری :۔ بڑے ذہین و ذکی۔ خوش فہم و خوش اخلاق اور متواضع عالم تھے۔ حضرت کے سامنے ہی مدرس ہوگئے تھے اور پھر مدرس دوم لگ گئے تھے۔ علمِ فقہ سے مناسبت کے سبب افتاء کا کام انھیں کے سپرد تھا جو بڑی خوبی سے انجام دیتے رہے بالآخر ترقی کرکے مدرسہ عالیہ کلکتہ جا پہنچے۔

۳۔ مولانا احمد علی فتحپوری : جامع علوم ظاہری و باطنی اور بڑی خوبیوں کے بزرگ تھے۔ فقہ سے بڑی مناسبت رکھتے تھے۔ حضرت کے پہلے خلیفہ مجاز تھے۔ بہشتی زیور کے پہلے پانچ حصے انھوں نے حضرت کے ارشاد پر مرتب کیے۔ جن سے اب تک ہزاروں مسلمان فیض یاب ہو رہے ہیں۔ یہ اپنے قصبہ فتحپور اور بارہ بنکی میں علمِ دین پڑھاتے تھے۔

۴۔ مولانا صادق الیقین کرسوی :۔ نہایت لطیف الطبع۔ ذہین و ذکی الحسن عالم باعمل اور متقی تھے مولانا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کے خلیفہ مجاز تھے۔ بدعات و رسومات سے اتنے نفور تھے کہ مولود شریف کے مسئلہ پر اپنے والد ماجد سے سخت اختلاف بلکہ

کشیدگی پیدا کرلی تھی۔ جسے بعد میں حضرت تھانویؒ نے حسنِ تدبیر سے اس طرح سلجھایا کہ ان کے والد ماجد کو وہ رسم ہی ترک کرنی پڑی جس پر ان کی آپس میں صُلح ہو گئی۔ قلتِ طعام و قلتِ منام کا بہت اہتمام تھا۔ جس کی وجہ سے ضعیف الجثہ ہو گئے تھے۔

۵۔ مولانا فضل حق بارہ بنکی : یہ حضرت کے تلامذہ میں سب سے پہلے فارغ التحصیل تھے۔ نہایت قابل عالم تھے۔ علم فلسفہ سے بڑی مناسبت رکھتے تھے۔ جس کی وجہ سے اُنھوں نے مشکل ترین مقام "مثناۃ بالتکریر" کی امتحان میں ایسی اچھی تقریر لکھی کہ وہ بطور یادگار مدرسہ میں محفوظ رکھی گئی۔ آپ کافی عرصہ قنوج میں شمع علم جلاتے رہے۔

۶۔ مولانا شاہ لطف الرسول بارہ بنکی :۔ نہایت ذہین و ذکی۔ فہیم و عاقل ذی استعداد عالم اور نہایت قوی الحال ذاکر و شاغل درویش تھے۔ حضرت حاجی امداد اللہ سے بذریعہ خط بیعت ہوئے مگر تعلیم حضرت تھانوی سے پا کر ان کے خلیفہ مجاز ہونے کا اعزاز حاصل کیا۔ خشیت کا بڑا غلبہ رہتا تھا۔ صاحب کشف بھی تھے۔ تیز طبع ہونے کے باوجود متواضع تھے۔ حضرت کے مشہور رسالہ "قصد السبیل الی مولی الجلیل" کی آپ نے ہی تسہیل کی تھی اور حضرت کے واقف کردہ قبرستان میں بھی سب سے پہلے اُنھوں نے ہی جگہ پائی تھی۔

۷۔ مولانا حکیم محمد مصطفٰے بجنوری :۔ ادبِ عربی اور معقولات کے بڑے ماہر تھے۔ حضرت کی تقریر کے نوٹ عربی میں بطور مختصر نویس لیا کرتے تھے۔ پھر اُردو میں پھیلا دیتے تھے اس طرح انھوں نے بے شمار وعظ قلمبند فرمائے۔ مناجاتِ مقبول کے عربی حصہ کا اُردو ترجمہ۔ حضرت کی مشہور تصنیف "الانتباہات المفیدہ عن الاشتباہات الجدیدہ" (جواب اسلام اور عقلیات کے نام سے شائع ہوئی) کی نفیس شرح۔ حضرت کے رسالہ "شوقِ وطن" کی تسہیل۔ بہشتی زیور کے حصہ نہم اور بہشتی گوہر میں مندرجہ مجربات۔ معلومات اشرفیہ۔ مجالس الحکمت۔ امثال عبرت وغیرہ تصنیفات سب ان

کی قلم کاری کا نتیجہ ہیں۔ تقویٰ کا اتنا اہتمام تھا کہ حج کے موقعہ پر نماز کے وقت اپنے ڈرائیور کو موٹر روکنے کے لیے کہا۔ مگر اس نے نہ روکی اس پر موٹر سے کودنے پر آمادہ ہوئے کہ معاً موٹر میں کوئی نقص پیدا ہو گیا۔ جس کی وجہ سے موٹر خود بخود رک گئی اور انھوں نے بروقت نماز باجماعت پڑھائی۔ صرف عالم، حافظ، متقی، مخیر، مصنف اور حضرت کے خلیفہ مجاز ہی نہ تھے۔ بلکہ بڑے پایہ کے حکیم بھی تھے کشش تحریر سے اخلاق و مزاج کی کیفیت معلوم کر لیتے تھے اور قارورہ دیکھتے ہی تبلا دیتے تھے کہ یہ فاسق کا ہے یا متقی کا۔

۸۔ **مولانا سید اسحٰق علی کانپوری :۔** بڑے سلیم الفطرت متواضع۔ صاحب نسبت بزرگ اور حضرت کے خلیفہ مجاز تھے اور نہایت قابل و ذی استعداد اساتذہ میں سے تھے کافی عرصہ آلہ آباد یونیورسٹی میں عربی کے پروفیسر رہے۔

۹۔ **مولانا مظہر الحق راموی (چاٹگام)** بڑے ادیب۔ نظم و نثر عربی فارسی میں قادر تھے اور بنگال کے مشاہیر علماء میں شمار ہوتے تھے۔

۱۰۔ **مولانا ظفر احمد عثمانی مدظلہٗ۔** حضرت کے خواہر زادہ اور بڑے صاحب فہم و فراست عالم ہیں۔ مشاہیر علماء میں ان کا شمار ہے۔ پہلے ڈھاکہ یونیورسٹی میں صدر شعبہ دینیات رہے۔ اب دار العلوم ٹنڈو الٰہ یار ضلع حیدر آباد سندھ میں شیخ الحدیث ہیں۔ "اعلاء السنن" کا دقیق علمی کام حضرت نے اعتماد کلی کی وجہ سے ان ہی کے ذریعہ مکمل کرایا اور اس کام سے بہت مسرور ہوئے۔ یہ گیارہ جلدیں ان کی فقہ و حدیث میں مہارت تامہ و نظر دقیق کی مظہر ہیں۔ جنگ پاکستان میں یہ قائد اعظمؒ کے خصوصی معاون رہے۔ سلہٹ کے ریفرنڈم میں ان کی سعی بار آور ہوئیں جن پر قائد اعظمؒ نے مسرت کا اظہار فرمایا۔

شاگردوں سے انس

اُستاد و شاگرد کا تعلق باپ بیٹے کا سا ہوتا ہے اور اس تعلق کی مضبوطی، ادب و اطاعت پر منحصر ہوتی ہے۔ جس سے اُستاد کی شفقت و محبت بڑھتی ہے۔ حضرت تھانوی کو اپنے مریدوں

سے اپنے شاگرد زیادہ عزیز تھے اور ان سے خود بھی بڑی ہی محبت و شفقت سے پیش آتے تھے اور ان کا دوسروں سے بھی اعزاز و احترام کراتے تھے۔ کسی کو ان کی طرف بری نظر سے نہ دیکھنے دیتے تھے۔ کبھی سے گھر کا کام نہ خود کراتے تھے نہ کسی دوسرے کو ان سے کام لینے دیتے تھے۔ نہ کسی کو کسی کے گھر سے جاکر کھانا لینے دیتے تھے اور نہ انھیں محتاجوں یا فقیروں کی طرح دعوتوں میں جانے دیتے تھے۔ غرضیکہ ہر طرح ان کا عز و وقار بڑھاتے رہتے تھے اور اکثر فرمایا کرتے تھے کہ:

"جتنا تعلق مجھ کو اپنے شاگردوں سے ہے اتنا معتقدین سے نہیں۔ کیونکہ معتقدین سے اتنی طبیعت نہیں کھلتی جلتی شاگردوں سے کھلی ہوئی اور بے تکلف ہوتی ہے۔"

اور یہ اسی حقیقت کا اثر تھا کہ طلباء کو بھی حضرت سے بدرجۂ عشق محبت تھی۔

صحبتِ بزرگاں

صحبت کا اثر

عقل پرستوں کے ماہرین تعلیم و نفسیات کو تو یہ راز اب معلوم ہوا کہ محض تحریر و تقریر سے ذہنیتیں نہیں بدل سکتیں۔ تاوقتیکہ اس غرض کے لیے خاص ماحول یا تربیت گاہیں پیدا نہ کی جائیں۔ جن میں کچھ عرصہ کے لیے طلباء الگ تھلگ رہ کر ایک مشترک زاویۂ نگاہ کے ماتحت زندگی بسر کرنا سیکھیں۔ یہی وجہ ہے کہ آج دنیا کے ہر نظامِ تعلیم میں ایک تربیتی نظام کی بھی گنجائش رکھی گئی ہے مگر شمعِ نبوت کے پروانے اس راز کو روزِ اول سے ہی پا گئے تھے۔ جس کی وجہ سے وہ زیادہ تر اپنا وقت مجلسِ نبوی میں گذار کر تعلیماتِ اسلام کی عملی تربیت حاصل کرتے رہتے تھے۔ بلکہ

اصحابِ صفہ تو اسی غرض کے لیے وہاں مستقل طور پر رہنے لگے تھے۔ تاکہ زیادہ سے زیادہ صحبتِ نبوی سے فیض یاب ہو سکیں اور تب سے ہی بزرگوں کی صحبت حاصل کرنے کی بنیاد پڑی۔ کیونکہ علم و معرفت کے جو اسرار و اسباق اس سے حاصل ہو سکتے ہیں وہ اوراق سے ممکن نہیں۔ اور جو منازل محض بزرگوں کی نظر و توجہ سے دنوں میں طے کی جا سکتی ہیں۔ وہ مجاہدات و ریاضات سے برسوں میں بھی طے ہونی محال ہیں۔

حضرت تھانویؒ بھی اپنی کامیابی کا راز اس صحبتِ بزرگاں کو ہی بتاتے تھے کہ:۔

"نہ کبھی طالب علمی میں مَیں نے محنت کی۔ نہ اس طریق میں کبھی مجاہدات و ریاضات کیے جو کچھ اللہ تعالیٰ نے عطا فرمایا۔ وُہ سب اپنے حضرات اساتذہ و مشائخ کی دعا و توجہ اور میری طرف سے غایت درجہ ادب و عقیدت کا ثمرہ ہے۔ مَیں نے کبھی کسی بزرگ کو ایک منٹ کے لیے بھی مکدر نہیں کیا۔"

صالحین سے محبّت

آپ کو بچپن سے ہی اہل اللہ سے بڑی محبت و عقیدت تھی۔ کتب بینی کا گو آپ کو زیادہ شوق نہ تھا مگر بزرگوں کے تذکرے بڑی دلچسپی سے پڑھتے تھے۔ "طبقات الکبریٰ" جو بزرگوں کے احوال و اقوال پر مشتمل ہے۔ اکثر زیرِ مطالعہ رہتی تھی۔ قلتِ فرصت کے باوجود عصر کے بعد قبل مغرب تک جبکہ حروف بھی بمشکل نظر آتے تھے۔ وقت نکال کر ایسی کتابیں پڑھا کرتے تھے اور ساتھ ساتھ ان سے انتخاب بھی کرتے جاتے تھے۔ جو بعد ازاں "نزہۃ البساتین" کے نام سے شائع ہوا ہے جو ایک ہزار حکایات پر مشتمل ہے۔

بزرگوں کے تذکرے

آپ مجلس میں اکثر و بیشتر بڑے جوش و خروش سے بزرگوں کے تذکرے سُنایا کرتے تھے۔ جو سُننے والوں کے دلوں میں مشائخ و صوفیا اور علماء و فقہا کی محبت پیدا کر دیتے تھے۔ آپ فرمایا کرتے تھے کہ:۔

"یہ حضرات اہل سکر تھے۔ ان کے تذکروں میں بھی یہ اثر ہے کہ سکر کی سی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ ان بزرگوں کے ناموں سے بھی روح میں تازگی اور قلب میں ایک نور پیدا ہو جاتا ہے۔ یہ حضرات عشاق تھے۔ ممکن نہیں کہ ان کے حالات پڑھے جائیں اور قلب میں محبت الٰہی پیدا نہ ہو۔"

بزرگوں کی غائبانہ توجہ

اولیاء اللہ سے والہانہ محبت و عقیدت کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ بھی غائبانہ طور پر آپ سے محبت و شفقت کرنے لگے۔ جس کی تائید ان واقعات سے ہوتی ہے۔

۱۔ حضرت مولانا خلیل احمد رحمۃ اللہ علیہ جو بہت بزرگ تھے۔ فرماتے تھے کہ مجھ کو اشرف سے اس وقت سے محبت ہے۔ جس وقت اس کو خبر بھی نہ تھی۔

۲۔ شیخ العرب والعجم حضرت حاجی امداد اللہ قدس سرہٗ مہاجر مکیؒ نے جو حضرت تھانوی کی ولادت سے بہت عرصہ پہلے ہندوستان سے ہجرت کرکے مکہ معظمہ میں سکونت پذیر ہو گئے تھے۔ آپ کو طالب علمی کے زمانہ میں ہی مکہ معظمہ بلوا بھیجا تھا۔

۳۔ مکہ معظمہ میں اس زمانہ میں حضرت خلیل پاشا نامی ایک بزرگ رہا کرتے تھے۔ حج کو جانے والے اکثر علماء ان کی خدمت میں حاضر ہوا کرتے تھے۔ مگر حضرت تھانویؒ نے اپنے حج کے زمانہ میں اپنے شیخ حضرت حاجی امداد اللہ کی موجودگی میں کسی دوسرے شیخ کی خدمت میں جانا خلافِ مصلحت سمجھا۔ جس کی وجہ سے وہ حضرت خلیل پاشا کی خدمت میں نہ گئے۔ رات کو آپ نے خواب میں دیکھا کہ کوئی صاحب فرما رہے ہیں کہ تم خلیل پاشا سے نہیں ملے؟ آپ نے عالمِ خواب میں ہی جواب دیا کہ :-

"اس کی ضرورت نہیں کیونکہ اس کی مثال ایسی ہے۔ جیسے لوگ حج

کو آتے ہیں تو مقصود خانہ کعبہ ہوتا ہے جس کے مختلف طرق ہیں۔ کوئی بمبئی کے راستے سے آتا ہے۔ کوئی کراچی ہو کر۔ اسی طرح اس طریق میں مقصود حق تعالیٰ ہیں اور شیوخ طرق ہیں جب ہم نے حاجی صاحب کو اپنا شیخ طریقت تجویز کر لیا تو پھر دُوسرے شیخ کے پاس جانے کی ضرورت نہیں مقصود کے حصول کے لیے وہی کافی ہیں۔"

بقول حضرت تھانویؒ اس جواب کو سن کر وہ صاحب خاموش ہو گئے اور صبح آپ نے اس خواب کا تذکرہ حضرت حاجی صاحب سے کیا تو انھوں نے فرمایا کہ کیسا مضائقہ ہے۔ بزرگ آدمی ہیں زیارت کر آؤ۔ تب جا کر آپ نے ان کی زیارت کی۔

۴۔ صرف دُنیا والوں کی ہی توجہ آپ کی طرف نہ تھی۔ بلکہ عالمِ برزخ والے بھی آپ کی طرف متوجہ تھے۔ چنانچہ آپ نے اپنی شادی کے موقعہ پر جب پہلا وعظ فرمایا۔ تو ایک رات کو حضرت مولانا شیخ محمد محدث تھانوی رحمۃ اللہ علیہ خواب میں حضرت کو شادی کی مبارک باد دینے تشریف لائے اور مبارک بادی کے بعد فرمایا کہ:-

"مجھ کو تو جو توجہ تمہارے ساتھ حالتِ حیات میں تھی۔ وہ اب بھی ہے۔"

یہ حقائق اس بات کے شاہد ہیں کہ اس زمانہ کے اولیاء اللہ پر آپ کا مقام۔ کام۔ ذاتی جوہر اور فطری استعداد منکشف ہو چکی تھی۔ جس کی وجہ سے سب آپ کے گرویدہ ہو رہے تھے۔

ہم مسلک بزرگوں کا سلوک

حضرتِ تھانوی گو حضرت حاجی صاحب کے مرید ہونے کی حیثیت سے یک درگیر محکم گیرؒ کے اصول پر عمل پیرا تھے مگر اس تعلق کو بزرگانِ عصر کی صحبت وزیارت کے سلسلہ میں مانع بھی نہ سمجھتے تھے اور نہ ہی آپ کے شیخ حضرت حاجی صاحبؒ نے کبھی اسے بُرا

منایا۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ آپ ہم مسلک اور مختلف المشرب دونوں طرح کے بزرگوں کی نظرِ توجہ کے مرکز بن گئے۔ ہم مسلک وہم سلسلہ بزرگان میں سے حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی حضرت مولانا محمد یعقوب نانوتوی اور حضرت مولانا محمود الحسن دیوبندی رحمہم اللہ تعالیٰ کا ذکر پیچھے گزر چکا ہے۔ ان کے علاوہ آپ جن حضرات سے روحانی تربیت حاصل کرتے رہے وہ یہ تھے۔

ا۔ حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ

یہ حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی قدس سرہٗ کے خلیفۂ اعظم تھے۔ اپنے وقت کے قطب الارشاد، محقق عالم اور کامل درویش تھے۔ طالب علمی کے زمانہ میں ہی آپ ان کی توجہِ خاص سے اتنے متاثر ہوئے کہ مولانا سے درخواست بیعت کر دی مگر وہ دیکھ رہے تھے کہ یہ میرے مرید نہیں بلکہ پیر بھائی بنیں گے۔ اس لیے انھوں نے یہ درخواست منظور نہ کی مگر بایں ہمہ وہ آپ کا بہت ہی لحاظ فرماتے تھے اور ہر طرح بڑے ہوتے ہوئے آپ سے ایسا سلوک فرماتے تھے۔ جیسے بڑے بڑوں سے کیا کرتے ہیں۔

قیام تھانہ بھون کے ابتدائی زمانہ میں ایک مرتبہ آپ حضرت مولانا گنگوہیؒ کو ملنے کے لیے تشریف لے گئے۔ اس وقت مولانا چارپائی پر تشریف فرما تھے اور باقی تمام حاضرین مجلس بوجہ ادب نیچے فرش پر بیٹھے ہوتے تھے۔ آپ بھی دوسرے حاضرین مجلس کے ساتھ فرش پر بیٹھ گئے۔ بس آپ کا نیچے بیٹھنا تھا کہ مولانا بھی چارپائی سے اتر کر نیچے فرش پر آ گئے۔ جہاں سب بیٹھے تھے۔ اس سے آپ کو سخت خجالت ہوئی۔ اور عرض کیا کہ :-

"حضرت اب تو اکثر حاضری کا اتفاق ہوا کرے گا اور میں تو خادمانہ طور پر حاضر ہوتا ہوں۔ خادموں ہی کا سا برتاؤ فرمایا کریں۔"

مولانا نے یہ فرما کر آپ کی خجالت دور کی کہ نہیں ! میں دیر سے لیٹا ہوا تھا۔ اس لیے نیچے آبیٹھا ہوں اس کے بعد آپ جب کبھی حاضر خدمت ہوتے۔ مولانا نشست تو نہ بدلتے مگر اکرام و احترام بڑا کرتے جس پر مولانا کے ایک خادم نے عرض کیا۔

"حضرت وہ تو اپنے کو حضرت کا ادنیٰ خادم سمجھتے ہیں اور پیر کا سا ادب کرتے ہیں۔ آپ کیوں اتنا لحاظ فرماتے ہیں"۔

"مولانا نے فرمایا کہ "تم تو اندھے ہو۔ میں تو اندھا نہیں"۔

حضرت تھانویؒ کو بھی حضرت مولانا گنگوہی سے اپنے شیخ جتنی محبت و عقیدت تھی۔ چنانچہ آپ فرماتے تھے کہ :-

"میں نے ایسا جامع ظاہر و باطن بزرگ کوئی نہیں دیکھا۔ اس لیے اور لوگوں کے ساتھ تو میری عقیدت استدلالی ہے اور مولانا کے ساتھ غیر استدلالی۔ دلائل سوچنے سے بھی ذہن دیا کرتا ہے کہ مولانا تو بزرگ ہیں ہی۔ دلائل قائم کرنے کی کیا حاجت ہے۔

ع آفتاب آمد دلیلِ آفتاب

بلکہ دلائل کا سوچنا بھی خلاف ادب سا معلوم ہوتا ہے۔ میں نے حضرت مولانا سے یہ بھی اجازت لے رکھی تھی کہ اگر کوئی اشکال ظاہری یا باطنی پیش آئے تو پوچھ لیا کروں۔ لیکن عمر بھر میں صرف تین چار ہی بار استفسار کی نوبت آئی۔ پھر مولانا کے جوابات کی ایسی برکت ہوئی کہ انھیں سے سارے اشکالات حل ہوتے رہے۔ مزید استفسارات کی ضرورت ہی واقع نہ ہوئی"۔

۲۔ حضرت مولانا خلیل احمد سہارنپوری رحمۃ اللہ علیہ

یہ حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کے خلیفۂ اعظم اور بڑے صاحبِ ارشاد بزرگ

تھے۔ جیسا کہ پہلے ذکر گزر چکا ہے۔ حضرت تھانویؒ سے انھیں غائبانہ محبت تھی۔ آپ کی طرف ان کی غیر معمولی توجہ دیکھ کر بعض حاسدوں نے جنھیں آپ ہمیشہ "عنایت فرماؤں" کے لقب سے یاد کیا کرتے تھے۔ آپ سے بعض غلط حکایات منسوب کر دیں تاکہ آپ کی عزّت و وقعت بزرگوں کی نظر میں نہ رہے۔ چنانچہ آپ نے اسی وقت ایک رقعہ لکھ کر مولانا کی خدمت میں حقیقتِ حال کی آگاہی کے لیے بھیجا۔ جس کا انھوں نے یہ جواب بھیجا کہ :۔

"معلوم نہیں۔ لوگوں کو کیا مزہ آتا ہے کہ غلط روائتیں پہنچا کر اہلِ خیر کے قلوب کو دکھاتے ہیں۔ مجھ ناچیز کو جو محبت اور تعلق پہلے تھا۔ وہی عقیدت بحمد اللہ موجود ہے ؎

آں نیست کہ حافظ را مہرت رود از خاطر آں وعدہ پیشینش تا روزِ پسیں باشد

جو قلبی محبت اور جس کو ذخیرہ آخرت سمجھ رکھا ہو۔ وہ انشاء اللہ تعالیٰ نہیں بدل سکتی جو روائتیں پہنچی ہیں۔ ان میں مبالغہ سے بہت کام لیا گیا ہے"۔

ایک مرتبہ آپ مولانا کے ساتھ بہاولپور کے سفر سے واپس آ رہے تھے۔ اتفاق سے یہ دونوں حضرات ایک ہی ڈبہ میں تھے۔ جس میں ان کے سوا اور کوئی نہ تھا۔ رفقاء سفر دوسرے ڈبہ میں تھے۔ ظہر کا وقت اور گرمی کا موسم تھا۔ آپ کو سخت پسینہ آرہا تھا جسے دیکھ کر مولانا نے نہایت بے تکلفی اور غایت تواضع سے آپ کو پنکھا کرنا شروع کر دیا۔ آپ بوجہ غایت ادب یہ برداشت نہ کر سکے۔ اس لیے پریشان ہو کر فوراً پنکھا پکڑ لیا مولانا نے فرمایا "کیا حرج ہے۔ کوئی دیکھتا تھوڑا ہی ہے۔ کیونکہ تیسرا آدمی تو کوئی موجود نہیں"۔

آپ نے جواب دیا کہ "جس کے لیے میں آپ کا ادب کرتا ہوں۔ وہ تو دیکھ رہا ہے"۔ اس پر مولانا ہنس پڑے۔

آپ نے حضرت مولانا سے اپنے تعلقات کی نسبت ایک رسالہ "خوانِ خلیل" کے نام سے بھی شائع فرمایا تھا۔ جس میں آپ لکھتے ہیں :۔

"عجیب بات یہ ہے کہ باوجودیکہ میں ہر طرح چھوٹا تھا۔ عمر میں بھی۔ طبقہ میں بھی اور علم و عمل میں تو مجھ کو کوئی نسبت ہی نہ تھی اس میں تو چھوٹے بڑے ہونے کی نسبت کا ذکر بھی ایک درجہ میں ادعا ہے۔ علم و عمل کا۔ مگر مولانا کا برتاؤ مساویانہ تو یقینی تھا ہی۔ بعض اوقات ایسا برتاؤ فرماتے تھے۔ جیسے چھوٹے بڑوں کے ساتھ کرتے ہیں۔

احقر کو بعض امور اجتہادیہ ذوقیہ متعلقہ معاشرت و انتظام میں رائے کا اختلاف تھا۔ اور اس اختلاف کے ہوتے ہوئے میرا یہ خیال تھا کہ مولانا سے صرف اعتقاد عقلی ہو سکتا ہے۔ انجذاب طبعی نہ ہوگا۔ مگر کیفیت یہ تھی کہ حاضری تو حاضری تصوّر کرنے سے اس قدر انجذاب ہوتا تھا کہ میری سمجھ میں نہ آتا تھا اور غالباً اسی کا اثر ہوگا کہ خواب میں بھی اگر کبھی زیارت ہوتی تو اسی شان سے ہوتی یہ کھلی دلیل ہے محبت کی کہ محب کا گمان بھی نہیں بلکہ احتمال عام کا ہے مگر طبیعت ہے کہ کھچی چلی جاتی ہے"۔

۳۔ حضرت حاجی سیّد محمّد عابد دیوبندیؒ

یہ حضرت حاجی امداد اللہ قدس سرہٗ کے مجازین خاص میں سے تھے۔ عملیات میں خصوصیت کے ساتھ شہرہ آفاق تھے۔ کچھ دن دارالعلوم دیوبند کے مہتمم بھی رہے تھے۔ اس قدر پابند اوقات و معمولات تھے کہ ایک مرتبہ حضرت مولانا محمد یعقوب فرمانے لگے کہ :۔

"جاننے والا ہر وقت یہ بتا سکتا ہے کہ اس وقت حاجی صاحب فلاں کام

میں مشغول ہوں گے اور اگر کوئی اس وقت جا کر دیکھے۔ تو ان کو اس کام میں مشغول پائے۔ کبھی اس کے خلاف نہیں ہو سکتا۔"

طالب علمی کے زمانہ میں حضرت تھانوی اکثر چھتہ والی مسجد میں نماز پڑھا کرتے تھے۔ جہاں حاجی صاحب کا زیادہ تر قیام رہتا تھا۔ حاجی صاحب خوش اعتقادی اور حسن ظن کی بنا پر اکثر اوقات آپ کو ہی اپنا امام بنایا کرتے تھے۔ خصوصی توجہ کا اندازہ صرف اس واقعہ سے ہو سکتا ہے کہ حاجی صاحب رمضان شریف میں افطاری کا بڑے پیمانہ پر اہتمام فرمایا کرتے تھے اور سب کو چیزیں تقسیم کرتے تھے۔ ان کے قیام مکہ معظمہ کے دَوران میں حضرت تھانویؒ بھی وہاں مقیم تھے چنانچہ افطار کے وقت حرم میں آپ جہاں بھی ہوتے وہیں آپ کا حصہ بھیجتے۔ آپ بھی ان کا بڑا ادب کرتے تھے۔ چنانچہ جن دنوں حاجی صاحب کی ارباب مدرسہ دیوبند سے کشیدگی تھی۔ تو آپ کو وہاں جانے کا اتفاق ہوا۔ آپ کے چونکہ اساتذہ اور مہتمم سب کے ساتھ خصوصی تعلقات تھے۔ اس لیے آپ حاجی صاحب کو ملنے کے لیے بڑے بے قرار تھے مگر اساتذہ کا ادب واحترام مانع تھا۔ اس لیے آپ نے ہمت کر کے اس کشیدگی کے اثرات کا حضرت مولانا محمود الحسن رحمتہ اللہ علیہ سے ذکر فرمایا کہ اگر انھیں ملنے نہ جاؤں تو سخت بے مروتی و بے وفائی ہوگی اور اگر ملنے جاؤں تو ممکن ہے مدرسہ کے مصالح کے خلاف ہو۔ مولانا نے فرمایا۔ "نہیں نہیں۔ ضرور جاؤ۔ مصالح کے خلاف نہیں۔ بلکہ اس میں مدرسہ کی یہ مصلحت ہے کہ ان کی مخالفت کم ہوگی۔" بہ الفاظ دیگر مولانا نے یہ فرما کر آپ کی مصلحت اندیشی اور دور بینی کی نہ صرف داد دی، بلکہ آپ کے صلح کل ہونے کا بھی اعتراف فرمایا۔

۴۔ حضرت مولانا سید احمد حسن امروہویؒ

یہ حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کے بہت محبوب اور ارشد تلامذہ میں سے تھے

اور حضرت حاجی امداد اللہؒ کے طریق باطن میں مجاز تھے۔ مشاہیر علمأ ہند میں ان کا شمار تھا۔ ان کی فصاحت و بلاغت، تحریر و تقریر اور مہارتِ مناظرہ شہرہ آفاق تھی۔ حضرت تھانویؒ ان کے ساتھ اکثر جلسوں میں بھی شریک رہے۔ گو آپ عمر میں ان سے چھوٹے تھے۔ مگر وہ آپ کا بہت ادب و لحاظ کرتے تھے۔ یہاں تک کہ ایک دن جب آپ کو ان کے ہاں امروہہ میں ٹھہرنے کا اتفاق ہوا تو آپ بیت الخلا پوچھنا بھول گئے۔ پچھلی رات کو جو قضاء حاجت کی ضرورت پیش آئی تو از حد پریشان ہوئے کہ اب کس سے پوچھا جائے۔ وہ اپنے نورِ فراست سے حضرت کو پریشان دیکھ کر فوراً گھر سے باہر آئے اور پردہ کرا کر زنان خانے میں لے گئے اور اپنے دستِ مبارک سے استنجے کے ڈھیلے اور پانی کا لوٹا بیت الخلا میں رکھ دیا۔ جس سے آپ کو از حد گرانی ہوئی اور فرمایا کہ یہ ڈھیلے تو تبرک ہو گئے۔ اب استنجا کس سے کیا جاوے۔ مولانا نے بغایت تواضع فرمایا کہ "کیا ہوا جو میں نے ہی رکھ دیئے"۔
اس واقعہ کو نقل فرماتے ہوئے ایک مرتبہ آپ نے فرمایا :۔

"ہماری جماعت میں مولانا بہت ہی نفیس لباس پہنتے تھے جو بظاہر تکلف کی حد تک پہنچا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ اور مجھے بھی ایسا ہی گمان تھا۔ مگر اس دن کے واقعہ سے میں مولانا کی تواضع بے تکلفی اور سادگی کا بے حد معتقد ہو گیا۔ اور سمجھ گیا کہ مولانا کی خوش لباسی کا منشاء نفاست و لطافتِ مزاج تھا۔ نہ کہ تکلف"۔

۵ حضرت مولانا احمد حسن کانپوریؒ

یہ بھی حضرت تھانویؒ کے پیر بھائی یعنی حضرت حاجی امداد اللہ رحمۃ اللہ علیہ کے خلفاء مجازین میں سے تھے۔ مگر مسائل اجتہادیہ میں آپ سے عملی اختلاف رکھتے تھے۔ ان کے علم و فضل کا کانپور میں بڑا شہرہ تھا اور بڑی عزت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔

حضرت تھانویؒ اُس وقت بالکل نوعمر تھے اور آپ کا ابتدائی زمانہ تھا کہ ایک دعوت میں مولانا نے محض اپنے خصوصی تعلق اور اعترافِ عظمت کے طور پر آپ کے سامنے کا بچا ہوا کھانا بطور تبرک سب کے سامنے نوش فرما کر لوگوں کو ورطۂ حیرت میں ڈال دیا۔

۶۔ مولانا شاہ محمد حسین الہ آبادیؒ

یہ بھی حضرت شیخ العرب والعجم حاجی امداد اللہؒ کے خلیفہ مجاز اور بڑے صاحبِ نظر بزرگ تھے۔ حضرت تھانویؒ کا خصوصی ادب و لحاظ کرتے تھے۔ گو مسئلہ اجتہادیہ سماع میں ان کا مذاق حضرت کے خلاف تھا مگر اس اختلاف کا ان کی باہمی محبت و الفت پر کوئی اثر نہ تھا۔ چنانچہ ایک دفعہ ایک شخص نے مولانا کے ساتھ حضرت تھانوی کی بھی دعوت کی۔ مولانا کا معمول تھا کہ وہ کھانا کھانے کے بعد مجلس سماع منعقد کرتے تھے۔ جسے وہ اپنی اصلاح کے لیے روحانی غذا سے تعبیر کرتے تھے۔ اس لیے حضرت تھانویؒ نے اس دعوت میں جانے سے عذر فرما دیا۔ داعی کی اس شرط پر کہ حضرت کی موجودگی میں مجلس سماع منعقد نہ ہوگی۔ حضرت نے شمولیت فرمائی اور مولانا کی رعایت و ادب کے پیشِ نظر کھانے کے بعد جلد ہی رخصت ہونے لگے تو مولانا بھی ساتھ ہی اُٹھ بیٹھے۔ حضرت کا خیال تھا کہ یہ شاید مشایعت کے لیے اُٹھے ہیں۔ مگر وہ بھی حضرت کے ساتھ ہی واپس گھر کو تشریف لے گئے اور اس بات کو نہ صرف خلاف مروت بلکہ خلافِ ادب سمجھا کہ جس مجلس میں حضرت شریک نہ ہوں۔ وہ اس میں شریک ہوں۔ اور اس طرح حضرت کی خاطر انھوں نے اپنا معمول بدل کر خود کو اس روز روحانی غذا سے محروم کر لیا۔ سوائے حضرت تھانویؒ کے انھوں نے اور کبھی کسی کے ساتھ ایسی رعایت نہ برتی تھی۔

۷۔ حضرت مولانا شاہ عبدالرحیم رائپوریؒ

یہ حضرت مولانا گنگوہیؒ کے خلفائے عظام میں سے تھے اور بڑے صاحبِ فیض بزرگ تھے۔ ان کی سادگی دینداری اور انکساری کا رنگ خدام میں بھی نمایاں تھا۔ امرحق کہنے میں کبھی کسی کا لحاظ نہ کرتے تھے۔ جو کہنا ہوتا۔ آنکھیں نیچی کر کے صاف صاف فرما دیتے تھے اور اسی وجہ سے حضرت تھانوی کو بھی ان سے خاص محبت تھی اور فرمایا کرتے تھے کہ "شاہ صاحب کے ساتھ بھی میرا اعتقاد وجدانی اور غیر استدلالی تھا۔" اور ان کی عنایات و توجہ اور تعظیم و تکریم کا یہ عالم تھا کہ جن دنوں وہ علیل تھے۔ حضرت عیادت کو رائپور تشریف لے گئے۔ اس وقت آرام تو آچکا تھا۔ مگر کمزوری باقی تھی۔ اور اپنے کمرہ کی چھت پر خلوت خانہ میں رہا کرتے تھے۔ حضرت کا قیام نیچے باغ کے صحن میں تھا۔ اور انھیں حضرت کے آرام کا اس قدر خیال تھا کہ نیچے تشریف لا کر بار بار پوچھتے تھے کہ کسی چیز کی ضرورت تو نہیں یہاں تک کہ حضرت تھانویؒ فرماتے ہیں:-

"نگرانی کا یہ حال تھا کہ رات کو جس وقت بھی میری آنکھ کھلتی تو دیکھتا کہ شاہ صاحب موجود ہیں۔ قریب قریب رات بھر یہی مشغلہ رہا۔"

حضرت شاہ صاحب مولانا کے وعظوں میں نہایت شوق و رغبت سے شرکت فرمایا کرتے تھے۔

۸۔ حضرت حاجی محمد انور دیوبندیؒ

یہ حضرت سید محمد عابد دیوبندیؒ کے خلیفہ اور بڑے صاحبِ نسبت بزرگ تھے اور بعض کے خیال کے مطابق یہ اپنے شیخ سے بڑھے ہوئے تھے۔ حج سے واپس آنے کے بعد ان پر شکر کی سی کیفیت غالب رہتی تھی۔ اپنی چیزیں لوگوں کو مفت دے دیتے تھے۔

کھانے پکوا کر لوگوں میں تقسیم کرتے رہتے تھے اور لوگ انھیں جنون میں مبتلا سمجھتے تھے۔ اسی عرصہ میں حضرت تھانویؒ کا دیوبند جانا ہوا اور آپ انھیں ملنے تشریف لے گئے۔ اہل اللہ کی نظر کے سامنے یہ سنگ و خشت اور گوشت و پوست کی دیواریں کبھی حائل نہیں ہوا کرتیں۔ انھوں نے فوراً تاڑ لیا کہ حضرت تو خود صاحب اسرار ہیں۔ اس لیے فرمایا کہ میں آپ سے ایک راز کی بات کہتا ہوں۔ جو میں نے آج تک کسی پر ظاہر نہیں کی اور نہ آپ میری زندگی میں کسی پر یہ راز فاش کریں۔ چنانچہ حضرت نے ان کی وفات کے بعد وہ بات بتلا دی۔ وہ فرماتے تھے کہ:۔

"میں نے حرم شریف میں بعض حضرات انبیاء علیہم السلام کی بیداری میں زیارت کی ہے جو میری حالت ہے۔ یہ انھیں حضرات کی نظر کا اثر ہے۔"

مختلف المشرب بزرگوں کی عنایتیں

ہم مشرب بزرگوں کے علاوہ حضرت تھانویؒ نے مختلف المشرب بزرگوں کی زیارت و صحبت حاصل کرنے میں کبھی بخل نہیں کیا تھا بلکہ آپ کو جہاں جہاں بھی کسی صاحبِ دل اور صاحبِ نظر بزرگ کا پتہ لگا۔ آپ فیض حاصل کرنے کے لیے بیتابانہ ان کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اسی غرض کے لیے آپ نے بارہا صعوبتِ سفر بھی برداشت کی۔ جو آپ کے اخلاص اور بے تعصبی پر دال ہے۔ ذیل میں چند ایسے بزرگوں کی ملاقاتوں کی تفصیل درج کی جاتی ہے۔

۱۔ قطب العالم حضرت مولانا شاہ فضل الرحمٰن مرادآبادی قدس سرہٗ العزیز

بڑے صاحبِ کشف و استغراق مستغنی المزاج اور آزاد خیال بزرگ تھے۔ نہ کوئی بات

یاد رکھتے تھے۔ نہ کسی کو منہ لگاتے تھے۔ ان کی وضع قطع اور بود و باش بالکل سادہ اور آزاد تھی۔ گو طبیعت میں تصنع و بناوٹ قطعاً نہ تھی مگر غایت سادگی اور بے ساختگی کی وجہ سے لہجہ ذرا سخت اور تیز تھا۔ کسی سے خصوصیت کا برتاؤ کرنے کے عادی نہ تھے اور نہ کسی کی تعریف میں مبالغہ کرتے تھے۔ مگر پاس ادب اتنا تھا کہ بزرگوں کے تذکرہ کے وقت جوش میں کھڑے ہو جاتے تھے۔

حضرت تھانویؒ ابھی جوان ہی تھے کہ دارالعلوم دیوبند سے فارغ التحصیل ہو کر مدرسہ فیض عام کانپور میں مدرس مقرر ہو کر آئے۔ مگر جب دو ماہ بعد ہی ملازمت چھوڑ کر تھانہ بھون واپس جانے لگے تو آپ کو گنج مراد آباد میں مولانا کی زیارت کرنے کا خیال آیا کہ شاید پھر اس طرف آنے کا اتفاق نہ ہو۔ یہ خیال آتے ہی آپ ایک طالب علم کو ساتھ لے کر چل پڑے اور راستہ کی ناواقفیت کے باوجود بھولتے بھٹکتے رات کو ایسے وقت وہاں جا پہنچے۔ جبکہ عشاء کی نماز ہو چکی تھی۔ اور مولانا حجرہ میں تشریف لے جا چکے تھے۔ آپ نے خادم کے ذریعے اطلاع کرائی۔ انھوں نے اندر بلایا اور ایک دم تیزی سے پوچھا کہ کون ہو؟ کہاں سے آئے ہو۔ آپ نے بہ ادب بہ اختصار جواب دیا۔ ایک طالب ہوں کانپور سے آیا ہوں۔ زیارت کو حاضر ہوا ہوں۔ وجہ تاخیر معلوم نہ ہونے کی وجہ سے انھوں نے پھر اس تلخ لہجہ میں فرمایا۔ بھلا یہ زیارت کا وقت ہے۔ آدمی اگر سویرے آئے تو دوسرا روٹی کا سامان بھی کرے۔ مگر اس مجسمۂ ادب و تہذیب نے تہدید پر بھی وجہ تاخیر پیش کرنا سوء ادب سمجھا اور بہ تقصیر بن کر کھڑے رہے۔ انھوں نے پوچھا کہ تمھارے پاس کچھ پیسے ہیں فرمایا جی ہاں۔ حکم ہوا کہ جاؤ بازار سے کچھ کھا لو اور صبح کو چلے جانا اور خادم سے کہا کہ اسے فلاں مکان میں ٹھہرا دو۔ حضرت تھانویؒ نے اس شدت کو شفقت و تربیت پر محمول کیا اور باہر آ کر بازار چلنے کی فکر کرنے لگے۔ بس ان کا باہر آنا تھا کہ شاید انھیں حضرت کے مقام کے متعلق کشف ہوا۔ فوراً واپس بلایا اور بیٹھنے کا امر فرمایا۔ آپ از راہ ادب تخت پر بیٹھنے کی بجائے

چٹائی پر بیٹھ گئے تو مولانا نے انھیں تخت پر بٹھایا۔ گھر سے کھانا منگوایا۔ وہ سامنے رکھا۔ خود اُٹھے اور بیر لاکر پیش کیے۔ آپ کے اُستاد مولانا محمد یعقوبؒ کی بہت تعریف کی۔ بہت دیر باتیں کرتے رہے اور جب آپ کھانے سے فارغ ہو کر جانے لگے تو مولانا خلافِ معمول آپ کو جائے قیام تک پہنچانے آئے اور صُبح جاتے وقت اپنے سامنے ٹٹو پر سامان لاد کر اور دُعا دیکر رخصت کیا۔

اگرچہ ان کے استغراق کا یہ عالم تھا کہ ایک آدمی ملنے کے بعد جب تھوڑی دیر بعد دوبارہ سامنے آتا۔ تو انھیں ہرگز یاد نہ رہتا کہ یہ ابھی ہو کر گیا ہے۔ مگر تھانہ بھون کے اس طالب علم کی یاد ان کے دل میں کچھ ایسی گھر کر گئی کہ کبھی کبھی آنے جانے والوں کے ذریعے آپ کو سلام کہلا بھیجتے تھے۔

چند سال بعد آپ کو دوبارہ ایام تعطیل میں ان کی خدمت میں حاضری کا موقعہ ہاتھ آیا۔ آپ ہدیتہً اپنے ساتھ کانپور کے خوبصورت۔ خوش ذائقہ اور خوشبودار پیڑے بھی لے گئے اگرچہ یہ ان کی مرغوبات میں سے نہ تھے۔ مگر چونکہ آپ کی شان عالی اور مآلی ان پر منکشف ہو چکی تھی اس لیے انھوں نے پیڑوں کو خلافِ توقع بہت مسرت سے قبول کیا اور فرمایا کہ یہ تو ہمارے کام کی چیز ہے۔ ہم تو ان کا شربت پیا کریں گے۔ اس روز آپ روزے سے تھے۔ اسی وقت آپ کے ایک اور ہم سفر روزہ دار بھی پہنچے جو بوڑھے تھے مولانا نے اس سے پُوچھا کہ کیا روزے سے ہو۔ اس نے کہا ہاں۔ اس پر بہت خفا ہُوئے کہ سفر میں اور ایسے سخت موسم میں روزہ رکھا۔ بس ابھی چلے جاؤ۔ ادھر آپ کو بھی اندیشہ خفگی لاحق ہو گیا کہ اتنے میں وہ آپ سے مخاطب ہُوئے اور پُوچھا کیا روزہ ہے؟ آپ نے خفگی کی پروا نہ کرتے ہُوئے سچ کہہ دیا کہ جی ہاں۔ تو بہت خوش ہُوئے اور فرمایا ہاں بہت اچھا کیا۔ جوان آدمی ہو تمھیں روزہ رکھنا مناسب تھا۔ اب تو بڑی ہی شفقت و محبت سے پیش آتے رہے اور بڑی رازدارانہ گفتگو فرماتے رہے۔ مثلاً فرمایا کہ :-

"کہنے کی تو بات نہیں۔ لیکن تم سے کہتا ہوں کہ جب سجدہ میں جاتا ہوں۔ تو ایسا معلوم ہوتا ہے۔ جیسے اللہ تعالیٰ نے پیار کر لیا۔ بھائی جنت کا مزہ برحق۔ حوض کوثر کا مزہ برحق مگر نماز میں جو مزہ ہے وہ کسی چیز میں بھی نہیں۔ بھائی ہم تو قبر میں بس نماز پڑھا کریں گے۔ دُعا ہے کہ ہمیں تو اللہ میاں قبر میں یہ اجازت دے دیں کہ بس نماز پڑھے جاؤ۔"

جب ایک دو دن بعد حضرت نے واپسی کی اجازت چاہی تو فرمایا کہ ابھی جلدی کیا ہے۔ مدرسہ کی تو تعطیل ہے اور ٹھہرو۔ وہاں چونکہ کسی کو ٹھہرنے کی اجازت ہی نہ ہوتی تھی۔ اس لیے حضرت نے اس رعایت کو غنیمت جانا اور چند دن ٹھہر گئے۔ اس عرصہ میں مولانا آپ کو صرف پرتکلف دعوتیں ہی نہ کھلاتے رہے۔ بلکہ علم و معرفت سے بھی نوازتے رہے۔

۲۔ حضرت صوفی شاہ سلیمان لاجپوریؒ

یہ بہت بڑے ذی وجاہت بزرگ تھے۔ حسنِ اتفاق سے ایک مرتبہ صوفی صاحب سورت سے راندیر تشریف لا رہے تھے اور حضرت تھانویؒ راندیر سے سورت جا رہے تھے راستہ میں ایک پُل پر دونوں کا آمنا سامنا ہو گیا۔ صوفی صاحب فوراً گاڑی سے اُترے اور حضرت تھانویؒ سے جو موٹر میں تھے ملے۔ بس پہلی ملاقات میں ہی کچھ ایسا اثر ہوا کہ راندیر واپس جا کر مسجد میں بیٹھے۔ اپنے معتقدین و مریدین کے سامنے بہت دیر تک روتے رہے۔ آخر ایک نے ہمت کر کے پوچھا کہ کیا ماجرا ہے تو انھوں نے بلا تامل حضرت تھانویؒ کا نام لے کر فرمایا کہ نہ جانے آنکھوں سے کیا کر گئے ہیں۔

۳۔ حضرت مولانا شاہ ابواحمد مجددی بھوپالیؒ

یہ اپنے وقت کے مشہور بزرگ تھے۔ حضرت تھانویؒ سفر بھوپال کے دَوران میں ان

کی زیارت کو بھی تشریف لے گئے۔ اتفاق سے اس وقت مولانا سو رہے تھے۔ اس لیے حضرت نے ان کے آرام میں خلل ڈالنا مناسب نہ سمجھا اور باہر انتظار کرتے رہے۔ کافی دیر کے بعد جب مولانا بیدار ہوئے تو آپ نے خادموں کی زبانی اطلاع کرائی۔ جب انھیں یہ معلوم ہوا کہ حضرت تھانویؒ آئے اور میرے سونے کی وجہ سے انتظار کرتے رہے تو خادموں سے سخت خفا ہوئے کہ تم نے مجھے کیوں نہیں جگایا۔ حضرت نے فوراً دکالتاً فرمایا کہ میں بڑے آرام سے بیٹھا رہا۔ اس پر ان کا غصہ ٹھنڈا ہوا اور کافی دیر تک حضرت سے محبت کی باتیں کرتے رہے۔

اسی طرح حضرت تھانویؒ نے کانپور کے تارک الدنیا بزرگ حضرت شاہ عبداللطیفؒ مراد آباد کے حضرت حافظ عبدالرحمٰنؒ، خلیفہ سائیں توکل شاہؒ، دیوبند کے حضرت بہادر علی شاہؒ، حضرت ملا شہاب الدین ولائیتی و حضرت گھیسن شاہؒ پانی پت کے صاحب کشف اور صاحب حال و قال بزرگ حضرت پیر احمدؒ۔ مونگیر کے حضرت مولانا محمد علی خلیفہ، مولانا شاہ فضل الرحمان۔ دہلی کے مولانا نذیر حسینؒ۔ بگھرہ ضلع مظفر نگر کے حضرت حافظ تفضل حسینؒ کانپور کے مشہور بزرگ حضرت شاہ احسان الحقؒ۔ بغداد کے صاحب کشف حضرت عبدالوہابؒ سہارنپور کے گوشہ نشین بزرگ حضرت شاہ ابوالحسنؒ۔ انبالہ کے مشہور سائیں توکل شاہؒ۔ دین پور کے مشہور شیخ حضرت مولانا خلیفہ غلام محمدؒ۔ کانپور کے مولانا محمدؒ عادل۔ لکھنؤ کے مولانا عبدالحی فرنگی محلی۔ مولانا محمد نعیم فرنگی محلی اور مولانا عین القضاۃ رحمہم اللہ کی زیارت کی اور فیض صحبت حاصل کیا۔

وجہِ مقبولیت

ہر سلسلہ کے بزرگان کرام اور اولیاء عظام کی طرف سے آپ کا غیر معمولی ادب و احترام۔ کم عمری کے باوجود آپ سے بزرگوں کا سا سلوک۔ بلا تعارف ظاہری آپ کی

انتہائی رعایت اور بلا معاملہ آپ پر غایت اعتماد کرنا گو بظاہر آپ کے صاحبِ عزت و عظمت اور محبوب و مقبول ہونے کی دلیل ہے۔ مگر فی الواقعہ اس کی حقیقت اور کچھ تھی جس پر سے حضرت مولانا گنگوہی رحمتہ اللہ علیہ کے خلیفۂ مجاز مراد آباد کے صاحبِ سوز و گداز بزرگ حضرت مولانا محمد روشن خاں رحمتہ اللہ علیہ نے اس وقت پردہ اٹھایا جب ممدوح الذکر کی عیادت کے لیے حضرت تھانوی تشریف لے گئے۔ مولانا اس وقت سفرِ آخرت کی تیاری میں تھے۔ انھوں نے اپنے حالاتِ مرض بیان کرنے کے بعد یکایک نہایت جوش کے ساتھ مگر آبدیدہ ہو کر آپ سے ان الفاظ میں درخواستِ دعا کی کہ :-

"خیر! یہ تو مرض کے حالات ہیں۔ اب آپ میرے لیے دُعا کر دیجیے کہ اللہ تعالیٰ میرا خاتمہ ایمان پر کرے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو اس صدی کا مجدد بنایا ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کے فیوض و برکات سے عالم منور کرے۔ اور آپ کے ذریعہ سے رسوم و بدعات کا قلع قمع کرے۔"

دُعاءِ بزرگاں

اہمیّتِ دُعا

حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ میں تمھیں وہ چیز بتلاتا ہوں جو تمھیں تمھارے دشمنوں سے نجات دلائے اور تمھاری روزی بڑھائے۔ وہ یہ کہ تم رات دن جس وقت کہ موقع ملے اللہ تعالیٰ سے اپنی حاجت کے لیے دُعا مانگا کرو کیونکہ دُعا مسلمانوں کا ہتھیار ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام کی منزہ عن الخطا جماعت بھی اکثر و بیشتر مصروفِ دُعا رہتی تھی۔ آج کل مُسلمانوں کے مصائب اور تباہی و بربادی کے جہاں اور

بہت سے اسباب موجود ہیں۔ ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ وہ اپنے معاملہ میں دُعا کی طرف متوجہ نہیں ہوتے۔

حضرت تھانویؒ ابھی عالم ارواح میں ہی تھے کہ آپ کے لیے اہلِ اللہ مصروف بدعا ہوگئے۔ عالمِ وجود میں آئے تو نہ صرف اس دَور کے بزرگوں کی غائبانہ دعائیں آپ کے شاملِ حال رہیں بلکہ عالم برزخ والے بھی آپ کی طرف متوجہ رہے باایں ہمہ آپ جب کسی بزرگ کے ہاں تشریف لے جاتے تو ان سے درخواست دُعا ہی کیا کرتے۔ حضرت تھانویؒ کے حق میں بزرگوں نے کس قسم کی دُعائیں کیں اور ان کے کیا نتائج برآمد ہوئے۔ اِن کی مختصر تفصیل ذیل میں پیش کی جاتی ہے۔

محبّتِ الٰہی

حضرت شاہ شیر محمد خاں پیلی بھیت کے مشہور بزرگ تھے۔ ایک عقد میں حضرت کا وہاں جانا ہوا تو آپ ان کی زیارت کو بھی تشریف لے گئے اور ان سے یہ درخواستِ دُعا کی کہ "میرے دل میں اللہ کی محبت پیدا ہوجائے۔" انھوں نے فرمایا کہ اپنے دونوں ہاتھ رگڑو۔ حضرت نے بلا تأمل بہ تعمیل حکم بہ غایت عقیدت دونوں ہاتھ ملے۔ جب مَل چکے تو پُوچھا کچھ گرمی پیدا ہوئی ہے۔ عرض کیا جی ہاں۔ وہ فرمانے لگے کہ بس اسی طرح قلب کو رگڑے جاؤ۔ انشاء اللہ اللہ تعالیٰ کی محبّت دل میں پیدا ہوجائے گی۔

طالب علمی کے زمانہ میں آپ نے ایک کتاب میں دیکھا کہ ایک پیر نے اپنے مرید سے پُوچھا کہ تم خدا کو جانتے ہو۔ اس نے جواب دیا کہ مَیں خدا کو کیا جانوں۔ مَیں تو آپ کو جانتا ہوں۔" بس یہ قول پڑھتے ہی آپ غصّہ سے لال پیلے ہوگئے اور حضرت مولانا محمد یعقوبؒ کی خدمت میں پہنچ کر یہ مقولہ پیش کرکے عرض کیا کہ :۔

"دیکھیے حضرت! خالی صُوفیوں کی یہاں تک پیر پرستی بڑھ گئی ہے کہ

پیر ہوتے ہوئے نعوذ باللہ اپنے کو خدا سے بھی مستغنی سمجھ لیا ہے۔"

مولانا نے نہایت لطافت سے اس کی تاویل کی طرف اشارہ کر کے فرمایا کہ کیا تم خدا کو جانتے ہو؟ اس پر حضرت کا ذہن فوراً اس طرف منتقل ہوا کہ واقعی اللہ جل شانہ کی کنہ کا علم تو کسی کو بھی نہیں اور یہ جواب عرض کر دیا۔ مولانا نے فرمایا تو پھر اس کے قول کی بھی یہی تاویل کیوں نہ کر لی جائے۔ کفر کا فتویٰ ہی کیوں لگایا جائے۔ اس واقعہ سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ آپ کے دل میں محبت الٰہی تو بچپن سے ہی موجود تھی۔ مگر اس بزرگ کی دعا نے سونے پر سہاگہ کا کام کیا۔ چنانچہ جب آپ مکہ مکرمہ تشریف لے گئے۔ تو وہاں اپنے قیام کے دوران میں تنزلات ستہ پر جس کا توحید وجودی سے خاص تعلق ہے۔ ایک رسالہ بعنوان "انوار الوجود فی اطوار الشہود" لکھ ڈالا جس کا ایک جزو "التجلی العظیم فی احسن تقویم" بھی ہے۔ جس میں انسان کی جامعیت کی تحقیق ہے۔ آپ نے جب یہ مضامین اپنے شیخ حضرت حاجی صاحب قدس سرہ العزیز کو سنائے تو انھوں نے مسرت و جوش میں آکر فرمایا:۔

"اس میں تو تم نے بالکل میرے سینہ کی شرح کر دی ہے۔"

اور یہ ایک حقیقت تھی کہ حضرت حاجی صاحب نے اپنے سینہ مبارک سے جو چیز حضرت کے سینہ مبارک میں ڈالی تھی۔ وہ توحید تھی۔ چونکہ یہ مضامین غلبۂ توحید کے زمانہ کے لکھے ہوئے تھے اسی لیے حضرت نے رسالہ تنبیہات وصیت کے ضمیمہ ملقب بہ ثانیۃ التابعہ حصہ دہم نمبر ا مطبوعہ النور ماہ شوال المکرم ۱۳۴۴ھ صفحہ ۲۰ میں عوام کو اس کے مطالعہ کی ممانعت کر دی اور خواص کو بھی ان کا درجہ بتلا دیا کہ ان کو ذوقیات سے آگے نہ بڑھائیں۔

وہیں ایک صاحب علم مولوی محمد احسن مطوف مکہ معظمہ نے وحدۃ الوجود کے مسئلہ پر شبہ کرتے ہوئے فرمایا کہ یہ تو بالکل ایمان کے خلاف ہے۔ حضرت نے اس پر جوش میں آکر مسلسل دو گھنٹے تقریر فرما دی تو وہ پکار اٹھے کہ:۔

"واقعی اس مسئلہ کی تو ایسی ضرورت ثابت ہوئی کہ بدوں اس کے تو ایمان کا تحقق ہی نہیں ہو سکتا۔"

بعض حضرات نے تو تکمیل ایمان ہی کو اس پر منحصر فرمایا تھا۔ اور انھوں نے اس سے بھی آگے بڑھ کر اس کو ایمان کا موقوف علیہ قرار دے دیا۔ جس سے ظاہر ہے کہ حضرت کے دل میں کتنی بے پناہ محبتِ الٰہی موجزن تھی۔

حال و قال

حضرت محمدی شاہ ولائیتی الٰہ آباد کے ایک درویش طبع بزرگ تھے ایک مرتبہ آپ کے والد ماجد بیمار ہو گئے اور حضرت کو بلوا بھیجا۔ صحت یاب ہونے پر وہ آپ کو شاہ صاحب کی خدمت میں لے گئے اور بتلایا کہ یہ میرا لڑکا ہے۔ دیوبند کا فارغ التحصیل ہے۔ اس نے فارسی میں ایک مثنوی بھی لکھی ہے۔ انھوں نے اس مثنوی کے کچھ اشعار سُن کر دُعا دی کہ :۔

"اللہ تعالیٰ قال کو حال کرے۔"

گو حال کا رنگ بچپن سے نمایاں تھا کہ تہجد پڑھا کرتے تھے۔ اور زمانہ طالب علمی میں حضرت مولانا شاہ رفیع الدین رحمتہ اللہ علیہ کے حلقہ توجہ میں شریک رہتے تھے جس کا نتیجہ خود حضرت ان الفاظ میں بیان فرمایا کرتے تھے کہ :۔

"مجھ کو اس زمانہ میں ایسا معلوم ہوتا تھا۔ جیسے مجھ میں نفسانیت کا شائبہ بھی نہیں رہا اور گویا میں بالکل فرشتہ ہو گیا۔"

اور بعد میں یہ حال آہ میں بدل گیا۔ یعنی آپ نے بے حال ہو کر آہ تخلص اختیار کر کے اشعار کہنے شروع کر دیے۔ قیامِ مکہ معظّمہ کے دَوران میں آپ نے اسی "حال" کے زیرِ اثر ایک پُر کیف غزل کہہ ڈالی جس میں سر تا سر توحید وجودی کے مضامین تھے۔ مگر اس کو عوام کے لیے مضر خیال کر کے اس کی اشاعت کی اجازت نہ دی۔ البتہ صاحب اشرف السوانح کی درخواست خاص پر انھیں صرف یہ دُو شعر نقل کرنے کی اجازت دے دی ؎

خودی جب تک رہی اس کو نہ پایا،
جب اس کو ڈھونڈ پایا خود عدم تھے
حقیقت کیا تمھاری تھی میاں آہ
یہ سب امداد کے لطف و کرم تھے

اسی زمانہ میں قاری عبدالحق صاحب کے سالانہ جلسہ میں حضرت سے وعظ کی فرمائش کی گئی۔ آپ نے غلبۂ حال کی وجہ سے سرزمینِ "حال" یعنی مکہ معظمہ میں وعظ کہنا خلافِ ادب سمجھا اور انکار کر دیا۔ لیکن حضرت حاجی صاحب کی سفارش پر مجبور ہو کر وعظ کے لیے اسٹیج پر تشریف لائے اور ایک خوش لحن ترکی آدمی نے آپ کی تقریر سے قبل کارروائی جلسہ شروع کرنے کے لیے تلاوت شروع کی بس اس کا پڑھنا تھا کہ حضرت پر ایسا "حال" طاری ہوا کہ "قال" کے نہ رہے۔ فرماتے تھے کہ :-

"ایسا پُر درد اور پُراثر لہجہ میں نے عمر بھر نہ سُنا تھا۔ تمام جلسہ پر ایک سناٹے کا عالم طاری ہو گیا اور میرے تو ہوش ہی بجا نہ رہے۔ ہچکی بندھ گئی۔ پھر جب مجھ سے وعظ کے لیے کہا گیا تو میں نے کہا کہ اگر مجھ سے وعظ کہلوانا تھا۔ تو اس سے قرآن نہ سنواتے۔ اَب تو میں بیان پر قادر ہی نہیں رہا اور واقعی اس کی قرأت کا اتنا شدید اثر ہُوا تھا کہ وعظ کہنے کی بالکل قدرت ہی نہ رہی تھی۔ نہ ہاتھ پاؤں قابو میں رہے۔ نہ دِل قابو میں رہا نہ زبان قابو میں رہی۔ ان لوگوں کو بھی دیکھنے سے معلوم ہو گیا کہ میں اس وقت واقعی معذور تھا۔"

اس طرح حق تعالیٰ نے بھی آپ کے اَدب کے پیشِ نظر بمصداق میدہد یزداں مراد متقیں۔ غیب سے ایسا ساماں پیدا کر دیا۔ وعظ نہ کرنے کا عذر معقول و مقبول ہو گیا اور ویسے بھی آپ کے ہر قال سے حال ظاہر ہے۔

امیری و فقیری

حضرت مولانا شاہ عبدالرحیم رائپوری کے سابق پیر جو آخون صاحب ولایتی کے خلیفہ اور حضرت شاہ صاحب کے ہم نام تھے۔ حضرت تھانوی سے بہت محبت فرماتے تھے۔ جب حضرت سہارنپور ان کی زیارت کے لیے تشریف لے گئے تو انھوں نے آپ کی درخواست دُعا پر فرمایا۔

"اللہ تعالیٰ بدن کو امیر رکھے اور دل کو فقیر۔"

بفضلہٖ تعالیٰ آپ کی ساری عمر ایسی گزری۔ کونسا انعام تھا جو حق تعالیٰ کی طرف سے عطا نہ ہُوا تھا۔ ازاں جملہ ایک اجرا امراض بھی تھا جو حق تعالیٰ نے اس طرح عطا فرمایا کہ اس سے کام میں کبھی حرج واقع نہیں ہُوا۔ اُتری ہُوئی آنت سے متواتر تیس برس وعظ و تبلیغ کے سلسلہ میں سفر فرماتے رہے۔ اگر اس مرض نے زیادتی بھی اختیار کی تو محض اس وجہ سے کہ حضرت کو قطب الارشاد بنا کر ایک جگہ بٹھانا مقصود تھا۔ دُوسرا عارضہ تبخیر کا تھا۔ جس کی وجہ سے نیند اکثر مختل رہتی اور کئی کئی راتیں ایسے گزر جاتیں۔ مگر پھر اتنی سیری سے نیند آتی کہ ساری تکلیف دُور ہو جاتی۔ نیند نہ آنے کی حالت میں حضرت کے قول کے مطابق دماغ کی حرارت میں انتعاش ہو کر کام کرتے وقت اور بھی تیزی سی محسوس ہونے لگتی اور خُوب کام ہوتا۔ یہ بدن کی امیری کا ہی تو نتیجہ تھا کہ مرض کے باوجود بھی کام میں حرج واقعہ نہ ہوتا تھا اور اجر میں اضافہ ہوتا رہتا تھا۔ ویسے بھی بفضلہٖ تعالیٰ آپ کی صحت غیر معمولی طور پر بھی بہت ہی اچھی تھی اور یہ اسی کی برکت تھی کہ حضرت صدیوں کا کام سالوں میں کر گئے جسے دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ کیا یہ ایک کثیر المشاغل انسان کا کام ہے؟ حالانکہ ایسی مثال شاذ ہی نظر آئے گی اور لُطف یہ کہ ایک ہی وقت میں کئی کئی کام کرتے تھے۔ مثلاً حفظ تلاوت بھی جاری ہے اور کبھی وقفات میں اور کبھی بلا وقفہ خطوط کے جواب بھی لکھے جاتے ہیں۔ مسائل دقیقہ پر بھی غور و خوض ہو رہا ہے۔ اور طالبین کے اشکال بھی رفع کیے جا رہے ہیں۔ پھر بدن کی امیری اس سے بھی ظاہر ہے کہ جس بیماری سے

لوگ مہینوں میں اچھے ہوتے تھے۔ حضرت دو تین دن میں اچھے ہو جاتے تھے۔ ان کی غیر معمولی صحت کا اتنا چرچا ہوا کہ ایک مولوی نے صاحب اشرف السوانح سے کہا کہ :۔

"مولانا کو کوئی بوٹی معلوم ہے۔ جس کے استعمال سے ان کی صحت ماشاء اللہ بہت اچھی رہتی ہے۔ ان سے وہ بوٹی معلوم کرنی چاہیئے۔"

چنانچہ انھوں نے حضرت تک اس کا سوال پہنچا دیا۔ آپ نے ہنستے ہوئے فرمایا کہ :

"وہ خبطی ہے۔ لو۔ میں وہ بوٹی بتلائے دیتا ہوں۔ وہ بوٹی تعلق مع اللہ ہے۔ جس سے ہر وقت قلب میں قوت و طمانیت اور طبیعت میں فرحت و بشاشت رہتی ہے۔ جو صحت کی جڑ ہے۔"

یہ اسی تعلق مع اللہ کا اثر تھا کہ بیماری کی حالت میں بھی معمولات میں فرق نہ آیا تھا چنانچہ ایک روز یعنی ۱۱ جمادی الثانی ۱۳۵۳ھ کو حضرت کو درد ریح کا شدید دورہ ہوا جو درد گردہ کے قریب تک پہنچا ہوا تھا، لیکن کمال ضبط کے ساتھ صبح کی نماز اسی درد کے عالم میں اس طرح پڑھائی کہ کسی پر اپنی تکلیف کو ظاہر نہ ہونے دیا۔ البتہ اس میں چھوٹی آیات تلاوت فرمائیں۔ نماز سے فارغ ہونے کے بعد دوسرے کام بھی کرتے رہے اور صبح کی مجلس میں تشریف لا کر طالبین کو بھی مستفید فرماتے رہے۔ آٹھ بجے کے قریب خدام کو اس تکلیف کا پتہ لگا۔ وہ دوائی وغیرہ لائے اس سے بفضلہ تعالیٰ گھنٹہ بھر میں درد دور ہو گیا۔ ورنہ ایسی حالت میں ایک عام انسان کے حواس اس قدر کام کے لیے کہاں بحال رہتے ہیں۔

دل کی فقیری کا یہ حال تھا کہ آپ فرماتے تھے کہ :۔

"مجھے تو اس تصور ہی سے وحشت ہوتی ہے کہ میری ملک میں ضرورت سے زیادہ چیزیں ہوں۔ چاہے ان چیزوں سے خود مجھے سابقہ کبھی نہ پڑتا ہو۔ لیکن خیال ہوتا ہے کہ میری ملک میں ایسی فضول چیزیں کیوں ہوں۔ آخر ان کا کیا ہو گا۔ بہت ہی طبیعت الجھتی ہے کہ جو چیز کام میں نہ آوے۔ وہ گھر میں کیوں رہے۔

مفت میں پہرہ چوکی دینا حمال ہونا۔ مزدور بننا۔ فضول کا دردسر۔
صائب نے خوب کہا ہے کہ ؎

حرص قانع نیست صائب ورنہ اسبابِ معاش
آنچہ ما در کار داریم اکثرے درکار نیست

میرے پاس کوئی چیز ہدیۃً آتی ہے تو آتے ہی غم سوار ہو جاتا ہے۔ کہ اس کو کس کام لاؤں۔ جب تک اس کی ضرورت ذہن میں نہیں آجاتی۔ ہمیشہ اس کی فکر رہتی ہے کہ کیا استعمال کروں۔ ڈر بھی لگتا ہے کہ کہیں حق تعالیٰ کی نعمت کی ناشکری نہ ہو کہ نالائق ہم تو تجھ کو دیتے ہیں اور تو گھبراتا ہے۔ بعضی چیز تو خیر ایسی ہوتی ہے کہ آتے ہی کام آجاتی ہے۔ لیکن بعضی چیز ایسی آتی ہے کہ سوچنا پڑتا ہے کہ آخر اس کا کیا کروں۔ یا تو کسی کو دیدی۔ یا اگر بخل کا غلبہ ہوا تو سوچا کہ اجی مفت کسی کو کیوں دوں لاؤ بیچو۔ بس بیچ کر اس کی رقم ضروری موقعوں پر خرچ کر دی۔ اللہ اللہ خیر سلا۔ اس کا موجود رہنا بار ہوتا ہے" (راحت القلوب صہ ۲۵)

برکاتِ اوقات

مکہ معظمہ کے قیام میں حضرت نے تنویر کا ترجمہ "اکسیر فی اثبات التقدیر" کے نام سے۔ حضرت حاجی صاحب کی فرمائش پر لکھا تھا۔ روزانہ جس قدر ترجمہ فرماتے۔ حاجی صاحب کو سنا دیتے۔ جسے سن کر وہ بہت خوش ہوتے اور مقدار کی زیادتی پر فرمایا کرتے کہ :۔

"اللہ تعالیٰ نے تمہارے وقت میں برکت عطا فرمائی ہے۔"

واقعی حضرت حاجی صاحب نے یہ فرما کر ایک مسلمہ حقیقت پر سے پردہ اٹھایا تھا۔ حضرت کے اوقات کی برکات کا تو روزانہ ہی مشاہدہ ہوتا رہتا تھا۔ اب بھی اس پر آپ کی صدہا تصنیفات و تالیفات شاہد عدل ہیں۔ روزانہ چالیس سے پچاس تک قابل جواب خط

آتے ۔ بڑے لمبے چوڑے اور فقہ ۔ سلوک ۔ کلام وغیرہ کے متعلق ۔ جن کے پڑھنے میں ہی کافی وقت صرف ہو جاتا اور جواب لکھنا تو مزید برآں ۔ ایک دن پچاس کے قریب خط آئے اور آپ جب پڑھ کر جواب لکھ بیٹھے تو حساب کرنے پر معلوم ہوا کہ فی خط دو منٹ سے بھی کچھ کم وقت صرف ہوا ۔ اسی طرح جب آپ کسی دینی کام میں مشغول ہوتے تو بفضلہٖ تعالےٰ مخل اوقات واقعات وحادثات پیش نہ آتے ۔ جیسے کسی دن ڈاک زیادہ آگئی تو تعویز لینے والے کم آئے ۔ وقس علیٰ ہذا ۔

جن ایام میں آپ تفسیر بیان القرآن" تحریر فرما رہے تھے ۔ ان کے متعلق حضرت کا بیان ہے کہ :۔

"بفضلہٖ تعالیٰ اڑھائی برس کی طویل مدت میں میرا کان تک گرم نہ ہوا اور ایک دن بھی ناغہ نہیں ہوا ۔ کبھی معمولی شکایت نزلہ زکام تک بھی نہیں ہوئی ۔ حالانکہ اس دوران میں خاص تھانہ بھون میں طاعون کا عرصہ تک زور رہا ۔ جس سے کسی قدر حرج بھی ہوا ۔ لیکن یہ ایسا حرج نہ تھا کہ جس کا بعد میں تدارک نہ ہو سکے ۔ میں اس زمانہ میں یہ دعا کیا کرتا تھا کہ تفسیر کے ختم ہونے تک نہ مروں"۔

پھر وقت میں برکت کچھ اس طرح بھی ہو جاتی کہ جب آپ کچھ لکھنے بیٹھتے تو مضامین کی آمد شروع ہو جاتی ۔ بڑے الجھے ہوئے خطوط کا ایسا کافی وافی وشافی جواب فی البدیہہ لکھتے جاتے کہ کوئی ضروری اور خفی سے خفی پہلو بھی نظر انداز نہ ہونے پاتا اور تصانیف میں بھی بڑے بڑے دقیق علمی مضامین نہایت جامعیت کے ساتھ قلم برداشتہ لکھتے چلے جاتے ۔

بسا اوقات اس کی یہ صورت پیدا ہو جاتی کہ جس مضمون کو کسی کتاب میں ڈھونڈنا چاہتے اس کا موقع فوراً ذہن میں آجاتا ۔ یا محض ورق گردانی سے سامنے آجاتا ۔ بسا اوقات راہ چلتے ۔ نماز پڑھتے ، بات کرتے ۔ اٹھتے بیٹھتے ضروری مسائل ذہن میں خود بخود آجاتے اور سب سے زیادہ وقت کی بچت انتہائی انضباط اوقات اور حسن انتظام سے ہوتی ۔ جب کوئی کام شروع فرما لیتے ۔ تو جب تک اسے ختم نہ کر لیتے ۔ چین نہ لیتے ۔ یہاں تک کہ بعض تصانیف کے قریب الاختتام

پر ساری ساری رات بیٹھتے لکھتے رہنے اور ایک منٹ کے لیے بھی آرام نہ فرماتے۔ اس کے ساتھ ہی متوجہ الی اللہ بھی رہتے اور فرمایا کرتے :۔

"چاہے توفیق یادِ خدا کی نہ ہو لیکن میں اپنی طرف سے تو قلب کو فارغ رکھنے کی کوشش کرتا رہتا ہوں تاکہ اگر کبھی توفیق ہو تو آسانی سے حق تعالیٰ کی طرف قلب کو رجوع کر سکوں اور اس وقت کوئی مانع توجہ الی اللہ سے نہ ہو۔ یہی وجہ ہے کہ اُلجھی ہوئی باتوں سے میری طبیعت پریشان ہو کر متغیر ہو جاتی ہے۔ کیونکہ میں چاہا کرتا ہوں کہ بات ختم ہو کر جلد یکسوئی حاصل کر لوں اور طبیعت اٹکی نہ رہے۔ لوگ اُلجھی ہوئی باتیں کر کے خواہ مخواہ دیر تک طبیعت کو اٹکائے اور اُلجھائے رکھتے ہیں۔"

دعاء امدادیہ

حضرت تھانویؒ نے جب حضرت حاجی امداد اللہ قدس سرہ العزیز سے استفاضہ شروع کیا۔ تو پھر وہ ہر وقت ان کے لیے دست بدعا رہنے لگے۔ کوئی خط ایسا نہ آتا جس میں دعاؤں سے نہ نوازا جاتا۔ جیسا کہ ذیل کی دعاؤں سے ظاہر ہے جنہیں مختلف مکتوبات امدادیہ سے نقل کیا گیا ہے:۔

۱۔ اللہ تعالیٰ آپ کے ظاہر و باطن میں ترقی کرے اور

۲۔ آپ کے جان و مال میں برکت دے۔ خاتمہ بخیر کرے۔

۳۔ اللہ تعالیٰ آپ کو اپنے مخلصین سے کرے۔

۴۔ اللہ تعالیٰ آپ کو اپنے ماسوا سے اپنی طرف کرے۔

۵۔ خداوند تعالیٰ آپ کو اپنی رضا و حفاظت میں رکھے اور ترقی دارین عطا فرماوے۔

۶۔ اللہ تعالیٰ آپ کو بادۂ عشق سے سیراب بنا کر تشنہ وار رکھے۔

۷۔ اللہ تعالیٰ آپ کو مدام اپنی یاد۔ ذوق شوق اور مواجید میں سرشار و مخمور رکھے۔

۸۔ اللہ تعالیٰ آپ کو اپنے دریائے محبت کا غواص بنائے اور مراد سے مالامال فرمائے۔

۹۔ حق سبحانہ آپ سے مخلوق کو فیض یاب کرے۔ برکاتِ بزرگاں اور مراد سے مالامال فرمائے۔

۱۰۔ خداوند تعالیٰ بتصدق اپنے حبیب احمد مجتبےٰ محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے سب مرادیں پوری فرمائے اور تمہارے دامنِ تمنا کو گوہر مقصود سے بھر دے۔

۱۱۔ آپ کے استقامت و توکل میں کامیابی کی دُعا کرتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ ظاہری و باطنی فیض کو روز افزوں ترقی عطا فرمائے۔

۱۲۔ اللہ تعالیٰ آپ کو زیادہ علم و فضل بخشے۔ جس میں خلق اللہ کو نفع عام ہو اور تصانیف مفید و مقبول ہوں۔

۱۳۔ ہمیشہ آپ کا خیال رہتا ہے۔ آپ کو درجات علیا عطا فرمائے اور آپ کا فیض ہمیشہ جاری رہے۔

ہر وقت دُعاؤں میں یاد رکھنے والے حاجی صاحب جب اس دُنیا سے رُخصت ہونے لگے تو دُعا کے لیے سائل بھی اسی دربار اشرفیہ کے ہُوئے اور حضرت کو لکھا:۔

"بخدمت فیض درجت عمدۃ السالکین۔ نجبۃ الواصلین حضرت العالم الحافظ الحاج القاری شاہ محمد اشرف علی الحقانوی ادام اللہ عرفانہ و مجتبہٗ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

خط آپ کا پہنچا۔ نہایت مسرت حاصل ہُوئی اور قلب کو فرحت۔ اللہ تعالیٰ آں عزیز کو ترقی ظاہر و باطن عطا فرمائے۔ اور خلق اللہ کو مستفید لفواء صوری و معنوی کرے۔ آمین۔ انشاء اللہ میں ہر وقت دعا کرتا ہوں۔ آپ سے خلقت کثیرہ کو فائدہ ہوگا اور سلسلہ جاری رہے گا۔ وقت آخر ہے۔ دعائے خاتمہ بالخیر کا طالب ہوں۔" (از مکتوب ۳۸)

آہ! یہ آخری گھڑی بھی کتنی کٹھن ہوتی ہے کہ جن کے دریائے فیض سے ایک دُنیا فیضیاب ہوتی رہتی ہے۔ وُہ دارالفناء سے دارالبقاء کو جاتے ہُوئے خود کو تشنہ کام پاتے ہیں۔

بزرگوں کی ان دعاؤں اور تمنّاؤں کی مقبولیت کی خود حضرت کی ساری زندگی ہی شاہدِ عدل ہے۔ کون سی دُعا اور کون سی تمنّا ہے جو مولا پاک نے اپنے فضلِ خاص سے پوری نہیں فرمائی۔

وعظ و تبلیغ

فریضۂ تبلیغ

یہ اتنا اہم فریضہ ہے کہ اس کے لیے حق تعالےٰ کو انبیاء علیہم السلام کی جماعت بھیجنی پڑی۔ ان کی آمد کا سلسلہ بند ہونے کے بعد یہ کام علماء کرام کے سپرد ہُوا جو ورثۃ الانبیاء ہیں۔ سُنّت اللہ یُوں جاری ہے کہ وُہ جس کو کسی کام کے لیے مامور کر کے بھیجتا ہے۔ اس کے اندر بدوِ فطرت سے ایسی صفات بھی پیدا کر دیتا ہے۔ جن کی مدد سے وہ یہ کام بآسانی اور بسہولت انجام دیتا ہے۔

مشقِ وعظ

حق تعالےٰ نے چونکہ حضرت تھانوی کو اس منصب جلیلہ پر فائز فرمانا تھا۔ اس لیے انکے دل میں بچپن سے ہی وعظ و تبلیغ کا شوق موجزن کر دیا تھا۔ آپ جہاں بھی مسجد خالی دیکھتے شغل کے طور پر اس کے منبر پر چڑھ کر کچھ نہ کچھ پڑھنا شروع کر دیتے۔ طالب علمی کے زمانہ میں آپ نے اس غرض کے لیے اپنے ہم سبق طلباء کی ایک مختصر سی بے نام و نشان انجمن بنائی ہوئی تھی جس کا ہر شب جمعہ کو اجلاس ہوتا تھا اور سب ممبر باری باری وعظ گوئی کی مشق کرتے تھے۔ اس طرح آپ نے تحصیلِ علوم کے ساتھ ساتھ وعظ و تبلیغ کی مہارت تامہ بھی حاصل کر لی تھی۔

پہلا وعظ

ابھی آپ تعلیم ہی حاصل کر رہے تھے۔ اور اپنی عمر کی اٹھارویں منزل سے نہیں گزرے

تھے کہ آپ کے نکاح کا انتظام کر دیا گیا اور اس غرض کے لیے آپ کو تھانہ بھون جانا پڑا۔ جمعہ کے روز آپ کے والد ماجد نے آپ کے ماموں منشی واجد علی سے فرمایا کہ :۔

"میں بوجہ مشغولیت حوض والی مسجد میں نماز پڑھ لوں گا۔ آپ اشرف کے ساتھ جامع مسجد چلے جائیں اور بعد نماز اس کا وعظ کرا دیں۔"

جب آپ کے ماموں نے اس امر سے آپ کو مطلع کیا تو آپ شرم کے مارے مجمع عام میں وعظ کہنے سے صاف انکار کر دیا۔ جونہی نماز ختم ہوئی۔ آپ کے ماموں نے آپ کے وعظ کا اعلان کر دیا۔ اب نہ جائے ماندن نہ پائے رفتن والا معاملہ تھا۔ آخر بہ تعمیل حکم وعظ کہنا پڑا۔ لیکن فرماتے تھے کہ :۔

"مجھے اتنی شرم آئی کہ ممبر پر بھی نہیں بیٹھا بلکہ نیچے بیٹھ کر اور نظریں نیچی کر کے سورۃ بقرہ کی شروع آیات کا وعظ بیان کر دیا۔"

گویا نکاح کی تقریب سعید آپ کا عوام سے بھی تعلق قائم کرنے کا باعث ہوئی۔

ترتیب وعظ

حضرت تھانویؒ ہمیشہ خطبہ ماثورہ پڑھ کر کسی آیت یا حدیث سے وعظ شروع فرماتے اور اس کی ذیل میں مناسب موقعہ ضروری مضامین بیان فرماتے جاتے جو فصیح و بلیغ، پُر مغز و متین الفاظ کا مرقع ہوتے اور اخیر میں اس آیت یا حدیث کے ترجمہ و دعا پر وعظ ختم فرماتے۔ ہر وعظ حقائق و معارف کا مجموعہ ہوتا جس پر تصوف کا رنگ غالب ہوتا۔ اگرچہ آپ پہلے سے مضمون سوچ کر یا تیار کر کے نہ آتے۔ بلکہ اس وقت جو کچھ القاء ہوتا۔ اس پر بے تکلفی سے وعظ شروع کر دیتے۔ مگر وہ بے ربط نہ ہوتا، بلکہ اس تسلسل اور تواتر سے مضامین بیان فرماتے۔ جیسے کوئی تصنیف شدہ رسالہ پڑھ رہے ہوں اور نہ ہی غیر ضروری مضامین یا اشعار یا مقفیٰ مسجع عبارت سنا سنا کر وضع الوقتی کے لیے سامعین کی سمع خراشی فرماتے بلکہ آمد مضامین کا یہ عالم ہوتا کہ وقت ختم ہو جاتا اور وہ باقی رہ جاتے۔ چنانچہ حکیم محمد مصطفےٰ صاحب جو حضرت کے وعظ

قلمبند کیا کرتے تھے۔ فرماتے تھے کہ :۔

"احقر نے خود ایک حدیث کا بیان کم از کم پچاس بار سُنا۔ کبھی مضامین مکرر نہیں ہوئے ۔"

وعظ کے دَوران میں آپ حضرت جلال الدین رومیؒ کی طرح ترغیب و ترتیب کے لیے برموقع حکایات وتمثیلات بھی بیان فرماتے تھے ۔ یہاں تک کہ عام لطیفوں اور بازاری حکایتوں سے بھی تہذیب ولطافت کے ساتھ ایسے نتائج ونصائح مستنبط فرماتے تھے کہ مجمع کبھی رو دیتا اور کبھی ہنس پڑتا۔ حکیم محمد مصطفٰے صاحب نے حضرت کے مواعظ کی زینت بننے والی حکایات کو الگ کر کے بترتیب فقہی دو جلدوں میں "امثالِ عبرت" کے نام سے شائع بھی کیا جو پانچ سو سے زائد حکایات پر مشتمل ہے ۔

اسی طرح بدوران وعظ عربی ۔ فارسی اور اُردو کے اشعار بھی ایسے برمحل پڑھتے کہ مضمون میں جان پڑ جاتی ۔ سامعین پھڑک اُٹھتے ۔ ان پر وجد کی سی کیفیت طاری ہو جاتی اور وہ بے اختیار ہو کر کہتے کہ حضرت جب شعر پڑھتے ہیں تو دل اچک لیتے ہیں ۔ اس وقت ایسا معلوم ہوتا کہ گویا یہ شعر اس موقع کے لیے کہا گیا ہے ۔ مگر کبھی کوئی شعر بطرز موسیقی نہیں پڑھا ۔ اگر کوئی شعر برمحل یاد آجاتا تو بے ساختگی کے ساتھ اپنے مخصوص انداز میں پڑھ دیتے ۔ اگرچہ حضرت نے اشعار یاد کرنے کی طرف کبھی توجہ نہ فرمائی تھی ۔ پھر بھی حضرت کے مواعظ سے جب حکیم محمد مصطفٰے صاحب نے اشعار چنے تو وہ تیرہ سو کے قریب نکلے ۔ جو "ابیاتِ حکمت" کے نام سے شائع ہوئے ۔

اثر و تاثیر

چونکہ آپ کا ہر وعظ ادع الی سبیل ربك بالحکمة والموعظة الحسنة وجادلهم بالتی هی احسن کا مظہر ہوتا ۔ جس میں نہایت حکیمانہ انداز قوی دلائل اور پختہ براہین کی روشنی میں بہترین مضامین ہوتے ۔ اس لیے عوام وخواص وجد میں آجاتے اور جس کی وجہ سے بسا اوقات وعظ ملتوی کرنا پڑتا ۔ کیونکہ لوگوں کے وجد میں آنے سے مجمع میں

انتشار پیدا ہوجاتا۔ بسا اوقات حضرت چھ چھ سات سات گھنٹے بھی وعظ کرتے رہتے اور بڑے بڑے امراء روساء برابر بیٹھے یا کھڑے رہتے۔ خواہ ان پر دھوپ بھی آجاتی۔ مگر وہ ٹس سے مس نہ ہوتے اور مجمع پر ایسا محویت کا عالم طاری رہتا کہ کان علیٰ رؤسہم الطیر کی یاد تازہ ہوجاتی۔ اچھے اچھے فلسفیوں کے فلسفے ماند پڑجاتے اور وہ حضرت کے بیان کردہ معارف کے سامنے اپنے علمی حقائق کو حقیر سمجھنے لگتے۔ پتھر دل موم ہوجاتے۔ مُردہ دلوں میں جان پڑ جاتی۔ مایوس پُر امید ہوجاتے۔ خشک اور پژمردہ چہرے ہشاش وبشاش نظر آنے لگتے۔ مختلف المشرب انھیں ہمشرب سمجھنے لگتے۔ مخالف اُلجھنے کی بجائے سلجھنے پر مجبور ہوجاتے۔ اگر کوئی کج فہم محض ہٹ دھرمی پر اتر بھی آتا۔ تو وہ بھی کچھ دیر بعد جاکر حضرت کے پاؤں پکڑ کر معافی کا خواستگار ہوتا۔ اسی لیے حضرت کے مخالفین لوگوں کو منع کرتے کہ تھانویؒ کے وعظ میں مت جاؤ۔ وہ کوئی عمل کردیتے ہیں۔ کانپور میں حضرت مسلسل دو ماہ محلہ محلہ نماز پر وعظ فرماتے رہے۔ جس کا اثر یہ ہوا کہ مسجدوں میں نمازیوں کی کثرت کی وجہ سے جگہ نہ رہتی اور نماز کا شوق اتنا بڑھا کہ تانگے والے اپنی سواریوں سے پوچھ پوچھ کر نماز یاد کیا کرتے تھے۔

پُرلطف واقعہ

شادی کے تھوڑے دنوں بعد آپ کو بمقام گنگوہ اپنے سسرال جانا پڑا۔ ان دنوں وہاں حضرت شیخ عبدالقدوس گنگوہیؒ کا عرس تھا۔ وہاں کے لوگوں نے آپ کو وعظ فرمانے پر مجبور کیا۔ آپ نے ان کی درخواست پر وعظ فرمایا۔ جس میں مناسب موقع پر اولیاء اللہ کے فضائل بیان فرمائے۔ ساتھ ہی ساتھ بڑے جوش وخروش سے بہ احسن طریق بدعات کا رد اور سماعِ مروّج کی مضرت بھی بیان فرمائی۔ اس وعظ میں بڑے بڑے پیرزادے بھی موجود تھے اگرچہ وعظ کا اکثر حصہ ان کے مسلک کی تردید میں تھا۔ مگر وہ اندازِ بیان سے بڑے خوش ہوئے کسی نے بُرا نہ منایا۔ بڑے اطمینان اور غور سے سب باتیں سُنتے رہے۔ وہیں حضرت نے مغرب کی نماز پڑھائی۔ اکثر نے تو اختلافِ مشرب کی پروا نہ کرتے ہوئے حضرت کے

پیچھے نماز پڑھ لی۔ مگر ایک پیر جی نے بدیں وجہ حضرت کے پیچھے نماز نہ پڑھی کہ یہ بزرگوں کو بُرا کہتے ہیں۔ اس سے سب کو حیرت ہوئی اور انھوں نے پیر جی سے پوچھا کہ کون سے بزرگ کو بُرا کہا ہے؟ آپ نے تو بزرگوں کے فضائل بیان کیے ہیں۔ کہنے لگے: "ڈھولکی کو بُرا کہا ہے"۔ پوچھا گیا کہ ڈھولکی تمھاری بزرگ ہے۔ کہا! ہاں!! ڈھولکی ہماری بزرگ ہے۔ اس پر لوگ ہنسنے لگے تو وہ اور جوش میں آئے اور کہا کہ اگر جبرائیل علیہ السلام بھی آکر اس کے خلاف کہیں گے تو نہ مانوں گا۔ شکر ہے حضورؐ کا نام نامی نہ لے دیا۔ اس پر سب لوگوں نے اسے بُرا بھلا کہا اور وہاں کے باشعور پیرزادوں نے اسے سمجھایا کہ:-

"یہ حضرات علماء ہیں۔ ان کو حق ہے کہ شریعت کے احکام ہم کو بتائیں صوفیہ نے ہمیشہ شریعت کا ادب کیا ہے۔ احکام شریعت کے سامنے اپنا سرِ تسلیم خم کیا ہے اور کبھی مزاحمت نہیں کی۔"

جب اس نے اپنے پیرزادوں کو بھی حضرت کی تائید وحمایت میں بولتے دیکھا۔ تو پھر اسے کچھ ہوش آئی اور پوچھا کہ انھوں نے جبہ شریف کی بھی زیارت کی تھی؟ لوگوں نے بمسرت کہا کہ ہاں! حضرت نے اس کی زیارت کی تھی۔ اس پر وہ بہت خجل ہوا اور تھانہ بھون جا کر حضرت سے معافی مانگی۔ اس واقعہ کو نقل کر کے حضرت فرمایا کرتے تھے کہ:-

"پہلے زمانہ کے پیرزادے بھی غنیمت تھے۔ کیونکہ وہ اللہ اللہ کرنے والے تھے گو غلطیوں میں مبتلا تھے۔ مگر اللہ کا نام لینے کی برکت تھی۔ آج کل تو اکثر محض دکاندار ہی ہیں۔"

اندازِ بیان

اختلافی مسائل پر حضرت جب بھی وعظ فرماتے۔ تو وہ مختلف المشرب حضرات کے مریدوں یا تعلقداروں کو ان سے برگشتہ کرنے کی قطعاً کوشش نہ کرتے۔ بلکہ ایسے احسن طریق سے بات کر جاتے کہ وہ تلخ و ترش باتیں سُن کر بھی یہی سمجھتے کہ ہماری تائید ہو رہی ہے۔

مارواڑ میں ایک جگہ حضرت کا وعظ تھا۔ وہاں کے پیرزادے کو خوف لاحق ہو گیا کہ یہ میرے مریدوں کو مجھ سے برگشتہ کرنے کی کوشش کرینگے۔ اس لیے وُہ چپکے سے اپنے "مطلب" کے کسی عالم کو لے کر وعظ میں آ بیٹھے کہ جونہی حضرت کوئی بات ان کے مفاد کے خلاف کریں گے۔ یہ اس عالم سے حضرت کا مناظرہ کرا دیں گے۔ حضرت کو اس بات کا قطعاً علم نہ تھا مگر منجانب اللہ مناسب حال مضمون ہی معرض بیان میں آ گیا۔ جس میں آپ نے انتہائی لطیف انداز میں لوگوں کی توجہ ایسے پیرزادوں سے ہٹانے کے لیے فرمایا:۔

"بزرگوں کی اولاد کا بھی حق ہے کہ ان کی مالی خدمت ضرور کی جائے۔ لیکن ان سے دین کی خدمت ہرگز نہ لی جائے۔ مسئلہ مسائل پُوچھنے کی ان کو ہرگز زحمت نہ دی جائے اور یہ کام علماء سے لیا جائے۔ کیونکہ وُہ واقف ہیں۔ لیکن علماء کی مالی خدمت نہ کی جائے کیونکہ ان کو اس کی ضرورت ہی نہیں۔ سب بقدر حاجت تحصیل معاش کر رہے ہیں اور ان بزرگ زادوں کا اور کوئی ذریعہ معاش نہیں۔ لہٰذا مالی خدمت تو ان کی کی جائے اور کام علماء سے لے لیا جائے۔"

یہ سُن کر وُہ پیرزادے بڑے خُوش ہُوئے اور بعد وعظ مناظرہ کرانے کی بجائے حضرت کے ہاتھ چومے حالانکہ حضرت نے ان کی جڑیں کاٹ دی تھیں۔

اظہارِ حق

بقول صاحب اشرف السوانح

"حضرت والا نے ضرورت کے موقعوں پر بڑے بڑے معرکۃ الآرا مباحث اور مختلف فیہ مسائل پر وعظ اس خوبی کے ساتھ فرمائے کہ نہ اظہار و احقاقِ حق میں کچھ تامل فرمایا۔ نہ تردید ابطال باطل میں کوئی کسر اٹھا رکھی۔ نہ کسی کی ذرا دل آزاری کی نہ تہذیب کو کبھی ہاتھ سے جانے دیا۔ خود فرمایا کرتے تھے کہ:۔

"کریلا تو کھلاتا ہوں لیکن چٹ پٹے مسالوں سے مزے دار بنا کر اور کونین کی گولی شکر میں لپیٹ کر دیتا ہوں کہ ناگواری کی بجائے خوشگواری کے ساتھ بسہولت حلق سے گزر جائے"۔

چنانچہ اکثر دیکھا گیا کہ آپ نے تو تعلیم یافتہ اور روشن خیالوں کو ایسے دل آویز عنوان سے کھری کھری باتیں سنائیں کہ وہ ناراض ہونے کی بجائے خوش ہوتے رہے اور اچھا اثر قبول کرتے رہے۔ موتمر الانصار کے اجلاس میرٹھ میں ایک متشدد واعظ نے انگریزی خوانوں کو بہت برا بھلا کہا۔ یہاں تک کہ ملعون کہہ دیا۔ جسے انھوں نے برا منایا۔ دوسرے روز حضرت تھانویؒ نے وہی مضمون اس تمہید کے ساتھ بیان فرمایا کہ :۔

"مولانا نے بوجہ وقت کی کمی کے جو کچھ فرمایا تھا۔ مجمل فرمایا تھا۔ چونکہ وہ مضمون ضروری ہے۔ اس لیے میں آج اسی کی تفصیل عرض کرتا ہوں"۔

اس پر وہ بچارے اور گھبرائے کہ حضرت تھانویؒ اب خوب آڑے ہاتھوں لیں گے۔ مگر ان کا یہ توحش بالکل غلط نکلا۔ کیونکہ اگرچہ حضرت نے ان سے زیادہ نو تعلیم یافتہ لوگوں کے عقائد ملحدانہ اور کفریہ کی تفصیل و تشریح کی۔ مگر اس تہذیب و لطافت کے ساتھ کی کہ زبان فیض ترجمان سے کوئی متوحش لفظ نہ نکلا اور اس کے بعد فیصلہ خود انہی لوگوں پر چھوڑ دیا کہ :۔

"جس کے ایسے ایسے عقائد و اعمال ہوں۔ اس کے بارے میں شریعت مقدسہ کو سامنے رکھ کر آپ کیا حکم دیتے ہیں"۔

۔ تو انھیں ناگواری کے ساتھ نہیں خوشگواری کے ساتھ ندامت کے لہجہ میں تسلیم کرنا پڑا کہ :۔

"واقعی ہم لوگ ایسے ہیں"۔

اس پر حضرت نے آخری اصلاحی تازیانہ لگایا کہ :۔

"اگر آپ واقعی اپنی اصلاح چاہتے ہیں۔ تو آپ جس کو محقق سمجھتے ہوں۔ اس کے پاس جا کر کم از کم چالیس روز مہمان رہیں۔ لیکن خاموشی کے ساتھ۔ اور اپنے تمام شبہات بلکہ کر ان کے حوالے کر دیں۔ پھر وقتاً فوقتاً جو باتیں مجلس میں ہوتی رہیں۔ ان کو سنتے رہیں اور تنہائی میں ان پر غور کریں۔ میں اللہ کے بھروسہ پر وعدہ بلکہ دعویٰ کرتا ہوں کہ اس مدت میں بایں تدبیر انشاء اللہ تعالیٰ شبہات دور ہو کر کم از کم عقائد تو بالکل درست ہو جائیں گے جب عقائد درست ہو گئے تو ان کی برکت سے انشاء اللہ رفتہ رفتہ اعمال بھی درست ہو جائیں گے۔"

اس سے ان پر اور بھی زیادہ اچھا اثر پڑا کہ یہ صرف دعویٰ نہیں کرتے بمشاہدہ بھی کرانے کو تیار ہیں۔ یہ صرف حسنِ بیان کی برکت تھی کہ لوگوں کی لغزشیں اور خطائیں آئینہ بن کر ان کے سامنے آ جاتی تھیں۔ اور وہ حضرت کی طرف متوجہ ہونے کی بجائے اپنی سیرت کی بدصورت دیکھ کر حیران و سرگرداں ہو جاتے تھے۔

اعجازِ بیان

مناسب موقع تقریر کرنے میں تو حضرت کو کمال حاصل تھا۔ کانپور کے قیام کے زمانہ میں جب حضرت نے یہ دیکھا کہ عشرہ محرم میں اہلِ سنت والجماعت بھی اہلِ تشیع کی مجالس عزا کو رونق دیتے ہیں۔ تو اس حکیم الامت نے ان کی عادت کی نبض دیکھ کر اس کا یوں علاج کیا کہ آپ نے بھی اول عشرہ محرم میں روزانہ بالترتیب سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین کے واقعاتِ وفات بیان کرنے شروع کر دیئے تاکہ مشاہیر اسلام کے کے حالاتِ زندگی سننے کی عادت بھی نہ چھوٹے اور اہلِ عزا کے ساتھ تشبہ بھی نہ رہے۔ مجدد کا بس یہی کام ہوتا ہے کہ وہ اپنی بصیرت و فراست سے لوگوں کی فطرت معلوم کر کے ان کی عادت نہیں بدلتا۔ ہیئت بدل دیتا ہے۔ حضرت کی مجلس کا رنگ ایسا نکھرا

کہ اب ادھر مجمع ہونا شروع ہو گیا۔ صرف سنّی ہی نہیں شیعہ بھی بکثرت حضرت کی مجلس میں آنے لگے۔ جس سے ان کی اپنی مجلسیں پھیکی پڑ گئیں۔ اب جو حضرت کا بیان شروع ہوا تو انھوں نے اوّل تینوں خلفائے عظام کے واقعات کچھ اس انداز سے پیش کیے کہ اہلِ تشیع حضرات کے ساتھ سب رو رہے تھے اور شہادتِ حسین رضی اللہ عنہ اس خوبی سے بیان فرمائی کہ ہائے ہائے کرنے والے واہ واہ کرنے لگے اور اتنے درد بھرے واقع پر کسی کی آنکھ سے ایک آنسو نہ نکلا۔ حالانکہ اس میں شیعہ بکثرت موجود تھے۔ حضرت کے اس کارنامہ پر لوگوں کو صرف حیرت ہی نہ ہوئی بلکہ عظمتِ حسین رضی اللہ عنہ کا انھیں کو پہلی بار احساس ہوا۔

اس طرح ایک موقع پر حضرت نے بارِ خلافت کی ذمہ داریوں اور دشواریوں کا بیان فرماتے ہوئے شیعہ حضرات سے فرمایا کہ :-

"آپ حضرات کو خلفائے ثلٰثہ کا ممنون ہونا چاہیئے کہ انھوں نے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو ۲۴ سال تک راحت میں رکھا۔ ورنہ بجائے ۶ سال کے ۳۰ تک مصیبت بھگتنی پڑتی۔ کیونکہ شروع خلافت سے تیس سال تک حضرت علی رضی اللہ زندہ رہے۔ جس میں صرف چھ سال خود خلیفہ رہے۔"

جس سے اکثر کے خیالات بدل گئے۔

حجتِ محبّت

نظامِ قدرت کا یہ دستور ہے کہ ہر شخص کو اس کے اعمال کی جزاو سزا کا کچھ یہاں بھی احساس و مشاہدہ کرا دیا جاتا ہے تاکہ وہ اپنی اصلاح و ترقی کی طرف زیادہ توجہ کرے اگرچہ ہر حادثہ کسی نہ کسی عمل کا نتیجہ ہوتا ہے۔ مگر اربابِ بصیرت تو اسے مسبب الاسباب کی طرف منسوب کرتے ہیں اور کور سواد اسے کسی اتفاقی سبب پر محمول کرتے ہیں۔ مقربین الی اللہ کو اکثر ایسے واقعات پیش آتے رہتے ہیں کیونکہ جو جتنا زیادہ محبوب ہوتا ہے۔ اس پر حجت بھی اتنی زیادہ ہوتی ہے۔ جیسے ایک مرتبہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے کسی کام کے سلسلہ میں لفظ انشاء اللہ

فرمانا سہوارہ گیا۔ جس پر کئی دنوں تک وحی کا آنا رک گیا تھا۔

حضرت تھانویؒ کے خطبات و مقالات سے چونکہ ہزاروں لوگ فیض یاب ہو رہے تھے جسے محسوس کرتے ہوئے ایک دن آپ کی زبان سے یونہی بر سبیل تذکرہ یہ الفاظ نکل گئے کہ :۔

"جیسا ہو سکتا ہے۔ برا بھلا بیان کر لیتا ہوں۔ پہلے سوچنے یا کتاب دیکھنے کا اتفاق نہیں ہوتا۔ جو کچھ بیان ہوتا ہے۔ وہ وقتی واردات ہوتے ہیں"

اس فی البدیہہ آمد سے حضرت کے دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ :۔

"مجھ میں قوتِ بیانیہ زباندانوں کی سی نہ سہی۔ مگر کچھ تو کہہ ہی لیتا ہوں"

بس اتنی سی بات پر قوتِ بیانیہ سلب ہو گئی "کچھ تو کہہ ہی لیتا ہوں" کی جگہ یہ فرما دیتے کہ کچھ تو کہلوا ہی دیتا ہے" تو وہ مالک و خالق جس نے آپ کو محبوب خلائق بنا دیا تھا زیادہ راضی ہو جاتا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ اس خیال کے پیدا ہونے کے بعد جب آپ گڑھی خام میں وعظ کہنے بیٹھے تو وہی الفاظ و مضامین جو بوقتِ وعظ صفوں کی صفیں بنا کر بغرض انتخاب سامنے آ جاتے تھے۔ قریب بھی نہ پھٹکے۔ بس اب وہ حضرت خالی الذہن ہو کر بیٹھے تھے۔ فرمایا :۔

اعترافِ عجز

"بہتیرا سوچ ساچ کر پھیر پھار کر بیان کرنا چاہا۔ مگر کچھ بیان نہ ہو سکا اور بالکل تقریر نہ چل سکی۔ کوئی مضمون ہی ذہن میں نہ آیا۔ آیت پڑھ کر اس کا ترجمہ کیا۔ پھر طبیعت بند۔ مرادفات بڑھا کر مکرر ترجمہ کیا کہ شاید اس سے کچھ طبیعت کھلے اور آگے کو سلسلہ چل سکے۔ لیکن اس سے کچھ نہ ہوا۔ مجبور ہو کر میں نے چاہا کہ لاؤ کوئی مضمون پہلے کا بیان کیا ہوا ہی بیان کر دوں۔ کیونکہ آخر بہت سے مضامین پہلے کے بیان کیے ہوئے اور پڑھے ہوئے ہی تھے۔ لیکن اس وقت کوئی ایسا مضمون بھی یاد نہ آیا۔ اور نہ ہی ذہن کچھ کام دیتا تھا۔

احساسِ انتباہ

اب مجھے معلوم ہو گیا کہ اس وقت مجھ کو در اصل بیان پر قدرت ہی نہیں رہی لہٰذا مجبور

ہو کر میں نے مجمع سے کہہ دیا کہ صاحبو! اس وقت کوئی مضمون ہی ذہن میں نہیں آتا۔ کیا بیان کروں۔ بس آپ دُعا کیجئے۔ چنانچہ دُعا کر کے بیان ختم کر دیا۔ شروع کرنے سے پہلے ہی ختم کر دیا۔ شرم بھی آئی کہ وعظ کا سامان۔ فرش چوکی وغیرہ سب کچھ ہوا۔ لوگ بھی وعظ سننے کے لیے بہت اشتیاق سے جمع ہوئے لیکن مجھ سے کچھ بیان نہ ہو سکا۔ سب کو تعجب تھا۔ کیونکہ ایسا کبھی نہیں ہوا تھا۔ لیکن مجھے کچھ بھی تعجب نہ تھا کیونکہ مجھے محسوس ہو گیا تھا کہ یہ اللہ تعالیٰ نے میرے ناز کا علاج کیا ہے اور میرے اس خطرہ کا جواب دیا ہے۔ جو مجھ کو اس واقعہ سے قبل بھی گزرا تھا کہ مجھے بیان پر قدرت حاصل ہے۔

کرشمۂ قدرت

اللہ تعالیٰ نے دکھلا دیا کہ یہ سب ہماری توفیق ہے۔ ورنہ تمھیں کچھ بھی قدرت حاصل نہیں ہے چنانچہ میں نے اس خیال سے توبہ کی۔ بس پھر کبھی ایسا نہیں ہوا۔ عمر بھر میں ایک ہی مرتبہ یہ صورت واقع ہوئی اور اللہ تعالےٰ نے ساری عمر کے لیے سبق دے دیا۔ تاکہ کبھی وسوسہ بھی نہ آئے۔ کہ ہم جب چاہیں بیان کر سکتے ہیں اور یہ دکھلا دیا کہ جو بیان ہوتے ہیں۔ اللہ تعالےٰ کی توفیق سے ہوتے ہیں۔"

بڑے آدمیوں کی یہی نشانی ہوتی ہے کہ وہ اعترافِ گناہ میں دیر نہیں کرتے۔ ورنہ ایسے موقعوں پر لوگ عام طور پر تاویل سے کام لیتے ہیں اور ناسازیٔ طبع وغیرہ کا عذر کر کے اپنے عیب پر پردہ ڈال دیتے ہیں۔

خط خرافات

دنیا میں ایسا کوئی پیغمبر یا ولی نہیں گزرا جسے احکامِ الٰہی سُنانے کے عوض مخالفین کے سب وشتم کا نشانہ نہ بننا پڑا ہو۔ حضرت تھانویؒ بھی اس قاعدہ اور کلیہ سے مستثنےٰ نہ تھے جب آپ بلاخوف لَومَۃَ لَائِمٍ ردِ بدعات فرماتے تو مخالفین کے سینوں پر سانپ لوٹ

لوٹ جاتے۔ مگر حضرت کے خداداد رعب سے بدورانِ وعظ کسی کو لب کشائی کی کبھی ہمت نہ ہوئی البتہ جونپور میں قبل از وعظ حضرت کو ایک خط بذریعہ ڈاک ملا جس میں درج تھا کہ تم جلاہے ہو۔ جاہل ہو اور کافر ہو۔ ذرا سنبھل کر بیان کرنا۔

جامع جواب

حضرت نے قبل وعظ مجمع کو خطاب کرتے ہوئے مضمونِ خط سے آگاہ کرنے کے بعد فرمایا کہ :۔

"میں آپ سے اس امر میں مشورہ چاہتا ہوں۔ یہ جو لکھا ہے کہ تم جلاہے ہو۔ تو اگر میں جولاہا بھی ہوں۔ تو اس میں ہرج ہی کیا ہے۔ میں یہاں کوئی رشتے ناتے کرنے تو نہیں آیا۔ صرف احکام الٰہی سنانے آیا ہوں۔ اس کو قومیت سے کیا علاقہ۔ دوسرے یہ چیز اختیاری بھی نہیں۔ اللہ تعالےٰ نے جس کو جس قوم میں چاہا پیدا فرما دیا۔ سب قومیں اللہ کی بنائی ہوئی ہیں۔ سب اچھی ہیں۔ اگر اعمال و اخلاق اچھے ہوں۔ یہ تو تھی مسئلہ کی تحقیق۔ رہی واقعہ کی تحقیق۔ اس کی مسئلہ کی تحقیق کے بعد ضرورت ہی نہیں رہتی۔ بہرحال اگر آپ کو مجھ پر اعتبار ہے تو میں مطلع کرتا ہوں کہ میں جلاہا نہیں۔ اگر تحقیق کا شوق ہے تو وہ میرے عمائدِ وطن سے کی جا سکتی ہے۔ البتہ اتنا اقرار کرتا ہوں کہ میں جاہل بلکہ اجہل ہوں۔ لیکن جو کچھ اپنے بزرگوں سے سنا ہے اور کتابوں میں پڑا ہے۔ وہی نقل کر دیتا ہوں۔ اگر کسی کو کسی بات کے غلط ہونے کا شبہ ہو تو اس پر عمل نہ کرے۔

باقی رہا کافر ہونے کا معاملہ! اس میں قیل و قال کی ضرورت نہیں۔ میں آپ صاحبان کے سامنے پڑھتا ہوں اشھد ان لا الٰہ الا اللہ و اشھد ان محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ علےٰ والہٖ وسلم۔

اگر میں نعوذ باللہ کافر تھا۔ تو اب نہیں رہا۔ دھمکی کے متعلق عرض یہ ہے کہ وعظ گوئی میرا پیشہ نہیں ہے۔ اگر آپ صاحبان نہ چاہیں۔ تو میں ہرگز بیان نہ کروں گا۔ رہا سنبھل کر بیان کرنا۔ تو اس کے متعلق صاف صاف عرض کیے دیتا ہوں کہ میری عادت خود ہی چھیڑ چھاڑ کی نہیں ہے قصداً کبھی کوئی بات ایسی بیان نہیں کرتا جس سے کسی کی دلآزاری ہو یا فساد پیدا ہو لیکن اگر اصولِ شرعیہ کی تحقیق کے ضمن میں کسی ایسے مسئلہ کے ذکر کی ضرورت ہی آجاتی ہے۔ جس کا رسومِ بدعیہ سے تعلق ہو۔ تو پھر میں رُکنا بھی نہیں۔ اس لیے کہ یہ صریح دین میں خیانت ہے۔

تجویز و مشورہ

ان باتوں کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے اب جو آپ کی رائے ہو مطلع فرمائیے۔ اگر اس وقت کوئی ادنیٰ شخص بھی مجھ سے کہہ دے گا کہ بیان نہ کیا جائے تو ہرگز نہ کروں گا۔ لیکن اس کے متعلق میرا مشورہ یہ ہے کہ مجھے بیان کرنے دیا جائے۔ جب کوئی بات خلافِ طبع کرنے لگوں مجھے فوراً روک دیا جائے۔ فی الفور بیٹھ جاؤں گا۔ بہتر تو یہ ہے کہ صاحبِ خط ہی مجھے روک دیں۔ اگر انھیں شرم آئے یا ہمت نہ پڑے۔ تو کسی دوسرے کو سکھا پڑھا دیں۔ وہ ان کی طرف سے مجھے روک دے گا۔"

بس پھر تو بڑے بڑے بدعتی جو اس مجمع میں موجود تھے۔ خط لکھنے والے کو بُرا بھلا کہنے لگے۔ مگر حضرت نے انھیں روک دیا کہ گالیاں نہ دیجئے۔ مسجد کا احترام کیجئے۔

ردِ بدعات

اس کے بعد حضرت نے ردِ بدعات پر حسبِ عادت تہذیب و معقولیت کے ساتھ غیر دل آزارانہ طریق پر پرجوش تقریر فرمائی کہ حضرت کی طرف سے روک دینے کا اختیار پانے کے باوجود کسی کو ہمت نہ ہوئی۔ البتہ تصوّف کے بیان پر بدعتی سبحان اللہ سبحان اللہ کہتے رہے اور جب رد بدعات ہونے لگا۔ تو سب منقار زیرِ پر رہے حالانکہ ان میں ایک بااثر کٹر بدعتی

معقولی مولوی اور پھر پٹھان بھی موجود تھا۔ جس کی عادت تھی کہ جو بھی وعظ میں کوئی بات خلافِ طبع کہتا۔ یہ وہیں ہاتھ پکڑ کر منبر سے اتار دیتا، لیکن خدا کے فضل سے اس نے بھی دم نہ مارا اور چپکے سے بیٹھا سب کچھ سنتا رہا۔

اعترافِ حکمت

لیکن جب وعظ ختم ہونے کے بعد سب مجمع رخصت ہونے کے لیے کھڑا ہوا تو اس مولوی پٹھان نے حضرت سے صرف اس قدر کہا کہ :-

"ان مسائل کے بیان کرنے کی کیا ضرورت تھی ؟"

انھیں ایک دوسرے بدعتی خیال کے ذی اثر مولوی صاحب حضرت کی حمایت میں کچھ کہنے لگے کہ حضرت نے روک دیا کہ :-

"خطاب مجھ سے ہے، آپ جواب نہ دیں۔ مجھے عرض کرنے دیں"۔

اور پھر ان معقولی مولوی صاحب سے فرمایا :-

"آپ نے یہ بات پہلے مجھ سے کیوں نہ فرمائی۔ جب میں نے مشورہ طلب کیا تھا اور پھر بیان میں کیوں نہ روکا۔ جبکہ میں نے آپ کو اختیار دیا تھا۔ اب اور تو کچھ نہیں ہو سکتا۔ مجمع ابھی موجود ہے۔ آپ ابھی پکار کر کہہ دیجئے کہ اس بیان کی کوئی ضرورت نہ تھی اگرچہ وہ میرے نزدیک ایک ضروری بیان تھا مگر میں آپ کی تکذیب نہ کروں گا۔"

اس پر لوگ ہنس پڑے اور وہ صاحب اپنی اہانت کے خوف سے حضرت کی حکمتِ عملی کا امتحان کرتے ہوئے چل دیئے۔ لوگ انھیں برا بھلا کہنے لگے تو حضرت نے کھڑے ہو کر فرمایا کہ :-

"صاحبو۔ ایک پردیسی کی وجہ سے آپ اپنے مقامی علماء کو ہرگز نہ چھوڑیں"۔

عزت و راحت

ان واقعات کو بیان کر کے حضرت فرمایا کرتے تھے کہ :-

"الحمد للہ بڑے بڑے مخالفین میں وعظ کہنے کا اتفاق ہوا لیکن کبھی کوئی ناگوار واقعہ پیش نہیں آیا۔ نہ کہیں بے آبروئی ہوئی۔ یعنی ایسی جس کو عادۃً بے آبروئی سمجھا جاتا ہے۔ مختلف مقامات پر جانا ہوا اور مختلف الخیال لوگوں سے سابقہ رہا۔ کہیں اپنے مسلک اور مشرب کو چھپایا نہیں۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے سب جگہ عزت اور آرام ہی کے ساتھ عمر بھر رکھا۔ البتہ دو بار قدرے خلجان پیش آیا جو حدِ کلفت تک نہ پہنچا تھا۔"

موقع شناسی

ایک ہم وطن دوست کی طلب پر ایک دفعہ حضرت تھانویؒ مولانا خلیل احمد سہارنپوریؒ کے ہمراہ جودھپور تشریف لے گئے۔ جہاں متعدد وعظ ہوئے۔ جن سے اہلِ بدعت بھی خاطر خواہ طریق پر متاثر ہوئے۔ ایک روز اس میزبان نے حضرت کے وعظ کے لیے ایسے مقام کا اعلان کیا جہاں کے لوگ نہ صرف اہلِ فساد اور اہل عناد بدعتی تھے۔ بلکہ وہ میزبان سے ذاتی کدورت بھی رکھتے تھے۔ پھر یہ اعلان ان کی رضا و مشورہ کے بغیر کیا تھا۔ اس لیے وُہ یوُں سمجھے کہ ان کو زک پہنچانے کے لیے یہ حضرت کا وعظ کرا رہے ہیں۔ جبکہ ہماری طرف سے کوئی درخواست وعظ نہیں۔ اس لیے ہم اپنی مسجد میں وعظ نہ ہونے دیں گے۔ میزبان کو بھی اس بات کا علم ہوگیا اور اس نے پولیس کی امداد کا انتظام کر لیا تاکہ کسی قسم کا اندیشہ فساد نہ رہے۔ جب حضرت تھانویؒ کو اس کیفیت کا علم ہوا تو انھوں نے حسبِ عادت ایسی تشویش کی جگہ پر وعظ نہ کرنے کا اعلان فرما دیا۔ مگر مولانا خلیل احمدؒ نے فرمایا اگر ایسا بھی ہو۔ تب بھی تبلیغ حق میں ایسے امور کی پروا نہ کرنا چاہیئے۔ مولانا کے اس ارشاد پر حضرت نے بدیں وجوہ موافقت کر لی کہ :-

"ایک اس وجہ سے کہ منشا، اس رائے کا دین ہے۔ گو وہ امر اجتہادی ہے جس میں موافقت واجب نہیں۔ مگر ناجائز بھی نہیں۔ دُوسرے اس وجہ سے کہ جب مولانا جانے کو تیار ہیں۔ تو مَیں کیا چیز ہُوں کہ اپنی جان بچاؤں۔"

جب یہ حضرات اس مسجد میں پہنچے تو سب نے بلا سلام و کلام غیظ آلود نگاہوں سے استقبال کیا۔ یہ سب حضرات خاموشی سے بیٹھ گئے۔ نماز سے فارغ ہو کر سُنتیں پڑھنے لگے کہ دونوں طرف سے آویزش ہو گئی یہاں تک کہ لوگوں کو سُنتیں بھی بھُول گئیں کہ وعظ نہیں ہونے دیں گے۔ ایک اُٹھ کر خود منبر پر بیٹھ گیا کہ جب منبر ہی فارغ نہ ہو گا۔ تو وعظ کس پر بیٹھ کر کریں گے۔ بعض نے آستینوں سے خنجر نکال لیے۔ مولانا تو اس لیے مطمئن تھے کہ حضرت خود تمام حالات پر قابو پا لیں گے اور حضرت اس لیے متفکر تھے کہ کوئی ناخوشگوار واقعہ نہ ہو جائے۔ کیونکہ جس امدادی پولیس کا آپ کے میزبان نے انتظام کر رکھا تھا۔ اس کا کہیں بھی نام و نشان ہی نظر نہ آتا تھا۔ حضرت نے سُنتوں سے فارغ ہوتے ہی بھانپ لیا کہ یہ سارا غیظ و غضب اس احتمال پر ہے کہ کہیں وعظ نہ ہونے لگے۔ اس لیے آپ نے مفسدین کے سرغنہ کو اپنے پاس بلایا۔ وُہ حضرت کے رُعب سے تو آ گیا۔ مگر بڑے غصہ سے کہا کہیئے! حضرت نے فرمایا:-

"تم کو یہ شُبہ ہے کہ وعظ ہو گا۔ لو سن لو۔ مَیں ہی وُہ واعظ ہُوں۔ میرا وعظ ایسا ارزاں نہیں کہ کسی کے سر ہو کر کہوں۔ مَیں تو بہت خوشامد کرا کر وعظ کہتا ہُوں اور اس حالت میں تو کسی طرح کہہ ہی نہیں سکتا۔ تم اطمینان رکھو۔ مَیں ہرگز وعظ نہ کہوں گا۔ خواہ تمام اہلِ محلہ بھی درخواست کریں۔ تم لڑو مت۔ یہ اعلان میرے مشورہ کے بغیر اور میرے مزاج کے خلاف ہُوا ہے۔"

اس لیے نہ صرف وُہ ٹھنڈا ہو گیا بلکہ سب خاموش ہو گئے۔ فضا میں سکون پیدا ہوتے ہی حضرت مع مولانا و ہمراہیوں کے مسجد سے رخصت ہُوئے۔ انھیں راستہ میں محافظانِ امن کا ایک دستہ ایک سب انسپکٹر کی زیرِ سرکردگی آتے ملا۔ وُہ کہنے لگے حضرت چلیے۔

وعظ فرمایئے۔ آپ نے فرمایا:۔

سبحان اللہ کیا موقع پر پہنچے ہیں۔ یہاں تو خون ہو جاتا۔ آپ کا آنا کس مصرف کا ہوا۔

ع پس ازاں کہ من نمانم بچہ کار خواہی آمد

اس پر مولانا بہ مسرت فرمانے لگے کہ:۔

" راہِ حق میں ایسی کلفت بھی کیسی لذت بخش ہے۔"

اُدھر مفسدین کا سرغنہ کہہ رہا تھا:۔

" ان لوگوں کی کیا بات ہے۔ ان لوگوں کی تو جوتیاں ہم اپنے سر پر رکھ لیں۔ یہ سارا فساد ان کے میزبان کا ہے۔ جس نے اپنی رائے سے اعلان کر دیا۔ ہم کو وعظ ہونا ناگوار نہ تھا بلکہ یہ متغلبانہ تصرف ناگوار ہوا۔ ہم کو خاص طور پر اطلاع کی جاتی تو ہم خود حاضر ہو کر وعظ کی درخواست کرتے۔ پھر آنے والوں کے لیے خاص طور پر فرش کا۔ برف کا، شربت کا انتظام کرتے۔ اس طرح ہماری سخت اہانت تھی جو کسی طرح گوارا نہ تھا۔

گویا یہ خلجان محض حضرت کے میزبان کی کوتہ اندیشی کی وجہ سے ہوا۔

قاتلانہ حملہ

اسی طرح آپ کو ایک مرتبہ بمبئی میں بھی کلفت کا سامنا ہوا۔ آپ وہاں اپنی چھوٹی اہلیہ محترمہ کو لینے گئے۔ جو حج سے واپس آرہی تھیں۔ وہاں عام طور پر حکیم محمد سعید صاحب کے ہاں ٹھہرا کرتے تھے۔ اس دفعہ ان کی عدم موجودگی کی وجہ سے ایک اور صاحب نے از راہِ محبت اپنے ہاں ٹھہرا لیا۔ مغرب کی نماز حضرت نے ان کے محلہ کی مسجد میں پڑھی۔ اتفاق سے ان دنوں کوئی مناظرہ ہونے والا تھا جس کے سلسلہ میں باہر سے بعض مناظرین نے آنا تھا۔ چونکہ جہاز دیر سے پہنچا تھا۔ اس لیے کپتان نے سواریوں کو نہ اُترنے دیا کہ صبح

اتاریں گے۔ جس کی وجہ سے حضرت کو رات وہاں رہنا پڑا۔ اہل محلہ کو جو جماعت مفسدین سے تعلق رکھتے تھے۔ شبہ ہوا کہ شاید حضرت بھی اس مناظرہ کے سلسلہ میں آئے ہیں۔ اس لیے انھوں نے تحقیق کیے بغیر نہ آؤ دیکھا۔ نہ تاؤ بمصداق

چو حجت نماند جفا جوئے را
بہ پرخاش درہم کشد روئے را

مسلح ہو کر بعد عشاء مداخلت بے جا کرتے ہوئے اس مکان میں گھس آئے اور لالٹین توڑ کر حضرت پر حملہ کر دیا۔ جس کو حضرت کے ایک ہمراہی رئیس کے ملازم نے روکا اور حضرت اس تاریکی میں سڑک کی طرف ایک برآمدہ میں ہو گئے۔ جہاں سے صاحب خانہ نے پولیس کو آواز دی۔ جس پر وہ سر پر پاؤں رکھ کر بھاگ نکلے اور اس طرح حق تعالیٰ نے سب کو محفوظ رکھا۔ صبح کو محبین نے پولیس کمشنر کو اطلاع دی۔ اس نے کہا کہ صاحب معاملہ کو تکمیل تفتیش تک ٹھیرنا پڑے گا۔ اس وقت تک یہ امر تصدیق ہو چکا تھا کہ حملہ آوروں کو حضرت کے شرکتِ مناظرہ کا دھوکا ہوا تھا۔ اس لیے حضرت نے اس غرض کے لیے وہاں ٹھہرنا گوارا نہ کیا۔ لکھتے ہیں کہ :-

"مجھ کو یہ دو وجہ سے منظور نہ ہوا۔ ایک تو اس لیے کہ میں حجاج کو جلد گھر پہنچانا چاہتا تھا دوسرے یہ کہ ان لوگوں کا یہ فعل عمداً نہ تھا۔ قتل خطا کی قابل قصاص نہ تھا پھر ایسے مواخذات اپنے بزرگوں کی وضع کے بھی خلاف تھے۔ البتہ میں نے مکان بدل لیا اور پھرتا رہا۔ کیونکہ ان کو دھوکہ ہونا محقق ہو گیا تھا اور امن و امان سے اپنے وطن واپسی ہوئی۔ یہ قصہ اتنا غلط مشہور ہوا کہ قتل تک کی روائتیں پھیل گئیں۔ تحقیق کے لیے دوستوں کے خطوط آئے۔ واقعیت معلوم کر کے سب مطمئن ہو گئے۔ غرضیکہ بفضلہ تعالےٰ کسی سفر میں میرے کسی فعل کی وجہ سے کسی کو کوئی ناگواری یا برہمی نہیں

ہوئی اور ان دو مقام یعنی بمبئی اور رجودھپور میں جو ہوا۔ غیروں کے سبب ہوا اور ان کے اثر سے بھی اللہ تعالیٰ کی حفاظت رہی۔"

عزمِ سفر یورپ

حضرت تھانویؒ نے چونکہ تبلیغِ دین کو مقصودِ حیات بنا لیا تھا۔ اس لیے اس غرض کے لیے آپ ہر جگہ جانے کے لیے تیار ہو جاتے تھے اور بعد زمانی و مکانی کو قطعاً خاطر میں نہ لاتے تھے۔ آپ کے ایک ہم وطن بابو حبیب احمد صاحب تھانویؒ کسی کام کے سلسلہ میں یورپ تشریف لے گئے۔ وہاں واقفیت بڑھنے پر انھوں نے لوگوں کے سامنے وقتاً فوقتاً اسلام کی خوبیاں بیان کرنی شروع کر دیں۔ جس کے نتیجہ کے طور پر وہاں کچھ لوگ مسلمان ہو گئے۔ جن میں بعض بڑے طبقہ اور بعض بڑے خاندانوں سے تعلق رکھتے تھے۔ اس سلسلہ میں وہ اکثر مسائل کے سلسلہ میں حضرت تھانویؒ سے بذریعہ خط و کتابت معلومات حاصل کرتے تھے اور نومسلموں کے نام بھی تجویز کرایا کرتے تھے۔ چنانچہ ایک کالج کی پروفیسر یا پرنسپل جو مسلمان ہوئی۔ حضرت نے اس کا نام "براڈے" "بریدہ" میں بدل دیا۔ جس سے وہ بہت خوش ہوئی اور حضرت کی خدمت میں شکریہ کا خط بھیجا۔

اس خط و کتابت کی وجہ سے بعض نومسلموں کو حضرت سے غائبانہ تعلق پیدا ہو گیا۔ ان میں سے ایک کا خط بھی حبیب احمد صاحب کی معرفت آیا کہ ہمیں حاضری کا اشتیاق ہے مگر پردہ کے پابند نہ ہونے کی وجہ سے ممکن ہے کہ ہماری عورتوں کی حاضری باعث ناراضی ہو۔ اس محقق کامل نے جواب میں لکھا کہ :-

"وجہ اور کفین کا ستر فی نفسہٖ واجب نہیں بلکہ فتنہ کے سبب مامور بہ ہے اور آپ کی عورتوں کی طرف یہاں کے لوگوں کو رُعب کی وجہ سے کسی قسم کا نفسانی خیال ہونا بعید ہے۔ لہٰذا انتفاء علت کے سبب ان کو اس کی اجازت ہل سکتی ہے۔"

اسی خط و کتابت کے دوران میں بابو حبیب احمد صاحب نے حضرت کو تبلیغی اغراض کے لیے یورپ آنے کی دعوت دی اور مترجم کی حیثیت سے اپنی خدمات بھی پیش کیں۔ چونکہ وہاں تبلیغ کے بہت ہی زیادہ اور مفید نتائج برآمد ہونے کی اُمید تھی۔ اس لیے آپ نے فوراً یورپ کا عزم کرلیا اور اس غرض کے لیے اپنے پاس سے مصارف اور ایک مترجم ترجمان کا بھی انتظام کرلیا مگر روانگی سے قبل آپ نے انھیں خط لکھا کہ :۔

"آنے سے پیشتر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ آپ ان لوگوں کے کچھ شبہات لکھ کر بھیج دیں اور یہاں سے جو جواب پہنچے۔ وہ ان کو سنا دیا جائے۔ تاکہ یہ اندازہ ہو جائے کہ آیا میرے جواب ان کے مذاق کے موافق بھی ہوتے ہیں یا نہیں اگر اس سے نفع ہو۔ تو آنا مناسب ہوگا۔ ورنہ اتنا طویل سفر کیوں اختیار کیا جائے۔"

مگر یہ ابھی ان تک پہنچنے بھی نہ پایا تھا کہ بابو حبیب احمد صاحب کا انتقال ہوگیا جس کی وجہ سے آپ اس تبلیغی دورہ پر نہ جاسکے۔

فتنہ ارتداد

۱۳۴۱ھ میں اطراف آگرہ کی طرف فتنہ ارتداد پھیل گیا۔ اس کے انسداد کے لیے آپ نے مولوی عبدالکریم صاحب گمتھلوی اور مولانا عبدالمجید صاحب بچھرایونی کو روانہ فرمایا۔ تاکید فرمائی کہ مبلغ کو لوگوں پر کھانے کا یا اور کسی قسم کا بار ہرگز نہ ڈالنا چاہیئے۔ حتیٰ کہ اگر وہ خوشی سے کوئی خدمت کرنا چاہیں۔ تب بھی عذر کر دیا جائے۔ صرف اس کی اجازت ہے کہ اگر کوئی شخص مبلغ سے آٹے وغیرہ کے پیسے لے کر کھانا پکوا دے تو مضائقہ نہیں بشرطیکہ کسی مقامی مصلحت کے خلاف نہ ہو اور کوئی شرعی مانع بھی نہ ہو اور اس کی بھی اجازت عطا فرمائی کہ جن ضروری چیزوں کا انتظام مبلغ خود نہ کرسکے۔ مثلاً چارپائی۔ وہ اگر کوئی شخص خوشی سے پیش کرے تو استعمال کا مضائقہ نہیں۔ مگر از خود ایسی اشیاء بھی طلب نہ کی جاویں۔

البتہ کسی کے بلانے پر جاویں تو داعی کے یہاں کھانا اور اس سے کرایہ لینا امر آخر ہے۔ اور اس معمول کو عام رکھا جائے۔ کیونکہ اگر کسی شخص کو خصوصیت کی وجہ سے مستثنیٰ کیا گیا تو دوسروں کو شکایت ہوگی۔ ان شرائط کے ساتھ ساتھ آپ نے مبلغین کی راحت کا خاصا انتظام فرمایا مصارف سفر میں ان کو بہت وسعت عطا فرمائی تاکہ بشاشت سے کام ہو سکے۔ یہاں تک کہ مصارف کا تفصیلی حساب طلب نہ فرمایا۔ کیونکہ آپ غیر معتمد کو سرے سے مبلغ ہی نہ رکھتے تھے اور معتمد سے تفصیل طلب کرنے کی ضرورت نہ سمجھتے تھے۔

ارتداد زدہ علاقہ میں مبلغین بھیجنے کے علاوہ آپ نے خود بھی ایک سفر فرمایا جس میں ریواڑی۔ نارنول اور موضع اسمٰعیل پور متصل الور میں الاتمام نعمۃ الاسلام وعظ ہوا جس کے تین حصے ہیں۔ دوسرے سفر کا قصبہ نوح اور فیروزپور جھرکا وغیرہ کے لیے ارادہ فرمایا تھا کہ اسی اثناء میں سفر سے عذر پیش آگیا جس کی وجہ سے سفر بالکل موقوف کر دیا۔ اسی زمانہ میں آپ نے رسالہ "انسداد لفتنۃ الارتداد" "حسن اسلام کی ایک جھلک" "نماز کی عقلی خوبیاں" شائع فرمائے۔ جن میں سے موخر الذکر دو رسالوں کا ہندی ترجمہ بھی شائع کیا گیا۔ ایک رسالہ میں وید سے گائے کی قربانی کو ثابت کیا۔

آپ کو تبلیغ کا اتنا اہتمام تھا کہ مولانا عبدالکریم صاحب کے ایک دوست نے انھیں اپنے ہمراہ حج پر لے جانا چاہا۔ مولانا صاحب کو بے حد اشتیاق حج بیت اللہ کا تھا انھوں نے حضرت سے اجازت چاہی تو آپ نے فرمایا کہ جس کام میں یہاں مشغولی ہے۔ وہ حج نفل سے مقدم اور افضل ہے اور بڑے جوش کے ساتھ فرمایا کہ ایسے ہی موقع کے لیے حضرت مسعود بکؒ نے فرمایا ہے ؂

اے قوم بہ حج رفتہ کجائید کجائید
معشوق دریں جاست بیائید بیائید

اس تبلیغی مہم سے پہلے دو سال کے اندر ہی ارتداد کی کافی روک تھام ہو گئی تھی۔

اس کے بعد مولانا عبدالکریم صاحب کو تحریک عدل فی المیراث کے سلسلہ میں پنجاب بھیج دیا اور مولانا عبدالمجید صاحب پُورے بارہ سال خانقاہ کی طرف سے یہ فریضۂ تبلیغ ادا کرتے رہے۔ جس سے بہت نفع ہوا۔

اہتمامِ تبلیغ

حضرتؒ ہمیشہ اسلامی مدارس کو بھی اس طرف توجہ دلاتے رہتے تھے کہ تبلیغ کا اہتمام بھی تعلیم کی طرح ضرور کیا جائے۔ کیونکہ تعلیم و تعلم کا اصل مقصد ہی تبلیغ ہے جو حضرات انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کا فرضِ منصبی تھا۔ چنانچہ خانقاہ کی طرف سے بھی آپ نے تبلیغ کا سلسلہ جاری فرما رکھا تھا اور اس غرض کے لیے باقاعدہ مبلغ رکھے ہُوئے تھے۔ "حیات المسلمین" بھی خاص تبلیغ کی نیت سے مرتب فرمائی تھی۔ ۱۳۵۵ھ میں تو اس سلسلہ کو باقاعدگی کے ساتھ چلانے کے لیے ایک خاص صورت تبلیغ و اشاعت کی تجویز فرمائی جو نہایت مفید اور سہل ثابت ہُوئی اور اس کو آثارِ رحمت ۱۳۵۵ھ کے لقب سے چھپوا کر شائع فرمایا۔

خطابِ خاص

غرضیکہ حضرت کی زندگی کا بیشتر حصّہ تبلیغ دین میں ہی صرف ہُوا اور ہزاروں وعظ فرمائے۔ اخیر عمر میں حضرتؒ نے قریب قریب وعظ کہنا ترک فرما دیا تھا۔ اگر کبھی کوئی اتفاق ہوتا تو حضرت ہاتھ میں کوئی کتاب لے کر بیان فرما دیتے۔ آپؒ فرمایا کرتے تھے کہ:۔

"اب وہ اُمنگ ہی نہیں رہی۔ جس کا سبب یہ ہے کہ بفضلہٖ تعالیٰ ساری ضروری باتیں بیان کی جا چکی ہیں اور بوجہ زیادتِ سن ضعف بھی عارض ہو گیا ہے۔ اَب لمبی تقریر سے جی الجھتا ہے۔ بس ضرورت کے موافق خطابِ خاص پر ہی اکتفا کرنا پسند کرتا ہوں اور حقیقت خطاب خاص ہی زیادہ منافع ہوتا ہے۔ کیونکہ اس میں سب ضرورت ہی کی باتیں ہوتی ہیں۔"

فیضانِ خداوندی

صاحب "اشرف المعمولات" لکھتے ہیں کہ :۔

"حضرت والا کی ذات بابرکات سے جو کچھ امتِ مرحومہ کو فائدہ پہنچا ہے۔ محتاج بیان نہیں۔ حضرت والا کے فیوضِ عامہ میں سے حضور کے مواعظ بھی ہیں۔ جو حضور کی کھلی کرامت ہیں۔ علوم و معارف کا ارشاد وقت کے لحاظ سے ہونا فیضانِ خداوندی ہوتا ہے۔ جتنی خوبیاں کسی کلام میں ظاہری و باطنی ہو سکتی ہیں۔ من کل الوجوہ حضور کے مواعظ میں موجود ہوتی ہیں۔ حضرت کے مواعظ میں علماء طلبا اور عوام سب قسم کے لوگ شامل ہوتے ہیں۔ اور اپنے اپنے مذاق کے موافق حظ اٹھاتے ہیں۔ مثلاً

۱۔ علماء علوم و معارف دیکھ دیکھ کر عش عش کرتے ہیں۔ انکل مسائل کا حل پاکر شاد ہوتے ہیں۔

۲۔ صُوفی منش اصحاب اپنے اپنے امراض باطنی کا حل پاکر دل ہی دل میں دعائیں دیتے جاتے ہیں۔

۳۔ عوام اپنے کام کی باتیں سُن کر الگ محظوظ ہوتے ہیں۔

۴۔ نئی روشنی کے دلدادہ اپنے خیالاتِ فاسدہ کی تردید سُن کر اوہام باطلہ سے تائب ہوتے ہیں۔

۵۔ قرآن کریم اور احادیث شریف میں باہم جہاں بظاہر تعارض معلوم ہوتا ہے۔ اس کو باحسن وجوہ حل فرماتے ہیں اور عجیب وغریب نکات و لطائف معرضِ ظہور میں آتے ہیں۔

۶۔ علومِ ظاہری و مسائل فقہیہ کو بھی عجیب انداز سے ارشاد فرماتے ہیں۔

۷۔ باطنی مسائل اور جہلاء صوفیہ کے اغلاط کو بھی بیان فرماتے ہیں۔ تاکہ عوام راہ پاکر جہلا صُوفیہ کے جال سے نجات پاویں۔

۸۔ کفار کے اعتراضات کے جوابات ایسے طرز سے بیان فرمائے جاتے ہیں کہ دوبارہ اس پر اعتراض کرنے کی گنجائش ہی نہیں رہتی۔

پسندیدگی رسولؐ

یہ انہی خصوصیات کا نتیجہ تھا کہ فخرِ موجودات سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی حضرت تھانویؒ کے مواعظ پر پسندیدگی کا اظہار فرمایا۔ جیسا کہ اصدق الرویا کے مندرجہ ذیل خواب سے ظاہر ہے جو بستی گوگران تحصیل کرانہ کے ایک مردِ صلح نے جمعرات ۵ شعبان ۱۳۵۳ھ کو دیکھا تھا۔ وہ لکھتے ہیں کہ :۔

"حضور رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم تشریف فرما ہیں اور ان کی خدمت میں ہمارے حضرت (تھانویؒ) اور دیگر علماء حضرات حاضر ہیں۔ ایک بڑا مکان ہے۔ سب علماء نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے درخواست کی کہ حضورؐ وعظ فرما دیں۔ حضورؐ نے جواب میں فرمایا کہ وعظ کرنے والے بہت سے علماء موجود ہیں۔ پھر دوبارہ علماء نے درخواستِ وعظ کی کہ حضورؐ صلی اللہ علیہ وسلم نے دوبارہ جواب میں ہمارے حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی صاحب مدظلہ العالی کی طرف اشارہ کر کے فرمایا کہ وعظ انہیں بیان کرنا چاہیئے یہ اچھا وعظ بیان کرنے والے ہیں۔ سب علماء چپ ہو گئے۔"

اس سے ظاہر ہے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ وسلم کی خوشنودی ہی مقبولیتِ مواعظ کا باعث تھی۔

تاثر سامعین

حضرت تھانویؒ کے وعظ میں علماء فضلاء حکماء۔ امراء۔ ادباء۔ شعراء۔ وکلاء غرضیکہ ہر طبقہ کے لوگ شمولیت کرتے تھے۔ اپنے تو خیر غیر بھی بہت ہی متاثر ہو کر جاتے تھے۔ ان کے تاثر کا اندازہ حسب ذیل چند آراء سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے۔

۱۔ ایک انگریزی خواں عہدہ دار نے صاحب اشرف السوانح سے کہا :۔

"ہم نہیں سمجھتے تھے کہ مولویوں میں بھی ایسے واعظ ہیں۔ جو ہر بات کو دلیل منطقی و عقلی سے ثابت کریں ۔"

۲۔ ایک بار حضرت مجذوبؒ وعظ "راحت القلوب" ریل میں بیٹھے اپنے احباب کو پڑھ کر سُنا رہے تھے کہ چند ہندو سامعین کہنے لگے کہ :۔

"یہ کتاب کسی بڑے قابل کی لکھی ہُوئی ہے ۔"

۳۔ سفر رنگون کے دوران میں انہی کی زبانی وعظ "طریق القلندر" سُن کر جہاز کا کپتان کہنے لگا :۔

"اگر یہ شخص انگریزی پڑھتا۔ تو جج ہو جاتا۔"

۴۔ بھوپال میں حضرت کے وعظ سُن کر ولایت کا سند یافتہ مرہٹہ کہنے لگا کہ :۔

"مَیں نے بڑے بڑے لیکچر دینے والوں کے لیکچر ہندوستان اور ولایت میں سُنے ہیں لیکن کسی میں مَیں نے وُہ بات نہیں دیکھی۔ جو آج مَیں نے ان کے بیان میں دیکھی ۔ بدوں پہلے سے نوٹ لکھے ہُوئے اتنا طویل طویل بیان اور ایسا مدلل مربُوط اور پھر اس قدر دانی کے ساتھ اس سے پہلے مَیں نے کبھی نہیں سُنا ۔"

۵۔ ڈیگ ریاست بھرت پور میں حضرت کا وعظ سُن کر ایک نو تعلیم یافتہ آریہ افسر کہنے لگا کہ :۔

"مجھے حیرت ہُوئی کہ ایک خالص مذہبی مسئلہ پر یعنی روزہ پر تو وعظ تھا لیکن ایسے مضامین تھے کہ ان کو ہر مذہب والا اپنے اصُول پر منطبق کر سکتا ہے۔"

۶۔ کانپور میں ایک وکیل صاحب حضرت کا وعظ سُن کر کہنے لگے کہ :۔

"آپ بھی کہاں مولویوں میں جا پھنسے۔ آپ اگر وکالت پاس کر لیتے، تو

وکیلوں میں آپ کا کوئی نظیر نہ ہوتا۔"

۷۔ ایک صاحب دل عاقل نے حضرت کے وعظ کا یوں نقشہ کھینچا کہ :۔

"حضرت کا وعظ کیا ہوتا ہے۔ حلقۂ مشائخ ہوتا ہے۔"

۸۔ ایک بدعتی مولوی جو دھپور میں حضرت کا وعظ سن کر اپنے ہم مشربوں کو کہنے لگا کہ :۔

"آپ جانتے ہیں کہ میں مولودیہ بھی ہوں۔ قیامیہ بھی ہوں مگر انصاف اور حق یہ ہے کہ جو تحقیق آج مولوی صاحب نے بیان فرمائی ہے۔ صحیح وہی ہے۔"

طباعت مواعظ

چونکہ حضرت کے مواعظ عوام و خواص اور موافق و مخالف سب طبقوں میں نہایت مفید و مقبول ہونے لگے اس لیے حضرت کے مخلصین نے حضرت کے ایماء یا تحریک کے بغیر از خود انھیں قلمبند کرنے کی کوشش شروع کر دی۔ چونکہ حضرت بہت روانی اور تیزی سے بیان فرماتے تھے۔ جن میں دقیق علمی مسائل ہوتے تھے۔ اس لیے مواعظ کو قلمبند کرنے کے لیے ایک صاحب کو مختصر نویسی دلائی گئی۔ لیکن وہ کامیاب نہ ہو سکے۔ پھر مولوی حکیم محمد مصطفٰے نے حضرت کے مواعظ عربی میں بطور مختصر نویس قلمبند کرنے شروع کیے۔ جنھیں وہ بعد میں اردو میں منتقل کر دیتے اور جس قدر مواعظ ضبط تحریر میں لائے جاتے وہ حضرت کی خدمت میں نظر ثانی کے لیے پیش کیے جاتے۔ تاکہ اگر کسی مقام پر کوئی سہو و خطا ہو تو درستی ہو جائے۔ نظر ثانی کے بعد اس نام سے جو حضرت وعظ کا رکھتے اسے شائع کر دیا جاتا اور ساتھ ہی بہ نمونہ ذیل ہر وعظ پر ایک گوشوارہ بنا دیا جاتا۔ تاکہ اس کی نوعیت، مقام اور تاریخ کا پتہ چل سکے :۔

کہاں ہوا	کب ہوا	کتنی دیر میں بیان ہوا	کس نشست سے ہوا یعنی بیٹھ کر یا کھڑے ہو کر	کس کی درخواست پر ہوا	کیا مضمون تھا	وعظ کا کیا عنوان قائم ہوا	کس طبقہ کے مجمع زیادہ مفید ہوا	کس نے قلمبند کیا	سامعین کی تخمیناً تعداد کیا تھی	متفرقات

اگرچہ مواعظ کے قلمبند کرنے کا شوق مخلصین میں حضرت کی وعظ گوئی سے بہت دیر بعد پیدا ہوا مگر پھر بھی ۳۶۳ وعظ حضرت کے تصدیق و تصحیح شدہ حالت میں موجود ہیں اور یہ اب تک رسالہ "الابقا" میں جو کراچی سے کتب خانہ اشرفیہ مولوی مسافرخانہ بندر روڈ کراچی شائع کرتا ہے۔ مکرر مسلسل اور متواتر شائع ہوتے رہتے ہیں۔ اس رسالہ میں سوائے حضرت کے مواعظ کے اور کچھ نہیں ہوتا۔ جنھیں پڑھ کر ہزاروں گمراہ راہ پر آرہے ہیں۔ ہر وعظ پڑھنے والوں پر ایسے نقوش چھوڑ جاتا ہے جو ان کی کایا پلٹ دیتا ہے مثلاً وعظ "روح الارواح" کو دیکھ کر بعض درویش جو شریعت اور طریقت کو جدا جدا سمجھتے تھے۔ یہاں تک کہ نماز بھی نہ پڑھتے تھے۔ وہ اپنے عقائد سے تائب ہو کر نماز کے عادی بن گئے۔ مولود شریف کے متعلق مواعظ "تلج الصدور" پڑھ کر بعض متشددین کی بھی غلط فہمیاں دور ہو گئیں اور ان کے عقائد درست ہو گئے۔ بلکہ وہ دوسروں کی بھی اصلاح عقائد کرنے لگے۔ حالانکہ انھوں نے نہ کبھی حضرت کی زیارت کی نہ رجوع کیا۔ اسی طرح وعظ "راحت القلوب" کے مطالعہ سے بہت سے ایسے پریشان حال مطمئن اور متوجہ بحق ہو گئے۔ جن کی زندگی کو مصائب و حوادث نے تلخ بنا دیا تھا۔

مقبولیتِ مواعظ

حضرت کے مطبوعہ مواعظ عام طور پر بڑے متکبرین۔ ملحدین۔ نو تعلیم یافتہ مسلمانوں، ہندوؤں، عیسائیوں اور شیعوں اور وہابیوں کے حلقوں میں بھی بڑی دلچسپی کے ساتھ پڑھے جاتے دیکھے گئے۔ شیعوں کے بعض مجتہدین خود صاحب اشرف السوانح سے حضرت کے مطبوعہ مواعظ منگا کر ان کے مضامین سے اپنی مجلسوں کو گرم کرتے اور رونق دیتے اور اکثر واعظین صرف حضرت کے وعظ یاد کر کے لوگوں کو سناتے اور ان کی نظروں میں مقبول ہو کر معقول معاوضے حاصل کرتے۔ اور یہ سلسلہ اب تک جاری ہے۔ ہم سے بھی بعض وکلاء حضرت کے مواعظ لے کر پڑھتے رہتے ہیں۔

شرفِ اولیت

یہ شرف و فضیلت صرف حضرت تھانویؒ کو ہی حاصل ہے کہ حق تعالیٰ نے اُمّتِ محمدیہ کی اصلاح کے لیے ان کے بعض مخلصین کے دل میں مواعظ قلمبند کر کے طبع کرانے کا خیال پیدا فرمایا۔ جس کی وجہ سے آج ہمارے پاس اتنی بڑی تعداد میں حضرت کے خطباتِ موعظت مقالاتِ حکمت اور مجادلاتِ معدلت موجود و محفوظ ہیں۔ حالانکہ مشاہیر اسلام میں سے کسی کے اس قدر خطبات اس طرح مطبوع اور مقبول نہیں ہوئے۔ ذالك فضل الله یوتیہ من یشاء۔

معمولاتِ وعظ

سادہ لباس میں آنا

حضرت تھانوی عام مقررین اور واعظین کی طرح وعظ کے وقت پُرتکلف لباس پہن کر جانے کے عادی نہ تھے۔ جس حال میں ہوتے۔ اسی طرح بے تکلف چلے جاتے۔ شملہ میں ایک وعظ کے موقع پر حضرت کو سادہ لباس میں دیکھ کر ایک "تہذیب یافتہ" نے منتظم جلسہ سے کہا کہ تمہارے علماء کا لبادہ کیسا ہے؟ جیسے پاخانہ سے نکل کر آئے ہوں۔ انھوں نے فرمایا کہ لباس پر نظر رکھنے کی بجائے وعظ پر کان رکھیں۔ وعظ ختم ہونے پر جب اُنھوں نے اس سے کیفیت پوچھی تو کہنے لگے کہ :۔

"میری حماقت تھی۔ میں تو یہ سمجھتا تھا کہ جیسا لباس ہے۔ ویسا ہی وعظ ہوگا۔ مگر یہاں تو معاملہ ہی برعکس نکلا۔ سُبحان اللہ! کیا بیان تھا۔ لباس سے ہرگز معلوم نہ ہوتا تھا کہ یہ اتنا بڑا شخص ہے۔"

حضرت تھانویؒ کے کان میں بھی کسی طرح یہ بات پہنچ گئی تو دوسرے وعظ میں آپ نے اس اعتراض کا لطیف پیرایہ میں جواب دیتے ہوئے فرمایا :-

"مجھے معلوم ہوا ہے کہ بعض صاحبوں کو ہم لوگوں کا لباس پسند نہیں آیا۔ خیر مَیں اس وقت اس میں تو کلام نہیں کرتا کہ وعظ کہنے کے لیے لباس کا اچھا ہونا ضروری ہے یا نہیں۔ یہ اپنا اپنا مذاق ہے۔ مَیں ان کی خاطر یہ مان لیتا ہوں کہ واعظ کو اچھا لباس پہن کر وعظ کہنا چاہیئے اور اس کو اس مصلحت پر محمول کرتا ہُوں کہ اچھے لباس سے وقعت ہوتی ہے اور متکلم کی وقعت سے کلام کی وقعت ہوتی ہے۔ جس سے اس کا اثر بڑھتا ہے مگر سوال یہ ہے کہ وہ لباس آخر کہاں سے آئے ظاہر ہے کہ اچھے لباس کے لیے کافی رقم کی ضرورت ہوگی۔ جس کے لیے مولویوں کی موجودہ آمدنی کافی نہیں ہوسکتی۔ اس لیے اس کی سہل صورت یہ ہے کہ جہاں وعظ ہو۔ وہاں کے حضرات واعظوں کے لیے اپنی پسند کا لباس بھی تیار کرا رکھیں۔ جب کوئی واعظ آئے وہی لباس پہنا کر وعظ کہلوایا جائے۔ اور جب وہ وہاں سے چلنے لگے تو وہ لباس اتروا لیا جائے تاکہ دُوسرے موقع پر کام آئے۔"

خلوص سے بیان کرنا

آپ مجسمۂ اخلاص تھے۔ ہمیشہ اپنے سے زیادہ دُوسروں کے مفاد پر نظر رکھتے تھے۔ اس لیے جو کچھ بھی فرماتے خلوص سے فرمایا کرتے تاکہ سامعین متاثر و مستفیض ہوسکیں۔ کیونکہ ؎

دل سے جو بات نکلتی ہے اثر رکھتی ہے

ایک دفعہ آپ جودھپور میں وعظ فرمانے لگے۔ تو ایک خیر خواہ نے مشورۃً عرض کیا کہ چونکہ یہاں کے لوگ دیو بندیوں کو وہابی کہتے ہیں۔ اس لیے آپ امام ابوحنیفہؒ کے ہی فضائل

بیان فرما دیں تاکہ ان کا شبہ رفع ہو جائے۔ آپ نے صاف انکار کرتے ہوئے فرمایا :۔

"اس کے تو یہ معنی ہوئے کہ میں اپنی مصلحت کے لیے وعظ کہوں۔ تاکہ لوگ مجھے حنفی سمجھیں حالانکہ وعظ سامعین کی مصلحت کے لیے ہونا چاہیئے۔"

فرمائشی وعظ نہ کرنا

حضرت کو فرمائشی وعظ کہنے کی قطعاً عادت نہ تھی اور نہ ہی کسی کا فرمائشی مضمون درمیان میں بیان کرتے تھے۔ بلکہ جو کچھ اُس وقت منجانب اللہ القاء ہو۔ بیان فرما دیتے۔ اگر بدوران بیان فرمائشی مضمون کے بیان کرنے کا کوئی قرینہ نکل آتا تو پھر اس کا بلا تکلف ذکر فرما دیتے۔ ایک مرتبہ ایک شخص نے فرمائش کی کہ حضرت وعظ میں ذرا ڈھولکی والوں کی بھی خبر لینا تو آپ نے یہ عُذر فرمایا کہ :۔

"میں کسی کی خبر نہیں لیتا۔ یہ میری عادت کے خلاف ہے۔ جو میری سمجھ میں آئے گا۔ بیان کروں گا۔"

معاوضہ نہ لینا

آپ وعظ کا معاوضہ بھی نہ لیتے تھے۔ یہاں تک کہ جس ہدیہ میں بھی صورتِ معاوضہ پیدا ہو جاتی۔ اس سے بھی اعتراض فرماتے۔ ایک نواب صدیق حسن خاں کی صاحبزادی صفیہ بیگم نے کانپور میں حضرت سے وعظ کہلوایا۔ وعظ ختم ہونے کے بعد اس نے ایک معتد بہ رقم پیش کی۔ جسے آپ نے قبول نہ فرمایا۔ انھوں نے عرض کیا کہ یہ معاوضہ نہیں ہے۔ فرمایا :۔

"صورت تو معاوضہ کی سی ہے۔ دیکھنے والوں کو تو یہی شبہ ہوگا۔ پھر کسی کو بلا ہدیہ دیئے وعظ کہلوانے کی ہمت نہ ہو گی۔"

اس پر وہ کہنے لگیں کہ اچھا کھانا ہی کھا لیجئے۔ فرمایا :۔

"گھر بھیج دیجئے۔ تاکہ اس میں بھی معاوضہ کی سی صُورت پیدا نہ ہو۔ کیونکہ میں

مہمان دُوسری جگہ ہُوں "۔

یہ محض قدیمی تعلقات کی بنا پر ان کی دلجوئی کے لیے فرمایا۔ ورنہ اس کی کبھی عادت نہ تھی۔

نعم البدل دینا

حسّاس اس قدر تھے کہ جو کوئی بھی تھوڑی بہت خدمت کرتا۔ اسے ضرور کسی نہ کسی صورت میں فیض پہنچاتے۔ جس کی وجہ سے سفر میں آپ کا یہ معمول ہو گیا تھا کہ جہاں بھی جاتے۔ وعظ ضرور فرماتے اور اس کی وجہ یہ بتلاتے کہ

"بلا وعظ کہے کسی جگہ جا کر روٹیاں کھانے میں شرم آتی ہے۔"

بلا ضرُورت وعظ نہ کہنا

آپ کا یہ بھی معمول تھا کہ اگر آپ سے پہلے کوئی دُوسرا عالم مناسب موقع تقریر کر دیتا تو بر بناء رعایت و اعتراف آپ قطعاً وعظ نہ فرماتے کہ جو ضروری مضمون تھا وُہ سُنا دیا گیا ہے۔ اَب تکلف کی کیا ضرورت ہے۔ ایسا سوائے اہلِ حق کے اور کوئی نہیں کر سکتا کہ وعظ کے لیے جس کو بلایا جائے۔ اسے موقع ہی نہ دیا جائے۔ اور وُہ اس پر ملال کی بجائے مسرّت کا اظہار کرے۔ ایک دفعہ الہ آباد میں حضرت کے وعظ کا اعلان ہُوا جس کی وجہ سے کافی مجمع جمع ہو گیا۔ حضرت کے وعظ سے قبل مولوی سلیمان پھلواروی نے حضرت سے اجازت لے کر کچھ کہنا چاہا۔ جوش کے عالم میں تقریر طول پکڑ گئی۔ جب انھوں نے بیان ختم کیا تو حضرت نے بطور اعترافِ حقیقت سامعین کے اصرار کے باوجود بدیں وجہ وعظ فرمانے سے انکار کر دیا کہ :-

"مولانا نے ضروری باتیں تو سب فرما دی ہیں۔ میرے بیان کی کیا ضرورت ہے۔ اَب جو مجھ سے اصرار ہے تو اس کے یہ معنی ہیں کہ میں ایسے مضامین ڈھونڈ کر بیان کروں جو مولانا سے رہ گئے ہوں اور اُن سے اچھے ہوں۔

یہ تو ایک معاوضہ اور مقابلہ کی صورت ہے۔ لہٰذا اب میں بیان نہ کروں گا۔"

جانبداری نہ کرنا

حضرت کو بار ہا ایسے مقامات پر بھی وعظ فرمانا پڑا۔ جہاں اور جماعتوں یا دو مدرسوں کے درمیان باہمی کشاکشی تھی۔ مدعو کرنے والوں کا یہ خیال ہوتا کہ حضرت کچھ ایسی باتیں فرما دیں گے۔ کہ اختلاف رفع ہو جائیں گے۔ مگر حضرت ایسے نازک موقعوں پر بڑی احتیاط فرماتے تھے اور جانبداری کے احتمال کی وجہ سے اختلافی امور پر کچھ نہ فرماتے تھے۔ کیونکہ اختلافیات کے متعلق بیان کرنے کا یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ جس فریق کے خلاف روئے سخن ہوتا ہے۔ وہ یہی سمجھتا ہے کہ یہ دوسرے فریق کی طرف داری کر رہا ہے اور اِن لوگوں نے انہیں اپنی طرف کرلیا ہے۔ اس لیے اس سے کچھ فائدہ نہیں ہوتا چنانچہ حضرت اس ضمن میں فرمایا کرتے تھے کہ وعظ میں سوائے مصلحت علمہ کے اور کوئی غرض نہیں چاہیئے۔

ترغیب کو ترجیح دینا

حضرت کے مواعظ میں ترغیب کا پہلو ہمیشہ نمایاں ہوتا تھا کیونکہ آپ فرماتے تھے کہ:۔

"آج کل کی طبیعتوں کو دیکھتے ہوئے یہ تجربہ ہے کہ شوق دلانے والے مضامین کے۔ اس واسطے میں ترہیب کے مضامین زیادہ بیان نہیں کرتا۔ ترغیب کے مضامین زیادہ بیان کرتا ہوں۔"

(الباطن ص۱۶۱)

ایک دُوسرے موقع پر فرمایا:۔

"اتنی بات تو ہے کہ بحمد اللہ بیان کے وقت یہ نیت ضرور ہوتی ہے کہ اے اللہ ایسا مضمون بیان ہو۔ جو ان لوگوں کی ضرورت کا ہو۔ جس سے

ان کی اصلاح ہوجائے۔ اسے چونکہ علم غیب ہے۔ وہ سب کی حالت جانتے ہیں۔ اس نیت کے بعد وہ ضرورت وحالت کے مطابق مضمون دل میں ڈال دیتے ہیں کہ آج یہ بیان کرو۔" (ذم النسیان ص ۱۵)

دورِ سفر

ضرورت سفر

حضرت تھانوی طبعاً خلوت پسند تھے۔ اس لیے بچپن اکثر ہمشیرہ کے ساتھ گھر کے اندر کھیل کود میں گزرا اور طالب علمی کے زمانہ میں فارغ اوقات اپنے کمرہ میں گزار دیئے۔ عام میل ملاپ اور ہجوم سے بوجہ خلل معمولات و یکسوئی آپ کی طبیعت بہت گھبراتی تھی۔ اس لیے سفر پر حضر کو ترجیح دیتے تھے۔ مگر بغرض اصلاحِ اُمتِ محمدیہ علی صاحبہا الصلوٰۃ والتحیۃ بطور حجۃ اللہ فی الارض تبلیغ احکام الٰہیہ کے لیے بڑے بڑے لمبے سفر فرمائے۔ ہندوستان و پاکستان کے کونہ کونہ میں پہنچ کر کتاب وسُنّت کی روشنی میں رد بدعات و رسومات فرماتے رہے اور جب ایک مرتبہ سفر میں نکلتے تو پھر مسلسل درخواستوں کی وجہ سے مہینوں واپسی نہ ہوتی۔

اگرچہ زیادہ تر سفر صرف تبلیغی سلسلہ میں ہیے مگر چند سفر بزرگانِ دین کی زیارت۔ مریضوں کے علاج وعیادت اور حج بیت اللہ کے لیے بھی فرمائے۔ بلا ضرورتِ شرعیہ اور واقعیہ یا کسی کی وجاہت کے زیرِ اثر کبھی کوئی سفر نہیں فرمایا۔

آغازِ سفر

درسیات سے فارغ ہونے کے بعد آپ نے پہلا سفر ماہ صفر ۱۳۰۱ھ میں کانپور کا فرمایا۔ یہاں آپ مدرس ہو کر تشریف لے گئے تھے۔ اس عرصہ میں آپ رنگون، کلکتہ،

بمبئی۔ کراچی۔ گجرات۔ مارواڑ۔ ڈھاکہ۔ حیدرآباد دکن۔ علاقہ سندھ اور بہاولپور۔ اعظم گڑھ۔ گورکھپور۔ غازی پور۔ بنارس۔ شملہ۔ لاہور اور دیگر سینکڑوں شہروں اور قصبوں میں پہنچ کر لوگوں کو ارشادات و ملفوظات پند و نصائح اور فیضِ صحبت و اسوۂ حسنہ سے مستفیض و مستفید فرماتے رہے۔

اہمیتِ سفر

عام دستور کے مطابق آپ کبھی خالی الذہن ہو کر سفر نہیں فرماتے تھے۔ دورانِ سفر میں آپ ہر موقع پر احکامِ شریعتِ مقدسہ اور اصولِ حسنِ معاشرت کی نہ صرف خود سختی سے پابندی فرماتے تھے بلکہ اپنے ہمراہیوں اور ملاقاتیوں سے بھی پابندی کراتے تھے۔ جس سے اہلِ نظر ہم سفر سبق حاصل کرتے تھے اور احکام و آدابِ سفر معلوم کرتے تھے۔ گویا آپ کی ہر حرکت باعثِ برکت ہوتی تھی اور گمراہوں کو راہ پر لاتی تھی۔

درخواستہائے سفر

حضرت تھانویؒ کے فیضِ عام کا شہرہ چونکہ دُور دراز تک پہنچ چکا تھا۔ اس لیے اطراف و جوانب سے شائقین و طالبین اس کثرت سے طلبی کی درخواستیں بھیجتے رہتے تھے کہ ان کے انبار لگ جاتے تھے۔ ان کی کثرت کا اندازہ صرف اس ایک امر سے لگایا جاسکتا ہے کہ اگر حضرت طلبی کی درخواستوں کا دس فیصدی حصہ بھی منظور فرماتے تو سال کے ۳۶۵ دنوں میں آپ کو ایک دن بھی وطنِ مالوف میں رہنا نصیب نہ ہوتا۔ جو آپ کی محبوبیت و مقبولیت کی بیّن دلیل ہے۔ اس لیے آپ بہت ہی اصرار کے بعد بعض شرائط و قیود کے تحت خاص خاص اور ضروری درخواستوں کو منظور فرماتے۔

ہنگامی سفر

زندگی کے آخری لمحات انتہائی امتحان و آزمائش کے ہوتے ہیں اور شیطان اس وقت بڑے بڑے اربابِ علم و فضل پر بھی اپنے ترکش کا آخری تیر چلانے کے لیے بیقرار رہتا۔

ہے اس لیے حضرت کے بعض مخلصین کی سفر آخرت کے وقت انتہائی خواہش ہوتی کہ انکا انتقال حضرت کی موجودگی میں ہو جب ایسے مریضوں کی درخواست سفر پہنچتی۔ تو حضرت بالکل بے قرار ہوجاتے اگرچہ عادۃً بہت ہی کم درخواستہائے سفر کو شرفِ قبولیت بخشتے تھے۔ مگر ایسی درخواستوں کو بجز کسی خاص مجبوری کے کبھی مسترد نہ فرماتے اور یہ شعر پڑھتے ہوئے ؎

خستگاں را چو طلب باشد و قوت نبود

گر تو بیداد کنی شرط مروّت نبود

سفر پر روانہ ہوجاتے اور اکثر مریضوں کی حضرت کی موجودگی میں دم نکلنے کی آرزو پوری ہوجاتی۔ جن مریضوں کی تمنّائے زیارت کا علم ان کے انتقال کے بعد ہوتا۔ تو حضرت کو بہت قلق ہوتا اور فرماتے :۔

"اگر مجھ کو اطلاع ہوجاتی تو ضرور جاکر ان کی اس تمنّا کو پوری کرتا"

ایک مرتبہ بریلی کے ایک معزّز، ذی علم، رئیس کو مرض الموت میں وساوس شیطانی نے اس قدر آگھیرا کہ انھیں سوءِ خاتمہ کا اندیشہ ہونے لگا۔ چنانچہ حضرت تھانویؒ کو بلایا گیا۔ آپ فی الفور تھانہ بھون سے بریلی پہنچے اور نوعیتِ وساوس معلوم کرکے ایسی تسلی بخش تقریر فرمائی کہ وہ ہشاش بشاش حضرت کی موجودگی میں اس دنیا سے رخصت ہوئے۔

والیانِ ریاست کے لیے سفر

حق تعالیٰ نے چونکہ حضرت کو مقبولیتِ عامہ بخشی تھی۔ اس لیے گاہے گاہے والیانِ ریاست بھی حضرت کو بڑے اشتیاق و اصرار سے سفر کی تکلیف دیتے رہتے تھے۔ مگر آپ کبھی ان کے اثر و اقتدار کے تحت ان کی درخواست قبول نہ فرماتے تھے۔ بلکہ انھیں احکام شریعت کی اہمیّت کا احساس دلانے کے لیے خصوصی شرائط کے تحت ان کی

درخواستوں کو شرفِ قبولیت بخشتے تھے۔

شرائط قبولیت

ایک دفعہ ڈھاکہ کے مشہور و معروف نواب سلیم اللہ خاں نے جن کی دعوت کے وائسرائے اور گورنر مشتاق رہتے تھے اور بلا شرط منظور کرتے تھے۔ حضرت تھانویؒ کو بڑے اشتیاق سے مدعو کیا۔ تو آپ نے ان کی امارت و وجاہت کے پیشِ نظر قبولیتِ دعوت کے لیے حسب ذیل شرطیں لکھیں۔

۱۔ کسی قسم کا نقد یا غیر نقد ہدیہ نہ دیا جائے۔

۲۔ کسی خاص مضمون پر وعظ کہنے کی فرمائش نہ کی جائے۔

۳۔ قیام کا انتظام ایوانِ خاص سے جدا ایسی جگہ ہو۔ جہاں عام مسلمان بے تکلف آ جا سکیں۔

۴۔ خود اپنی ملاقات کے لیے کوئی خاص وقت متعین کر لیں۔ جس میں کوئی اور شخص شریک نہ ہو تاکہ جانبین سے بے تکلف افادہ و استفادہ ہو سکے۔

نواب صاحب بھی بڑے سمجھدار سلیم الفطرت اور اسم بامسمیٰ تھے۔ شرائط کو پڑھ کر ان کی حکمت و ندرت۔ صحت و مصلحت پر عش عش کر اُٹھے اور غلبۂ اشتیاق میں بلا چوں و چرا سب شرطیں منظور کر لیں۔

شاہانہ تزک و احتشام

حضرت تھانویؒ عوامی یا مذہبی لیڈروں کی طرح شاندار استقبال۔ جلسہ و جلوس اور زندہ باد کے نعروں کے قطعاً دلدادہ نہ تھے۔ اگر کوئی از راہِ محبت ایسا انتظام بھی کرتا۔ تو حضرت منع فرما دیتے۔ نواب ڈھاکہ نے حضرت کا بھی اسی تزک و احتشام کے ساتھ استقبال کرنا چاہا۔ جس طرح وہ وائسرائے کا استقبال کرنے کے عادی تھے کہ پلیٹ فارم پر مخملی فرش بچھایا جائے۔ تمام راستوں کو رنگ برنگ کی جھنڈیوں اور خوبصورت دروازوں

سے سجایا جائے اور شاہانہ جلوس کی صورت میں حضرت کو دیوانِ خاص تک لایا جائے۔ واقعی حضرت ایسے ہی استقبال کے مستحق تھے۔ بلکہ اس سے بھی زیادہ کے۔ کیونکہ یہ اپنے زمانہ کے مجدد تھے۔ مگر یہ سب کچھ چونکہ خلافِ شریعت تھا اس لیے حضرت نے نواب صاحب کو اس کی اجازت نہ دی۔ اب انہوں نے دوسری درخواست بھیجی کہ ہمیں ایک جمِ غفیر کے ساتھ استقبال کی اجازت بخشی جاوے جو عمالِ ریاست اور روٗسا شہر پر مشتمل ہوگا۔ حضرت نے لکھا کہ "یہ بھی خلافِ طبیعت ہے"۔ جس سے ان کی ساری اُمیدوں پر پانی پھر گیا۔ مگر قدم قدم پر حضرت کی مصلحت آمیز اور سبق آموز ہدایات نواب صاحب کی گرویدگی میں نہ صرف اضافہ کر رہی تھیں۔ بلکہ ان کے دل میں حضرت کی عظمت بڑھا رہی تھیں۔ چنانچہ نواب صاحب بلا کسی اہتمام کے بہ نفس نفیس اسٹیشن پر پہنچے۔ اپنی خاص موٹر میں حضرت کو سوار کیا۔ حضرت کی خواہش کے باوجود حضرت کے ساتھ بیٹھنے سے عذر کر دیا اور خود دوسری موٹر میں حضرت کی موٹر کے پیچھے پیچھے روانہ ہوئے۔ حالانکہ وائسرائے کی آمد کے وقت ان کے ساتھ ہی بیٹھ کر جایا کرتے تھے۔ مگر حضرت کے ساتھ بیٹھنے کی ہمت نہ ہوئی۔ اور فرمایا کہ حضرت کے ساتھ بیٹھنا خلافِ ادب تھا۔ گھر پہنچ کر بھی نواب صاحب خود خادموں کی طرح حضرت کی خدمت میں کھڑے رہے یہاں تک کہ کھانے کے وقت ہر ایک چیز خود اٹھا اٹھا کر حضرت کے سامنے رکھتے رہے۔

منتظم کی نخوت

علامہ اقبالؒ نے اس دَور کو اپنے ایک مکتوب میں "دَورِ بدتمیزی" قرار دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس نمرود و فرعونیت کے زمانہ میں عام طور پر اہلِ دین اور علماء حق کو نفرت و حقارت کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ مگر حضرت تھانویؒ یہ برداشت نہیں کرتے تھے کہ کوئی علمائے حق کی شان میں ایسی ویسی بات کرے۔ کیونکہ اسے آپ اہلِ دین اور دین کی توہین سمجھتے تھے۔ اس لیے اگر کسی سے ایسی غلطی ہو بھی جاتی۔ تو ایسا سبق پڑھاتے کہ

پھر وہ عمر بھر نہ بھولتا۔

ڈھاکہ کے پہلے سفر کے بعد ایک کانفرنس کے سلسلہ میں نواب ڈھاکہ کے اشتیاق اور علماء دیوبند کے اصرار پر آپ کو دوبارہ ڈھاکہ جانا پڑا۔ مگر آپ نے بفراست دیکھ لیا تھا کہ وہاں ایک ایسا واقعہ پیش آئے گا۔ جس کی ناگواری کی وجہ سے آپ کے لیے ان حضرات کا اخیر وقت تک ساتھ دینا مشکل ہو جائے گا۔ اس لیے آپ نے وہ سفر اپنے ذاتی خرچ پر فرمایا تاکہ جس وقت چاہیں آزادی سے واپس آسکیں۔

ان حضرات نے کلکتہ سے ہو کر ڈھاکہ جانا تھا۔ اس لیے نواب صاحب کی طرف سے ان کے قیام و طعام کا کلکتہ میں شایانِ شان انتظام تھا۔ جس کے منتظم ایک رئیس اور نواب صاحب کے دوست تھے۔ باتوں باتوں میں وہ رئیس حضرت سے کہنے لگے کہ :۔

"آپ کے انکار کے بعد آپ کی تشریف آوری سے نواب صاحب کو بڑی مسرت ہوئی ہے۔ فرماتے تھے کہ آپ کی شرطیں بڑی سخت ہیں۔ جن کو قبول نہیں کر سکتے۔ جیسے ایک تو یہی کہ کوئی ہدیہ پیش نہ کیا جائے۔"

حضرت نے فرمایا :۔

"نہ دینے کی شرط کیا مشکل ہے۔ دینا تو دشوار ہو سکتا ہے نہ دینا کیا مشکل ہے۔"

رئیس نے کہا۔

"صاحب! جس سے محبت ہوتی ہے۔ اس کو تو ہدیہ دینے کے لیے جی چاہتا ہے۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ کہ اپنے محبوب کی خدمت نہ کی جائے۔"

حضرتؒ نے جواب دیا۔

"یہ کیا ضروری ہے کہ محبوب کو اپنے گھر ہی بلا کر ہدیہ دیا جائے۔ اگر ایسا ہی شوق ہے۔ تو اس کے گھر جا کر یا گھر بھیج کر بھی تو ہدیہ دیا جا سکتا ہے"

رئیس ہونا اور بات ہے۔ سلیقہ سے گفتگو کرنا اور بات ہے۔ اس منتظم کو بات کرنی نہ آئی اور نخوت سے کہا کہ :۔

"جناب معاف فرمایئے۔ پیاسا کنوئیں کے پاس آتا ہے۔ کنواں پیاسے کے پاس نہیں جاتا"۔

نخوت کا علاج

حضرت تھانویؒ کو یہ کلمات سُن کر بہت رنج ہُوا مگر آپ نے ناگواری ظاہر کیے بغیر نہایت تہذیب سے اس رئیس کو مخاطب فرمایا کہ :۔

"آپ کا خیال یہ ہے کہ آپ حضرات کنواں ہیں اور ہم پیاسے ؟ اور ہمارے دماغ میں یہ سمایا ہُوا ہے کہ ہم لوگ کنواں ہیں اور آپ پیاسے ! اور اس کی ہمارے پاس دلیل بھی ہے کہ ضرورت کی دو چیزیں ہیں دین اور دنیا۔ ان میں سے ہماری حاجت کی ایک چیز تو آپ کے پاس ہے اور آپ کی حاجت کی چیز ہمارے پاس۔ فرق صرف اتنا ہے کہ ہماری حاجت کی جو چیز آپ کے پاس ہے۔ یعنی دنیا۔ تو وہ اللہ تعالیٰ نے بقدر ضرورت ہمیں بھی دے رکھی ہے۔ لیکن آپ کی حاجت کی جو چیز ہمارے پاس ہے، یعنی دین۔ وُہ آپ کے پاس بقدر ضرورت بھی نہیں۔ اس لیے آپ ہمارے محتاج ہُوئے یا ہم آپ کے ؟ آپ پیاسے اور ہم کنواں ہُوئے ؟ یا ہم پیاسے اور آپ کنواں ہُوئے ؟"

بس اس تازیانۂ حکمت کے لگنے کی دیر تھی کہ وُہ رئیس شرمندہ ہو کر بغلیں جھانکنے لگے۔ اس ناگواری کے بعد حضرت نے وہیں سے قطع سفر کا ارادہ کر لیا۔ کسی نے ٹیلیفون پر نواب صاحب کو بھی خبر دی۔ انھوں نے حضرت کو ٹیلیفون پر بلانا خلافِ ادب سمجھ کر ضروری تار دیا۔ رفقاء نے بھی اصرار کیا کہ آپ واپسی کا ارادہ ترک کر دیں۔ مگر آپ نے

کسی کی خاطر اپنا اصول نہ توڑا۔ اپنے کرایہ پر تو گئے ہی تھے بڑی آزادی سے واپس آ گئے۔ اور الہ آباد پہنچ کر نواب صاحب کو تار کا جواب دیا۔ اس واقعہ سے فراست کی حقیقت واضح ہو جاتی ہے۔ جس کے مقابلہ میں کشف بہت متاخر ہے۔ اس لیے اس کی حدیث میں فضیلت آئی ہے۔

تعلیم تہذیب

حضرت تھانویؒ نفسیات کے بڑے ماہر تھے اور مدعیانِ تہذیب جدید سے ملنٹوں میں بد تہذیبی کا اقرار کرا لینے میں اپنا ثانی نہیں رکھتے تھے۔ آپ کی ناگواری۔ ناراضی۔ سختی اپنی ذات کے لیے نہیں ہوتی تھی۔ بلکہ مناسب موقع تعلیم تہذیب کے لیے ہوتی تھی۔ اور آپ دعویٰ سے فرمایا کرتے تھے کہ :۔

"جس کو اسلامی تہذیب کے مقابلہ میں اپنی تہذیب جدید کا دعویٰ ہو کچھ دن میرے پاس رہ کر دیکھ لے۔ اللہ تعالیٰ کے بھروسہ پر کہتا ہوں کہ انشاءاللہ تعالےٰ خود اُسی کے مُنہ سے کہلوا دوں گا کہ واقعی ہم بد تہذیب ہیں۔ اور حقیقی تہذیب وہی ہے۔ جس کی شریعت مقدسہ نے تعلیم فرمائی ہے۔"

چنانچہ مظفر نگر کے سفر میں بھی آپ کو ایک ایسے ہی رئیس سے سابقہ پڑا جو بڑے بیباک۔ زبان دراز یہاں تک کہ بڑے بڑے حکام سے بھی نہ ڈرنے والے اور ان کے سامنے نہ جھکنے والے تھے۔ چونکہ ان کی عادت ہی ایسی بن چکی تھی۔ اس لیے انھوں نے کوتاہ اندیشی سے حضرت سے بھی بے ڈھنگی باتیں شروع کر دیں جس سے آپ کو از حد تکلیف ہُوئی۔ آپ نے انھیں مناسب الفاظ میں تنبیہ بھی فرمائی۔ ریاست کے نشہ میں وہ کچھ نہ سمجھ سکے اور نوبت گزاری تک پہنچی۔ حضرت نے انھیں مجلس سے اُٹھ جانے کے لیے فرمایا مگر وہ بیٹھے رہے۔ اس پر حضرت یہ فرماتے ہُوئے۔ خود ہی اُٹھ کھڑے ہُوئے کہ :۔

"اگر آپ نہیں اُٹھتے۔ تو مَیں خود اُٹھ جاتا ہوں۔ مَیں ایسے شخص کے ساتھ ہم نشینی بھی گوارا نہیں کر سکتا۔"

بس آپ کا اتنا فرمانا تھا کہ ان پر ایسی ہیبت طاری ہوئی کہ دست بستہ کہنے لگے۔ "حضرت آپ بیٹھے رہیں۔ مَیں خود ہی جاتا ہوں" اور اُٹھ کر چلے گئے۔ بعد ازاں انھوں نے حافظ صغیر احمد سے کہا کہ:۔

"میرا تو عمر بھر کے لیے علاج ہو گیا۔ مَیں علماء اور ملانوں کو بہت ذلیل سمجھا کرتا تھا۔ اَب ہر ایک مولوی اور ملّانے کا ادب و لحاظ کرتا ہوں۔ کیونکہ خیال ہوتا ہے کہ کہیں یہ بھی ایسا ہی نہ ہو۔ مَیں بڑے بڑے حکام سے بھی مرعوب نہیں ہوتا۔ اس روز مولانا سے اتنا مرعوب ہُوا کہ ڈانٹ پڑنے کے بعد ایک لفظ بھی میرے مُنہ سے نہ نِکل سکا۔"

اس لیے حضرت مجذوبؔ فرمایا کرتے تھے کہ اس ع

میخانہ کا محروم بھی محروم نہیں ہے

نواب رامپور کو سبقِ شریعت

ایک مرتبہ نواب رامپور نے قادیانیوں سے مناظرہ کا انتظام کیا اور اس غرض کے لیے علماء دیوبند کو مدعو کیا گیا۔ چنانچہ بہت سے اکابر علماء تشریف لے گئے اور اپنے حضرات کے اصرار پر حضرت نے بھی بادلِ ناخواستہ شرکت فرمائی۔ مناظرہ سے فراغت پانے کے بعد جب سب حضرات واپس ہونے لگے۔ تو نواب صاحب نے حضرت کو کچھ زیادہ رقم دینی چاہی۔ جو حضرت نے بواسطہ پیام یہ کہہ کر واپس کر دی کہ:۔

"ریاست کو بیت المال میں سے زائد از ضرورت صرف کرنے کا شرعاً اختیار حاصل نہیں ہے۔"

اس سے نواب صاحب حضرت کے اصُولِ شرعیہ کی پابندی سے بہت متاثر

ہوئے۔ خواہ ان سے اس پر بعد میں عمل نہ ہو سکا ہو مگر حضرت نے انھیں ایک ایسا سبق دیا جو کوئی دوسرا نہ دے سکا اور جس میں ان کی دنیوی اور اخروی فلاح و نجات مضمر تھی۔

امیر بہاولپور کو تعلیم دین

ایک سلسلہ میں نواب بہاولپور کی طرف سے حضرات علماء کو مدعو کیا گیا۔ ان میں حضرت تھانویؒ بھی شامل تھے۔ واپسی کے وقت نواب صاحب کی طرف سے سب حضرات کو ڈیڑھ ڈیڑھ سو روپیہ بطور خلعت اور پچیس پچیس روپے بنام دعوت عطا کیے گئے۔ اس وقت تو حضرت نے احترام نواب کے خیال سے سب کے ساتھ یہ رقم لے لی۔ لیکن خلوت میں وزیر متعلقہ سے عذر فرمایا کہ :۔

"یہ رقم مجھ سے واپس لے لی جائے۔ کیونکہ یہ بیت المال میں سے دی گئی ہے۔ جس کا میں مصرف نہیں۔"

انھوں نے عرض کیا کہ :۔

"چونکہ اس رقم کا کاغذات سرکار میں اندراج ہو چکا ہے۔ اس لیے اب اس کی واپسی کی کوئی صورت نہیں۔"

حضرت نے فرمایا :۔

"خیر! اگر خزانہ میں واپسی نہیں ہو سکتی۔ تو اس رقم کو مقامی علماء اور طلباء میں صرف کر دیا جائے۔ کیونکہ شرعاً بیت المال کے مصرف کے وہ قریب ہیں۔"

غرض جو کچھ حضرت کو ملا تھا۔ وہ آپ نے سب کا سب واپس فرما دیا لیکن نہایت سلیقہ اور طریقہ سے جب یہ بات نواب صاحب کو معلوم ہوئی انھوں نے اس "عطائے تو بلقائے تو" پر خفگی کی بجائے حسرت کا اظہار فرمایا۔

خلعت کی واپسی

ایسا ہی واقعہ آپ کو ریاست خیرپور سندھ میں پیش آیا۔ وہاں بھی آپ نے خلعت کی واپسی کا عذر فرمایا جس پر وزیر متعلقہ نے کہا کہ نواب صاحب کو واپسی خلعت ناگوار ہو گی تو حضرت نے فرمایا :۔

" اگر یہ اندیشہ ہے تو ان کو معلوم ہی کیوں کرایا جائے بلکہ جو نقد بہ عنوان خلعت ملا ہے۔ اس کو مساکین میں تقسیم کر دیا جائے۔ کیونکہ وہ لوگ اس کے صحیح مصرف ہیں "

چونکہ حضرت کی نیت نیک ہوتی تھی۔ اس لیے حق تعالیٰ آپ کو ایسے اتفاقی سوالات کا بر موقعہ ایسا جامع و مانع جواب بالقا فرماتے تھے کہ دُوسرے کو ماننے کے سوا کوئی چارہ ہی نظر نہ آتا تھا۔ اسی لیے حضرت فرمایا کرتے تھے کہ :۔

" الحمد للہ ! مجھے کسی جگہ خلافِ شریعت یا خلافِ طبیعت کرنے پر مجبور نہیں ہونا پڑا "

ایک نواب کا اقرارِ بد تہذیبی

ایک خاندانی۔ مقتدر۔ ذی وجاہت۔ رئیس اور نواب نے مبلغ دو سو روپیہ امداد العلوم تھانہ بھون کی امداد کے لیے بھیجے۔ جو بلا کسی چندہ کے توکلاً علی اللہ حضرت کی سرپرستی اور نگرانی میں خاص خانقاہ کے اندر قائم تھا۔ اس عطیہ کے ساتھ انھوں نے تشریف آوری کی درخواست بھی بھیج دی۔ حضرت نے یہ لکھ کر روپے واپس کر دیئے کہ :۔

" اگر اس رقم کے ساتھ بلانے کی درخواست نہ ہوتی تو مدرسہ کے لیے روپیہ لے لیا جاتا۔ اب اس اقتران سے یہ احتمال پیدا ہوتا ہے کہ شاید مجھ کو متاثر کرنے کے لیے یہ رقم بھیجی گئی ہو۔ آپ کی یہ غرض نہ سہی۔ لیکن میرے اُوپر تو طبعی طور پر اس کا یہی اثر ہو گا کہ مَیں آزادی کے ساتھ اپنے آنے نہ

آنے کے متعلق رائے نہ قائم نہ کرسکوں گا۔ کیونکہ انکار کرتے ہوئے شرم
آئے گی۔"

نواب صاحب بھی بڑے فہمیدہ اور جہاں دیدہ تھے فوراً سمجھ گئے کہ عطیہ اور درخواست
اکٹھی نہ بھیجنی تھی۔ فوراً معذرت نامہ لکھا کہ :۔

"آپ کے متنبہ کرنے سے اب یہ معلوم ہوا کہ واقعی یہ مجھ سے سخت بدتہذیبی
ہوئی۔ میں اب اپنی درخواست تشریف آوری واپس لیتا ہوں اور روپیہ
مکرر ارسال خدمت کرتا ہوں براہِ کرم مدرسہ کے لیے قبول فرما لیا جائے۔"

حضرت نے پھر بخوشی قبول فرماتے ہوئے نواب صاحب کو لکھا :۔

"ابھی تک تو آپ میری ملاقات کے مشتاق تھے اور اب آپ کی تہذیب اور
شرافت نے خود مجھ کو آپ کی ملاقات کا مشتاق بنا دیا ہے۔"

کچھ مدت کے بعد نواب صاحب نے پھر تشریف آوری کے لیے درخواست بھیجی
تو حضرت بخوشی اس شرط پر تشریف لے گئے کہ "کسی قسم کا ہدیہ پیش نہ کیا جائے گا۔"

محبت و مصلحت کا تصادم

جب آپ واپس آنے لگے تو نواب صاحب کی والدہ ماجدہ نے جو آپ کی پیر بہن
تھیں۔ تقریباً سو روپیہ خدمت میں پیش کرنا چاہا۔ اس پر آپ نے خلافِ شرط ہونے کا
عذر فرمایا۔ نواب صاحب نے عذر کیا کہ شرط تو میرے ساتھ تھی۔ یہ والدہ صاحبہ کی
طرف سے ہے۔ فرمایا :۔

"والدہ اور ولد میں کیا فرق ہے۔ گھر تو ایک ہی ہے۔"

نواب صاحب نے مجبور ہو کر کہا :۔

"حضرت اگر کسی کا جی ہی خدمت کرنے کو چاہے۔ تو آخر وہ کیا کرے۔"

فرمایا :-

"میں خانہ بدوش تو نہیں ہوں کہ میرا کوئی ٹھکانا نہ ہو۔ میرے ٹھکانے پر بھی تو تشریف لانا ممکن ہے۔"

چونکہ نواب صاحب ماشاء اللہ بڑے ہی سلیم الفطرت واقع ہوئے تھے اور ایک پرانے دیندار خاندان کے مایہ ناز فرزند تھے۔ اس لیے انھوں نے حضرت سے عام لوگوں کی طرح کچھ اصرار نہ فرمایا اور خاموش ہو رہے۔ پھر ایک معتدبہ مدت گزر جانے کے بعد خود تھانہ بھون گئے اور تین گنیاں ہدیۃً پیش کیں جو حضرت نے بڑی مسرت و احترام سے قبول فرمائیں۔

نواب صاحب کی یہ دانشمندی قابلِ داد تھی کہ انھوں نے حضرت کے ذہن کو گذشتہ واقعہ کی طرف منتقل نہ کرنے کے لیے اور قلب پر بار نہ ڈالنے کی غرض سے پہلی رقم کی مقدار بدل دی تاکہ محض وضعداری نہ سمجھی جائے۔ نواب صاحب کے مؤدب و مہذب ہونے کی وجہ سے اور ان کی اہلیت و عقیدت کی بنا پر حضرت کے ان سے خصوصی تعلقات قائم ہو گئے تھے۔ کیونکہ حضرت کو با اصول انسان سے ملنے میں بڑی فرحت ہوتی تھی۔

ایک رئیسہ کا علاج

حضرت تھانویؒ کو بحالتِ سفر چونکہ مختلف المزاج لوگوں سے سابقہ پڑتا تھا۔ اس لیے ہر ایک کے مرض کا علاجِ روحانی بھی مختلف ہوتا تھا۔ ایک دیندار رئیسہ نے دارالطلبہ مدرسہ مظاہر العلوم سہارنپور تیار کرایا اور اس کے افتتاحی جلسہ کی تاریخ مقرر کر کے مہتمم صاحب کو لکھا کہ اپنے مدرسہ کے سرپرستوں اور دیگر اراکین کو اطلاع کر دیں کہ اس تاریخ پر مدرسہ میں آجائیں۔ مہتمم صاحب نے اس اطلاع کے ساتھ حضرت کو بھی شرکت کی دعوت دی۔ تو آپ نے بدیں وجہ شرکت فرمانے سے انکار کر دیا کہ :-

"ان کو اس حاکمانہ لہجہ میں بلانے کا کوئی حق حاصل نہیں۔ اس طرح حکم نامہ بھیج کر بلانا خلافِ تہذیب ہے۔ یہ بھی کوئی بلانے کا طریقہ ہے۔ میں نہیں

آؤں گا۔ کیا وہ کسی رئیس کو ایسے طریقہ سے دعوت دے سکتی تھیں"۔

مہتمم صاحب نے مدرسہ کی مصالح کی بنا پر تاویلاً اصرار کیا کہ ان رئیسہ کا فعل نہیں۔ ان کے میر منشی کا ہے۔ اس پر حضرت نے لکھا :۔

"پھر بھی یہ شکایت ہے کہ اس معاملہ کو بالکل میر منشی ہی پر کیوں چھوڑ دیا گیا۔ مسودہ خود دیکھ کر منظوری دیتیں جس طرح حکام کے دعوت ناموں میں اہتمام کیا جاتا ہے۔ ان کے بلانے پر تو میں اب نہیں آؤں گا۔ البتہ اگر آپ حکم دیں تو جوتیاں چٹخاتا ہوا سر کے بل حاضر ہوں گا۔ مگر رئیسہ سے نہیں ملوں گا۔ نہ ان سے کوئی گفتگو بلا واسطہ یا بالواسطہ کروں گا"۔

مہتمم صاحب نے اس مشروط شرکت کو ہی غنیمت سمجھا اور حضرت کو تشریف آوری کے لیے لکھا چنانچہ حضرت وہاں تشریف لے گئے۔ بڑا پر اثر وعظ فرمایا۔ جس سے رئیسہ بھی متاثر ہوئیں۔ مگر وعظ فرمانے کے فوراً بعد حضرت کسی کو ملے بغیر یہاں تک کہ حضرت مولانا خلیل احمدؒ کو بھی ملے بغیر چلے آئے تاکہ کسی کو کچھ کہنے سننے یا اصرار کرنے کا موقع نہ ملے۔ رئیسہ کو بھی اس واقعہ کا علم ہو گیا اور انھوں نے پہلی دفعہ محسوس کیا کہ علماء میں بھی ایسے خود دار لوگ ہوتے ہیں۔ اس لیے انھوں نے مدرسہ میں جو مٹھائی تقسیم کی تھی۔ اس میں سے اپنا حصہ حضرت کو اسٹیشن پر یہ کہلا کر بھیجا کہ یہ مٹھائی عام تقسیم کی نہیں ہے خود میرے حصہ کی ہے اس لیے ضرور قبول فرماویں اور واپس نہ فرماویں۔ چونکہ رئیسہ صاحبہ کو اپنے باطنی مرض کا احساس ہو گیا تھا۔ اس لیے حضرت نے وہ قبول فرمالی اور اس طرح نہایت خوش اسلوبی سے حضرت نے علماء کو بنظر حقارت دیکھنے والی کا ایسا علاج فرمایا کہ پھر وہ علماء کی بڑی عزت کرتی رہی۔

انگریز کی دعوت

الافاضات الیومیہ کے ملفوظ نمبر ۱۷۱ ۳ میں حضرت کا ارشاد درج ہے کہ مجھے اکثر اوقات

انگریزوں کے ساتھ بھی سفر کرنے کا اتفاق ہوا ہے۔ مگر کبھی کوئی شریر نہیں مِلا۔ ایک مرتبہ ایک دوست کے اصرار پر کلکتہ سے سیکنڈ کلاس میں سوار ہوا۔ اسی میں ریلوے کا ایک انگریز افسر بھی سوار ہوا۔ جسے اُوپر کے تختہ پر جگہ مِلی۔ کہنے لگا کہ ہم کو نیچے کے تختہ (سیٹ) پر تھوڑی سی جگہ کھڑکی کی طرف آپ دے دیں۔ ہم کو بار بار ریلوے کے انتظام کے لیے باہر آنا جانا پڑتا ہے۔ مَیں نے کہا کہ بہت اچھا۔ ہمارا کوئی حرج نہیں۔ آپ بیٹھ جائیں۔ وُہ بیٹھ گیا۔ جب کھانے کا وقت آیا۔ مَیں نے ان دوست کے ذریعہ سے دریافت کیا کہ آپ کھانا کھائیں گے۔ کہا کہ مجھ کو کیا عذر ہے۔ ہم نے کھانا بازار سے خریدا تھا جو کچھ پتوں پر مِلا تھا۔ ہم نے اس کو بھی اس خیال سے کہ برتنوں کو کون دھوتا پھرے گا۔ انھی پتوں پر کچھ کھانا رکھ کر دے دیا۔ جو اس نے بڑی خوشی سے لے کر کھایا۔ ایک صاحب پُوچھنے لگے کہ برتن میں کھانا کیوں نہ دیا؟ مَیں نے کہا کہ چونکہ پڑوسی تھا۔ اس لیے حق جوار ادا کیا۔ حق احترام ادا نہیں کیا کہ اسلام سے محروم تھا۔ وُہ بردوان کے اسٹیشن پر اُترا اور شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا۔

"آپ کو بہت تکلیف ہُوا۔ ہماری وجہ سے۔ اور ہم کو آپ کی وجہ سے بہت آرام مِلا۔"

ایک رفیقِ سفر کہنے لگے۔ اگر آپ برتنوں میں کھانا دیتے تو زیادہ شکر ادا کرتا۔ مَیں نے کہا کہ یہ بھی ممکن تھا کہ نہ کرتا۔ برتن میں کھانا دینے سے اپنے کو بڑا سمجھتا کہ ہمارا احترام کیا گیا ہے۔ پھر شکریہ کی ضرورت ہی کیا محسوس ہوتی۔

تعظیمی رسُوم کا خاتمہ

ہر علاقہ میں مِلنے جلنے۔ کھانے پینے اور تعظیم و تکریم کی مختلف رسومات رائج ہوتی ہیں۔

حضرت تھانویؒ اپنے سفر کے دورانِ میں جہاں جہاں بھی ایسے رسومات کو دیکھتے

ان کے انسداد و استیصال کی طرف فوری توجہ دیتے اور اس تہذیب و تدبیر سے ان رسومات کے عادی لوگوں کو سمجھاتے کہ وہ فوراً حضرت کے فرمان سے متاثر ہو کر انھیں ترک کر دیتے۔

اعظم گڑھ میں یہ دستور تھا کہ حضرت کے ساتھ ایک جمِ غفیر کی بھی دعوت کی جاتی۔ حضرت تھانویؒ میزبان پر کسی قسم کا بار ڈالنے کے عادی نہ تھے۔ اس لیے کبھی کسی سے کوئی فرمائش نہ کرتے۔ پُرتکلف کھانوں کی بجائے سادہ معمولی کھانوں سے خوش ہوتے۔ آپ نے وہاں کی اس رسم کے انسداد کی یہ ترکیب نکالی کہ جو شخص بھی دعوت کرتا۔ یہ قید لگا دیتے کہ "میں تنہا کھاؤں گا۔ اور محض خشکہ اور ارہر کی دال کھاؤں گا۔ کیونکہ وہاں بیلن کی روٹیوں کا رواج ہے۔ جو ذرا سخت ہوتی ہے۔ اور مجھے موافق نہیں آتی۔" اس طرح آپ نے میزبان کو بہت بڑے بار سے بچا لیا۔

بنگال میں یہ رسم تھی کہ جو بھی ملنے آتا۔ آکر پاؤں کو چھوتا۔ جیسے پنجاب میں بھی اکثر پیروں کے ہاں دیکھا جاتا ہے۔ اس کے روکنے کی یہ ترکیب نکالی کہ اوّل آپ منع فرماتے جو اس کے بعد بھی آپ کے پاؤں پکڑتا تو اس کے لیے علاج بالمثل فرماتے یعنی آپ بھی فوراً اس کے پاؤں پکڑ لیتے۔ اور جب وہ شرمندہ ہو کر روکتا تو فرماتے:۔

"اگر یہ کوئی اچھی بات ہے تو مجھے اس سے کیوں روکتے ہو۔ اور اگر بُری بات ہے تو تم ایسی حرکت کیوں کرتے ہو۔"

بس دو چار مرتبہ ایسا کرنے کی دیر تھی کہ اس کی شہرت عام ہو گئی اور لوگوں نے اس بیہودہ رسم کو ترک کر دیا۔ ضلع اعظم گڑھ میں بھی یہ دستور تھا کہ جب کسی بڑے آدمی کی سواری گزرتی تو چند لوگ آگے آگے ہٹو بچو کہتے ہوئے چلتے۔ جو کوئی آگے آتا ہوا دیکھتے اسے ہٹا دیتے۔ حضرت نے ان لوگوں سے فرمایا کہ:۔

"راستہ کسی کی مِلک نہیں ہے سب کو چلنے کا برابر حق حاصل ہے یہ حرکت خلافِ شرع ہے۔ اس کو چھوڑنا چاہیئے۔ اور آیندہ ہرگز ایسا نہ کیا جائے۔"

بس لوگوں کی سمجھ میں یہ بات آگئی اور آیندہ کے لیے یہ رسم موقوف ہوگئی۔

ایک جگہ یہ دستور تھا کہ لوگ پالکی کے ساتھ دائیں بائیں دَوڑتے ہوئے چلتے۔ حضرت نے منع فرمایا کہ مجھ کو اس سے تکلیف ہوتی ہے۔ انھوں نے عرض کیا کہ ہم تو محبت سے ایسا کرتے ہیں۔ فرمایا پھر مجھے دکھاتے کیوں ہو۔ دائیں بائیں نہ چلو۔ پالکی کے پیچھے چلو۔ جہاں سے مجھ کو نظر نہ آئے چنانچہ تھوڑی دیر بعد جو حضرت نے مڑ کر دیکھا تو کوئی بھی نہ تھا۔ معلوم ہوا کہ یہ رسم محض دکھلاوے کے لیے ہوتی ہے۔ مگر وہ بچارے کیا کرتے۔ کسی مقتدا نے کبھی انھیں ٹوکا ہی نہ تھا۔ وہاں یہ بھی دستور تھا کہ علماء ہندوؤں سے بھی بات نہ کرتے تھے اور اگر کوئی علماء کی تعظیم کے لیے نہ اُٹھتا تو اسے اہانت سمجھتے۔ حضرت جب ایک انگریزی سکول کے پاس سے گزرے تو دستور کے مطابق سب ہندو طلبا اور مدرسین تعظیماً کھڑے ہو گئے۔ ان کا یہ سلوک دیکھ کر حضرت سکول کے اندر تشریف لے گئے اور نہایت سادگی اور ملاطفت کے ساتھ سب سے ملے اور کچھ دیر باتیں کرتے رہے جس سے وہ لوگ بہت مسرور ہوئے اور تعجب کرنے لگے کہ ایسے بھی مولوی ہوتے ہیں۔

ایک جگہ دستور کے مطابق گاؤں کے چودھری نے چندہ جمع کر کے دو سو روپیہ حضرت کو نذرانہ دیا لیکن یہ ظاہر نہ کیا کہ یہ گاؤں والوں سے جمع کیا گیا ہے۔ اس کی مالی حالت سے حضرت کو شبہ ہوا کہ یہ از خود اتنا نہیں دے سکتا۔ اس لیے حضرت نے پُوچھا کہ یہ آپ کی طرف سے ہے یا اس میں اور بھی شریک ہیں۔ جواب ملا کہ اس میں دُوسرے بھی شریک ہیں۔ فرمایا :-

"ہدیہ محبت کے لیے ہوتا ہے۔ جب دینے والوں کو میں نہیں جانتا۔ تو مجھ کو ان کی محبت کیسے ہوگی۔ اس لیے ہر ایک کی رقم اس کو واپس کردو۔ پھر جس کو دینا ہوگا۔ ہر ایک خود آکر اپنے ہاتھ سے دے گا۔ جس سے مجھے پتہ

پہچلے گا کہ یہ میرا محسن ہے اور مجھے اس سے محبت ہے۔"

چوہدری نے عذر کیا کہ اب تو آپ جارہے ہیں۔ فرمایا:۔

"میں بہت قریب مقام پر جارہا ہوں۔ جہاں پہنچنا سب کو آسان ہے۔
جس کو شوق ہو وہاں آکر ھدیہ دے۔"

مگر کوئی بھی ہدیہ دینے نہ آیا۔ کیونکہ وہاں یہ رسم تھی کہ اگر کوئی مولوی آئے اور اسے معقول نذرانہ نہ دیا جائے تو وہ بُرا مناتا تھا۔ مگر جب لینے والا ہی نہ لے تو پھر کسی کو پیچھے دوڑنے کی کیا ضرورت تھی۔

اعظم گڑھ کے ان واقعات کے سلسلہ میں حضرت فرمایا کرتے تھے کہ:۔

"میں نے وہاں کی اور رسموں کو تو مٹا دیا لیکن ایک رسم کے مٹانے میں کامیاب نہ ہوسکا، وہ یہ کہ جب کوئی عالم آتا تو موضع کے اکثر لوگ یہاں تک کہ چھوٹے لڑکے بھی استقبال کے لیے دُور تک آتے اور ایسا ہی رخصت کے وقت کرتے۔ وہاں کے لوگوں میں بہت ہی صلاحیت اور دینداری ہے۔ وہاں کے انگریزی خوانوں میں بھی خوش عقیدہ ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ بیچارے صرف معاش کے لیے انگریزی پڑھتے ہیں"۔

سفری مناظرے

سفر میں اکثر ہر خیال کے لوگوں سے حضرت کا سابقہ پڑتا تھا۔ جن سے مختصر سے مناظرے بھی ہوجایا کرتے تھے۔ جو دو چار باتوں تک ہی محدود رہتے تھے۔ مثلاً ریاضی کے پروفیسر اور مشہور اہلِ قلم مولوی ذکاء اللہ مرحوم سے حضرت کی دہلی میں ملاقات ہوگئی۔ انھوں نے آپ سے پوچھا کہ آپ کے مدرسوں میں طلبا میں کچھ لیاقت بھی پیدا ہوتی ہے؟ حضرت نے فرمایا کہ پہلے مجھے لیاقت کا مفہوم معلوم ہوجائے تو جواب دوں۔ بس خاموش ہوگئے۔ کیوں کہ وہ جانتے تھے کہ اگر جواب دیا تو لیاقت کے مفہوم کا

مدعی بن کر اس کا ثابت کرنا مشکل ہو جائے گا۔ بولوں گا تو دلدل میں پھنستا چلا جاؤں گا۔

آریہ کا اقرارِ کفر

ایک سفر کے دوران میں آریہ سماج کے ایک لیکچرار نے حضرت کی باتیں سن کر آپ سے یہ سوال کیا کہ دو شخص ہیں۔ ان میں ایک مُسلم ہے اور دُوسرا غیر مُسلم دونوں نے نیک نیتی سے کوئی نیک عمل کیا۔ تو اس عمل کا اجر دونوں کو یکساں ملے گا یا مختلف؟ حضرت نے فرمایا کہ :۔

"یہ سوال آپ کی دانشمندی اور تہذیب سے نہایت بعید ہے۔ کیونکہ آپ نے یہ ایک ایسا سوال کیا ہے۔ جس کا جواب آپ کے ذہن میں موجود ہے۔"

اس نے کہا :۔

"یہ آپ کو کیسے معلوم ہے کہ اس کا جواب میرے ذہن میں موجود ہے؟"

آپ نے فرمایا :۔

"جب اس جواب کے سب مقدمات آپ کے ذہن میں موجود ہیں تو وُہ جواب بھی موجود ہے کیونکہ جب ملزوم موجود ہے۔ تو لازم کا وجود بھی ضروری ہے۔"

اس نے پھر سوال کیا کہ :۔

"یہ آپ کو کیسے معلوم ہُوا کہ سب مقدمات میرے ذہن میں موجود ہیں؟"

فرمایا کہ :۔

"لیجئے! مَیں آپ ہی کے مُنہ سے اُن مقدمات کے موجود فی الذہن ہونے کا اقرار کرائے لیتا ہُوں۔ کیا آپ یہ نہیں جانتے کہ مختلف مذاہب میں حق مذہب ایک ہی ہو سکتا ہے۔ اس وقت اس کی بحث نہیں کہ

حق مذہب کون سا ہے ۔"

اس نے کہا :۔

" بیشک ۔ حق تو ایک ہی مذہب ہو سکتا ہے ۔"

حضرت نے فرمایا :۔

" ایک مقدمہ تو یہ ہوا ۔ جو آپ کے ذہن میں پہلے سے موجود ہے ۔ دُوسری بات مَیں یہ پُوچھتا ہُوں کہ کیا مذہب حق والے کی مثال مطیع سلطنت کی سی اور باطل والے کی مثال باغی سلطنت کی سی نہیں ؟"

اس کا بھی اس آریہ نے اقرار کیا اس دُوسرے مقدمہ کو تسلیم کرنے کے بعد حضرت نے پھر اسے فرمایا :۔

" کیا باغی کے سارے کمالات محض اس وجہ سے کہ وُہ باغی ہے نظرانداز نہیں کر دیئے جاتے اور کیا باوجود صاحب کمالات ہونے کے اُس کو عدالت سے سزا نہیں ملتی اور کیا وہ سزا عقل و انصاف کے خلاف ہوتی ہے ؟"

جب اس نے ان سب باتوں کے صحیح ہونے کا اقرار کر لیا ۔ تو اس پر حضرت نے فرمایا ۔

" بس یہ تینوں مقدمات آپ کے ذہن میں پہلے سے موجود ہیں ۔ تو اس کا نتیجہ بھی ضرور آپ کے ذہن میں ہے اور وہی آپ کے سوال کا جواب ہے تو ایسی حالت میں آپ کے سوال کا صاف یہ مطلب ہُوا کہ مَیں اپنے منہ سے آپ کو کافر کہوں ، سو ہماری شریعت اس بات کی اجازت نہیں دیتی کہ بلاضرورت ہم کسی کو کافر کہیں ۔"

اس آریہ نے خوش ہو کر کہا :۔

" واقعی مجھے اس کا شوق تھا کہ مَیں اپنے بارہ میں آپ کے مُنہ سے یہ لفظ سنوں

ایسے مُنہ سے اپنے بارہ میں کافر کا لفظ سُننے میں بھی مزہ آتا ہے"

حضرت نے جواب دیا۔

"خیر یہ آپ کے لیے تو خوبی ہے۔ لیکن میرے لیے سخت بدنما بات ہے"

ترکِ سفر

ہر کام کے لیے ایک وقت مقرر رہتا ہے۔ اتنا عرصہ صعوبتِ سفر برداشت کرنے کے بعد یکایک حضرت کی آنت اُترنے کی تکلیف میں اضافہ ہوگیا۔ جس کی وجہ سے آپ نے مجبوراً آیندہ کے لیے کلیتہً سفر کرنا بند کر دیا اور مشتاقانِ دید کے لیے حسب ذیل عذر نامہ چھپوا دیا جہاں سے درخواست طلبی آتی یہ بھیج دیا جاتا اور اس کے بعد کسی کو بلانے یا اصرار کرنے کی ہمت نہ ہوتی۔

عذر نامہ

"اکثر احباب کو معلوم ہے کہ آنت اُترنے کا عارضہ مجھ کو تیس برس سے زائد عرصہ سے ہے مگر جب تک بدن میں کافی قوت رہی تکلیف کم تھی۔ اب قوت کم ہوجانے سے تین برس سے زیادہ زمانہ ہُوا کہ یہ حالت ہوگئی ہے کہ باوجودیکہ ایک سخت کمانی (جس کی سختی یعنی بعض اوقات بہت ناگوار ہوتی ہے اور جس کے نیچے ہوا نہ لگنے سے یا پسینہ آجانے سے کھال میں دانے بھی پیدا ہو جاتے ہیں۔ جن میں سوزش ہونے لگتی ہے۔ تو ایسی سخت کمانی) ہر وقت لگی رہتی ہے۔ مگر پھر بھی بکثرت ایسا ہوتا ہے کہ (۱) کھانسنے سے (۲) دھسک اُٹھنے سے (۳) چھینکنے سے (۴) پکار کر بولنے سے (۵) دیر تک کھڑے رہنے سے (۶) دُور تک چلنے سے آنت اُتر آتی ہے۔ بعض دفعہ تو ایک گھنٹہ میں دو دو تین تین بار اترنے کی نوبت آجاتی ہے۔ جس کو اگر فوراً ٹھیک نہ کیا جائے تو تکلیف اس قدر بڑھ جاتی ہے کہ سہار نہیں ہو سکتی اور بعض دفعہ اترتے ہی پیٹ اور سینہ کی رگیں کھنچنے لگتی ہیں جن سے سخت تکلیف ہوتی ہے اور ٹھیک کرنے کے لیے اس کی ضرورت ہوتی ہے کہ پردہ کے

مکان میں لیٹ کر کپڑا ہٹا کر کمانی اتار کر ہاتھ کے دباؤ سے آنت کو چڑھا کر پھر کمانی لگائی جاوے اور ظاہر بات ہے کہ اس مجموعی حالت میں کسی طرح بھی سفر ممکن نہیں۔ اس بنا پر اطباء اور ڈاکٹروں نے زیادہ چلنے پھرنے بلکہ زیادہ دیر کھڑے رہنے کو بھی مضر بتلا رکھا ہے اور خود مجھ کو بھی مضر ہونے کا شب و روز مشاہدہ و تجربہ ہو رہا ہے۔ اسی لیئے تین سال سے زائد زمانہ ہوا کہ میں نے کوئی چھوٹا یا بڑا سفر نہیں کیا بلکہ اگر کوئی عزیز دوسرے محلہ میں مرگیا تو بذریعہ رقعہ اس کا پرسہ دے دیا۔ خود نہیں جا سکا اور چونکہ سبب اس کا جھلی کا پھٹ جانا ہے۔ اور قاعدہ کی رو سے اب اس کا چڑھانا عادۃً غیر ممکن ہے۔ اس لیے اس عارضہ کے جانے کی آیندہ بھی کوئی امید نہیں۔ چنانچہ متعدد ہندوستانی، بنگالی اور یورپین ڈاکٹروں کا اس پر اتفاق ہے کہ بجز اپریشن کے اس کا کوئی علاج نہیں۔ اور اس پر بھی اتفاق ہے کہ اپریشن اس عمر میں خطرناک ہے۔ یہ سب مجموعی واقعات سفر سے میری دائمی معذوری کو صاف ظاہر کر رہے ہیں۔ چونکہ بعض احباب جنھوں نے اس حالت کا مشاہدہ نہیں کیا۔ اب بھی اپنی تقریبات وغیرہ میں میرے بلانے کی تحریک کیا کرتے ہیں۔ ان کی اطلاع کے لیے یہ اعلان شائع کرتا ہوں۔ تاکہ میرے اس قوی عذر پر نظر فرما کر ایسی تحریک نہ فرماویں۔

والسلام

اشرف علی۔ تھانہ بھون

۱۰ جمادی الثانی ۱۳۳۷ھ

حقیقتِ عُذر

چونکہ قدرت نے حضرت سے چلتے پھرتے جو کام لینا تھا۔ وہ پورا ہو چکا تھا۔ اور اب حضرت کو قطب الارشاد بنا کر ایک جگہ بٹھانا مقصود تھا۔ جیسا کہ اکثر اولیاء اللہ کے ساتھ معاملہ رہا ہے۔ اس لیے غیب سے ایک عُذر لاحق کر دیا گیا۔ جس میں بفضلہٖ تعالیٰ کوئی بڑی تکلیف بھی نہ تھی اور دوسروں پر حجت قائم کرنے کے لیے وجہ بھی معقول اور قابلِ قبول تھی اس

کے بعد آپ قطبِ زماں کی حیثیت سے اپنے مرکز پر ہی بیٹھے اور خلقِ خدا کو اپنے فیوض سے بہرہ اندوز کرنے میں پہلے سے زیادہ مشغول ہو گئے۔

سفرِ لاہور

شوال ۱۳۴۳ھ کے بعد سے حضرتؒ نے سخت مجبوریوں۔ کبر سنی اور ضعف کے باعث ترکِ سفر کا مصمّم ارادہ فرمالیا تھا اور اس کے بعد کسی صورت میں بھی کسی کی درخواست منظور نہ فرمائی۔ لیکن پھر بھی اپنی ذاتی ضرورتوں اور اپنی وجہ سے دوسروں کو تکلیف سے بچانے کے لیے چار مرتبہ سفر کی زحمت گوارا کرنی پڑی۔ پہلا سفر غالباً ذی قعدہ ۱۳۵۲ھ اور دُوسرا ۱۸ جمادیٰ الاخریٰ ۱۳۵۴ھ کو سہارنپور تک کا ہُوا۔ جو صرف اپنے بڑے بھانجے مولوی سعید احمد صاحب مرحوم کی صاحبزادی کو سفرِ حج کے سلسلہ میں سہارنپور تک پہنچانے اور دوسری مرتبہ سہارنپور سے لانے کے لیے صرف ان کی خاطر سے بغایت شفقت و محبت برداشت کیا۔

ان دو مختصر سفروں کے بعد تیسرا اہم سفر لاہور کا اس لیے کرنا پڑا کہ حضرت کو عرصہ سے معدے کی شکایت چلی آتی تھی جس سے غذا کم ہو گئی تھی اور وُہ بھی ہضم نہ ہوتی تھی چونکہ اُوپر نیچے کے بعض دانت ٹوٹ گئے تھے۔ اس لیے خیال ہُوا کہ شاید غذا پُورے طور پر نہ چبائے جا سکنے کی وجہ سے ہضم میں فتور ہو کر معدہ خراب ہو گیا ہو۔ دانت بنوانے کا خیال پیدا ہُوا اور اپنے مخلص خادم اور لاہور کے مشہور و تجربہ کار ڈاکٹر عزیز احمد جلال الدین صاحب سے دانت بنوانے کا فیصلہ کیا جو اس فن میں مہارت تامہ اور نہایت کمال رکھتے تھے۔ گو ڈاکٹر صاحب تھانہ بھون پہنچ کر یہ خدمت انجام دینے کے لیے تیار تھے۔ مگر آپ کی غیور اور با اصول طبیعت نے یہ گوارا نہ کیا اور ۲۹ صفر ۱۳۵۷ھ بمطابق ۳۰ اپریل ۱۹۳۸ء کو بروز شنبہ صبح کی گاڑی سے بقصدِ لاہور تھانہ بھون سے سہارنپور روانہ ہُوئے۔

رفقائے سفر

رفیق سفر حضرت آپ کے بھتیجے مولانا شبیر علی صاحب تھانوی اور شیخ فاروق احمد صاحب متوطن لندن تھے۔ شیخ فاروق احمد نے انگریزی میں شائع شدہ حضرت کی تصانیف کتب تصوف اور تذکرہ ہائے اولیاء پڑھنے کے بعد کوئی دو سال قبل لندن میں اسلام قبول کیا تھا اور حضرت کی زیارت کا شوق رکھتے تھے کہ خدا تعالیٰ نے کچھ ذرائع پیدا کر دیئے۔ جن کی وجہ سے وہ لندن سے ہندوستان آئے اور ریاست بہاولپور میں مقیم ہوئے۔ وہاں سے وہ اپنے قومی لباس کی بجائے اسلامی لباس میں یعنی ہیٹ کی بجائے ترکی ٹوپی۔ قمیض کی بجائے کرتہ۔ کوٹ کی بجائے شیروانی۔ پتلون کی بجائے شلوار اور بوٹ کی بجائے جوتہ پہنے اور ڈاڑھی بڑھائے نورانی شکل میں خانقاہ امدادیہ میں پہنچے وہ اگرچہ اردو۔ فارسی۔ عربی نہ جانتے تھے مگر حضرت کی زبان مبارک سے نکلے ہوئے الفاظ کانوں میں پڑنے۔ رُخِ انور پر نظر جانے اور باطنی توجہ اور فیوض و برکات کے اثر سے ان کو اتنی تسکینِ قلب ہوتی تھی کہ ہر مجلس میں حاضر رہتے تھے۔ ان کے جذبات و کیفیات اور احساسات و سوالات حضرت تک اور حضرت کے جوابات و ملفوظات ان تک مترجمین پہنچاتے رہتے تھے۔ جن سے ان کو اتنے فوائد حاصل ہوئے کہ ضبطِ تحریر میں نہیں آسکتے۔

ایک اہم سبق

چونکہ یہ سفر ایک ذاتی ضرورت کے ماتحت کیا جا رہا تھا۔ اس لیے آپ نے اپنی روانگی کو پردۂ اخفا میں رکھا اور شروع سے ایسے انتظام کر دیئے کہ سوائے متعلقین کے دوسروں کو اس سفر کا علم نہ ہو سکے۔ چنانچہ سہارنپور اترنے کے بعد آپ سیدھے اپنے بھتیجے حامد علی صاحب اور محمود علی صاحب کے ہمراہ جو اسٹیشن پر آئے ہوئے تھے۔ حامد علی صاحب کے مکان پر اترے اور وہاں سے بلا اطلاع مدرسہ مظاہر العلوم میں

تشریف لے گئے۔ بس آپ کا وہاں پہنچنا تھا کہ کسی پوشیدہ مقناطیسی کشش سے آناً فاناً مشتاقانِ زیارت کا اتنا ہجوم ہو گیا کہ مدرسۂ قدیم کی عمارت ناکافی ہو گئی۔ اور حضرت کو چند قدم چلنا دشوار ہو گیا۔ ہر شخص زیارت و مصافحہ کے لیے بیتاب تھا اور حضرت حتّٰے کہ ہاتھ بڑھائے ہر ایک کو مصافحہ کی سہولت بہم پہنچا رہے تھے۔ ہجوم لمحہ بہ لمحہ بڑھتا جا رہا تھا اور وقت رفتہ رفتہ کم ہوتا جا رہا تھا۔ ادھر حضرت بھی اتنی دیر ہاتھ بڑھائے تھک رہے تھے۔ جسے دیکھ کر مولانا حافظ عبداللطیف صاحب ناظم مدرسہ نے مصافحہ کرنے والوں کو روکا۔ مگر حضرت نے خود ان کو روک دیا کہ نہیں کسی کو نہ روکا جائے۔ میری محبت ان کو لے آئی ہے۔ میں یہاں ملنے ملانے کو تو آیا ہوں۔ ناظم صاحب نے کہا کہ حضرت والا کو تکلیف ہو گی۔ فرمایا کبھی احباب کو ملنے میں بھی تکلیف ہوتی ہے۔ یہاں اور کام ہی کیا ہے۔ تھانہ بھون تو دوسرے مشاغل ہوتے ہیں۔ اس لیے وہاں انضباطِ اوقات ضروری ہے۔ ورنہ کوئی کام بھی نہ ہو سکے۔ یہ جو اتنا کام ہو گیا ہے وہ انضباطِ اوقات ہی کی بدولت ہے۔

جب معاملہ حد سے تجاوز کر گیا۔ تو اب ناظم صاحب نے کچھ سختی کرنی چاہی تو حضرت نے پھر روک دیا۔ اس پر ناظم صاحب نے کہا کہ ہم دیکھ رہے ہیں کہ حضرت کو تکلیف ہو رہی ہے اور لوگ ہیں کہ نہیں مانتے اور نہ کچھ سنتے ہیں۔ یہ بھی کوئی انسانیت اور تہذیب ہے۔ اس پر ارشاد ہوا کہ :-

" دیکھئے۔ جس کے سپرد انتظام ہوتا ہے۔ اس کو سختی کرنا ہی پڑتی ہے۔ بغیر اس کے کام نہیں چلتا۔ جو لوگ مجھ کو سخت کہتے ہیں۔ اب دیکھیں حقیقت میں میں سخت ہوں یا نرم حالانکہ حافظ صاحب بیچارے بہت نرم ہیں۔ لیکن انتظام کے لیے ان کو سختی کرنا پڑ رہی ہے۔ کوئی اجنبی آدمی اگر دیکھے تو اس کو تعجب ہو گا کہ جس کی نسبت مشہور ہے کہ بہت سخت

ہے۔ وہ کتنا نرم ہے اور جو نرم ہیں وہ سختی کر رہے ہیں۔ بات یہ ہے کہ جب تک میں تھانہ بھون میں ہوں۔ وہاں کے انتظام اور کام کا تعلق مجھ سے ہے اگر میں سختی نہ کروں۔ تو کچھ کام بھی نہ کر سکوں اور یہاں ملنا ملانا یہی کام ہے اس لیے سختی کی ضرورت نہیں۔ نرم ہوں اور ناظم صاحب چونکہ یہاں کے منتظم ہیں۔ اس لیے وہ یہاں بہت سخت معلوم ہوتے ہیں۔"

(ارمغان جاوداں ص ۱۴)

دُوسروں کی رعایت

حضرتؒ نے اپنے پروگرام کے مطابق سہارنپور سے دو بجے رخصت ہونا تھا۔ احباب نے تقاضا کیا کہ دو بجے کی گاڑی میں سخت گرمی ہو گی لہٰذا بعد مغرب طوفان میل سے تشریف لے جائیں۔ حضرت نے فرمایا کہ مولوی شبیر علی سے مشورہ کر لیا جائے لیکن اس کا خیال رہے کہ لاہور کے لوگ اس گاڑی سے انتظار کریں گے۔ اہلِ مدرسہ کی خواہش تھی کہ کوئی ایسی تجویز کی جائے کہ یہاں زیادہ قیام کا موقع مِل سکے۔ گھر میں آئی ہوئی نعمت و برکت کو جلد چھوڑنے کو کسی کا بھی جی نہ چاہتا ہے۔ اس لیے کسی نے تجویز کی کہ لاہور تار دے دی جائے۔ مگر اس کے ساتھ ہی یہ قباحت نظر آئی۔ کہ رات کی گاڑی میں ہجوم زیادہ ہونے کی وجہ سے تکلیف ہو گی اور اہل لاہور کی پریشانی علاوہ۔ اس لیے حضرت کی خواہش کے مطابق دو بجے دن کی ہی گاڑی سے روانگی طے پائی۔ جب حضرت کو اس کی اطلاع دی گئی تو آپ نے فرمایا :۔

"بہتر آرام تسلیم و انقیاد ہی میں ہے۔"

چنانچہ سہارنپور سے وقت مقررہ پر روانہ ہوئے۔ یہاں سے حامد علی صاحب۔ مولوی ظہور الحسن صاحب مولوی ولی محمد صاحب بٹالوی اور مولوی حافظ سلیمان صاحب رنگونی بھی حضرت کی اجازت سے رفقاء سفر میں شامل ہو گئے۔ اگرچہ خاص مصالح کی

بنا پر حضرت نے روانگی سے پہلے اہلِ پنجاب عوام و خواص سب پر اس سفر کے مخفی رکھنے کا خاص اہتمام فرمایا تھا اور حضرت کی آمد کا صرف ڈاکٹر عزیز احمد جلال الدین صاحب اور حضرت مولانا مفتی محمد حسن صاحب مدظلہٗ امرتسری کو علم تھا اور انہیں تاکید بھی تھی کہ آمد کو مخفی رکھنا ہے۔ مگر اس گاڑی میں دو ایک ایسے آدمی بھی تھے، جو لاہور جا رہے تھے اور ان کو حضرت کے ہم سفر ہونے کا علم ہو چکا تھا۔ جب وہ حضرت سے ملنے آئے تو حضرت نے انہیں فرمایا کہ :-

"لاہور میں کسی سے نہ کہنا کہ میں یہاں آیا ہوں۔ اگر تم نے کہا تو تمہیں گناہ ہوگا۔ اس لیے کہ تمہاری اطلاع پر لوگ میرے پاس آئیں گے اور ہجوم سے مجھے تکلیف ہوگی اور میرے نہ مل سکنے سے ان کو تکلیف ہوگی اور مسلمان کو تکلیف پہنچانا گناہ ہے۔" (ارمغانِ جاوداں صـ۱۷)

اس پر وہ لوگ بڑے حیران ہوئے کہ ہمارے مشائخ، علماء اور لیڈر تو جہاں جاتے ہیں روانہ ہونے سے پہلے اخبارات کے ذریعہ اپنے پروگرام سے لوگوں کو آگاہ کرتے ہیں تاکہ شایانِ شان استقبال ہو اور ان کے پروگرام کو شہرت دینے اور استقبال کرنے والوں کے ممنون ہوتے ہیں اور یہاں معاملہ بالکل برعکس ہے۔

سلسلہ ملفوظات

ہمیشہ کے معمول کے مطابق اس مرتبہ بھی آپ تیسرے درجہ میں سفر کر رہے تھے۔ اللہ کے فضل سے ایک ایسا ڈبہ مل گیا تھا، جو گو مختصر تھا۔ مگر آرام دہ مسافر بھی کم تھے چند ہندو اور دو ایک مسلمان اور بیٹھے تھے جو حضرت اور حضرت کے ہمراہیوں سے مراعات سے پیش آتے رہے اور نماز بھی باجماعت ہوتی رہی۔ جب گاڑی امرتسر پہنچی تو حضرت مولانا مفتی محمد حسن صاحب بھی تشریف لے آئے۔ ان کا خیال تھا کہ حضرت ڈیوڑھے میں ہوں گے۔ اس لیے انہوں نے بھی ڈیوڑھے درجہ کا ٹکٹ خرید

رکھا تھا۔ لیکن جب حضرت کے قریب آکر بیٹھے تو ان کو جوشِ مسرت میں یہ بھی محسوس نہ ہوسکا کہ یہ تیسرا درجہ ہے۔ اس بات کا انھیں لاہور جاکر علم ہوا۔

امرتسر سے لاہور تک ریل میں حضرتؒ کے ملفوظات کا سلسلہ برابر جاری رہا۔ حضرت مفتی صاحب کا بیان ہے کہ معلوم ہوتا تھا گویا خانقاہِ امدادیہ تھانہ بھون کی سہ دری ہے وہی مسند رشد و ہدایت وہی مجمع وہی اہل حاجت۔ وہی نشست۔ وہی ہیبت۔ وہی منظر اور وہیں حضرت والا حسب معمول تقریر فرمارہے ہیں۔ اس وقت زیادہ تر تذکرہ حضرت مفتی کے شاگرد مولوی فقیر محمد صاحب کی تحریروں اور عرضداشتوں کا رہا۔ اس کے علاوہ بھی علوم ظاہری و باطنی کا سلسلہ جاری رہا۔ کہ رات کے گیارہ بجے گاڑی لاہور پہنچی۔ ڈاکٹر کے صاحبزادے تو موجود تھے مگر خود ڈاکٹر صاحب ندارد دریافت پر پتہ چلا کہ وہ رفع حاجت کے لیے گئے ہیں۔ ابھی آتے ہیں۔ حضرت اور ان کے رفقاء گاڑی سے اُتر کر پلیٹ فارم پر بنچ پر بیٹھ گئے۔ سامان جب اکٹھا ہوکر گنا جاچکا تو ڈاکٹر صاحب تشریف لے آئے۔ حضرت نے مزاحاً فرمایا کہ:۔

"آج تک تو یہ سُنا تھا کہ خوف سے رفع حاجت کی ضرورت ہوتی ہے۔ لیکن لاہور آکر معلوم ہوا کہ ازدیادِ شوق میں بھی ایسا ہوجاتا ہے۔"

اس کے بعد ڈاکٹر صاحب ان نفوس قدسیہ کا قافلہ اپنی کوٹھی پر لے گئے۔ جہاں گھر والوں کو بھی اس بات سے بے خبر رکھا ہوا تھا کہ حضرت تشریف لا رہے ہیں۔

دانتوں کا معائنہ

صبح کو ڈاکٹر صاحب نے دانتوں کا معائنہ کیا۔ حضرت نے انھیں فرمادیا کہ جو دانت موجود ہیں۔ ان کو باقی رکھنا چاہتا ہوں۔ ڈاکٹر صاحب نے صرف ایک دانت ایسا پایا جس کا طول تو قائم تھا۔ مگر عمق اور کسی قدر عرض گھس کر اوپر سے بہت چپٹا اور نیچے سے نوکیلا ہوگیا تھا۔ جس کا وجود غیر معین ہونے کے علاوہ ناموزوں تھا اور جدید دانت بن جانے

کے بعد اور بھی ناموزوں ہو جاتا۔ اس لیے ڈاکٹر صاحب نے حضرت کو اطلاع کیے بغیر مولانا شبیر علی صاحب کی موجودگی میں دانت دیکھتے دیکھتے وہ ایسی صفائی سے نکال لیا کہ حضرت کو احساس تک نہ ہُوا۔ سانچہ لینے کے بعد حضرت والا نے جو آئینہ دیکھا۔ تو دانت موجود نہ پایا اور حیرت سے فرمایا کہ یہاں کا دانت کہاں گیا۔ اس پر ڈاکٹر صاحب نے دانت پیش کر دیا۔ حضرت نے فرمایا کہ خواہش تو میری بھی تھی کہ یہ دانت نکل جائے۔ لیکن کہنے کو دل نہیں چاہتا تھا۔

قیامِ لاہور

لاہور میں آپ نے پُورا ہفتہ قیام فرمایا۔ تمام ڈاک باقاعدہ یہاں پہنچتی رہی۔ سب معمولات روزمرّہ تھانہ بھون کی طرح انجام پاتے رہے۔ پہلے چھ دن تو آپ نے اپنے علاج کے لیے وقف رکھے۔ آخری دن عام ملاقات کے لیے مخصُوص فرمایا۔ اس عرصہ میں آہستہ آہستہ آپ کی آمد کی خبر کانوں کان پہنچتی پہنچتی عام لوگوں تک بھی پہنچ گئی۔ آپ کی اچانک بلا اطلاع آمد پر طرح طرح کی قیاس آرائیاں ہونے لگیں۔ زیادہ تر لوگوں نے یہی خیال کیا کہ آپ کانگرس اور مُسلم لیگ میں صلح کرانے آئے ہیں۔ یہیں سے حضرت مولانا خیر محمد صاحب کو بھی جالندھر حضرت کی آمد کی اطلاع مفتی صاحب نے بھیجی۔ وُہ بھی اس اچانک آمد پر بڑے حیران ہُوئے۔ دوسرے روز روانہ ہو کر مولانا خیر محمد صاحب ۶، مئی کو شام کی گاڑی سے لاہور پہنچ گئے اور کوٹھی ایسے وقت پہنچے۔ جبکہ حضرت نماز۔ نوافل اور اوراد وغیرہ سے فارغ ہو کر کمرہ کے اندر تشریف لے جا رہے تھے۔ ادب سے سلام عرض کیا۔ حضرت نے انتہائی شفقت سے گلے لگا لیا۔ معانقہ و مصافحہ کے بعد ہنس کر فرمایا کہ "میں نے کہا کہ میں کیوں "مناع للخیر بنوں"۔" مولانا نے نماز پڑھنی تھی۔ نماز سے فارغ ہو کر اندر آئے حضرت نے "دُودھ کا گلاس" عنایت فرمایا اور حضرت مولانا مفتی محمد حسن صاحب مولانا خیر محمد کی درخواستوں پر امرتسر اور جالندھر واپسی کے وقت قیام کا وعدہ فرمایا۔

زیارتِ مزارات

قیام لاہور کے دوران میں آپ سب سے پہلے حضرت داتا گنج بخش رحمۃ اللہ علیہ کے مزار پر بغرضِ فاتحہ خوانی تشریف لے گئے۔ آپ وہاں صبح کو ایسے وقت پہنچے۔ جبکہ زائرین کی کثرت تھی۔ آپ حسبِ معمول صاحبِ مزار کی پائینتی کی طرف قدرے پیچھے ہٹ کر ہاتھ چھوڑے کھڑے کھڑے ایصالِ ثواب میں مشغول ہو گئے۔ ڈاکٹر صاحب حضرت کے پیچھے کھڑے تھے کہ حضرت کو اس حالت میں کھڑے دیکھ کر ایک قوی ہیکل مجاور نے زور دار اور ہیبت ناک آواز سے پکارا کہ ہاتھ آگے باندھو۔ مگر حضرت کو آواز کی طرف مطلق التفات نہ ہُوا۔ ڈاکٹر صاحب نے اِسے سمجھانے کی کوشش کی مگر اس پر اس کا کوئی اثر نہ ہُوا اور وُہ بدستور تند آواز میں یہی پکارتا رہا اور ہر مرتبہ اپنی آواز کو پہلے سے بلند کرتا رہا۔ لیکن حضرت بدستور اُدھر متوجہ رہے۔ فاتحہ سے فارغ ہونے کے بعد فرمایا کہ حضرت داتا گنج بخش:-

"بہت بڑی شخصیت ہیں۔ عجیب رعب ہے۔ وفات کے بعد بھی سلطنت کر رہے ہیں"

دُوسرے روز صُبح کے ناشتہ کے بعد آپ جہانگیر کے مقبرہ پر تشریف لے گئے۔ نُورجہاں کے مزار کو دیکھ کر فرمایا کہ اوّل یہیں چلیں۔ عوام تو اس قبر پر کم آتے ہوں گے۔ وہاں سے ہو کر جہانگیر کے مزار پر تشریف لے گئے۔ بعد ازاں لاہور کے دیگر تاریخی مقامات شاہی مسجد قلعہ۔ شالامار باغ۔ خانقاہ میاں میر وغیرہ کو دیکھا۔ ڈاکٹر صاحب ان کی تاریخی حیثیت تاریخی واقعات و حالات بتاتے گئے اور حضرت ہر چیز پر محققانہ نظر دوڑاتے گئے اور اپنے خیالات کا اظہار فرماتے رہے۔

امرت سر کو روانگی

۸ مئی ۱۹۳۸ء کی صُبح کو نمازِ فجر پڑھنے کے بعد حضرت مولانا محمد حسن صاحب حضرت

تھانویؒ اور ان کے رفقاء کو بذریعہ موٹر لاری لے کر امرتسر روانہ ہوئے۔ وہاں پہنچنے کی دیر تھی کہ زائرین کا ہجوم ہو گیا۔ مشتاقین پروانوں کی طرح ایک دوسرے پر گرے پڑتے تھے اور ملفوظات سننے کی کوشش میں ہمہ تن توجہ ہو کر علی رؤسہم الطیر کا منظر پیش کر رہے تھے۔ نماز عصر مسجد نور میں پڑھنے جا رہے تھے کہ گاماں پہلوان کی درخواست پر چند منٹ کے لیے ان کے مکان پر تشریف لے گئے۔ وہاں سے قریب ہی حضرت مولوی نور احمد صاحب کی مزار پر فاتحہ پڑھا۔ مسجد نور میں عصر کی نماز پڑھنے کے بعد موٹر پر خواجہ محمد صادق کے مکان پر کٹڑہ مہاں سنگھ تشریف لے گئے۔ وہاں سے ہال بازار ہوتے ہوئے مسجد خیر الدین کو دیکھتے ہوئے لاہور روانہ ہو گئے اور مغرب کی نماز لاہور جا کر پڑھی۔

امرتسر سے واپسی کے بعد آپ ۱۱ مئی تک لاہور رہے۔ اس عرصہ میں حضرت نے ملاقات کی اجازت عام فرما دی تھی۔ ہر شخص بلا تکلف حاضر ہو سکتا تھا۔ پھر تو زائرین اور مشتاقین نے دل بھر کر دولتِ دیدار حاصل کی اور فیوض و برکات سے مالا مال ہوئے۔

لاہور پر امرتسر کو ترجیح

لاہور میں چونکہ آپ بغرض علاج تشریف لائے تھے۔ اس لیے آپ نے اپنی آمد و قیام کو پردۂ اخفا میں رکھنے کی حتی الوسع کوشش کی یہاں تک کہ نماز بھی باجماعت کوٹھی پر ہی پڑھتے تھے۔ کیونکہ مسافر کو مسجد کی حاضری اور جماعت کی حاضری معاف بھی ہے۔ سیر اور چہل قدمی کے لیے بھی اکثر اندھیرے میں نکلتے تھے۔ کیونکہ فرماتے تھے کہ "اگر کسی نے دیکھا تو شہر میں عام اطلاع ہو جائے گی۔ عوام کے ہجوم کی وجہ سے اطمینان بے تکلفی اور آسانی نہ رہے گی۔ تھانہ بھون میں آرام کہاں ملتا ہے۔ یہاں تو چند روز آرام کر لوں۔ آج کل لوگوں میں تہذیب تو ہے نہیں۔ اُلٹے سیدھے سوالات شروع کر دیتے ہیں۔ خواہ مخواہ جھک جھک ہوتی ہے۔ اس لیے بہتر یہی ہے کہ احتیاط کی جائے۔"

جس وقت ڈاکٹر صاحب نے حضرت مفتی صاحب کے ایما پر حضرت کی خدمت

میں امرتسر تشریف لے جانے کی درخواست پیش کی تو حضرت نے درخواست منظور کرتے ہوئے فرمایا کہ وہاں اخفا کی ضرورت نہیں ہے۔ صرف ایک دن کا قیام ہوگا۔ نیز ذوقاً اہلِ امرتسر سے انس معلوم ہوتا ہے بخلاف لاہور کے جہاں کی یہ کیفیت ہے کہ موٹر سے گزرتے وقت عام سڑک پر جو لوگ نظر آتے ہیں ان کی ہیئت اور حال بتاتا ہے کہ وہ سمجھے ہوئے ہیں کہ ہمچو ما دیگرے نیست۔ اس لیے یہاں کے عام لوگوں سے دل نہیں ملتا۔

عرض کیا گیا کہ اہلِ امرتسر کی خوش قسمتی ہے کہ آنجناب نے یہاں قدم رنجہ فرمایا ہے۔ ملاقات کی عام اجازت بخشی حالانکہ لاہور میں عام اجازت نہ تھی اس پر اوّل تو مزاحاً فرمایا کہ لاہور لاحول اور امرتسر امرت بر سر اور پھر فرمایا کہ میں بھی مسئلہ مختلف فیہا بن گیا ہوں کہ امرتسر والے تو کہیں گے کہ خوش خلق ہے جو کسی کو ملاقات سے روکتا ہی نہیں۔ اور لاہور والے کہیں گے کہ بڑا ہی سخت مزاج ہے کہ ملنے کی اجازت ہی نہیں دیتا۔ حالانکہ وجہ اس کی یہ ہے کہ لاہور میں کئی دن رہنا اور کام کرنا تھا اور امرتسر میں بجز ملاقات اور مصافحے کے کوئی کام ہی نہ تھا۔

لاہور میں ایک رات کو موٹر پر تفریح کے لیے تشریف لے جا رہے تھے۔ تو ہر طرف بجلی ہی بجلی کی روشنی۔ اس کی کثرت اور اس کی قطار نظر آئی۔ اس پر فرمایا کہ "اس روشنی میں ظلمات بتین۔ کیونکہ اس کو حق تعالیٰ سے انتساب نہیں" روشنی سے گذر کر جب کھلے میدان میں اندھیرا آیا تو فرمایا کہ "اس ظلمت میں نور ہے" امرتسر جانے سے قبل متعدد بار فرمایا کہ "مجھے امرتسر کے لوگوں سے محبت کی بو آتی ہے اور لاہور میں تو بجز الحاد اور دہریت کے کچھ نظر نہیں آتا۔"

لاہور سے واپسی کی اہلِ امرتسر کو قصداً اطلاع نہ کی گئی کہ حضرت کو ہجوم سے تکلیف ہوتی تھی۔ مگر بایں ہمہ جب گاڑی لاہور سے امرتسر پہنچی۔ کافی تعداد میں لوگ استقبال و زیارت کے لیے موجود تھے۔ بعض تو حضرت کے ڈبہ میں داخل ہو گئے۔ اور حضرت

نے داہنے دست مبارک سے مصافحہ کرنا شروع کر دیا تھا جو باہر رہے ان کے لیے حضرت نے بایاں ہاتھ باہر کر دیا۔ جسے لوگوں نے چومنا شروع کر دیا۔ اس اثنا میں حکیم عبدالخالق صاحب نے پانی پیش کیا۔ فرمایا میں کس طرح پیوں۔ دونوں ہاتھ رُکے ہوئے ہیں اس پر باصرار داہنا ہاتھ گاڑی کے اندر سے خالی کرایا گیا۔ حضرت پانی بھی پیتے رہے اور مشتاقین سے مصافحہ بھی کرتے رہے۔ کسی کو بھی منع نہ فرمایا۔ یہ صرف اہلِ امرتسر کے خلوص کا نتیجہ تھا۔ جو حضرت مولانا مفتی محمد حسن صاحب مدظلہٗ کے فیض کا اثر تھا۔ جب حکیم صاحب نے حضرت کو لکھا کہ "اہلِ امرتسر حضور کی عنایت نامہ سے بہت خوش ہیں" تو حضرت نے فرمایا کہ "میں خود ان کی محبت سے بے حد متاثر ہوں"۔

ورودِ جالندھر

۱۱ مئی کو پانچ بجے شام کی گاڑی سے آپ جالندھر روانہ ہوئے حضرت مولانا خیر محمد صاحب پہلے جالندھر پہنچ چکے تھے۔ انھوں نے صرف خواص کو بھی حضرت کی آمد کی اطلاع کی تھی۔ عام اعلان نہیں کیا گیا تھا۔ نہ اس کی اجازت حاصل کی گئی تھی۔ لیکن جب گاڑی اسٹیشن پر پہنچی تو استقبال کرنے والوں کی تعداد ہزاروں سے متجاوز تھی۔ ارد گرد کے قصبات سے لوگ بیس بیس کوس پیدل سفر کر کے آئے ہوئے تھے۔ حالانکہ گاڑی رات کے ساڑھے آٹھ بجے وہاں پہنچی تھی۔ مولانا حیران تھے کہ ان کو کس نے خبر کر دی۔ مگر کوئی سُراغ نہ چلا۔ ایسا محسوس ہوتا تھا۔ جیسے جالندھر کے مضافات میں کسی نے منادی کرا دی ہو۔ مولانا خیر محمد صاحب نے فرمایا کہ اس کو حضرت والا کی کرامت اور مقبولیت الٰہیہ کے سوا کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ ورنہ جالندھر کی تاریخ میں ایسا عام استقبال اور اژدہام یاد نہیں۔ حالانکہ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ جب پنجاب کے مشہور پیر و مولوی جماعت علی شاہ کی آمد پر مریدین کی طرف سے منادی کرائی گئی تھی اور ترغیب بھی دی گئی تھی۔ تب گنتی کے آدمیوں میں سے زیادہ پلیٹ فارم پر نظر نہیں آتے

تھے۔

ٹرین سے اُترنے پر حضرت کو معلوم ہُوا کہ نو تعلیم یافتہ طبقہ کچھ رسمی استقبال کرنا چاہتا ہے تو فرمایا کہ میں کوئی لیڈر نہیں ہوں۔ ایک طالب علم ہوں۔ میرے لیے کسی خصوصیت کی ضرورت نہیں۔ مشتاقین نے چونکہ حضرت کو مصافحہ میں مشغول کر لیا تھا۔ اس لیے حضرت کے دونوں ہاتھ رُکے ہُوئے تھے۔ کہ سوٹ و بوٹ۔ ہیٹ سے آراستہ ایک نو تعلیمیافتہ حضرت کے ہاتھ میں پھول دینے لگا تو حضرت نے تیز لہجہ میں فرمایا کہ صُورت تو مہذبوں کی سی ہے۔ لیکن کیا یہی تہذیب ہے کہ ایک مشغول شخص کے ہاتھ کو دُوسری چیز میں مشغول کر دیا جائے اور پہلے سے فراغت کا انتظام نہ کیا جائے۔ جب آپ موٹر میں سوار ہُوئے۔ جسے ایک دُوسرے خیال و عقیدہ و عمل کے صاحب ازراہِ محبت چلا رہے تھے۔ تو وہی پھول حضرت کو موٹر میں نظر آئے فرمایا کہ اگر میں اس نو تعلیم یافتہ صاحب کو نہ روکتا۔ تو وہ یہ ہار میرے گلے میں ڈالنے کا ارادہ کر چکا تھا۔

جب حضرت نے مدرسہ خیر المدارس کو اپنے قدوم میمنت لزوم سے نوازا تو عشاء کی اذان ہو چکی تھی۔ نماز سے فارغ ہونے پر حضرت مولانا خیر محمد صاحب کے ہمراہ مدرسہ کی چھت پر تشریف لائے جہاں مولانا کی طرف سے عشائیہ کا انتظام تھا اور سولہ سترہ صلحا مدعو تھے۔

صبح اشراق سے فارغ ہو کر باہر تشریف لائے۔ مسجد میں زائرین کا مجمع تھا۔ جس کی کثرت کی وجہ سے ہر شخص اُٹھ اُٹھ کر حضرت کی زیارت کرنے کی کوشش کرتا۔ اس پر عرض کیا گیا کہ اگر کرسی پر تشریف رکھنا منظور فرمائیں تو سب اپنی اپنی جگہ پر بیٹھے زیارت سے مشرف ہو سکیں گے۔ فرمایا یہ میری عادت کے خلاف ہے اور منقول بھی نہیں۔ البتہ بیان کی حالت میں تو منقول ہے۔ مجمع لحہ بہ لحہ زیادہ ہو رہا تھا۔ اس لیے دوبارہ چارپائی کی اجازت چاہی گئی۔ تو فرمایا: اس میں مضائقہ نہیں۔ یہ دیہاتی وضع ہے مگر اس

پر میں اکیلا نہ بیٹھوں گا۔ دو چار اور بھی ہوں گے۔ چنانچہ فوراً چارپائی لائی گئی۔ جب اس پر کچھ بچھانے لگے تو اس سے منع کر دیا۔ سرہانے کی طرف خود رونق افروز ہوئے اور دوسری طرف یہ فرماتے ہوئے حضرت مولانا محمد حسن صاحب اور حضرت مولانا خیر محمد صاحب کو بٹھلایا کہ مجھے اکیلے بیٹھتے شرم سی محسوس ہوتی ہے۔ وہیں حضرت کے مخلص خادم میاں طور شاہ صاحبؒ نے (جو اب بھی خیر المدارس ملتان میں رہتے ہیں) حضرت کی خدمت میں دو پیسے اور مٹھی بھر ستو کا ہدیہ پیش کیا۔ جسے حضرت نے بطور تبرک قبول فرما لیا۔ مگر اور کسی کا ہدیہ قبول نہ کیا کیونکہ سفر میں ہدیہ قبول کرنے کی آپ کی عادت نہ تھی۔ گھنٹہ بھر مجلس قائم رہی اور ملفوظات کا سلسلہ جاری رہا اور پونے نو بجے صبح کی گاڑی سے تھانہ بھون تشریف لے گئے۔ وہاں جس مکان میں آپ تشریف فرما رہے۔ بلا مبالغہ ایک ماہ تک اس کے در و دیوار سے انوار محسوس ہوتے رہے۔

بیماری کا شدید حملہ

سفر لاہور سے واپسی کے بعد ابھی تھانہ بھون کے قیام کو پورا مہینہ نہیں گزرا تھا کہ شب درمیان ۱۱-۱۲ جون ۱۹۳۹ء کو دو بجے کے قریب آپ پیشاب کے لیے اٹھے۔ استنجا سے فارغ ہو کر کھڑے ہونے کا قصد فرمایا کہ یکایک دماغ خالی معلوم ہوا اور اس کے بعد بے ہوش ہو گئے جب ہوش آیا تو خود کو زمین پر پایا۔ اس لیے یہ معلوم نہ ہو سکا کہ کھڑے کھڑے گرے یا بیٹھے بیٹھے بے ہوش ہوئے۔ البتہ جس حالت میں بھی گرے۔ اس بری طرح گرے کہ داہنی پسلی، سر اور کہنی میں چوٹیں آگئیں۔ اس لیے اغلب یہی ہے کہ کھڑے ہونے کے بعد بے ہوشی طاری ہوئی۔ جس سے آپ زمین پر آرہے۔ ورنہ اتنی سخت چوٹیں ممکن نہ تھیں۔ جب ہوش آیا تو پھر اجابت کا تقاضا ہوا۔ لیکن نقاہت بے حد تھی۔ بمشکل تمام خود اٹھ کر بیت الخلاء تشریف لے گئے۔ مگر کسی کو اطلاع نہ کی۔ کیونکہ آپ کا معمول تھا کہ جب تک خود کوئی کام کر سکیں یا انتہائی

مجبوری نہ ہو۔ اس وقت تک کسی کو مطلع نہ فرماتے۔ تاکہ دوسرے کو تکلیف نہ ہو۔
بیت الخلا سے تو بفضلہٖ تعالےٰ بخیریت نکلے۔ یہاں تک کہ اندر چکر تک بھی نہ آیا۔
مگر باہر قدم رکھتے ہی اس قدر ضعف محسوس ہُوا کہ ایک قدم اُٹھانا بھی مشکل ہوگیا۔ مجبوراً
زمین پر وہیں بیٹھ گئے مگر بیٹھا بھی نہ گیا۔ اس لیے وہیں زمین پر لیٹ گئے۔ کچھ دیر بعد ہمت
کرکے نماز کے چبوترے پر جو قریب ہی تھا۔ جاکر لیٹ گئے۔ اب ہوش تو تھا۔ لیکن
طاقت نہ تھی۔ اسی حالت میں خود اپنی نبضیں دیکھیں۔ نبضوں کا پتہ نہ چلتا تھا۔ بدن تمام
سرد تھا اور پسینے پر پسینہ آرہا تھا۔ جب اس حالت میں قدرے افاقہ ہوا۔ تو بمشکل
تمام پلنگ پر پہنچے۔ اب تک تو دوسروں کو تکلیف نہ پہنچانے کے خیال سے ہمتِ
خداداد سے کام لیتے رہے۔ مگر زمین پر گرنے اور لیٹنے سے جو مٹی وغیرہ لگ گئی تھی۔ اس
سے طبیعت بے حد منغض تھی۔ اس لیے مجبوراً چھوٹی بیگم صاحبہ کو آواز دے کر جگایا۔ تاکہ
پانی کا انتظام ہوجائے۔ تو غسل کیا جائے۔ حالانکہ اس وقت غسل کرنا اتنا ضروری نہ تھا کہ
نقصان پہنچنے کا اندیشہ تھا مگر ایک لمحہ کے لیے بدن کو ناپاک رکھنا گوارا نہ کیا اور اس ضعف
کی حالت میں لیٹ کر غسل فرمایا۔

اس نازک حالت۔ شدید ضعف اور دورے کے وقت بھی اصول و انتظام کا
برابر خیال رہا یہاں تک کہ استنجے سے فارغ ہونے کے بعد انتہائی نقاہت کے باوجود
لوٹا جہاں سے اُٹھایا تھا وہیں رکھا۔ پانی جس گھڑے سے لیا تھا۔ اس کو دیکھ لیا کہ ڈھکا
ہُوا ہے یا نہیں۔ یہ نہیں کیا کہ جہاں استنجا کیا تھا لوٹا وہیں چھوڑ کر تشریف لے آتے۔
یا گھڑا کھلا ہُوا رہتا۔ بلکہ بیگم صاحبہ نے پریشان ہوکر عزیزوں کو اس واقعہ کی اطلاع کرنی
چاہی۔ مگر حضرت نے محض اس خیال سے کہ ابھی رات کا کچھ حصہ باقی ہے۔ تکلیف
ہوگی۔ کسی کو خبر نہ کرنے دی۔ پھر بھی چند اعزہ کو خبر لگ گئی اور مولانا ظفر احمد صاحب
مولانا شبیر علی صاحبؒ وغیرہ صبح کی نماز سے پہلے پہنچ گئے۔

صبح ہونے پر حکیم بلایا گیا پھر ڈاکٹر کو بلا کر تشخیص کرائی گئی۔ آپ انگریزی ادویات کے مشتبہ ہونے کی وجہ سے ان کا استعمال نہ فرماتے تھے۔ ڈاکٹروں نے بلڈ پریشر (خون کا دباؤ) تشخیص کیا اور سخت تاکید کے ساتھ کسی کام یا کسی قسم کی جنبش۔ یا کسی طرح کی فکر رنج۔ غصہ یا شدید ضرورت کے سوا زیادہ بات کرنے کی ممانعت کر دی اور غذا وغیرہ میں بہت احتیاط بتائی اور تیمار دار کو علیحدہ لے جا کر کہا کہ فالج کا اندیشہ ہے۔ اس کا خطرہ قریب ہے۔ احتیاط بہت ضروری ہے۔

ڈاک کا اِنتظام

چونکہ ڈاکٹر صاحب نے ڈاک کے کام کو دیکھ کر سختی سے منع کر دیا تھا۔ اس لیے جس روز سے دَورہ پڑا تھا۔ ڈاک حضرت کو نہیں بھیجی جاتی تھی۔ بلکہ مولانا شبیر علی صاحب ڈاک کو دیکھ کر جواب میں یہ تحریر فرما دیتے تھے کہ" حضرت والا کو چند روز کے لیے ڈاکٹروں اور طبیبوں نے مکمل آرام کرنے کا مشورہ دیا ہے۔ اس لیے آج کل حضرت والا ڈاک بھی خود ملاحظہ نہیں فرماتے۔ آپ اس خط کو دس روز بعد ارسال فرما دیں۔ اُمید ہے کہ حضرت اس وقت جواب عنایت فرمائیں اور یوں تو بحمد اللہ حضرت والا کی طبیعت اچھی ہے۔"

دو روز تو یہ انتظام رہا۔ مگر اس سے حضرت کو سخت گرانی ہوئی اور فرمایا کہ میرے تعلقات بعض لوگوں سے ایسے ہیں کہ ان کو اگر اس طرح اطلاع ملی تو سخت پریشان ہوں گے اور مزاج پُرسی کے لیے آجائیں گے۔ ڈاکٹر نے زیادہ مِلنے جُلنے سے منع کیا ہے۔ تو ان لوگوں کے آنے پر ایک ہجوم ہو جائے گا اور ڈاکٹر کی ہدایت پر عمل نہ ہو سکے گا۔ جس سے بجائے فائدے کے نقصان ہو گا۔ اس خیال سے جو دماغ پر اثر ہے۔ وہ خود مضر ہے۔ اس لیے یہ مناسب ہے کہ ڈاک مجھ کو دکھا دی جایا کرے۔ اس میں جو خطوط ایسے ہوں گے۔ ان کے جواب مَیں خود لکھوا دیا کروں گا۔ باقی خطوط کے جواب میں وہی اطلاع تحریر لکھ کر روانہ

کر دی جایا کرے۔ چنانچہ ۱۴ جون سے ۲۴ جون ۱۹۳۸ء تک تو یہ معمول رہا۔ اس کے بعد مندرجہ ذیل تحریر چھپوائی گئی۔ سالکین کے خطوط کے جواب میں یہ بھیج دی جاتی اور مقربین کے خطوط کے جواب اپنے قلم سے تحریر فرما دیتے۔

السلام علیکم۔ بوجوہ چند مثل زیادتِ سن وغیرہ عرصہ سے مجھ میں کام کرنے کی طاقت نہ تھی۔ مگر اپنی ہمت سے کام کرتا تھا۔ آخر کار اس سے نقصان عظیم ہوا۔ جس سے بعض سخت خطرناک حالات پیش آئے۔ اس سے میں نے خود بھی محسوس کیا اور ڈاکٹروں، طبیبوں نے بھی سخت تاکید کے ساتھ مشورہ دیا کہ کام کرنا بالکل چھوڑ دیا جائے۔ اس لیے میں نے ڈاک لکھنا بھی چھوڑ دیا ہے۔ مگر طالبوں کی سہولتوں کے لیے ذیل میں اپنے چند مجازین کے نام لکھتا ہوں۔ جن کی طرزِ تعلیم پر مجھے اعتماد ہے۔ ان میں سے جن صاحب سے جی چاہے۔ اپنی تربیت متعلق کر لیں لیکن صرف دریافت خیریت وطلب اجمالی دعا یا بعد تکمیل شرائط درخواست بیعت کے لیے دو سطریں لکھنے کی اجازت ہے۔ والسلام

وہ نام یہ ہیں:۔

۱۔ مولوی محمد عیسےٰ صاحب موضع محی الدین پور۔ ڈاکخانہ میںڈارہ ضلع الہ آباد۔

۲۔ مولوی حکیم محمد مصطفےٰ صاحب۔ محلہ کرم علی۔ میرٹھ شہر۔

۳۔ مولانا ظفر احمد صاحب (عثمانی) تھانہ بھون۔ ضلع مظفر نگر۔

۴۔ مولوی محمد حسن صاحب۔ مسجد خیر الدین۔ امرتسر۔

۵۔ مولوی عبد الغنی صاحب مدرسہ روضۃ العلوم۔ پھولپور ضلع اعظم گڑھ۔

۶۔ مولوی خیر محمد صاحب مدرسہ خیر المدارس۔ جالندھر شہر۔

۷۔ مولوی وصی اللہ صاحب فتح پور تال نرجا۔ ضلع اعظم گڑھ۔

۸۔ حقداد خاں صاحب پنشنر۔ مولوی گنج لکھنؤ۔

۹۔ مولوی ولی احمد صاحب پنشنر۔ مولوی گنج لکھنؤ۔

۱۰۔ مولوی مسیح اللہ صاحب مدرسہ عربی جلال آباد ضلع مظفر نگر۔

۱۱۔ مولوی خدا بخش صاحب نواکھالوی۔ مدرسہ صوفیہ۔ پوسٹ بھیرواراٹ چاٹگام

اور بھی بہت سے حضرات ہیں۔ جن کی فہرست اشرف السوانح حصہ سوم کے اخیر میں شائع ہوئی ہے مگر نمونہ کے طور پر بعض ان اصحاب کے نام لکھ دیئے ہیں۔ جن سے جواب جلدی مل جانے کی غالب توقع ہے۔ اگر ان کے علاوہ بوجہ مناسبت دوسرے مجازین سے رجوع کریں تو اجازت ہے۔ فقط

اشرف علی تھانہ بھون

روانگی لکھنؤ

بعد ازاں حکیم خلیل احمد صاحب سہارنپوری۔ حکیم محمد مصطفٰے صاحب میرٹھی کے علاج اور ڈاکٹر عبد الصمد صاحب کانپوری کے مشورہ پر عمل ہوتا رہا۔ لیکن ان کے علاج سے جس قدر فائدہ ہوا وہ آگے نہ بڑھا اور چونکہ بلڈ پریشر کا علاج ہی کوئی نہ جانتا تھا۔ اس لیے مخلصین کے مشورہ سے لکھنؤ بغرض علاج جانے کا فیصلہ فرمایا کیونکہ وہاں میڈیکل کالج۔ طبیہ کالج موجود تھے اور ڈاکٹری یونانی دونوں علاج آسانی سے ہو سکتے تھے۔ چنانچہ پورے پندرہ سال بعد ۱۰ اگست ۳۸ء کو تھانہ بھون سے بارادہ لکھنؤ حضرت مع اہل خانہ و مولوی شبیر علی صاحب مولوی جمیل احمد صاحب مع اپنی اہلیہ و صاحبزادیوں کے سہارنپور روانہ ہوئے۔ ان کے علاوہ پیر جی ظفر احمد صاحب ڈپٹی علی سجاد صاحب اور مولانا عبد الباری صاحب ندوی مع اپنے اہل و عیال کے بھی رفیق سفر تھے۔ ایک روز سہارنپور ٹھیرنے کے بعد ۱۱ اگست کو بذریعہ طوفان ایکسپریس لکھنؤ پہنچے۔

قیام لکھنؤ

مولوی گنج میں مولوی محمد حسن صاحب مالک انوار بک ڈپو لکھنؤ کے مکان پر قیام فرمایا جہاں پہلے سے انتظام ہو چکا تھا۔ وہاں ڈاکٹر عبد الحمید صاحب پروفیسر میڈیکل کالج لکھنؤ

کے مشورہ سے شفاء الملک حکیم عبدالمجید صاحب نے حضرت کا علاج شروع کیا اور حضرت کے مزاج کے موافق دوائی کو نفاست سے تیار کرنے کا اہتمام حکیم سمیع اللہ خاں کے سپرد رہا۔ جو اس نفاست سے دوائی تیار کرتے کہ اس کو دیکھتے ہی طبیعت میں اس کے استعمال کرنے کی رغبت پیدا ہونے لگتی اور حضرت اکثر فرمایا کرتے کہ اس نفاست کو دیکھ کر بغیر ضرورت بھی دوا کے استعمال کرنے کو جی چاہتا ہے۔

قیام لکھنؤ کے دوران میں بھی مشتاقانِ دید کا ہجوم ہونے لگا۔ تو حضرت نے معالجوں کے مشورہ کے مطابق اپنی قیام گاہ کے باہر ایک ضروری اعلان بدیں مضمون چسپاں کرا دیا کہ جن صاحبوں کے ساتھ پہلے سے تعلقات کے خصوصیات ہیں۔ ان سے ملاقات اور بات چیت کر لوں گا۔ بقیہ حضرات سے عذر کر دوں گا۔ اس لیے عام ملاقات بند کر دی ہے۔ اس لیے دروازے پر کھڑے رہ کر میری مجلس پریشان نہ کریں کہ اس سے مجھے تکلیف ہوتی ہے اور یہ امر محبت کے بھی خلاف ہے۔ چنانچہ مخصوصین قیام گاہ کے باہر صبح نو بجے سے گیارہ بجے تک اور پھر پانچ بجے سہ پہر سے گھنٹہ بھر برابر جمع رہتے اور حضرت جس کو چاہتے اندر بلا لیتے اور باقی حضرت کی مرضی کو مقدم سمجھ کر خاموشی سے واپس چلے جاتے۔ مولانا عبدالماجد صاحب لکھتے ہیں کہ :۔

" انتظامات حضرت کے اس علالت کے زمانہ میں بھی قابلِ دید تھے۔ نشست کے اوقات مقرر ہر آنے والے کے لیے حصولِ اجازت کی ضرورت۔ چھوٹی بڑی ہر شے میں ایک قاعدہ اور انتظام۔ مرض کے باوجود افادات مجلسی کی گرم بازاری اسی طرح تھی۔ صبح کی مجلس کہنا چاہیئے کہ خواص تک محدود تھی۔ سہ پہر کی مجلس گویا عام تھی۔ کلماتِ حکمت و معرفت کی بارش تھانہ بھون ہی کی طرح ہوتی رہتی۔ "

(حکیم الامت صہ ۵۳۲ و صہ ۵۳۵)

یہاں کے علاج سے جب افاقہ ہونا شروع ہُوا تو آپ معمولاً عصر کی نماز کے وقت مسجد خواص میں تشریف لے جاتے۔ بعد نماز عصر مغرب تک وہیں اجلاس فرماتے وہیں ڈاک دیکھتے وہیں دوائی پیتے اور ملفوظات سے حاضرین کو محو و بیخود بنائے رکھتے مولانا عبد الباری صاحب ندوی اور ڈاکٹر عبد العلی صاحب ناظم ندوۃ العلمأ لکھنؤ قریباً روزانہ شریک مجلس ہوتے اور اگر کسی روز کسی مجبوری کی وجہ سے نہ آسکتے۔ تو انھیں از حد صدمہ ہوتا۔

اس عرصہ میں عیادت کے لیے دور دراز سے بڑے بڑے علماء۔ رؤساء امراء۔ وکلاء آتے رہے جن میں سے مولانا سیّد سلیمان ندویؒ۔ خواجہ عزیز الحسن مجذوبؔ۔ مولانا عبد الماجد صاحب دریابادی۔ مولانا جمال میاں خلف مولانا عبد الباری فرنگی محلی۔ نواب حافظ سر احمد سعید خاں صاحب چھتاری۔ نواب جمشید علی خاں صاحب باغپت اور نواب محمد اسمٰعیل خاں صاحب بیرسٹر میرٹھ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

طبیعت سنبھلنے پر آپ نے مخصوصین کی دعوتیں بھی قبول فرمائیں۔ دُوسروں کے ہاں تو دعوت پر ہی تشریف لے جاتے رہے مگر ڈاکٹر عبد العلی صاحب ناظم ندوۃ العلماء لکھنؤ کے ہاں ان کی درخواست کے بغیر خود اپنی محبت و عنایت سے لکھنؤ سے روانگی سے دو روز قبل تشریف لے گئے اس عرصہ میں کانپور بھی تشریف لے گئے۔

شفاء الملک حکیم عبد المجید کے مشورہ سے ۲۰ ستمبر ۱۹۳۸ء کو لکھنؤ سے روانہ ہُوئے اور اہلِ لکھنؤ نے یہ شعر بزبانِ حال کہتے ہُوئے حضرت کو رُخصت کیا کہ ؎

ہر کہ در محفل تو آمد خنداں آمد
ہر کہ از بزم تو برخاستہ گریاں برخاست

حکیم شفاء الملک حکیم عبد المجید صاحب کی مخلصانہ مساعی سے بفضلہٖ تعالیٰ صحت یاب

نسر

ہو کر خنداں و فرحاں تھانہ بھون پہنچے۔

مقبولیت نامہ

اس کے بعد علاج کے سلسلہ میں آپ کو ۱۹۴۰ء اور ۱۹۴۱ء میں بھی لکھنؤ جانے کا اتفاق ہوا۔ ہر بار اہل لکھنؤ نے حضرت کا نہایت جوش و خروش اور اخلاص و محبت سے خیر مقدم کیا اور آپ کی آرام و آسائش میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کیا۔ آپ کی اس غیر معمولی مقبولیت کا نقشہ کھینچتے ہوئے۔ مولانا عبدالماجد صاحب دریا بادی لکھتے ہیں۔

"حضرت کا آنا کسی "لیڈر" کا آنا نہ تھا۔ نہ پوسٹر چھپے، نہ اشتہارات تقسیم ہوئے نہ ڈگڈگی پٹی نہ رضاکاروں نے نعرے لگائے۔ نہ مقامی اخبارات میں آمد کا غلغلہ بلند ہوا۔ اس کے باوجود خلقت کا ایک میلہ صبح اور سہ پہر دونوں وقت لگا رہتا تھا۔ کوئی ملفوظات مبارک سے استفادہ کو آتا۔ کوئی مصافحہ اور دست بوسی پر ٹوٹا پڑتا۔ اور کسی کو محض شوق زیارت کھینچ کر لاتا۔ اولیاء الٰہی میں جو ایک خاص قسم کی کشش۔ محبوبیت و مرجعیت ہوتی ہے اس کا نمونہ اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا اور بار بار دیکھ لیا ۱۹۳۸ء میں بھی ۱۹۴۰ء اور اب ۱۹۴۱ء میں بھی۔ جب حضرت بہت زیادہ معذور ہو چکے تھے۔ تنا ہوا قد کمان بن چکا تھا۔ اور گردن پر اثر ضعف و پیرانہ سالی کا بہت زائد تھا۔"

(حکیم الامت ص ۵۷)

معمولاتِ سفر

سفر کی تیاری

حضرت تھانویؒ فرمایا کرتے تھے ؛

”میری عادت ہے کہ جو کام کرنا ہے۔ جلد اُس سے قلب کو فارغ کر لیتا ہوں“۔

چنانچہ اس اصُول کی بنا پر آپ روانگی سے قبل تمام گردوپیش کے حالات کا جائزہ لیتے۔ سفر کی غرض۔ مقدار اور مدّت کا تعین فرمالے کے بعد ان تمام ضروری کاموں کو شب و روز مشغول رہ کر پہلے سے نپٹا لیتے۔ جن کا سفر کی وجہ سے حرج ہونا لازمی ہوتا۔ تاکہ عین عجلت میں کوئی کام بقایا رہ نہ جائے۔ سواری کا انتظام روانگی سے بہت پہلے فرماتے۔ اگر سواری میں توقف ہوتا۔ تو مصلحتاً پیدل چل پڑتے۔

سفر کا سامان

روانگی سے ایک روز قبل ضروری سامانِ سفر درست فرما لیتے تاکہ عین وقت پر دقت نہ ہو۔ یا کوئی چیز بھول نہ جائے۔ عام طور پر سردی کا سامانِ سفر یہ ہوتا :۔

ایک بنڈل بستر جس میں بچھونا مع اُوپر کی چادر کے۔ اور مومی چھینٹ کا لحاف ایک کنٹوپ دوہرا بغیر روئی کے۔ جس میں بند لگے ہُوئے۔ جو رات کو سوتے وقت اور صبح کو تا فراغ از ضروریات و وضو وغیرہ اوڑھے رہتے۔ بعد ازاں عمامہ باندھ لیتے۔ بستر میں ایک تھیلی سنگین کپڑے کی ہوتی۔ جس میں ایک زائد جوڑا جوتا ہوتا جو ہوا خوری کے وقت استعمال فرماتے۔ دوسرا جوتا زیرِ استعمال عام رہتا۔ بستر کے اُوپر بستر پوش ہوتا۔ جسے چمڑے کے بستر بند میں باندھ دیا جاتا۔ چمڑے کا ایک بیگ ساتھ ہوتا۔

جس پر لفظ محمد اشرف علی کندہ ہوتا۔ اس کی وجہ سے آپ کو بیگ کا بھی ادب کرنا پڑتا۔ اور حتی الامکان اسے نیچے یا جگہ بے جگہ نہ رکھنے دیتے۔ بیگ میں دو تین جوڑے کپڑے۔ مناجات مقبول اور چند دیگر کاغذات ہوتے اور ایک دستہ والی ٹوکری ساتھ ہوتی جس میں متفرق اشیاء مثلاً مسواک۔ گھڑی دوا بشرط ضرورت۔ لوٹا۔ سرمہ دانی۔ خطوط کی تھیلی۔ دو کٹورے ایک پانی پینے کے لیے دوسرا دوائی پینے کے لیے اور بشرط ضرورت کھانا بھی ہوتا۔ گھڑی جیب میں رکھنے کی عادت نہ تھی اس لیے اسے پانوں والی گلٹ کی ڈبیہ میں بند کر کے ٹوکری میں رکھتے اور رات کو سرہانے رکھ لیتے۔ اگر کھانا ساتھ لے جانے کی ضرورت ہوتی تو آٹے کی پوڑیاں۔ کچھ چپاتیاں اور آلو قیمہ لے لیتے۔ سفر کی یہ حضرت کی مرغوب غذا تھی۔

سامان کا انتظام

سامان کا بڑا انتظام رکھتے۔ اسٹیشن پر اترتے ہی سب سے پہلے سامان گنواتے اور جب تک ایک معین شخص کے سپرد نہ کر دیتے بے فکر نہ ہوتے۔ یہ نہ ہوتا کہ کوئی چیز کسی نے اٹھالی۔ کوئی چیز کسی نے لے لی۔ صرف ایک یا دو افراد کو اس سامان کا ذمہ دار قرار دے کر پھر مصافحہ وغیرہ کرتے۔ جائے قیام پر پہنچنے کے بعد بھی سب سے پہلے اسباب کا جائزہ لیتے۔ اور اس کو ٹھکانے لگوا کر بیت الخلا کا معلوم کرتے۔ تاکہ عین وقت پر بالخصوص رات کو دقت نہ ہو۔

بار برداری کی اُجرت

سامان اٹھوانے سے قبل قلیوں سے اُجرت طے فرما لیتے۔ پھر سامان اُٹھواتے۔ کیونکہ آپ ریلوے کی مقرر کردہ اجرت پر سامان اُٹھوانا جائز نہ سمجھتے تھے۔ کیونکہ فرمایا کرتے تھے کہ دستور کوئی چیز نہیں ہے۔ مزدور کا خوش کرنا ضروری چیز ہے۔

محصول کی ادائیگی

آپ بلا ادائے محصول کوئی چیز نہ لے جاتے۔ اگر ذرا بھی کسی چیز میں شبہ ہوتا کہ یہ مقررہ وزن سے زائد ہو گی تو آپ اسے فوراً وزن کراتے اور اس کا محصول ادا کرتے۔ اس

اس کا اتنا اہتمام تھا کہ ایک مرتبہ سہارنپور سے کانپور جاتے ہوئے کچھ گنے ساتھ تھے۔ جب ادائیگی محصول کے لیے تلوانے لگے تو کوئی تولے نہیں۔ یہاں تک کہ غیر مسلم ملازمین ریلوے بھی کہیں کہ حضرت آپ یونہی لے جائیے۔ تلوانے کی ضرورت نہیں۔ ہم گارڈ کو کہہ دیں گے فرمایا یہ گارڈ کہاں تک جائے گا۔ کہا گیا غازی آباد تک۔ فرمایا: غازی آباد سے آگے کیا ہوگا کہا گیا کہ یہ دوسرے گارڈ سے کہہ دے گا اور وہ کانپور تک پہنچا دے گا۔ جہاں آپ کا سفر ختم ہو جائے گا۔ فرمانے لگے نہیں۔ وہاں ختم نہ ہوگا بلکہ آگے ایک اور سفر آخرت بھی ہے وہاں کا انتظام کیا ہوگا؟ یہ سن کر سب انگشت بدنداں رہ گئے۔ جن میں تعلیم یافتہ ہندو بابو بھی تھے۔ کہنے لگے کہ اس زمانہ میں بھی خدا کے ایسے ایماندار بندے موجود ہیں جو خدا سے ڈر کر احتیاط کرتے ہیں۔

کرایہ کی ادائیگی

اس میں بھی آپ بڑے محتاط تھے۔ بلا ٹکٹ اور بلا ادائے کرایہ سفر کرنے کے قطعاً عادی نہ تھے۔ نہ کسی دوسرے کو ایسا کرنے دیتے۔ ایک مرتبہ ایک طالب علم حضرت کی زیارت کے لیے تھانہ بھون آیا۔ آپ اس وقت سفر پر جا رہے تھے۔ اس لیے وہ تنگی، وقت کی وجہ سے گارڈ کو کہہ کر بلا ٹکٹ حضرت کے ساتھ سوار ہو گیا اور دوسرے اسٹیشن نانوتہ پر گارڈ کو کرایہ دینے لگا۔ تو اس نے کہا معمولی کرایہ ہے۔ تم غریب آدمی ہو۔ جاؤ۔ اس نے آکر حضرت سے کہا کہ یہ معاملہ ہے۔ تو آپ نے فرمایا کہ گارڈ ریلوے کمپنی کا ملازم ہے ریل کا مالک نہیں ہے۔ اس لیے یہاں تک کا کرایہ برابر تمہارے ذمہ ہے۔ اتنے داموں کا ٹکٹ لے کر اسے پھاڑ دو تاکہ کمپنی کا حق ادا ہو جائے اور تم حق العباد سے بری ہو جاؤ۔ اس ڈبہ میں ایک انگریزی خواں آریہ مبلغ بھی بیٹھا تھا۔ اس نے یہ ساری گفتگو سن کر کہا کہ میں تو خوش ہوا تھا کہ اس نے غریب پر ترس کھایا ہے مگر آپ کی تقریر سن کر محسوس کرتا ہوں کہ میری خوشی بے ایمانی کی تھی۔

ریلوے والوں کا اعتماد

اسی وجہ سے حضرت اور حضرت کے منتسبین کے متعلق ریلوے والوں کا اعتماد اتنا بڑھ گیا تھا کہ جب کوئی ثقہ صورت تھانہ بھون کی طرف جاتا ہوا دیکھتے تو نہ اس کا ٹکٹ چیک کرتے اور نہ ہی اسے اسباب تلوانے پر مجبور کرتے یا روکتے ٹوکتے بلکہ بڑے جزم سے کہتے کہ یہ تھانہ بھون مولانا کے پاس جا رہے ہیں۔ وہاں جانے والے نہ بغیر ٹکٹ سفر کرتے ہیں اور نہ سامان تلوائے بغیر سوار ہوتے ہیں۔

رفیقِ سفر ہمراہ رکھنا

حضرت تھانویؒ کا ارشاد ہے کہ :-

"میری عادت ہے کہ جب میں سفر کرتا ہوں تو اپنے ساتھ صرف ایک آدمی کو لیتا ہوں اور داعی کو پہلے سے اطلاع کر دیتا ہوں تا کہ وہ آزاد رہے داعی پر صرف میرا اور اس آدمی کا بار ہوتا ہے۔ پھر بعض دفعہ راستہ میں اگر بعض لوگ محبت کی وجہ سے ساتھ ہو لیتے ہیں تو میں ان سے صاف کہہ دیتا ہوں

میزبان پر بار نہ ڈالنا

کہ آپ اپنا انتظام خود کریں۔ جہاں میرا قیام ہوگا وہاں آپ قیام بھی نہ کریں بلکہ سرائے وغیرہ میں جہاں آسانی ہو۔ وہاں ٹھہریں اور بازار سے اپنے کھانے کا انتظام کریں اور ملاقات کے لیے صبح و شام میرے پاس آجایا کریں، جس سے میزبان کو یہ معلوم نہ ہو کہ آپ میرے ساتھ ہیں۔ پھر اگر وہ از خود آپ کی دعوت کرے تو آپ اپنے تعلقات کو دیکھ کر دعوت منظور کریں یا رد کریں۔ میرے طفیلی بن کر کھانا نہ کھاویں۔ اگر کسی وقت میزبان مجھ سے کہنے لگتا کہ میں آپ کے ان ہمراہیوں کی بھی دعوت کرنا چاہتا ہوں۔ تو میں صاف کہہ دیتا کہ میرے ساتھ کوئی نہیں۔ میں نے کسی کو نہیں بلایا اگر آپ

کسی کا احسان نہ اٹھانا

کو دعوت کرنا ہو تو خود ان سے کہئے اور محض اپنے

تعلقات پر جو چاہے کیجئے۔ میرے اوپر اس کا احسان نہ ہوگا۔ مَیں ان سے کہنا نہیں چاہتا۔ میری عادت یہی ہے۔ ہاں اگر کوئی بہت ہی مخلص ہوتا تو وہاں مَیں اس قاعدہ پر عمل نہیں کرتا۔ (ایوار الیتامیٰ صک۲۶)

اسی طرح فرمایا کہ :۔

تھانہ بھون کے اسٹیشن والوں نے اور گارڈ وغیرہ نے (جدید اسٹیشن بننے سے قبل بہت دفعہ کہا کہ ہم تم کو قصبہ کے پاس اُتار دیا کریں۔ مگر مَیں نے ٹال دیا اس کی تین وجوہات ہیں۔

۱۔ احسان سے بچنا۔

۲۔ امتیاز سے بچنا کہ لوگوں کی نظریں اُٹھیں گی کہ یہ کون ہے جس کے لیے ریل بے موقع روکی گئی۔

۳۔ اور اتنی مسافت کے کرایہ کا حساب نہ ہو سکنا (خیر العبود صک)

معین سفر پہلے منگانا

ایک بار حضرت کسی جگہ بلائے گئے۔ حسب وعدہ آپ اس اسٹیشن پر جا اترے۔ اتفاق سے اسٹیشن پر ان کی طرف سے کوئی آدمی موجود نہ تھا جو منزلِ مقصود تک پہنچنے کے لیے رہبری کرتا۔ اس لیے آپ دوسری گاڑی سے اسٹیشن پر سے ہی واپس آ گئے اور اس کے بعد آپ نے دستور بنا لیا کہ :۔

"بلانے والے کے ذمّہ ہے کہ وہ اپنا آدمی معیت کے لیے بھیج دیں۔ جو برابر ساتھ رہے تاکہ کسی مقام پر کوئی دقت نہ ہو۔ مگر وہ آدمی ایسا عزیز نہ ہو۔ جس سے بوقت ضرورت کوئی کام لینے میں حجاب معلوم ہو۔ مخدوم نہ ہو بلکہ خادم ہو۔ یا کوئی بے تکلف دوست ہو۔"

اس معمول کے اختیار کرنے سے آپ کو سفر میں بڑا آرام رہتا۔

لباسِ سفر کی سادگی

حضرت تھانویؒ سفر میں کوئی خاص لباس پہننے کے عادی نہ تھے۔ نہ عبا، نہ قبا، نہ عمامہ، صرف کرتا، پاجامہ اور ٹوپی جو حضر میں استعمال کرتے وہی سفر میں بھی ساتھ لے جاتے۔ ایک بار حضرت معمولی زیرِ استعمال لباس میں ہی سفر پر جانے لگے تو بڑی پیرانی صاحبہ نے مشورہ دیا کہ نیا جوڑہ پہن لیا جائے۔ حضرت والا نے فرمایا! کیوں کیا کسی کو کو دکھانا ہے؟ انھوں نے عرض کیا کہ میرا یہ مطلب نہیں۔ بلکہ مصلحت یہی ہے کہ آپ ہمیشہ لباس میں سفر کیا کریں کہ معتقدین آپ کو دیکھ کر مطمئن ہو جایا کریں کہ ماشاءاللہ فراخی ہے تنگدستی نہیں۔ اگر شکستہ حال دیکھیں گے تو یہی سمجھیں گے کہ آجکل نادار ہی ہے۔ لہٰذا خواہ مخواہ ہدایا دینے کا خیال پیدا ہوگا۔ حضرت نے فرمایا۔ واقعی نیت تو بہت اچھی ہے۔ لیکن اس نیک مشورہ کے باوجود ہمیشہ مذاقِ فطری غالب رہا اور سفر میں حضر کا ہی سادہ لباس استعمال کرتے رہے۔

سادگی کا نتیجہ

چونکہ آپ لیڈرانِ عظام اور مولویانِ کرام کی طرح شان و شوکت سے سفر کرنے کے عادی نہ تھے۔ بلکہ ایک عام مسافر کی طرح سفر فرماتے تھے۔ اس لیے راستہ میں عجیب و غریب واقعات اکثر پیش آتے رہتے تھے۔ ایک مرتبہ تھانہ بھون آتے ہوئے سہارنپور کے اسٹیشن پر گاڑی کے انتظار میں ایک ٹوکری لیے سامنے بیٹھے تھے۔ جس میں کھیرے تھے۔ جو کسی نے ہدیۃً دے دیئے تھے۔ کیونکہ سہارنپور کے کھیرے بہت مشہور ہوتے ہیں۔ ایک دیہاتی جو اُوپر سے گذرا تو پُوچھا کہ یہ کھیرے کس بھاؤ دو گے؟ حضرت نے نہایت سادگی سے فرمایا یہ بکری کے نہیں ہیں اسی طرح ایک مرتبہ آپ پانی پت سے واپس ہو رہے تھے۔ آپ کے ساتھ صرف پہنچانے والا ایک شخص تھا۔ عام مسافروں کی طرح ڈبہ میں بیٹھے تھے۔ اسی ڈبہ میں ایک پنجابی بھی سفر کر رہے تھے۔ انھوں نے حضرت سے پوچھا آپ

کہاں تشریف رکھتے ہیں۔ فرمایا تھانہ بھون۔ یہ سنتے ہی انھوں نے بڑے اشتیاق سے پوچھا آپ حضرت مولانا اشرف علی صاحب کو بھی جانتے ہیں۔ آپ نے فرمایا کہ میرا ہی نام اشرف علی ہے۔ وہ حیران ہو کر حضرت کو اوپر نیچے سے دیکھنے لگا۔ کیونکہ اس نے حضرت کی شہرت سن کر اور تصانیف عالیہ دیکھ کر آپ کے متعلق کچھ عجیب ہی تصور جبہ و دستار اور عبا و قبا حشم و خدم کا باندھا ہوا تھا۔ اسے یقین نہ آیا اور مکرر پوچھا کہ کیا آپ ہی مولانا اشرف علی صاحب ہیں۔ حضرت نے فرمایا کیا اس کا کوئی خاص حلیہ ہے۔ جس کو آپ مجھ پر منطبق نہیں پاتے اس پر گو وہ خاموش ہو گئے۔ مگر تسلی نہ ہوئی اور تردد باقی رہا۔ جسے رفع کرنے کے لیے انھوں نے آپ سے امتحاناً ایک علمی سوال کیا جس کا معقول۔ مدلل مفصل جواب پاکر انھیں یقین آیا۔ پھر بڑی تعظیم و تکریم سے پیش آئے۔ اسٹیشن پر اتر کر حضرت کا سامان اتارا اور مصافحہ کر کے بہت ہی مسرور و محظوظ ہوئے۔

نمازِ سفر کی باقاعدگی

سفر میں ہمیشہ پابندی وقت کے ساتھ نماز ادا فرماتے اور اس میں بفضلہ تعالٰے کبھی دِقّت واقع نہ ہوئی بلکہ اکثر ریل کے ڈبہ کے اندر بھی بڑی بڑی لمبی لمبی جماعتوں کے ساتھ نمازیں برابر ہوتی رہتیں۔ کیونکہ مسافروں کے ہجوم کے باوجود حضرت کے ڈبہ میں اکثر و بیشتر جگہ فارغ ہی رہتی۔ جس سے سفر بہ اطمینان کٹتا۔ سفر میں نماز قصر ضرور فرماتے بسا اوقات جلدی کی وجہ سے سنتیں چھوڑ دیتے۔ کیونکہ فرمایا کرتے کہ :۔

"سفر میں سُنت کا درجہ نفل کا ہو جاتا ہے۔ ضرورت کی حالت میں بالکل حذف کر دینا بھی جائز ہے اور ضرورت کے موقع پر بھی شرعی رخصتوں پر عمل نہ کرنا اپنے اوپر بلاضرورت تعصب ڈالنا ہے جو ایک درجہ میں حق تعالیٰ کی ناشکری ہے۔"

سفر کا شغل

جتنے دن سفر کے لیے تجویز فرماتے۔ اتنے دن کے لیے ڈاک منگانے کا انتظام پہلے فرما لیتے۔ ہر جگہ سے گھر برابر خطوط جاتے رہتے کہ کسی کو تشویش نہ ہو۔ نیز ان مہمانوں کو اطلاع ملتی رہے جو حضرت کی عدم موجودگی میں تشریف لائے ہوں۔ اس لیے بدورانِ سفر ریل میں زیادہ تر وقت خطوط کے جوابات دینے اور بشرط فرصت تصنیف کے کام میں، مشغول رہنے۔ میں گزارتے کیونکہ تصنیف کا کام اکثر سفر میں جاری رہتا تھا۔ جس کے لیے بسا اوقات خادم اور کاتب خصوصیت کے ساتھ ہمراہ لے لیتے تھے۔

پروگرام کی پابندی

سفر کے لیے آپ جو پروگرام بناتے اس کی پوری پابندی فرماتے اور اس میں کسی کی خاطر کوئی تغیر تبدل نہ فرماتے۔ ایک مرتبہ کانپور سے تھانہ بھون تشریف لا رہے تھے۔ راستہ میں ایک خادم نے بڑی منت سماجت کی کہ ایک دن کے لیے خورجہ اتر پڑیں۔ فرمایا کہ میں مظفر نگر سواری کے لیے لکھ چکا ہوں۔ اگر وقت پر نہ پہنچوں گا تو وہاں بیحد تشویش ہوگی۔ کیونکہ بفضلہٖ تعالیٰ آج تک کبھی ایسا نہیں ہوا کہ میں حسب اطلاع وعدہ پر نہ پہنچا ہوں۔ وہ کہنے لگا کہ میں تار دے دیتا ہوں۔ فرمایا نہیں۔ بدنظمی پھر بھی باقی رہے گی۔ کیونکہ گاڑی کرایہ کی آئی ہوئی ہوگی۔ نہ معلوم وہ ٹھہرے یا نہ ٹھہرے۔ پھر دوسری گاڑی مل سکے یا نہ مل سکے۔ غرض بڑا خلل واقع ہوگا۔ پھر اطلاع کے بعد بر وقت نہ پہنچنے میں کچھ نہ کچھ مایوسی اور حسرت تو ضرور ہوتی ہے۔ ہاں اگر خط لکھنے سے پہلے کہتے تو میں ایسا ہی پروگرام بنا لیتا۔ یہ پابندی دوسروں کی رعایت کے لیے تھی۔ اپنی ذات کے لیے نہ تھی۔

تیسرے درجہ کو ترجیح

غایت سادگی کی وجہ سے آپ بڑے درجوں میں بیٹھنے کے مشتاق اور عادی نہ تھے۔ عام طور پر تیسرے درجہ کے سفر کو ترجیح دیتے اور اس کی وجہ یہ فرماتے کہ تیسرے

درجہ میں جو لطف و آرام ہے۔ وہ بڑے درجوں میں نہیں۔ کیونکہ تیسرے درجہ والے تو خود ہمارا لحاظ کرتے ہیں اور بڑے درجہ والے اپنی انیٹھ مروڑ ہی میں رہتے ہیں اس لیے ان کا ہمیں لحاظ کرنا پڑتا ہے کہ بے تکلف ہنس بول بھی نہیں سکتے۔ جب آپ رامپور قادیانیوں سے مناظرہ کے سلسلہ میں اپنے اکابر کے ساتھ جا رہے تھے تو سب کا ٹکٹ درمیانہ درجہ کا تھا۔ لیکن گاڑی میں ایک ڈبہ جو خالی نظر آیا۔ تو سب اسی میں بیٹھ گئے۔ کسی نے کہا کہ یہ تیسرا درجہ ہے تو حضرت نے فرمایا کہ مقصود تو آسائش ہے اور یہ درجہ خالی مل گیا ہے۔ ڈیوڑھے درجہ میں اس سے زیادہ کیا آسائش ہوگی۔ چنانچہ اسی ڈبہ میں آرام سفر فرمایا :

راحت کی تلاش

غرضیکہ سفر میں بھی آپ راحت کے بہت متلاشی رہتے تھے اور فرمایا کرتے تھے کہ میں تو راحت کا عاشق ہوں اور دوسروں کے واسطے بھی یہی اختیار کرتا ہوں۔ اس لیے جس درجہ میں آپ کو زیادہ راحت نظر آتی۔ اس میں سفر کر لیتے۔ دنیوی تو کیا اُخروی درجوں پر بھی آپ کی نظر نہیں تھی۔ فرماتے تھے :-

"میں قسم کھا کر کہتا ہوں۔ مجھے کبھی درجوں کی ہوس نہیں ہوئی کہ مجھے جنت میں بڑا درجہ ملے۔ میں اس بات پر بالکل خوش اور راضی ہوں کہ عذاب سے نجات ہو جائے۔ خواہ جنت میں جوتیوں کی جگہ مل جائے۔ اگر سزا نہ ہو تو بھی بہت ہے۔" (الخضوع صـ ۱۹)

راحت کے غیبی سامان

چونکہ آپ اپنی ذات کے لیے نہیں بلکہ خلق خدا کی خدمت اور بہتری کے لیے سفر کیا کرتے تھے۔ اس لیے حق تعالیٰ نے بھی حضرت کو ایسی ہمت اور قوت عطا فرمائی تھی کہ لمبے لمبے سفروں میں بھی ایسا تکان نہیں ہوا کہ جس سے ضروری کاموں میں خلل پڑے۔ اکثر دیکھا گیا کہ ساری ساری رات سفر کیا۔ جس میں نیند تقریباً آئی ہی نہیں۔ لیکن صبح کو

گھنٹوں کھڑے ہو کر نہایت جوش کے ساتھ وعظ فرمایا۔ پھر جمع شدہ ڈاک کو بھی ختم کیا۔ حالانکہ رفقائے سفر کے حواس قلتِ نوم کی وجہ سے مختل ہو جاتے تھے۔ لیکن بفضلہٖ تعالےٰ حضرت پر اس کا کوئی معتدبہ اثر نہ ہوتا تھا اور برابر وعظ ملفوظات وتحریر خطوط میں مشغول رہتے تھے اور اگر کہیں خفیف سا خلجان بھی پیدا ہوتا تو قدرت کی طرف سے فوراً غیبی سامان ہو جاتا۔ جیسے حضرت چھوٹی پیرانی صاحبہ کو واپسی حج پر بمبئی سے لا رہے تھے تو حضرت کی ربیبہ جو اس وقت بچی تھیں شدتِ تشنگی کی وجہ سے بیتاب ہونے لگی۔ اسٹیشن بہت دور تھا سخت پریشانی ہوئی کہ اب کیا تدبیر کی جائے کہ یکایک ریل راستہ میں ایسی جگہ رُک گئی۔ جہاں نیچے دریا بہہ رہا تھا۔ وہاں سے بالٹی میں پانی کھینچ کر بچی کو پلایا گیا اور تمام رفقاءِ سفر اس انعامِ الٰہی پر حیران رہ گئے۔

مصافحہ کی سہولت

حضرت جہاں بھی تشریف لے جاتے۔ مشتاقانِ زیارت کا ہر جگہ ایک انبوہِ عظیم جمع ہو جاتا۔ یہاں تک کہ حضرت کے استقبال اور رخصت کے وقت اسٹیشنوں پر اتنا ہجوم ہو جاتا کہ مسافروں کو چلنا دشوار ہو جاتا۔ پھر ہر ایک کی خواہش ہوتی کہ مصافحہ تو ضرور کر لوں۔ ان کی سہولت کے لیے حضرت دونوں ہاتھ جُدا جُدا دونوں طرف بڑھا دیتے اور لوگ مصافحہ کرتے رہتے یا چومتے رہتے اور حضرت سب پر نظرِ توجہ دوڑاتے رہتے۔ جب تک گاڑی تیز نہ ہو جاتی۔ یہ سلسلہ جاری رہتا۔

سفر میں ہدیہ نہ لینا

سفر میں آپ کسی سے ہدیہ قبول نہیں فرماتے تھے اور اپنے اس معمول کو غیر معمولی حالات میں بھی نہ توڑتے تھے اور مناسب موقعہ حسنِ تدبیر سے انکار فرما دیتے یا واپس فرما دیتے۔ جسے دوسرا بھی بُرا محسوس نہ کرتا۔ بلکہ آپ کی شانِ استغنا کا گرویدہ ہو جاتا۔ نواب ڈھاکہ سے یہ پہلی دفعہ ہی طے ہو گیا تھا کہ کسی قسم کا ہدیہ نقد یا غیر نقد نہ دیا جائے

گا اور نواب صاحب خدمت کرنے کے لیے کسی نہ کسی بہانہ کے متلاشی رہتے تھے جس روز حضرت نے ان کی بچیوں کو بسم اللہ پڑھائی تھی۔ نواب صاحب نے بذریعہ رقعہ التجا کی کہ ہمارے خاندان میں قدیم سے یہ رسم چلی آتی ہے کہ بسم اللہ پڑھوانے والے کی کچھ نقد سے خدمت کی جاتی ہے۔ ایسا نہ کیا جائے گا۔ تو میری سخت سبکی ہو گی۔ اُمید ہے کہ آپ میری سبکی کو گوارا نہ کرتے ہوئے کچھ ہدیہ پیش کرنے کی ضرور اجازت مرحمت فرما دیں گے۔

حضرت نے جواب دیا کہ :۔

"سبکی سے بچنے کی تو ایک بہت سہل صورت ہو سکتی ہے۔ وہ یہ کہ مجمع میں تو میں آپ سے لے لوں اور خلوت میں آپ کو واپس کر دوں۔ اس طرح آپ کی وضع بھی قائم رہے گی۔ اور میری مصلحت بھی محفوظ رہے گی اور میں یہ آپ سے وعدہ کرتا ہوں کہ اس واپسی کی عمر بھر کسی کو اطلاع نہ کروں گا۔"

اس کو نواب صاحب نے گوارا نہ کیا اور عرض کیا کہ :۔

"حضرت میں اپنی وضع کو آپ کی مصلحت پر قربان کرتا ہوں۔"

سفر سے عبرت پکڑنا

سفر سے آپ خود بھی عبرت پکڑتے تھے اور اس کی مثال دے کر دوسروں کو درس عبرت کے طور پر فرمایا کرتے تھے کہ :۔

"مجھے سفر کے وقت اکثر یہ خیال آیا کرتا ہے کہ اے نفس ! ضرورت کی چیزیں تو بس اتنی ہی ہیں جتنی اس وقت سفر میں ساتھ ہیں کہ دو چار کپڑوں کے جوڑے ہیں۔ بستر اور لوٹا ہاتھ میں ہے۔ اب مجھے سفر کیے ہوئے دو ماہ ہوئے ہیں ان چیزوں کی کچھ بھی ضرورت نہیں ہوتی جو گھر میں بھری ہوتی ہیں۔ بلکہ سفر میں بھی بعض چیزیں جب غیر ضروری معلوم ہوئیں تو گھر بھیج دی

گئیں۔ لیکن میں کیا کروں۔ میں تو بہت بچنا چاہتا ہوں کہ زیادہ بکھیڑا جمع نہ ہو مگر حق تعالیٰ میرے پاس بہت کچھ بھیجتے ہیں۔ میرے دوست احباب کے دلوں میں ڈال دیتے ہیں وہ بھی بہت سی چیزیں بھیج دیتے ہیں۔ جن کو واپس کرتا ہوں تو ان کا دل بُرا ہوتا ہے اور واپس نہ کروں تو خود بوجھ محسوس کرتا ہوں۔ اس لیے میں اپنی مملوکہ چیزوں کا جائزہ لیتا رہتا ہوں اور غیر ضروری اسباب کو نکالتا رہتا ہوں۔ (الاسراف، ۴۳)

بیعت و استفاضہ

تمہیداتِ نعمت

گزشتہ صفحات میں یہ امر واضح کیا جا چکا ہے کہ مایوس الاولاد والدین کے گھر بفضلہٖ تعالےٰ حضرت تھانویؒ ایک برگزیدہ بزرگ کی دُعا سے ہی تشریف لائے تھے۔ ان کی بزرگی کا اثر حضرت کے بچپن میں نمایاں تھا۔ اس کی سرحد پار کر کے جب آپ نے علم کے میدان میں قدم رکھا تو آپ کو غزالی و درازیٔ وقت اساتذہ مل گئے۔ جو صرف اپنے علوم و فنون میں ہی ماہر و یگانۂ روزگار نہ تھے بلکہ صاحبِ باطن اور شیخِ کامل بھی تھے اس کے ساتھ کاملین کی کشش اور بزرگوں کی توجہ بھی شاملِ حال رہی، جس سے "انجذاب الی الحق اور انقطاع عن الخلق" کے آثار بڑھنے لگے۔ گویا کہ شروع سے ہی آپ کی ظاہری و باطنی تربیت ایسے بزرگوں کے ہاتھوں ہوئی جو خود خدمتِ دین میں مصروف تھے اور آپ کو اصلاحِ اُمت و تجدیدِ دین کے فرائض کی ادائیگی کے لیے تیار کر رہے تھے۔ مگر یہ سب کچھ صرف تمہید ہی تمہید تھی۔

مربّیٔ باطن

جس کی تکمیل حق تعالیٰ نے ایک ایسے بزرگ کے سپرد کر رکھی تھی۔ جو تھانہ بھون سے ہزاروں میل دُور اور کئی سمندر پار خود بیت اللہ میں بیٹھ کر فراست کی دُوربین سے حضرت تھانویؒ کی نقل و حرکت کا مشاہدہ فرما رہے تھے۔ یہ شیخ العرب والعجم۔ جامع شریعت و طریقت مرجع العلماء والمشائخ۔ امامِ طریق۔ نمونۂ سلف۔ جنیدِ زماں اور شبلی دوراں حضرت حاجی امداد اللہ تھانوی چشتی۔ صابری مہاجر مکی قدس سرہ العزیز تھے۔ حضرت تھانویؒ ابھی مدرسہ میں تعلیم ہی پا رہے تھے۔ کہ حضرت حاجی صاحب نے باشارۂ غیبی از خود حضرت تھانویؒ کے والد ماجد کو کہلا بھیجا کہ جب تم حج کو آؤ۔ تو اپنے بڑے لڑکے کو بھی ہمراہ لیتے آؤ حالانکہ حضرت حاجی صاحب حضرت تھانوی کی ولادت سے بھی بہت پہلے ہندوستان سے ہجرت کر کے مکہ معظمہ تشریف لے جا چکے تھے۔ اور نہ اس وقت تک بظاہر کوئی ایسے حالات پیدا ہوئے تھے۔ جن کی بنا پر حضرت کی شہرت مکہ معظمہ تک جا پہنچتی۔

شوقِ بیعت

دِل کو دِل سے راہ ہوتی ہے۔ آخر جو آپ پر مکہ معظمہ سے نظر رکھے ہوئے تھے۔ اس کا اثر بھی تو کچھ ہونا تھا۔ سو وُہ اس طرح نمودار ہوا کہ حضرت حاجی صاحب کے خلیفۂ اعظم حضرت مولانا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کسی سلسلہ میں مدرسہ دیوبند تشریف لائے۔ کچھ تو ان کی شہرت آپ نے پہلے سُن رکھی تھی اور کچھ ان کے شیشۂ دل نے اپنے شیخ کے انوار کا عکس ان پر ڈالا تو آپ انھیں دیکھتے ہی پروانہ وار مصافحہ کے لیے دوڑے۔ راستہ میں مدرسہ کے نودرہ کی تعمیر کے لیے اینٹیں پڑی تھیں۔ آپ عجلت و شدت سے مجبور ہو کر راستہ سے جانے کی بجائے انہی پر سے کُودتے پھاندتے جا رہے تھے کہ ایک جگہ پاؤں پھسل گیا۔ جس سے زمین پر گرنے لگے کہ حضرت گنگوہیؒ نے بڑھ کر تھام لیا اور گرنے

سے بچالیا۔ کسی نے سچ کہا ہے کہ ؎

مزہ تو جب ہے کہ گرتوں کو تھام لے ساقی

بس اس ساقیِ معرفت نے اس تشنۂ طریقت کو تھامتے ہی آنکھوں میں کچھ ایسی مے معرفت پلادی کہ حضرت تھانویؒ فرمانے لگے کہ مجھے بیعت کر لیجئے۔ حالانکہ بقول آپ کے :۔

"میں اس وقت حقیقت و غایت بیعت سمجھتا ہی نہ تھا۔ مگر مولانا نے اس بناء پر کہ بزمانہ طالب علمی شغل باطن مخل تحصیل علم ہوگا۔ بیعت کرنے سے انکار فرمادیا۔ مگر اس وقت میرے سامنے میرے ایک ہم سبق کو اس کی درخواست پر بیعت فرمالیا۔"

اس سے گو حضرت تھانویؒ کے شیشۂ دل پر ایک چوٹ سی لگی۔ مگر اسے کسی مصلحت پر مبنی سمجھ کر خاموش ہو گئے اور وہ مصلحت سوائے اس کے اور کچھ نہ تھی کہ مولانا گنگوہیؒ بچشمِ فراست دیکھ رہے تھے کہ انھوں نے میرا پیر بھائی بننا ہے۔ اس لیے مرید کیسے بناؤں۔ ورنہ جس طرح انھوں نے گرتے ہوئے کو تھام لیا تھا۔ اس طرح سینہ سے لگانے میں بھی کیا عذر ہو سکتا تھا۔ مگر شنیدہ کے بود مانند دیدہ حضرت نے حاجی صاحب کی تو صرف شہرت ہی سُنی تھی۔ مگر اس قطب الارشاد کو اپنی آنکھوں سے نہ دیکھا تھا۔ اس لیے سنہ ۱۲۹۹ھ میں جب مولانا گنگوہی تیسری بار حج مبارک کے لیے جانے لگے تو آپ نے ایک عریضہ حاجی صاحب کے نام لکھ کر ان کے ہاتھ بدیں مضمون بھیجا کہ آپ مولانا سے مجھے بیعت کر لینے کی سفارش فرمادیں۔ مگر بفحوائے ؎

تشنگاں گر آب جویند از جہاں

آب ہم جوید بہ عالم تشنگاں

غائبانہ بیعت

حضرت حاجی صاحب نے مولانا گنگوہیؒ سے اس عریضہ کے بارہ میں کچھ راز و نیاز کی باتیں کرنے کے بعد حضرت تھانویؒ کو وہیں بیٹھے بیٹھے غائبانہ طور پر خود بیعت فرما لیا۔ اس وقت آپ کی عمر ۱۹ برس کی تھی۔

سفرِ حج

حضرت تھانویؒ فارغ التحصیل ہو کر آخر صفر ۱۳۰۱ھ میں کانپور تشریف لا چکے تھے۔ گو ۱۲۹۹ھ میں آپ کی غائبانہ بیعت ہو چکی تھی۔ مگر مسندِ درس پر بیٹھنے سے قبل چونکہ کچھ مزید باطنی تربیت کی ضرورت تھی۔ اس لیے حسب خواہش حاجی صاحب شوال ہی میں آپ کے والد ماجد آپ کو ساتھ لے جا کر حج کو روانہ ہو پڑے۔ ابھی غازی آباد اسٹیشن تک ہی پہنچے تھے کہ وہاں آپ کے والد ماجد کے ایک ملاقاتی تحصیلدار نے بتایا کہ "آجکل سمندر سخت طغیانی میں ہے۔ طوفان کی متواتر خبریں آ رہی ہیں۔ اور ایسی حالت میں سفر" بس اتنا ہی کہا تھا کہ آپ کے والد نے فرمایا بھائی اب تو روانہ ہو چکے ہیں۔ دُعا کیجیے۔ اللہ مالک ہے اور اِدھر حضرتؒ نے جوش میں آ کر انھیں جواب دیا کہ ؎

چہ غم دیوار امت را کہ باشد چوں تو پشتیباں
چہ باک از موج بحر آں را کہ دارد نوح کشتیباں

سفر جاری رہا۔ اس عاشق کو جہاز بھی امام طریقت کی نسبت سے "حیدری" ملا۔ جس طرح حضرت کے جذبات میں طوفان و تلاطم تھا۔ ویسا ہی سمندر میں نظر آیا۔ موجوں کے تھپیڑوں کی تاب نہ لا کر یہ چھوٹا سا جہاز بار بار سطح آب پر سر بسجود ہو جاتا۔ موجیں اس کے اوپر سے گزر کر مسافروں اور اسباب کو شرابور کر دیتیں اور حجاج مصروف دعا نظر آتے جنھیں دیکھ کر جہاز کے عملے کے افراد کلمات کفریہ بکتے کہ نعوذ باللہ اللہ میاں اس وقت کیا کر لیں گے۔ مگر حضرت فرماتے تھے کہ چونکہ اللہ تعالیٰ کی راہ میں جا رہے تھے۔ اس لیے الحمدللہ

کہ باوجود اندیشہ غرق کے قلب میں وحشت اور پریشانی مطلق نہ تھی۔ بفضلہٖ تعالےٰ جہاز بخیریت منزل مقصود پر پہنچ گیا اور ہم بعافیت دارالامان میں جا اُترے۔

ادب مکہ معظمہ

سرزمین مکہ پر قدم رکھتے ہی اس ارض پاک اور حرم محترم کے ادب و عظمت کا اس قدر غلبہ ہوا کہ وہاں تھوکنے میں بھی تامل ہونے لگا اور جس وقت بیت اللہ پر پہلی نظر پڑی۔ تو ایسی کیفیت شوقیہ انجذابیہ پیدا ہوئی کہ حضرت فرماتے تھے کہ ایسی کیفیت میرے اوپر کبھی عمر بھر طاری نہیں ہوئی۔

اشتیاق مرشد

حضرت تھانویؒ کی آمد سے حضرت حاجی صاحب کو دلی مسرت ہوئی۔ جس کی وجہ سے بعد فراغ حج و زیارت مدینہ منورہ آپ نے از خود حضرت سے فرمایا کہ تم میرے پاس چھ ماہ رہ جاؤ۔ حضرت نے اس کی والد ماجد سے اجازت چاہی لیکن انھوں نے بوجہ شفقت پدری اس مفارقت کی اجازت نہ دی۔ جب حضرت نے اس امر کی اطلاع حضرت حاجی صاحب کو باندازِ افسوس دی تو انھوں نے آپ کی تسلی کراتے ہوئے فرمایا کہ :۔

"والد کی اطاعت مقدم ہے۔ اس وقت چلے جاؤ۔ پھر دیکھا جائے گا۔"

دست بدست بعیت

اگرچہ حضرت حاجی صاحب نے آپ کو قبل از حج ہی بذریعہ خط از خود غائبانہ بعیت سے مشرف فرمایا تھا۔ مگر اب اصالتاً حاضری پر دست بدست بعیت کا شرف بھی بخشا جس وقت معتقدین کو حضرت حاجی صاحب بعیت فرما رہے تھے تو آپ نے حضرت کے والد ماجد سے بھی فرمایا کہ :۔

"میاں عبدالحق تم بھی مرید ہونے کو کہتے تھے۔ آؤ تم بھی آجاؤ۔"

تو انھوں نے نہایت سادگی سے فرمایا۔ نا حضرت نا۔ میں ابھی مرید ہونے کو

کو تیار نہیں۔ میں تو بعد میں ہوں گا یہ فرما کر فوراً ایک سینی مٹھائی کی منگوائی اور ایک خوبصورت عمامہ اور پچیس روپے اوپر رکھ کر بادب پیش کر کے کہا کہ اب بیعت فرمایئے۔ حضرت حاجی صاحب نے ان کے خلوص کے پیش نظر وہ ہدیہ قبول فرما کر انھیں بھی بیعت فرما لیا اور اس طرح باپ بیٹا دونوں بیعت ہو کر واپس وطن پہنچے۔ ۱۳۰۲ھ میں واپس آنے کے بعد حضرت تھانویؒ درس و تدریس مواعظ و تبلیغ میں ہمہ تن مشغول ہو گئے اور علمی شغل کا یہ سلسلہ ۱۳۰۱ھ تک جاری رہا۔ اور اس کے ساتھ ساتھ ذکر و شغل بھی فرماتے رہے۔

حضرت تھانوی کو شوق طریق باطن تو نوعمری سے ہی تھا اور بیعت کے بعد یعنی ۱۲۹۹ھ سے ہی ذکر و شغل میں مشغول ہو گئے تھے۔ مگر دقت یہ پیش آئی کہ استفادہ باطنی اپنے شیخ سے اس وقت ممکن نہ تھا۔ کیونکہ وہ کئی سمندر پار ہزاروں میل دور مکہ معظمہ میں بیٹھے تھے ادھر مفارقت کی ایک گھڑی پہاڑ ہو رہی تھی۔ اس لیے حق تعالےٰ نے آپ کی طلب صادق کو پورا کرنے کے لیے یہ سبب بنا دیا کہ اسی عرصہ میں آپ کے ماموں پیر جی امداد علی رحمۃ اللہ علیہ حیدر آباد سے وطن جاتے ہوئے حضرت کو ملنے کے لیے کانپور اتر پڑے۔ وہ اولیاء متہلکین میں سے تھے۔ بڑے ہی صاحب حال و قال بلکہ مغلوب الحال درویش تھے۔ طبیعت میں بڑی شوخی و بیساختگی اور مزاج میں بے حد بیباکی و آزادی تھی۔ پابند صوم و صلوٰۃ ہونے کے علاوہ صاحب عرس و سماع بھی تھے۔ اور آلات سماع ساتھ رکھتے تھے مقصود حقیقی کی طلب میں ایسے ایسے ریاضات و مجاہدات شاقہ کیے ہوئے تھے کہ دماغ پگھل کر ناک سے بہنے لگا تھا۔ سوز و گداز کا یہ حال تھا کہ ان کے پاس بیٹھتے ہی قلب میں ایک آگ سی لگ جاتی تھی اور دنیا سے نفرت اور تعلقات سے وحشت ہونے لگتی تھی۔ آپ اپنے "حال" کی وجہ سے اپنے صاحب قال بھانجے کے پاس نہ اترے اور ایک سرائے میں اتر کر آپ کو کہلا بھیجا کہ :-

" اگر تم اپنی وضع کے خلاف نہ سمجھو۔ تو مجھ سے سرائے میں آ کر مل جاؤ۔"

حالانکہ بوجہ بزرگی و رشتہ داری آپ بے تکلفی سے حضرت کے پاس آکر ٹھہر سکتے تھے مگر ادب علم مانع ہوا۔ اس لیے سیدھے حضرت کے پاس تشریف نہ لائے اور نہ حضرت کو یہ گوارا ہوا کہ ان کی موجودگی میں وہ سرائے میں رہیں۔ اس لیے آپ نے انھیں ساتھ چلنے پر مجبور کیا تو فرمانے لگے :

"میاں تم عالم باعمل ہو۔ مجھے نہ لے چلو۔ دیکھنے والے کہیں گے کہ کسی لچے اور شہدے کو اپنے یہاں لے آئے ہیں۔"

مگر حضرت نہ مانے اور انھیں ساتھ لے آئے۔ صرف انھیں ہی ساتھ نہ لائے۔ ان کے آلاتِ سماع بھی ساتھ لائے۔ ان کی آمد۔ ان کی آتش بیانی اور اثرِ سوز و گداز نہانی سے وہ آگ بھڑک اٹھی۔ جو حضرت کے سینہ میں طالب علمی کے زمانہ سے سلگ رہی تھی۔ اس لیے حضرت تھانوی کے دل کی تڑپ اور شدتِ طلب سے مجبور ہو کر نیز اپنے پیر و مرشد تک رسائی میں سمندر کو حائل دیکھ کر پیر جی کی طرف رجوع کر لیا۔

رجوع کی اطلاع

اگرچہ حضرت تھانویؒ کا تعلق بعیت براہِ حضرت حاجی صاحب سے قائم ہو چکا تھا لیکن ان کے خلیفۂ اعظم مولانا گنگوہیؒ سے جو اعتقادِ قلبی پیدا ہو گیا تھا۔ وہ بدستور راسخ رہا کچھ ان کی بزرگی کی وجہ سے کچھ ان کی حضرت حاجی صاحبؒ کی نیابت کی وجہ سے اور کچھ گرتے ہوئے کو تھام لینے کی وجہ سے۔ اس لیے حضرت تھانویؒ ہمیشہ انھیں بھی بمثیل اپنے مرشد کے سمجھتے تھے۔ جب بھی کوئی مشکل ظاہری و باطنی یعنی علمی و عملی پیدا ہوتی۔ آپ بلا تکلف بطور ایک مرید کے ان کی طرف رجوع فرماتے اور مولانا بھی ہمیشہ ان سے از راہِ شفقت مریدوں کا سا سلوک اور از راہِ احترام پیر بھائیوں کا سا معاملہ فرماتے۔

چنانچہ اسی تعلق افاضہ و استفاضہ کی بنا پر آپ نے شورشِ عشق سے مجبور ہو

کر اپنے ماموں پیر جی امداد علی رحمتہ اللہ علیہ کی طرف رجوع کرنے کی اطلاع اپنے شیخ کی بجائے ان کے خلیفۂ اعظم حضرت مولانا گنگوہی رحمتہ اللہ علیہ کو کردی مگر وہ خط عوام غیر ذوی الافہام سے خفیہ رکھنے کی خاطر عربی میں لکھا۔ جس کا ترجمہ درج ہے۔

" اے مولانا ! خدا کی قسم میں اس زمانہ میں حیرت و جستجو کے سمندروں میں غرق تھا اور ایسے شخص کو ڈھونڈ رہا تھا۔ جو مجھے اس تکلیف اور پریشانی سے نجات دلائے۔ یکایک بغیر میرے قصد و ارادہ کے ایک منادی نے مجھے آواز دی کہ اپنا ہاتھ میرے ہاتھ میں دے دے۔ میں تجھ کو اس بحرِ ذخار سے نجات دلاؤں گا۔ چونکہ ڈوبتا تنکے کا سہارا ڈھونڈتا ہے کیونکہ وہ پریشان و مشوش ہوتا ہے اور میں تو اپنے حبیب و دستگیر اور اپنے طبیب سے اس طرح بچھڑا ہوا تھا کہ ہم میں سمندر حائل تھے۔ اس لیے میں نے اس منادی کی آواز پر لبیک کہی اور اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ میں دے دیا، لیکن اس کے باوجود بحمداللہ میں نے ایک دن بھی اکابر کے اس قول پر عمل کو نہ چھوڑا کہ خذ ماصفا ودع ماکدر (جو اچھائی ہو لے لو اور برائی کو چھوڑ دو۔)"

رجوع کا نتیجہ

حضرت پیر جیؒ ایسے صاحبِ سوز و گداز کی طرف رجوع کرنے کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہی آتش عشق اور ہر فروزاں ہوگئی۔ اب ذکر و شغل میں زیادہ مشغول رہنے لگے۔ جس نے حضرت کا بالکل رنگ بدل دیا اور سارے تعلقات دنیوی کی خواہشات کو خاکستر بنا دیا اور متعدی ہو کر ایک عالم کو سوختہ و افروختہ کر دیا۔ حضرت نے بذریعہ عریضہ حضرت حاجی صاحب سے ترک ملازمت کا مشورہ طلب کیا۔ اگرچہ اشتیاق وصول الی اللہ بڑھ رہا تھا۔ مگر حضرت حاجی صاحب نے افاضہ خلق اللہ کی خاطر آپ کو ترک ملازمت کی ممانعت کر دی اور اپنے ۲۲ محرم ۱۳۰۸ھ کے مکتوب گرامی میں لکھا :-

"نامۂ بہجت شمامۂ آں عزیز باتمیز رسید۔ از استماعِ حالِ ذوق و شوق آثارِ ترقی فہمید۔ مسرت بر مسرت افزود۔ حق تعالیٰ برکت زیادہ کند۔" بخلق اللہ فیض دینی رسانیدن راہ اقرب وصول الی اللہ است ؛

اور اس طرح آپ نے نہ صرف حضرت کو ترک تعلق دنیا سے منع فرمایا۔ بلکہ اہلِ اللہ کے طریق کو اہلِ تصوف کے طریق سے ممیز و ممتاز کرنے کے لیے اپنے طریق کی حقیقت بھی بیان فرمادی کہ ہمارے تئیں کتاب و سنت سے دوری اور شریعت سے گریز جائز نہیں۔ بلکہ دُنیا کے اندر رہ کر خلقِ خدا کی خدمت دینی کرنا ہی وصول الی اللہ کا ذریعہ ہے۔

سفرِ حج ثانی

چنانچہ حضرت تھانویؒ نے اپنے شیخ کے حکم کے مطابق اپنا سلسلہ درس و تدریس جاری رکھا۔ مگر جس شعلہ بار آتش عشقِ الٰہی کو حضرت پیر جیؒ اپنی توجہ اور اثر سے کچھ ٹھنڈا کر گئے تھے۔ وہ بجھائے نہ بجھی اور پھر بھڑک اٹھی جس کی وجہ سے آپ سپند آسا بے قرار رہنے لگے اور کچھ حضرت حاجی صاحب کا یہ پُر از اشتیاق فقرہ کہ "میاں اشرف علی تم میرے پاس چھ مہینے رہ جاؤ۔" تیر و نشتر کا کام کرنے لگا۔ ادھر آپ کے والد ماجد کی وفات سے وہ رکاوٹ بھی جاتی رہی جس کی وجہ سے آپ حضرت حاجی صاحب کے پاس سفرِ حج میں مطلوبہ مدت کے لیے نہ ٹھہر سکے تھے۔ اس لیے آپ نے چھ ماہ حضرت حاجی صاحب کی خدمت میں گزارنے کے ارادہ سے اپنے آپ کو درس و تدریس کے مشاغل سے فارغ کرلیا اور پورے دس سال بعد مکہ معظمہ کو روانہ ہوگئے۔ حضرت حاجی صاحب کی خدمت میں پہنچتے ہی وہ سارا اضطراب والتہاب سکون و اطمینان قلب میں تبدیل ہوگیا۔ اور حضرت حاجی صاحب کو آپ کے آنے کی مسرت بالکل اسی طرح ہوئی۔ جیسے حضرت یوسف علیہ السلام کے ملنے سے حضرت یعقوب علیہ السلام کو حاصل ہوئی تھی۔

اشتیاق جانبین

وہاں پہنچتے ہی حضرت تھانویؒ حضرت حاجی صاحب کی توجہات خاص کے مرکز بن گئے۔ صرف مرکز ہی نہ بنے دو جان یک قالب ہو گئے۔ شیخ مرید کے لیے مضطرب اور مرید شیخ کے لیے بے قرار۔ بس ذرا ایک دوسرے کی نظروں سے اوجھل ہوئے کہ سازِ اضطراب بجنے لگتا۔ جس سے بزبانِ حال تو من شدی و من تو شدم کی آواز آنے لگتی۔ حضرت تھانویؒ بیٹھے بیٹھے اشتیاقِ زیارت سے مجبور ہو کر حضرت حاجی صاحب کے اوقاتِ خلوت میں ہی حاضرِ خدمت ہو جاتے اور معذرت کرنے لگتے کہ میں اس وقت خلوت میں مخل ہوا اور حاجی صاحب بر بنائے غایت خصوصیت فرماتے کہ "خلوت از اغیار نہ از یار" حضرت تھانویؒ جب مزارات کی زیارت کو نکل جاتے تو حاجی صاحب انتظار کی گھڑیاں گنتے رہتے اور آتے ہی حضرت سے تاخیر کا سبب پوچھتے۔ آپ فرماتے کہ مقاماتِ مقدسہ و مزارات کی زیارت کرنے چلا گیا تھا تو یہ فرما کر مطمئن ہو جاتے کہ "جائے بزرگاں بجائے بزرگاں" غرضیکہ اس طرح افاضہ و استفاضہ کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ حاجی صاحب کی غایت شفقت دیکھ کر لوگ متعجب ہو کر ان سے پوچھتے کہ یہ کون ہیں تو آپ فرماتے کہ یہ میرے پوتے ہیں۔ کیونکہ حاجی صاحب حضرت کے دُور کے رشتہ دار بھی تھے۔ اور جس کی تحقیق خود حضرت تھانویؒ نے بھی ضروری نہ سمجھی۔ کیونکہ وہ اس روحانی رشتہ کی نسبی رشتہ کے مقابلہ میں کوئی حقیقت نہ سمجھتے تھے۔

آغازِ تربیت

حضرت حاجی صاحبؒ کی یہ دلی خواہش تھی کہ حضرت تھانویؒ ہر لحاظ سے آپ کے مشابہ ہو جائیں۔ اسی لیے حاجی صاحب نے حضرت کی تربیت بالکل اس انداز سے شروع فرمائی۔ جس طرح باپ بچے کو بغرض تربیت ہر وقت اپنے ساتھ رکھتا ہے اور بچہ بھی ہر حالت میں باپ کی انگلی پکڑے اس کے ساتھ جانے کے لیے تیار ہوتا ہے۔

اس لیے حاجی صاحب نے آپ کے لیے جلوت و خلوت کا امتیاز ہی اڑا دیا تھا۔ مگر اس کے باوجود حضرت کے مرتبہ کے تحفظ کا بڑا خیال رکھتے تھے۔ کیونکہ بقول حضرت تھانویؒ۔

"حضرت حاجی صاحب کو اس کا بہت خیال رہتا تھا کہ میرے متوسلین کو کوئی تحقیر کی نظر سے نہ دیکھے۔ اس لیے خدام پر بہت ہی شفقت اور ان سے بہت ہی تعلق تھا۔"

مشاہدہ حدِ سماع

ایک بار سلسلہ شاذلیہ کے ایک شیخ نے حضرت حاجی صاحب اور ان کے خدام کی دعوت کی۔ جو حاجی صاحب نے اس شرط پر منظور فرمائی کہ اس میں سماع بھی ہو۔ اس پر بعض ظاہر بین علماء نے جو حلقۂ خدام میں داخل تھے۔ شرکتِ دعوت سے عذر کر دیا مگر حضرت

ع بے سجادہ رنگیں کن گرت پیر مغاں گوید

پر عمل فرماتے ہوئے بلا تامل ساتھ ہو لیے۔ بعض حضرت سے پوچھ بیٹھے کہ یہ کیا؟ فرمایا ع

محتسب گر مے خورد۔ معذور دارد مست را

غرضیکہ شیخ و مرید دونوں وہاں جا پہنچے۔ قبل از طعام اس شیخ کے خدام حلقہ باندھ کر کھڑے ہو گئے ان میں سے ایک نے کسی اسم الٰہی کا ذکر شروع کیا۔ جو منشد کہلاتا۔ اس کے ساتھ دوسروں نے بھی آواز ملا کر ذکر کرنا شروع کر دیا۔ کچھ دیر تک ایک اسم کا ذکر کر کے سب خاموش ہو جاتے۔ پھر منشد کچھ توحیدیہ عشقیہ اشعار دلکش لہجہ میں پڑھتا۔ اس کے بعد کسی دوسرے اسم کا ذکر شروع ہو جاتا غرضیکہ سماع کیا تھا۔ ایک پُر لطف و پُر کیف مجلسِ ذکرِ الٰہی تھی۔ اس سے فارغ ہونے کے بعد حضرت سے حاجی صاحب نے پوچھا کہ کہو کچھ لطف آیا۔ عرض کیا بہت لطف آیا۔ فرمایا کہ "بس یہی سماع تھا۔ جس سے ہمارے دوستوں کو خواہ مخواہ وحشت ہوئی۔ میں نے تو قصداً یہ شرط لگائی تھی تاکہ میں آپ کو دکھلا دوں

کہ سماع کی کیا حد ہے۔"

تعلیمِ شکر

حضرت حاجی صاحب حضرت تھانویؒ کو بربنائے محبت "میاں اشرف علیؒ" سے خطاب فرما کر فرمایا :۔

"میاں اشرف علی ۔ پانی جب پینا ۔ ٹھنڈا پینا تاکہ ہر بُن مُو سے الحمد للہ نکلے ۔ ورنہ زبان تو الحمد للہ کہے گی ۔ لیکن دل الحمد للہ کہنے میں شریک نہ ہوگا ۔"

اثرِ افاضہ

صاحب اشرف السوانح لکھتے ہیں :۔

"ادھر حاجی صاحب کی قوت اِفاضہ ادھر حضرت والا کی قابلیتِ استفاضہ، بس تھوڑے ہی دِنوں میں باہم اس درجہ مناسبت ہوگئی کہ حضرت حاجی صاحب بے ساختہ یہ فرمانے لگے کہ بس تم پُورے پُورے میرے طریق پر ہو ۔ اور جیسا کہ پہلے بھی بیان کیا گیا ہے ۔ جب کبھی حضرت والا کی کوئی تحریر یا تقریر دیکھنے یا سُننے کا اتفاق ہوتا ۔ تو خوش ہو کر فرمانے لگتے کہ جزاکم اللہ تم نے تو بس میرے سینہ کی شرح کر دی اور اگر دوران علوم و معارف میں کوئی کچھ سوال کرتا تو بجائے خود جواب دینے کے حضرت والا کی طرف اشارہ فرما دیتے ۔ کہ ان سے پُوچھ لینا ۔ یہ اچھی طرح سمجھ گئے ہیں ۔ حالانکہ حضرت والا فرمایا کرتے تھے کہ مَیں غایت ادب سے حضرت کے سامنے ہمیشہ خاموش ہی بیٹھا رہتا تھا اور بہت ہی کم کبھی ضرورت ہی کے وقت کچھ بولنے کا اتفاق ہوتا تھا ۔"

یہ حضرت حاجی صاحب کی بصیرت باطنی کا کرشمہ تھا ۔ جو اپنے نورِ فہم اور فراست

ایمانی سے حضرت کی سخن فہمی اور معنی شناسی کو معلوم کر لیتے تھے۔

آتشِ حسد

حضرت کی حد سے بڑھتی ہوئی شفقت۔ عنایت اور توجہ نے دوسروں کو حضرت کا حاسد بنا دیا۔ شیخ و مرید کے تعلقات بوجہ غایت مناسبت جب اس مقام پر پہنچ گئے سے

من تو شدم تو من شدی۔ من تن شدم تو جاں شدی
تا کس نگوید بعد ازیں من دیگرم۔ تو دیگری

تو انھوں نے آتشِ حسد کو تیز تر کر دیا اور بعض حاشیہ نشینوں نے خبث باطنی کی وجہ سے حاجی صاحب کو حضرت سے بدظن کرنے کی کوشش شروع کر دی۔ ایک دفعہ حضرت حاجی صاحب نے سر سید احمد خاں مرحوم کو نصیحت کے طور پر خط لکھنا چاہا اور اس کے لیے مسودات طلب فرمائے۔ بہت سے حاشیہ نشینوں نے اپنے اپنے مسودات پیش کیے جو حاجی صاحب کو پسند نہ آئے پھر انھوں نے حضرت سے مسودہ پیش کرنے کو فرمایا جب آپ لکھ کر لے گئے تو بہت پسند فرمایا۔ مگر حاسدوں نے خواہ مخواہ یہ اندیشہ ظاہر کیا کہ سر سید بدگمانی کریں گے کہ حضرت مولانا گنگوہی کے ایماء پر یہ خط لکھا گیا ہے اور یہ بدگمانی مولانا کے لیے مضر ہوگی۔ اس لیے اس کا بھیجنا خلافِ مصلحت ہے۔ اگرچہ حاجی صاحب کا اس پر اصرار تھا کہ یہ خط مفید رہے گا۔ مگر انھوں نے حضرت کی نرم خوئی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنی بات منوالی اور وہ خط نہ بھیجنے دیا۔ لیکن حاجی صاحب بدستور یہ فرماتے رہے کہ :

"اگر وہ خط بھیج دیا جاتا۔ تو امید تو تھی کہ اصلاح ہو جاتی۔ لیکن ہمارے دوستوں کی رائے نہ ہوئی۔"

چونکہ اس خط سے فیض یاب ہونا سر سید کے مقدر میں نہ تھا۔ اس لیے حاسدوں کی تدبیر کامیاب رہی۔"

خط بنام سرسید

اس خط کا مسودہ یہ تھا جو حضرت نے رسالہ "اصلاح الخیال" کے اخیر میں شائع کر دیا تھا:۔

"بخدمت عالی مرتبت مجمع اخلاق و الطاف سلمہم اللہ تعالیٰ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ"

ہر چند کہ مجھ کو آپ سے صوری نیاز حاصل نہیں۔ مگر آپ کے اخلاق کے اوصاف سن کر غائبانہ تعلق ہے۔ جس نے اس عرض کی جرأت دلائی۔ آپ میری گمنامی و ناشناسائی پر نظر نہ فرماویں۔ بلکہ انظر و الی ما قال ولا تنظروا الی من قال کو پیش نظر رکھیے۔ اب بنام خدا شروع کرتا ہوں۔

مکرما! جہاں تک آپ کی مساعی و تصانیف کو غور کر کے دیکھا۔ یوں معلوم ہوا کہ آپ کو دو چیزیں مقصود ہیں۔ خیر خواہی اسلام و خیر خواہی مسلماناں نے اس پر مجبور کیا کہ جو اعتراضات مذہب اسلام پر مخالفین کے ہیں۔ ان کے جواب دیئے جائیں۔ اور خیر خواہی مسلمانان اس امر کا باعث ہوئی کہ مسلمان جو حضیض تنزلی (پستی) میں گرے ہیں ان کو ترقی پر پہنچایا جائے ان دونوں مقصودوں کے مستحسن ہونے میں کسی منصف کو کلام نہیں ہو سکتا۔ مگر غور طلب امر یہ ہے کہ اس کے ذرائع اور وسائل کیا ہیں؟ اس کی تعیین باعث اختلاف خیالات جمہور اہل اسلام ہے۔ آپ نے اسلام کے اوپر سے اعتراض رفع کرنے کی یہ صورت ٹھہرائی کہ جو تحقیقات جدیدہ ہیں۔ ان میں کلام نہ کیا جائے۔ بلکہ جس طرح بن پڑے اسلام کو اس پر منطبق کیا جائے اور منشا اس تجویز کا صرف یہ دلیل ہے کہ تحقیقات جدیدہ مطابق واقع کے ہیں۔ اور اسلام مطابق واقع کے نہیں۔ دوسرے مقدمہ کے تسلیم کرنے میں تو کسی مسلمان کو گنجائش نہیں رہا۔ پہلا مقدمہ! وہ محل کلام ہے۔ اس کی کیا دلیل ہے کہ سب تحقیقات جدیدہ صحیح ہیں؟ تمثیلاً بعض امور کو پیش کرنا چاہتا ہوں۔ مثلاً

(۱) فلاسفہ کی تحقیق ہے کہ آسمان کوئی مجسم چیز نہیں۔ بھلا اس کی صحت پر کونسی دلیل قائم ہے اگر یہ رنگ جو نظر آتا ہے آسماں نہ ہو۔ اس سے آگے بہت دُور موافق حدیث صحیح کے پانچ سو برس کی مسافت پر پہلا آسماں موجود ہو۔ اس سے آگے اور سماوات ہوں تو کونسی دلیل عقل سے قطعی کی مخالفت لازم آتی ہے۔

(۲) ان کی تحقیق ہے کہ اصحاب کہف اور یاجوج ماجوج اور جن موافق عقائد اسلام موجود نہیں اس کی دلیل کیا ہے؟ اگر کہیئے کہ باوجود تلاش جن نہیں ملے یا نظر نہیں آئے تو جہاں میں کسی چیز کا نہ ملنا یا نظر نہ آنا دلیل اس کے عدم کی نہیں ہوتی۔ امریکہ کا حال پہلے معلوم نہ تھا۔ سیاحانِ ارض کو پتہ تک نہ لگا تھا۔ اور معتبر اخبار سے ثابت ہے کہ نئے نئے حصے نکلتے آتے ہیں تو کیا یہ مقامات اس وقت معدوم تھے۔ رہا یہ کہ جن شہروں کے نام مفسرین نے لکھے ہیں۔ وہاں نہیں ملے۔ (حالانکہ ان کے آثار اب ظاہر ہو رہے ہیں ۱۲ منہ) تو اوّل حق تعالیٰ میں قدرت ہے کہ باوجودیکہ انھیں مقامات میں موجود ہوں۔ پھر محجوب کر دیئے جاویں۔ چنانچہ عنقریب بحث معجزہ میں یہ مضمون آتا ہے۔ بعد تسلیم ان مقامات میں نہ سہی اور کہیں ہوں۔ نصوص کی کیوں تاویل کی جاوے؟

فلاسفہ جدید نے معجزات انبیاء کا انکار اس وجہ سے کیا ہے کہ یہ خلافِ فطرت ہے۔ اس پر کونسی شافی دلیل موجود ہے؟ جس سے نصوص کو مصروف عن الظاہر کیا جاوے۔ رہا یہ کہ خلافِ فطرت ہے۔ اس فطرت کی ماہیت آج تک متعیّن نہیں ہوتی۔ جس سے کوئی قاعدہ منضبط ہو سکے۔ نہ یہ کسی دلیل قطعی سے ثابت ہوا کہ فطرت کے خلاف کیوں محال ہے۔ اگر فطرت کی حقیقت عادت الٰہی ٹھیرایئے اور دلیل استحالہ خلاف تو یہ ٹھیرایئے کہ عادۃ الٰہی وعدۂ فعلی ہے۔ اس کا خلاف مثل وعدۂ قولی کے محال ہو گا۔ تو اوّل تو ان دونوں مقدموں میں کلام ہے کیونکہ

عادت الٰہی اول وعدہ نہیں۔ یہ امر دلیل طلب ہے۔ دُوسرے عادت کے لیے یہ ضروری نہیں کہ ہر روز واقع ہُوا کرے۔ بعض امور میں یونہی عادت ہو کہ گاہ گاہ واقع ہو جاتا ہو اور معجزات اسی قبیل سے ہوں۔ اس سے استدلال کا جواب بھی ہو گیا۔ فطرۃ اللہ التی فطر الناس علیہا لاتبدیل لخلق اللہ اور لن تجد لسنہ اللہ تبدیلا یہ جب ہے کہ ان آیات کے وہی معنی تسلیم کر لیے جاویں۔ جو آپ فرماتے ہیں اور اگر دوسری توجیہ کی جاوے۔ جیسا کہ مفسرین محققین نے کی ہے تو وُہ توجیہ آپ کی تاویلات سے زیادہ بعید نہیں۔ اس وقت استدلال ہی صحیح نہیں۔ جواب کی کیا حاجت ہے۔ دُوسرے یہ کہ ریل۔ تار برقی۔ موٹو گراف۔ ٹیلیفون وغیرہ کیا کیا ایجاد ہُوا۔ آپ انصاف سے فرمائیے کہ اگر یہ چیزیں کسی نے نہ دیکھی ہوں اور آپ کا قاعدہ کہ خلاف عادۃ محال ہے اس کے نزدیک مسلّم ہو۔ تو وُہ ان چیزوں کے وجود کا اس قاعدہ کی رُو سے انکار کرے گا یا نہیں ؟ ضرور انکار کرے گا۔ پس اگر وہ قاعدہ صحیح ہے تو آپ کو بھی ان چیزوں کا انکار ضروری ہے بلکہ صانعِ عالم کا ماننا بھی ضروری نہ ہوگا۔ اگر ان چیزوں کا وجود مسلّم ہے تو قاعدہ سے دستبردار ہونا ضروری ہے اگر یہ شبہ ہو کہ یہ چیزیں مستند الی الاسباب ہیں تو معجزہ تو بلا سبب ایک فعل ہو جاتا ہے تو اس کا جواب یہ ہے اسباب دنیاویہ اختیاریہ للعباد میں انحصار اسباب کا کسی دلیل سے ثابت ہونا چاہیئے۔ حق تعالیٰ کی مشیّت اور حکم کتنا بڑا سبب ہے اس کے سبب ہونے میں کیا خرابی عقلی ہے۔ پس ثابت ہُوا کہ انبیاء سے معجزہ ہر قسم کا صادر ہونا ممکن ہے پھر کیوں نصوص کی تاویل کی جاوے۔ یہی حال دوسری تحقیقات جدیدہ کا ہے کہ اکثر اس میں مخدوش اور مبنیٰ بر تخمین و تقلید ہیں۔ البتہ اگر کوئی دلیل عقلی ایسی ہو کہ اس کے تمام مقدمات برہانی ہوں یا مشاہدہ صحیحہ ہو۔ جس میں احتمال غلط فہمی کا نہ ہو اور پھر کوئی نص ظاہراً اس کے مخالف معلوم ہو۔ اس وقت اس نص میں تاویل مناسب ضرور ہے۔ مثلاً نصوص قرآنیہ سے ید اور وجہ وغیرہ حق تعالیٰ کے لیے ہونا ظاہراً معلوم

ہوتا ہے۔ اور دلیل قطعی سے انتفاء اجزاء ثابت ہے۔ ان لفظوں میں البتہ تاویل کی گئی۔ اور تاویل میں بھی یہ شرط ہے کہ موافق قواعد عربیہ و شرعیہ ہو۔ ورنہ وہ تحریف ہے۔ آپ کی تاویلات اولاً بلاضرورت میں جیسا کہ اوپر بیان ہوا۔ ثانیاً قواعد عربیہ کی پابندی نہ قواعد شرعیہ کی۔ پہلے علماء نے بھی ملاحدہ کے جواب دیئے ہیں۔ مگر اس طرح کہ اول ان کی تحقیقات کو منہدم کیا اور جس تحقیق کو بالکل صحیح پایا۔ اس جگہ مناسب تاویل کی۔ اسی جگہ سے معلوم ہوگیا کہ آپ نے جو اکثر احادیث نبویہ کو غیر معتبر ٹھہرایا ہے۔ اس کی بھی کوئی دلیل نہیں۔ اگر دلیل مخالفت دلیل عقلی ہے تو معلوم ہو چکا کہ دلیل عقلی سے مراد دلیل قطعی ہے۔ نہ کہ دلیل وہمی۔ ورنہ اس دلیل عقلی کی تعیین مشکل ہو جاوے گی۔ پس کون بعض عقل کو اس کا معیار قرار دیں گے۔ کیونکہ عقول میں تفاوت فاحش ہے۔ پھر ہر شخص کی عقلی تحقیق جدا ہے اور سب کو صحیح ماننا پڑے گا۔ اس میں تو اجتماع نقیضین والتقاء ضدین لازم آوے گا۔ مثلاً بصلیموس اور فیثاغورس حرکت و سکون زمین و آسمان میں مختلف ہیں۔ افلاطون اور ارسطو حدوث و قدم ارواح میں متخالف ہیں۔ پھر ایک تحقیق تو ضرور غلط ہوگی۔ ہر گاہ تحقیق عقلی کی غلطی بھی ممکن ہوئی۔ تو آپ کو کیسے وثوق ہوا کہ آپ کی دلیل عقلی ایسی ہی صحیح ہے کہ لابد نص میں تاویل ہی واجب ہے۔ معلوم ہوا کہ ایسے کی عقل ان امور میں قابل وثوق نہیں۔ جن کی نبوت و اخبار عن الواقع مسلم ہے۔ ان کی خبر قابل اعتبار ہوگی۔ عقل کا کام اتنا ہی ہے کہ توحید و رسالت کو اصول عقلیہ میں سے ہیں۔ سمجھ لے آگے فروع میں زمام اختیار بدست حاکم حقیقی اور اس کے خلیفہ اعظم کو دے دے۔ دیکھئے جب سلطان وقت بعد تدبر و تفکر کے اپنے کسی حاکم کی معرفت کوئی قانون ملک میں جاری کرے۔ رعایا کو اس کی تحقیق کی تو ضرورت ہے کہ یہ سلطان ہے اور فلاں شخص اس کا حاکم۔ تاکہ بے اصل منادی پر جو کسی نے براہ بغاوت یا براہ تمسخر شہر میں کر دی ہو۔ عمل نہ کرلیں اور جب دونوں امر محقق ہوگئے۔ تو اب اس قانون میں غور کرنا کہ ہماری عقل کے خلاف تو نہیں۔ محض ناجائز ہے۔ اگر ایسا کیا اور اپنی

عقل کا اتباع کر کے قانون کا انکار کیا - یا تاویل بعید کی - تو معذور نہ ہوگا - اگر یہ باب مفتوح ہو تو ملک میں قوانین کا جاری ہونا فوت ہو جاوے اور بغاوت عالمگیر ہو جائے - یہی حال حاکم حقیقی کے قوانین کا سمجھنا چاہیئے - اور اگر انکارِ حدیث اس بنا پر ہے کہ ان میں کسی قدر اختلاف ہے سو اتنا غور فرما لیجئے کہ تواریخ و اخبار میں اختلاف ہوتا ہے یا نہیں ؟ ہر گاہ اختلاف موجود ہے - پھر چاہیئے کہ کوئی تاریخ و خبر معتبر نہ ٹھیرے - جیسے مورخین راویان اخبار کے معتبر ہونے کو دیکھ کر مان لیتے ہیں اور اختلاف کو مضر تسلیم نہیں سمجھتے ایسے ہی حدیث میں رواۃ اسناد کے حالات اسماء الرجال سے تحقیق کر کے اس کے ساتھ یہ عملدر آمد کریں - تو کیا حرج ہے -

اس تقریر سے غالباً آپ کے تمام خیالات کا جو باعث ایسی تحریرات کے ہوئے جواب آ گیا ہے علاوہ اس کے ہر کا ئے دہر مردے تحقیقاتِ دینیہ میں گفتگو کرنا اور لوگوں کا کام تھا - آپ اس جملہ سے یہ نہ سمجھے کہ میں آپ کے علم و عقل کا منکر ہوں - یہ بات نہیں بلکہ اصل بات یہ ہے کہ ہر امر میں اس شخص کی وقعت و تاثیر ہوتی ہے جس سے اس کا پہلے سے اعتبار ہو - علماء محققین کی تحقیقات مسلمانوں میں معتبر سمجھی گئی ہیں اور وہ لوگ کم و بیش اس کام کو کر بھی رہے ہیں - وہ اس خدمت کے لیے کافی تھے - دوسرے یہ کہ ہر شئے کے لیے ہر زمانہ میں اس کے مناسب لوازم و خواص و آثار ہوتے ہیں - اول تو ہر زمانہ میں نہیں تو اپنے زمانہ میں تو ہم دیکھتے ہیں کہ تحقیق مسائل کے لیے اتنی چیزیں ضروری ہیں کہ وہ شخص عالم مشہور ہو - متقی پرہیز گار ہو - یہی شغل زیادہ ہو - لوگ اس کو دیندار و فہیم سمجھتے ہوں - دُنیا میں زیادہ آلودہ نہ ہو اور جس شخص میں یہ صفات نہ ہوں - اس کو اس میدان میں قدم نہ رکھنا چاہیئے - کیونکہ سعی لاطائل وجہد باطل ہے - سو جیسی حالت اس وقت آپ کی ہے - ایسی حالت پر آپ کی کوئی تحقیق صحیح بھی ہوتی - تب بھی سکوت فرمانا چاہیئے تھا - کیونکہ ایسی حالت میں بولنا اور بولنا بھی ایسا جو سارے

جہان کے خلاف ہو۔ بیٹھے بٹھلائے اپنے مسلمان بھائیوں میں تفرقہ ڈالنا ہے جس کو آپ سب سے زیادہ پسند کرتے ہیں اور تعجب ہے کہ اس تفرقہ کے سبب عظیم پر آپ غور نہیں فرماتے۔

یہاں تک تو خیر خواہی اسلام پر عرض کیا گیا۔ دوسرا امر مسلمانوں کی خیر خواہی اور ان کی ترقی کی تدبیرات کرنا ہے۔ اس کے مستحسن ہونے میں بھی کوئی کلام نہیں کرتا۔ ہاں اس کے متعلق جو تدابیر کی جاتی ہیں۔ وہ البتہ غور طلب ہیں۔ خلاصہ تمامتر آپ کی کارروائیوں کا یہ ہے کہ انگریزی میں اعلیٰ درجہ کی لیاقت و استعداد حاصل کر کے بڑے بڑے عہدوں اور حکام تک رسائی اور قوم میں وقعت حاصل کریں۔ میں اس میں زیادہ گفتگو کرنا نہیں چاہتا کہ انگریزی پڑھنا بحالت موجودہ کیسا ہے اور اس کا اثر کھلی آنکھوں مذہب پر کہاں تک پڑ رہا ہے۔ کیونکہ اولاً اس میں بحث طویل ہے۔ دوسرے علماء سے تحقیق ہو سکتی ہے۔ صرف اس قدر عرض کرتا ہوں کہ اول تو قومی ترقی انگریزی پڑھنے پر منحصر نہیں۔ میری رائے میں اگر ترقی وقعت مطلوب ہے تو ترقی مالی اس کا ذریعہ ہے۔ اس زمانہ میں دیکھا جاتا ہے کہ علم و کمالات پر کسی کی بھی نظر نہیں الاماشاء اللہ عوام میں حکام میں مالدار کا اعتبار ہے۔ اس کی عزت ہے اس کو خطاب و القاب ملتے ہیں۔ اکثر مقاصد میں کامیاب ہوتا ہے۔ مجسٹریٹی وغیرہ عہدے بھی مل جاتے ہیں مشورہ حکام میں شریک بھی کیے جاتے ہیں۔ خواہ انگریزی ایک حرف بھی نہ جانتے ہوں اور اگر ترقی مال مطلوب ہے تو تجارت و صنعت سے بہتر کوئی ذریعہ نہیں ہر شخص ہر وقت میں پیشہ ور اور تاجر کا محتاج ہے۔ تعلیم انگریزی خواں فیصدی دس جمعیت سے ہوں گے اور اہل صنعت و تاجر فی صدی دس پریشان ہوں گے اگر بجائے تعلیم انگریزی صنائع کی تعلیم کا اہتمام فرماتے تو قوم کو زیادہ نفع ہوتا۔ ثانیاً اگر فرض کر لیا جاوے کہ قومی ترقی انگریزی تعلیم میں منحصر ہی ہو۔ سرکاری مدارس کیا کچھ کم تھے جو جناب کے مدرسہ کی حاجت ہوئی؟ اگر یہ وجہ بتلائی جائے کہ ان مدارس میں مذہبی خیالات خراب ہو جاتے ہیں۔ اس لیے ایسے مدرسہ کی ضرورت ہوئی۔ جہاں مذہبی تعلیم بھی ہو۔

مکرما! سچ کہتا ہوں۔ اور آپ بھی دل میں جانتے ہوں گے کہ سرکاری مدارس کے تعلیمیافتہ ایسے بدعقیدہ نہیں۔ جیسے اس مدرسہ کے اکثر تعلیمیافتہ ہیں۔ اگر نماز و وعظ کے انتظام کو آپ عذر پیش کریں تو یہ خوب جان لیں کہ جب تک آپ کے خیالات نہ بدلیں گے آپ کے متبعین کی وہی کیفیت رہے گی۔ ثالثاً یہ بھی فرض کر لیا جائے کہ اس مدرسہ کی ضرورت ہی ہے اور اسی مدرسہ سے ترقی دین و دنیا کی ہو سکتی ہے۔ تو اس صورت میں انصاف سے دیکھیے۔ ترقی کے مستحق زیادہ کون لوگ ہیں۔ اُمرا یا غُربا، ؟ امرا کو تو پہلے سے ترقی حاصل ہے۔ آپ کی مطلوبہ ترقی نہ سہی۔ مگر کسی قسم کی تو ہے۔ جو ان کے لیے زیادہ اہتمام کرنا تحصیل حاصل کی قبیل سے ہے۔ البتہ غربا، اس کے زیادہ مستحق تھے۔ غریب بچوں کو مدرسہ میں داخل کیا جاتا۔ ان کے مصارف کی کفالت کی جاتی۔ ان کی تعلیم و تربیت کر کے معزز عہدوں پر ممتاز کراتے۔ ان کے دل سے دُعا نکلتی۔ خیر اگر قبولِ دُعا کوئی چیز نہیں تو ان کے دلوں کو راحت تو پہنچتی۔ یہ تو آپ کے نزدیک بھی محمود چیز ہے۔ اب تو تحقیق ہُوا ہے کہ غریب کا گذر وہاں مشکل ہے پھر ہمدردی قومی، خیرخواہی مُسلمانان کہاں رہی؟ پھر اُمرا نے پڑھ کر ترقی بھی کی۔ تو اوّل تو تعلیم میں کس قدر صرف ہوتا ہے۔ خصوصاً جو لوگ کہ یہاں سے ولایت جاتے ہیں جو آپ کے نزدیک عین صلاح ہے۔ ان کا اس قدر صرف ہوتا ہے کہ اس رقم کا بڑا گاؤں آسکتا ہے یا تجارت کر کے اس کا بڑا کارخانہ بن سکتا ہے۔ جس میں اس شخص کی استعداد کے قریب کے لوگ کارکن مقرر ہو سکتے ہیں۔ اس سے بھی قطع نظر کر لی جاوے تو مبلغ ترقی یہ ہے کہ بیرسٹر ہو گئے یا کوئی حکومت مِل گئی۔ اگر بیرسٹر ہیں تو انھوں نے ستانا شروع کیا۔ جو دو قومی بھائی لڑیں تو ہماری ضرورت رفع ہو۔ ان کی مراد پُوری ہُوئی۔ کسی نے ان کو مقرر کرنا چاہا تو ایک پیشی کے دو چار سو روپیہ عملی قدر اپنے مال کے اس سے فرمایا۔ اس نے کچھ کم کیا تو خفا ہو کر نکالنے کا حکم دیا۔ صاحب الغرض مجنوں۔ اس نے معذرت کر کے وہ رقم قبول کی اور جہاں سے ہو سکا۔ توڑ جوڑ کر بند و بست کر کے ان کا رومال بھر دیا۔ خدا کی قدرت پہلی پیشی

میں بحث تمام نہ ہوئی۔ دوسری تاریخ مقرر ہوئی اس تاریخ میں بھی وہی رقم مانگی گئی۔ غرض دو تین پیشیوں میں اس کا۔ اس کے اعزہ کا گھر لٹ گیا۔ بھلا یہ کیا ترقی وہمدردی ہے کہ دس گھر اجڑ کر ایک آباد کیا جاوے۔ اگر حکومت مل گئی تو عقائد پہلے سے خراب ہو چکے ہیں۔ قبرو حشر فسانہ بے معنی ہے۔ پھر خدا کا خوف کس لیے۔ تہذیب واخلاق میں یہ قوت ہرگز نہیں کہ امور مذمومہ سے روک سکے۔ یہ برکت مذہب ہی میں ہے کہ بعض لوگ اپنے آقا کی ناخوشی سے۔ کوئی عذاب قبر و دوزخ سے ڈر کر منہیات سے بچتے ہیں۔ سو اس شخص کو مذہب مانع رہا نہیں۔ اخلاق میں یہ قوت نہیں۔ پھر ایسا شخص جو کچھ کرے۔ ظلم کرے۔ رشوت لے۔ ناحق فیصلہ کرے۔ پرانی عداوت نکالے۔ جو کرے تعجب نہیں۔ ایک عاقل نے کیا خوب کہا ہے۔ کہ جو شخص اپنے مذہب کا پابند نہ ہو۔ وہ لائق حکومت کے نہیں۔ اور اگر کسی کے اخلاق ایسے ہی مہذب ہو گئے ہوں جو سب امور سے مانع ہو جاوے۔ تو یہ شاذ و نادر ہے۔ والنادر و کالمعدوم۔ بہرحال جو کارروائی مسلمانوں کی ترقی کے لیے اس وقت ہو رہی ہے۔ وہ سراسر خرابی درخرابی سے بھری ہوئی ہے۔ پس نہ خیر خواہی اسلام کے اصول صحیح ہیں۔ نہ خیر خواہی مسلماناں کے ذرائع راست ہیں۔ یہ تو بھلا ان امور کا ذکر تھا جن کا اثر دوسروں کو پہنچتا ہے۔ اب جو امور آپ کی ذاتِ خاص سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان کو بھی بطور نمونہ پیش کرتا ہوں۔ سب سے اوّل عقائد کی درستی ہے۔ اگر کچھ شبہات انسان کو واقع ہو جاویں۔ تعجب نہیں۔ مگر خدا کے فضل سے اس زمانہ میں اہلِ علم محققین جامع معقول و منقول شبہات رفع کرنے والے موجود ہیں۔ اوّل درجہ مولا محمد علی صاحب تحصیلدار مرحوم کی تحریرات میرے نزدیک آپ کے اصولی و فروعی شبہات کے

ف گو حضرت نے تو شنید یا فراست کی بنا پر اس طبقہ کا یہ حال لکھا۔ مگر احقر مؤلف اپنے ۲۴ سالہ کچہری کے تجربوں کی بنا پر اس شنید کی اپنی دید سے حرف بحرف تائید کرتا ہے۔

جواب کے لیئے کافی ہیں۔ اصرار کو کام نہ فرمایئے۔ نظر انصاف سے اس کو دیکھ کر اپنے خیالات درست فرمالیجیے اور یہ خیال نہ فرمایئے کہ آپ اپنی مشہور تحقیقات کے کس طرح خلاف کہیں۔ آپ کی انصاف پسند طبیعت پر اس خیال کا احتمال نہیں۔ آپ نے بہت سی غلطیوں کا اقرار بھی فرمایا ہے مثلاً حدیث فاطمہ میں فجارت فاطمہ وہی جویریہ کا فجارت فاطمہ ہی ہے، وجویریہ لکھا گیا۔ پھر آپ نے نہایت انصاف وخوبی کے ساتھ اس سے رجوع کر کے طبع کر دیا۔ اگر اب بھی اپنے خیالات کو صحیح کر کے اعلان فرما دیجئے۔ تو آپ کا اعلیٰ درجہ کا کمال ظاہر ہو۔ جمہور اہل اسلام کہ وہ تعداد میں آپ کے مدعیان اتباع سے بہت زیادہ ہیں۔ آپ کے محب ومخلص بن جاویں۔ اس وقت ان کو ترقی کی تدابیرات جو بتلاویں۔ وہ قبول کرنے کو دل سے تیار ہوں اور آخرت میں ثواب ملے۔ اپنے صحت عقائد کا بھی اور بہت سے لوگوں سے محفوظ رہنے کا اور بعضوں کے عقائد درست ہو جانے کا بھی۔ جو غایت محبت و اعتماد سے آپ کے رجوع کرنے سے وہ بھی رجوع کرلیں دوسرے نماز کی پابندی جماعت کے ساتھ ضروری ہے۔ خود نماز کی پابندی فرض ہے اور جماعت سُنت موکدہ اللہ ورسُولؐ کی محبت جو مقتضیٰ اسلام کا ہے۔ وہ اسی کو مقتضیٰ ہے کہ نہ فرض چھوڑے۔ نہ سُنت۔ تیسرے اصلاح لباس میں۔ مَیں زیادہ دلائل بیان نہیں کرتا۔ صرف ایک مختصر سی بات کہتا ہوں کہ مرد اگر عورت کا لباس پہن لے تو کیوں معیوب ہے۔ اسی وجہ سے ایک مذہب کی ایک قوم دُوسرے مذہب کے لوگوں کا لباس و وضع اختیار کریں تو کیا بے موقع نہیں۔ چوتھے خدا تعالیٰ نے آپ کو ہر قسم کی استطاعت دی ہے۔ حج بنص قرآنی فرض ہے۔ خدا اور رسُول کی محبت کا مقتضا یہ تھا کہ اگر فرضاً اسلام میں حاضری فرض وسُنت بھی نہ ہوتی۔ تب بھی بمقتضائے محبت دربار خدا اور رسُول میں ہر استطاعت والے کو حاضر ہونا ضرور تھا نہ کہ حاضری مکہ کی فرض اور حاضری مدینہ طیبہ کی سُنت۔ پھر کس قدر نازیبا ہے کہ عمر میں ایک بار بھی تشریف

نہ لاویں۔ جس وقت لندن کا سفر کیا تھا۔ آتے جاتے اگر عدن سے سیدھے تشریف لے جاتے تو کیا مشکل تھا۔ اب ہمت کیجئے اور سامانِ سفر کر دیجئے اور روزہ۔ زکوٰۃ ایک مخفی عبادت ہے۔ مجھ کو اس کی اطلاع نہیں۔ خدا کرے آپ پابند ہوں۔ ورنہ وہ بھی فہرست معروضات بالا میں منسلک سمجھیں۔

خلاصہ تمام معروضات کا یہ ہے کہ اب آپ کا اخیر وقت ہے۔ بجز عقائد و اعمال کے کوئی اس سفر آخرت کا ساتھی نہیں۔ اپنے "چند روزہ رفقاء" کو رخصت کیجئے۔ خواہ ظاہراً بھی خواہ صرف دل سے اور اس دائمی رفیق کو ساتھ لیجئے یعنی عقائد و اعمال کی اصلاح فرمایئے کیونکہ اذا جاء اجلهم لا یستاخرون ساعة ولا یستقدمون ؎

نسیم جاگو کمر کو باندھو
اٹھاؤ بستر کہ رات کم ہے

آخر میں یہ عرض ہے کہ اس التماس نامہ میں اگر کوئی لفظ خلافِ مزاج سامی سرزد ہوا ہو۔ مزاج ناشناسی پر حمل کر کے معذور سمجھیں۔ تعصب و عناد پر محمول نہ فرماویں کہ بخدا باعث تحریر صرف خیر خواہی و دلسوزی ہے اور عرض ہذا اگر مقبول خاطر عاطر ہو اور اُمید ہے کہ ہو تو اس نیاز مند کو مطلع فرما کر مسرور فرماویں۔ ورنہ کچھ حاجت تحریر جواب نہیں زیادہ نیاز۔ فقط"

یہ خط جسے حاسدوں نے بلطائف الحیل محض اس وجہ سے سر سیدؔ تک نہ جانے دیا کہ وہ حضرت تھانویؒ کا لکھا ہوا تھا۔ آج بھی سر سیدؔ مرحوم کے ہم خیال طبقہ کے لیے سرمایہ بصیرت ہے۔

سپردگی کتب

حضرت تھانویؒ چونکہ حضرت حاجی صاحب کے منظورِ نظر تھے۔ اس لیے حاجی صاحب نے نہایت خصوصیت کی وجہ سے اپنا کتب خانہ حضرت تھانویؒ کے سپرد کرنا

چاہا۔ مگر آپ نے عرض کیا۔

"حضرت کتابوں میں کیا رکھا ہے۔ ان کو لے کر میں کیا کروں گا۔ اپنے سینۂ مبارک سے کچھ دولت عطا فرمائیے۔"

انھوں نے حضرت تھانویؒ کو بطلبِ فیض روحانی مغلوب الحال دیکھ کر جوش سے فرمایا۔

"ہاں میاں! ہاں!! سچ ہے۔ کتابوں میں کیا رکھا ہے ؎

صد کتاب و صد ورق در نار کن

سینہ را از نور حق گلزار کن"

چنانچہ اس وقت تو حاجی صاحب نے آپ کے انکار پر اصرار نہ فرمایا۔ تاکہ آپ کی دل شکنی نہ ہو لیکن کچھ عرصہ بعد ان کتابوں کا پلندہ بنوا کر ہندوستان جانے والے ایک رئیس کے ہاتھ حضرت کو بھیجنے لگے۔

دامِ حسد

لیکن بعض حاسدین نے فوراً ان کتابوں کے متعلق ایک جعلی وقف نامہ تیار کر کے اور کسی خفیہ ذریعہ سے حضرت حاجی صاحب کی مہر اس پر ثبت کر کے حاجی صاحب سے کہا کہ آپ یہ کتابیں حضرت تھانویؒ کو نہیں بھیج سکتے۔ یہ مال وقف ہے۔ حاجی صاحب بار بار کہیں کہ میں نے وقف نہیں کیں۔ مگر وہ بھانپ گئے کہ کیا معاملہ ہے۔ اس لیے اس وقت تو انھوں نے مصلحتہً ان کی روانگی روک دی مگر مرض الموت میں مولانا محمد سعید صاحب کیرانوی کو وصیت فرمائی کہ وہ کتابیں حضرت تھانویؒ کو بھیج دی جاویں۔ اور اگر وہ نہ لینا چاہیں تو پھر مدرسہ صولیتہ (مکہ معظمہ) میں رہیں۔ چنانچہ مولانا نے اس بارہ میں حضرت تھانویؒ کو خط لکھا۔ جو گم کر دیا گیا یا گم ہو گیا۔ اس لیے وہ مدرسہ میں ہی رہیں جب اس واقعہ کا بعد میں حضرت کو علم ہوا تو فرمانے لگے کہ اگر وہ خط مجھ کو مل جاتا۔ تو تب بھی

ہیں یہی تجویز کرتا کہ وہ وہیں مدرسہ میں ہی رہیں۔ اس طرح آپ نے کم ظرفی کے مقابلہ میں وسیع الظرفی دکھائی اور جوبات شروع میں حضرت حاجی صاحب سے فرمائی تھی کہ کتابوں میں کیا رکھا ہے۔ اس پر اخیر وقت تک استقامت دکھائی۔ حالانکہ معاملہ دینے کا نہیں بلکہ لینے کا تھا۔

واپسی وطن

حاجی صاحب کی خواہش حضرت تھانویؒ کو پورے چھ ماہ اپنے پاس ٹھہرانے کی تھی۔ مگر چھ ماہ گزرنے سے قبل ہی حضرت تھانویؒ نے وہ تمام دولتیں جو بمشیتِ ایزدی حضرت حاجی صاحب سے حاصل کرنی تھی۔ کر چکے تھے بلکہ اخذ بیعت کی اجازت کے علاوہ حاجی صاحب کے جانشین اور خلیفہ خاص بھی بن چکے تھے۔ جس کی وجہ سے حاسدین حضرت کو حاجی صاحب کی نظروں میں گرانے کے درپے ہو گئے۔ اس لیے حضرت فرماتے ہیں کہ میں چاہا کرتا تھا کہ حضرت میرے اوپر اتنی شفقت و عنایت سب کے سامنے نہ فرمایا کریں تو اچھا ہو۔ آخر میں حاسدین سے حضرت کو اتنا اندیشہ لاحق ہوا کہ آپ وہاں چھ ماہ پورے کرنے سے ہفتہ عشرہ قبل ہی انشراح کی حالت میں واپس روانہ ہو پڑے۔

دو وصیتیں

حضرت تھانویؒ کو حاجی صاحب نے واپسی سے قبل دو وصیتیں فرمائیں۔

۱۔ میاں اشرف علی ہندوستان پہنچ کر ایک حالت پیش آئے گی۔ اس وقت عجلت مت کرنا۔

۲۔ جب کبھی بھی کانپور کے تعلق سے دل برداشتہ ہو تو پھر کسی دوسری جگہ تعلق نہ کرنا۔ بلکہ توکل بخدا تھانہ بھون جا کر بیٹھ جانا۔

حالانکہ محرم ۱۳۰۸ھ میں انھوں نے ایک مکتوب میں حضرت کو ترکِ تعلق سے منع فرمایا تھا لیکن چونکہ تلوین کا دور ختم ہو چکا تھا اور تمکین کا دور شروع ہو گیا تھا۔ اس لیے اب

حاجی صاحب نے تھانہ بھون چلے جانے کا اشارہ فرمایا۔

ساعتِ سعید

حضرت حاجی صاحب کے حضرت تھانوی کو اپنا خلیفہ و جانشین بنانے منصب ارشاد و تلقین پر متمکن فرمانے کے واقعہ پر خسرو دربار اشرفیہ حضرت مجذوبؒ صاحب اشرف السوانح لکھتے ہیں کہ :۔

"اللہ اللہ! وہ کیسی مسعود و مبارک اور خلاصہ ازمنہ ساعت تھی جس میں ایک قطب الارشاد حکیم الامت۔ مجدد دین ملت ایک شیخ العرب والعجم کے دست مقدس و مبارک سے دنیائے اسلام سے رسوم و بدعات کو مٹانے اور اسلام کو اس کی اصلی صورت میں دکھانے۔ مسلمانوں کو افراط و تفریط سے ہٹانے۔ جادۂ مستقیم پر لانے۔ علوم و معارف کے دریا بہانے عوام و خواص سب کو متمتع و مستفید فرمانے۔ فیوض و برکات ظاہری و باطنی کو شرقاً و غرباً پھیلانے۔ بڑے بڑے عقدہ ہائے لاینحل اور پیچیدہ پیچیدہ مسائل علمیہ و عملیہ کی گتھیاں سلجھانے۔ بندگانِ خدا کو صحیح آداب عبودیت و اصولِ معاشرت سکھانے اور مسلمانوں کو صحیح معنوں میں مسلمان اور انسانوں کو صحیح معنی میں انسان بنانے، تعلیم و تہذیب اسلامی کی خوبی و متانت کو عالم آشکارا اور تعلیم جدید و تہذیب نو کی ملمع کار و نظر فریب چادر زرنگار کو پارہ پارہ کر کے اس کی دھجیاں اڑانے اور نئی روشنی کی مخفی ظلمات کھلی آنکھوں دکھلانے۔ اہلِ دنیا کے قلوب میں اہلِ دین کا سکہ بٹھانے۔ دین و اہلِ دین۔ علم دین اہلِ علم دین کی وقعت بڑھانے اور بڑے بڑے سرکشوں کے سر جھکانے۔ شبہاتِ جدیدہ کو اصول منطق و فلسفہ ہی کی بنا پر باطل ٹھہرانے اور بڑے بڑے مدعیان منطق و فلسفہ سے بھی

کتاب وسُنت کے احکام واخبار وعقائدِ حقہ منوانے۔ اعلاالسنن میں احادیث تائیدیہ جمع کرا کر فقہ حنفی کو چار چاند لگانے۔ ہزاروں بے نمازیوں سے نماز پڑھوانے۔ سود خواروں سے سود اور دیگر ناجائز آمدنی والوں سے ناجائز آمدنیاں ترک کرانے۔ اہل حقوق کے حقوق دلوانے صدہا اہل معاصی سے معاصی ظاہرہ باطنہ چھڑوانے بڑے بڑے مہلک امراض روحانی کے نہایت سہل سہل اور تیر بہدف معالجات اور نادر نادر طرق اصلاح بتانے۔ نہایت باریک باریک مکائدِ نفس سمجھانے۔ بڑے بڑے مہلکات طریق کی طرف توجہ دلانے اور ہلاکت باطنی سے بچانے۔ تصوف کو بجائے اس کے موجودہ مصنوعی عباو قبا کے اس کا صدیوں کا اُترا ہُوا اصلی خرقہ دیرینہ پہنانے اور سالکین کو سلف صالحین کے برگزیدہ اور بالکل مطابق کتاب وسُنت طریق پر جو مدّت دراز سے متروک تھا۔ پھر چلانے۔ ترغیب وترہیب کے پُر اثر مضامین سے روتوں کو ہنسانے اور ہنستوں کو رُلانے۔ بالخصوص آیات وبشارات رحمت سنانے۔ ہزارہا مایوسین کی ڈھارس بندھانے نامرادوں کی مرادیں برلانے۔ صدہا طالبین کو جن میں ہر اعلیٰ وادنیٰ طبقہ اور پیشہ کے افراد شامل ہیں۔ محبوب حقیقی تک بہ اقرب طرق پہنچانے۔ غرضیکہ ہر شعبۂ دینی خصوصًا تفسیر وتصوّف کے متعلق ہر ضروری خدمت بہ احسن وابلغ وجوہ بجالانے کے لیے سریر آرائے منصب ارشاد ہُوا۔

یہ کوئی معمولی واقعہ نہ تھا۔ بلکہ اس لحاظ سے کہ دین محمدی علیٰ صاحبہ السلام والتحیۃ کی از سرِ نو تجدید اور رسُوم قبیحہ قدیمہ وبدعات سیئہ دیرینہ کی تردید آیندہ اسی کی بدولت ہونا تھی یہ واقعہ دُنیا کے اہم ترین واقعات سے بھی زیادہ اہم واقعہ تھا۔“

تائیدِ غیبی

حضرت مجذوبؒ نے جو کچھ فرمایا۔ اس کی تائید غیبی اس طرح سے ہوگئی کہ جس وقت حضرت تھانویؒ مکہ معظمہ سے واپس ہونے لگے تو بخشی نذیر حسین مرحوم کانپوری جو ایک دیندار صالح شخص تھے اس نے خواب میں دیکھا کہ حضرت والا مکہ معظمہ سے ہندوستان تشریف لے آئے ہیں اور جس وقت جہاز سے اُترے ہیں۔ دفعۃً سارے ہندوستان میں ایک روشنی سی پھیل گئی ہے اور تاریکی سی جو اس سے قبل بحالت خواب محسوس ہو رہی تھی۔ یک بیک دُور ہوگئی ہے۔ چنانچہ یہ خواب خود حضرت کی مجلس میں حاجی بشیر لکھنوی نے بروایت بخشی نذیر حسین کانپوری بیان کیا۔ جس کی صداقت کی دلیل حضرت کی مابعد کی ساری زندگی ہے۔ جو آپ نے افاضۂ ظاہری و باطنی میں گذاری۔

اشتیاقِ استقبال

اہلِ کانپور جو حضرت تھانویؒ پر پروانہ وار قربان ہوتے تھے اور آپ کی چھ ماہ کی طویل مفارقت کے سبب بہت ہی اداس و پریشان ہو رہے تھے۔ حضرت کی واپسی کی خبر سُن کر بہت مسرور ہوئے اور حضرت کے شایانِ شان استقبال کرنے کا اہتمام کرنے لگے۔

کمالِ عبدیت

جس کا حضرت تھانویؒ کو قوی احتمال تھا۔ لیکن چونکہ حضرت اپنی شان کو بالکل مٹا کر عبدیتِ کاملہ کے شرف سے مشرف ہو کر اپنے پیر و مُرشد سے واپس تشریف لا رہے تھے۔ اس لیے آپ نے نہایت اہتمام سے اپنی آمد کی تاریخوں کو پردۂ راز میں رکھا۔ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہونے دی اور اچانک بلا اطلاع خود بخود مدرسہ میں آ پہنچے جس سے مشتاقین و مخلصین کو بڑی حیرت و حسرت ہوئی۔ استقبال کے سارے ساز و سامان دھرے کے دھرے رہ گئے۔ یہاں تک کہ کوئی اسٹیشن تک بھی نہ پہنچ سکا۔ آپ کی آمد کی خبر

بجلی کی طرح شہر میں پھیل گئی اور لوگ جوق در جوق آنے لگے اور حضرت کی بدلی ہوئی حالت کو بنظرِ حیرت دیکھتے اور کہنے لگے کہ "یا اللہ کس حال میں گئے تھے۔ یہ کیا ہو گیا؟ اب تو رنگ ہی کچھ اور ہے۔" کیونکہ

حالتِ تمکین

حضرت کا ایک تو وہ زمانہ تھا کہ

"نہایت سُرخ و سفید ہشاش بشاش۔ خوبصورت اور چمکتے ہوئے پٹہ دار بال۔ خوش لباس ایسے کہ گویا ہر وقت دُولہا بنے رہتے تھے۔ اور جوانی کا وہ عالم تھا جس کو کہتے ہیں کہ شباب پھٹا پڑتا ہے۔"

اور جب حضرت حاجی صاحب کی خدمت میں رہنے کے بعد واپس تشریف لائے تو

"چہرہ بالکل زرد اور اداس۔ پژمردہ و ژولیدہ حال۔ نہ بالوں میں تیل کا اہتمام نہ کنگھی کا التزام۔ نہ اچکن۔ نہ انگرکھا۔ نہ پیچک۔ نہ بیل بوٹے۔ صرف سادہ کرتہ اور پاجامہ۔ غرضیکہ حضرت والا کو باطنی باغ و بہار نے ظاہری بناؤ سنگار سے بالکل بے پروا کر دیا تھا لیکن اس خستہ حالی پر ہزاروں بناؤ سنگار قربان ہوتے تھے۔ اور پہلے سے زیادہ کشش ہوتی تھی۔"

اور آپ کی ہیئت بزبانِ حال پکار رہی تھی ؎

قبا دا کردہ و کاکل پریشاں کردہ می آید
بہ بیں ایں بے سروساماں چہ ساماں کردہ می آید

لطفِ سادگی

لوگوں نے اپنے قصد و اہتمامِ استقبال کا ذکر کیا تو فرمانے لگے کہ "اسی وجہ سے میں بے اطلاع آیا ہوں۔" لوگوں نے کہا کہ چونکہ گھر کے لوگ بھی ہمراہ تھے اسٹیشن پر بڑی زحمت

ہوتی ہوگی۔ فرمایا کہ:۔

"زحمت کچھ بھی نہیں ہوئی۔ اللہ تعالیٰ نے ایسا فضل کیا کہ اتفاق سے پلیٹ فارم پر ہی ایک ڈولی مل گئی۔ اس میں گھر کے لوگوں کو سوار کرکے اور اسباب کو ایک قلی کے حوالے کرکے اسٹیشن سے باہر آگیا اور سواری میں بیٹھ کر یہاں پہنچ گیا۔ اس سے مجھے بھی زحمت نہ ہوئی اور اتنے سارے مسلمان بھی تکلیف سے بچ گئے۔ ورنہ تکلفات میں کلفت ہی کلفت تھی۔ سادگی میں جو بات ہے وہ تکلیف میں کہاں؟"

سلسلۂ توجہ

حضرت تھانویؒ حاجی صاحبؒ سے واپس آنے کے بعد بھی ان کی توجہات و عنایاتِ خاص کا مرکز رہے۔ جیساکہ مکتوباتِ امدادیہ کے حسب ذیل اقتباسات سے ظاہر ہے:۔

۱۔ آپ کے کوائف باطنی سن کر بہت جی خوش ہوا۔ اللہ تعالیٰ کا ہزار ہزار احسان ہے کہ آپ کو یہ نعمت عطا فرمائی۔ آپ کے سب حالات ماشاء اللہ محمود ہیں۔ انشاء اللہ آپ کو خود ان کی محمودیت معلوم ہوجائے گی۔ خدا کا شکر بجالایئے اور اس سے زیادتی کے شب و روز طالب رہیئے۔

۲۔ تم کو چاہیئے کہ ہمیشہ اپنے حال سے اور جو کوئی کیفیت جدید اپنے زمرہ والوں میں پیش آئے۔ اس سے مطلع کرو۔

۳۔ وہ مسبب الاسباب ہے سب سامان آپ کے درست کردے گا۔ انشاءاللہ آپ کو کوئی تردد نہ کرنا پڑے گا۔

۴۔ اپنے کام میں لگے رہو۔ خدا خود ہادی و مددگار ہے۔ خاک سے کیمیا کردے۔ تو کچھ عجب نہیں۔

۵۔ دین کو خوب مضبوط پکڑنا۔ دنیا خود ہی اچھی طرح صورت میں خدمت کو حاضر رہے گی۔
اپنے مقصود کا خیال سب پر مقدم رکھنا چاہیئے۔

۶۔ کوائف معلوم ہوئے نہایت خوشی حاصل ہوئی انشاء اللہ تعالیٰ یوماً فیوماً ازدیاد
انوار باطنی ہوگی اور خلق اللہ کو آپ کے ذریعہ سے فائدہ عظیم ہوگا۔ ہر وقت ایک
خاص خیال تمہاری طرف رہتا ہے۔

۷۔ باطن فقیر ہر وقت آپ کے ساتھ بلکہ آپ کے پاس ہے۔ محبت قلبی چاہیئے۔ اس
کی بدولت سب کچھ ہوتا ہے۔

۸۔ میرا تعلق خاطر تمہاری جانب مصروف ہے۔

۹۔ آپ کے لیے ایک عبا سبز رنگ بدست شاہ بہاء الدین صاحب دستی روانہ کیا گیا
ہے۔ قبول فرمادیں اور اپنے تصرف میں لادیں۔

۱۰۔ آپ سے خلق کثیرہ کو فائدہ ہوگا۔ یہ سلسلہ جاری رہے گا۔ وقت آخر ہے۔ دعا خاتمہ
کا طالب ہوں۔

۱۱۔ فقیر کے حق میں دعائے حسن خاتمہ کریں۔

مکتوبات امدادیہ کے استقصاء سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حضرت حاجی صاحبؒ
پر حضرت تھانویؒ کا تمامتر مستقبل بوجہ فراست ایمانی بالکل منکشف تھا۔ جس کا ثبوت ان
پیش گوئیوں سے ملتا ہے جن سے مکتوبات بھرے پڑے ہیں۔

حاجی صاحب صرف مکتوبات کے ذریعے ہی توجہ نہیں فرمایا کرتے تھے۔ بلکہ گاہے
گاہے حاجیوں کی زبانی بھی حضرت کو اس عنوان سے سلام بھیجا کرتے تھے کہ

"ہمارے مہین (دقیقہ رس۔ نکتہ شناس اور لطیف المزاج) مولوی سے
سلام کہہ دینا۔"

غرضیکہ حضرت حاجی صاحب کی توجہات وعنایات بعض حیثیتوں کے

اعتبار سے جس نوعیتِ خاص کی حضرت تھانویؒ پر تھیں۔ ویسی کسی خادم پر نہ تھیں۔ کیونکہ آپ کو ہی ان کا سجادہ نشین بننا تھا۔

شرفِ جانشینی

چونکہ علمِ الٰہی میں یہ طے ہو چکا تھا کہ حضرت تھانویؒ نے ہی حضرت حاجی صاحب کا جانشین ہونا تھا۔ اس لیے حاجی صاحب کی خاص نظرِ عنایت اخیر تک حضرت پر رہی آپ کے تمام حالات ظاہری و باطنی سے باخبر رہ کر اس وقت کا انتظار کرنے لگے کہ آپ کو وہ مقامِ جانشینی کب نصیب ہوگا۔ چنانچہ جب حق تعالیٰ کے فضلِ خاص سے حضرت کو وہ مقامِ باطنی حاصل ہو گیا تو آپ نے حاجی صاحب کو اس کی اطلاع دی۔ ان دنوں آپ بیمار تھے یہ خبر سنتے ہی اتنی مسرت ہوئی کہ افاقہ محسوس کرنے لگے۔ چنانچہ اپنے مکتوب مورخہ ۲۵ صفر ۱۳۱۴ھ میں لکھتے ہیں:۔

"سلام علیکم چو در خاطری گر از چشم دوری بدل حاضری۔ راحت نامہ مشعر احوال باطنیہ آنعزیز مع کوائف متعلقہ وصول ہوا۔ آپ کے مژدۂ ترقیات باطنیہ نے کمال مسرور کیا۔ اللہ تعالیٰ شب و روز ترقی مزید فرماوے۔ میں ہر وقت دست بدعا ہوں۔ گو اس وقت میری طبیعت اچھی نہ تھی۔ مگر آپ کی کیفیت سن کر بہت جی خوش ہوا۔ جس سے افاقۂ ظاہری ہونے لگا۔"

اس مقام کے حاصل ہونے کے کچھ عرصہ بعد آپ حسبِ وصیت حضرت حاجی صاحب تھانہ بھون تشریف لے گئے۔ جس کی اطلاع پر حضرت حاجی صاحب نے مورخہ ۱۲ ربیع الثانی ۱۳۱۵ھ کو یہ مکتوب روانہ فرمایا:۔

"بہتر ہوا کہ آپ تھانہ بھون تشریف لے گئے۔ امید ہے کہ آپ سے خلائق کثیر کو فائدہ ظاہری و باطنی ہوگا۔ آپ ہمارے مدرسہ و مسجد کو از سرِ نو آباد کریں۔ میں ہر وقت آپ کے حال میں دعا کرتا ہوں۔ اور خیال رہتا ہے۔"

جب آپ حاجی صاحب کی خواہش کے مطابق مدرسہ و مسجد کو آباد کر چکے اور سلسلۂ رشد و ہدایت جاری ہوگیا۔ تو پھر آپ کو جانشینی کی یوں نوید دی کہ :-

"خط آپ کا پہنچا۔ نہایت مسرت ہوئی۔ اللہ آپ کو جمیع مقاصد دارین سے فیض یاب کرے اور محبت اور خیال آپ کا بیان کرنا حاجت نہیں۔ دل کو دل سے راہ ہے ...... عزیزم ...... کو سلسلۂ بیعت عثمانی میں داخل کیا ہے۔ آپ ان کو شغل افکار بتادیں۔ آپ کافی ہیں۔ جو طالب ہو اُن سب کو ذکر و اشغال بتانے کی اجازت عامہ آپ کو ہے۔ میرا ہر وقت خیال آپ کی طرف ہے۔" (مکتوب مؤرخہ ۱۱ محرم الحرام ۱۳۱۶ھ)

اس اجازت عامہ کے بعد آپ نے حضرت کو جانشینی کی اطلاع اپنے آخری مکتوب مورخہ ۲۰ ربیع الاول ۱۳۱۷ھ میں یوں دی کہ :-

"اب مناسب حال ہر شخص کی آپ خود تعلیم کریں۔ اب تو آرزو یہی ہے کہ اللہ تعالٰے اس دار فانی سے جلد بلالے۔ فقیر جملہ احباب کے لیے دعا کرتا ہے۔ اللہ تعالٰے فائز المرام کرے۔ گفتگو کی طاقت نہیں۔ ضعف کی یہ حالت ہے کہ ایک جانب سے دُوسری جانب کروٹ لینا مشکل ہے۔"

اور اس آخری خط کے دو ماہ بعد حضرت حاجی صاحب اس دارِ فانی سے ہمیشہ کے لیے رخصت ہو گئے اور حضرت تھانویؒ نے بالکل انہی کے طریق پر سلسلہ فیض جاری کر دیا۔

غلبۂ حال

راہِ سلوک

انسان کو جس طرح دینوی اور دینی ترقی کے لیے مختلف مدارج سے گزرنا پڑتا ہے

اسی طرح اسے اصلاحِ ظاہر و باطن کے لیے بھی مختلف منازل طے کرنی ہوتی ہیں۔ اصلاحِ باطن کے سلسلہ میں وہ جن راستوں سے گزرتا ہے۔ انھیں اصطلاحِ صوفیہ میں راہِ سلوک کہتے ہیں اور جن منازل پر پہنچتا ہے۔ انھیں مقامات کہا جاتا ہے اور ہر مقام مقامِ ماسبق سے ارفع ہوتا ہے۔ مگر ان میں سے کوئی راہ یا مقام ایسا نہیں جس کی کتاب وسُنت سے نشاندہی نہ ہوتی ہو۔

اس راہ کی اولین منزل مرادیت ہے۔ یعنی فطرۃً مناسبتِ تامہ مقدرًا اہلیت متوقعہ اور ازلاً محبوبیتِ عامہ حاصل ہونا۔ جس پر حضرت تھانویؒ عالمِ ارواح سے ہی جادۂ پیما تھے۔ اس کی دُوسری منزل شوق کہلاتی ہے۔ یعنی جس جس محبوب چیز کا من وجہ علم ہو اور من وجہ علم نہ ہو۔ اس کو بکمالہٖ جاننے اور دیکھنے کی خواہش طبعی ہونا۔ اور اس کے سلسلہ میں محبت پیدا کرنا۔ یہ شوق ہی تھا جس نے حضرت تھانوی کے دل میں علم اور اہلِ علم دین اور اہلِ دین کی محبّت پیدا کر دی۔ اور جو حضرت تھانویؒ کو اربابِ ولایت ومعرفت کی خدمت میں کشاں کشاں لے جاتا رہا۔ اس سے اگلی منزل انس کہلاتی ہے۔ حضرت تھانویؒ کے الفاظ میں :-

> "جو چیز من وجہ ظاہر اور معلوم ہو اور من وجہ مخفی اور مجہول ہو۔ اگر وجوہ مخفیہ پر نظر واقع ہو کر اس کے ادراک کی خواہش ہو۔ اس کو شوق کہتے ہیں اور اگر وجوہ معلومہ پر نظر واقع ہو کر اس پر فرح وسرور ہو اس کو انس کہتے ہیں۔ یہ فرحت کبھی یہاں تک غلبہ کرتی ہے کہ مطلوب کے صفات جلال پیشِ نظر نہیں رہتے اور اس وجہ سے اس کے اقوال وافعال میں کسی قدر بے تکلفی ہونے لگتی ہے۔ اس کو انبساط اور ادلال کہتے ہیں۔"
>
> (تعلیم الدین صہ ٦٨)

چنانچہ جب حضرت تھانویؒ اپنے شیخ کی خدمت بابرکت میں جاکر رہنے لگے۔ تو ان

کی نظر و توجہ سے وہ شوق مبدل بہ انس ہوگیا۔

ان کیفیات لطیفہ کے بھی مختلف مقامات ہوتے ہیں۔ جو ایک دوسرے سے ارفع ہوتے ہیں۔ مثلاً بقول حضرت تھانوی اگر

"بسط کے بعد قبض لاحق ہوگیا۔ تو یہ قبض اس بسط سے ارفع ہوگا اور اگر اس قبض کے بعد پھر بسط ہوگا۔ تو یہ بسط اُس قبض سے بھی نیز پہلے بسط سے بھی ارفع ہوگا۔"

غلبۂ شوق

حضرت تھانویؒ جب اپنے شیخ کے پاس رہ کر فیوض ظاہری و باطنی سے اپنا دامنِ مراد بھر لائے۔ تو اس نے شوق کو تیز تر کر دیا۔ جو پہلے شوق و انس سے ارفع و اعلیٰ ثابت ہُوا۔ چنانچہ صاحب اشرف السوانح لکھتے ہیں کہ :-

"حضرت پر اپنے پیر و مرشد کی خدمت سے واپسی کے کچھ عرصہ بعد پھر کیفیت شوقیہ الٰہیہ کا نہایت جوش و خروش کے ساتھ ورود ہُوا۔ اور حالتِ سابقہ نے عود کیا۔ مگر اب کی بار اُس کا رنگ بدلا ہُوا تھا۔ قبل حاضری جو کیفیت شوقیہ تھی۔ اس میں اضطراب تھا۔ اس میں اشتیاق۔ اُس میں پریشانی تھی۔ اس میں انبساط۔ اُس کی لذت ایک گونہ ناگوار تھی۔ اس کی خوشگوار وہ سیر الی اللہ تھی۔ یہ سیر فی اللہ۔ وہ دوا دوش طریق تھی۔ یہ طواف کعبۂ مقصود۔ وہ عدم وصُول سے ناشی تھی یہ وصُول سے۔ وہ وقت طلب تھا۔ یہ وقت وصُول تھا۔ وہ زمان ہجر تھا۔ یہ زمانِ وصال۔ وہ دورِ حسرت تھا۔ یہ دورِ شوق۔ وہ تلوین تھی۔ یہ تمکین۔ وہ حالت مشاہدہ سے قبل کی تھی۔ یہ بعد کی۔ وہ اثر عشق کا تھا۔ یہ اثر حسن۔ بمصداق قطعہ حضرت حافظ شیرازیؒ ؎

بلبلے برگ گلے خوش رنگ در منقار داشت
واندراں برگ ونوا خوش نالہ ہائے ہزار داشت
گفتمش در عین وصل ایں نالہ و فریاد چیست
گفت مارا جلوۂ معشوق دریں کار داشت

غرض اس مرتبہ کی بے چینی بخلاف پچھلی مرتبہ کی بے چینی کے بڑے مزے کی بے چینی تھی۔ کیونکہ یہ بے چینی غایت انس مع اللہ سے ناشی تھی گویا شوق و انس دونوں سے مرکب تھی اور بجائے آثار اضطراب آثار اشتیاق نمایاں تھے۔ جس کا یہ اثر ہوا کہ مدرسہ کا رنگ ہی بدل گیا۔ درسی کتابوں کا سبق ہو رہا ہے اور ادنیٰ مناسبت سے تصوف کے مضامین کی دھواں دھار تقریریں ہو رہی ہیں اور طالب علموں پر کیفیت وجدیہ طاری ہو رہی ہے۔ بہت سے مدرسین اور طلبہ نے ذکر وشغل شروع کر دیا اور حالات عجیبہ وکیفیات غریبہ کا ورود ہونے لگا۔" (ص ۲۱ جلد ۱)

اثر توجہ

اس ذوق وشوق کا نتیجہ یہ نکلا کہ حضرت تھانویؒ نے حلقۂ توجہ قائم کر دیا۔ جس سے مدرسہ خانقاہ میں تبدیل ہو گیا۔ اُس وقت کے جوش وخروش کے متعلق خود حضرت فرمایا کرتے تھے۔ کہ "بس جی یہ چاہتا تھا کہ ساری دُنیا کو ذاکر ومشاغل اور ولی کامل بنا دوں۔" یہ کیفیت صرف حضرت کی ہی نہ تھی۔ بلکہ جس پر بھی حضرت کی توجہ ہوتی۔ وہی صاحب حال ہو جاتا۔ بقول حضرت مجذوبؒ اس زمانہ میں حضرت کے قوی الحال اور باکمال خلیفہ لطف الرسول کی یہ حالت تھی کہ اکثر کسی شعر یا کسی بات پر ایسی شدید کیفیت طاری ہوتی کہ ہاتھ پاؤں ٹھنڈے ہو جاتے۔ بے اختیار چیخنے چلانے لگتے اور ماہی بے آب کی طرح تڑپنے لگتے۔ ایک مرتبہ وہ حضرت مجذوبؒ کے ساتھ منصوری جا رہے تھے۔ جب چڑھائی چڑھ چکے۔ تو

بہت تکان محسوس کرنے لگے اور ناگواری کی شکایت کی جس پر حضرت مجذوب نے فرمایا ؎

یہ شکوہ بے وفائی کا یہ رونا کج ادائی کا
سزا ہے دل لگانے کی مزہ ہے آشنائی کا

بس اس شعر کے سنتے ہی تکان وتعب تو دور ہو گیا اور چیخ مار کر وجد میں رقص کرنے لگے۔ غرضیکہ ان کی مغلوبیت کا یہ عالم تھا کہ حضرت تھانوی فرمایا کرتے تھے کہ اس قدر خوف وخشیت کا غلبہ میں نے کسی پر نہیں دیکھا۔ جب وہ غلبہ حال میں باتیں کرتے۔ تو ان کی باتوں سے معلوم ہوتا۔ جیسے ان کا اس وقت کلیجہ پھٹا جا رہا ہو۔ حضرت تھانویؒ کے اس زمانہ کا جوش وخروش وہ اخیر وقت تک نہ بھول سکے۔ بلکہ اکثر اس توجہ کے طالب رہتے تھے۔ جس پر حضرت بغرض تسلی فرمایا کرتے تھے کہ :۔

"وہ کیفیات سابقہ نفسانی تھیں اور موجودہ کیفیات لطیفہ روحانی ہیں۔ ان کے مقابلہ میں وہ کوئی حقیقت نہیں رکھتی تھیں۔ اس زمانہ کی توجہ کے آثار کی مثال ایسی تھی۔ جیسے بڑے زور کی بارش ہو کر ایک ریلا سا بہہ گیا اور پھر نہ بادل رہا۔ نہ پانی۔ زمین بدستور خشک کی خشک۔ اور آجکل کی کیفیات کی ایسی مثال ہے۔ جیسے لگاتار پانی کی پھوہار برس رہی ہو۔ جس کو جھڑی لگ جانا کہتے ہیں۔ گو دیکھنے میں تو پھوہار ہے۔ جو زور کی بارش کے مقابلہ میں کچھ بھی نہیں۔ لیکن کیفیت یہ ہے کہ زمین کے اندر پیوست ہوتی چلی جا رہی ہے۔ ریلے کی طرح نہیں کہ ایک ساتھ بہتا ہوا نکل گیا اور زمین کے اندر کچھ اثر ہی نہ پہنچا۔ زمین تو کاشت کے قابل ایسی ہی ہلکی ہلکی اور جمی ہوئی بارش سے ہوتی ہے۔"

چونکہ حضرت کی توجہ سے اکثر طلباء ذاکر وشاغل ہو گئے تھے۔ اس لیے ان میں عام

طور پر ایسی کیفیات کا مشاہدہ ہوتا رہتا تھا۔ ایک دن ایک ایسا طالب علم جس نے حضرت کی دیکھا دیکھی ان کے مشورہ کے بغیر ذکر و شغل شروع کر دیا تھا۔ ایک مولوی صاحب سے بوستان کا سبق پڑھ رہا تھا۔ جب وہ اس شعر پر پہنچے ؎

نہ دوری دلیلِ صبوری بود

کہ بسیار دوری ضروری بود

تو اس پر ایسی شدید کیفیت طاری ہوئی کہ لا الٰہ الا اللہ کہتے ہوئے بازار کو نکل گئے جو بھی ملتا۔ خواہ مسلم خواہ غیر مسلم۔ سب کو کہتا کہ پڑھو لا الٰہ الا اللہ اس کے اثر کا یہ حشر تھا کہ ہندو بھی بے اختیار ہو کر لا الٰہ الا اللہ کہنے لگتے۔ اس کی حالت غیر دیکھ کر اس کے ماموں پریشان ہونے لگے۔ حضرت نے فرمایا کہ "میاں پریشان ہونے کی کیا بات ہے آپ کو تو خوش ہونا چاہیئے کہ آپ کا بھانجہ ولی ہو گیا۔" جب کسی طرح بھی اس کیفیت میں کمی واقع نہ ہوئی۔ تو حضرت نے ایک صاحب تصرف درویش میاں خاکی شاہ کے پاس سلب کیفیت کے لیے بھیجا۔ اُنھوں نے کہا :-

"یہ عجیب بات ہے کہ گولی تو ماری خود اور اب نکلوانے بیٹھے ہیں مجھ سے۔"

غرضیکہ انھوں نے اس پر توجہ کا عمل کر کے دُوسرے روز پھر آنے کو کہا۔ رات کو اس طالب علم کو سرکارِ دوجہاں صلی اللہ علیہ وسلّم کی خواب میں زیارت نصیب ہوئی جو فرما رہے تھے کہ "اس فقیر سے کہہ دینا کہ کیا تیری کمبختی آئی ہے۔ جو اس نعمت کو سلب کرتا ہے۔" حضرت نے جب یہ خواب سُنا تو اسے درویش کے پاس جانے سے روک دیا اور اس کے لیے سماع تجویز کر کے ایک صاحب سماع صُوفی سے کہا کہ اسے ذرا اپنے ہاں لے جا کر سماع میں شریک کریں اگرچہ یہ ہمارے مسلک کے خلاف ہے لیکن بغرض دوا ایسا کیا جا رہا ہے۔ مگر حضرت کو یہ معلوم نہ تھا کہ وہ آلات سے سماع سُنتے ہیں اس سے جب وہ لڑکا وہاں پہنچا۔ تو آلات سماع دیکھ کر بہت بگڑا کہ یہ کیا

واہیات بات ہے۔ مجھے کیوں معصیت میں گرفتار کیا جا رہا ہے۔ میں ان سب کو توڑ دوں گا۔ گویا وہ دیوانہ بھی فرزانہ نکلا۔ اور بھاگ کر حضرت کے پاس آگیا۔ اس پر حضرت نے اسے ایک خوش آواز بنگالی طالب علم کے سپرد کیا جس کی آواز میں بڑا سوز و گداز تھا کہ اسے خلوت میں لے جاکر کچھ اشعار سنا دو۔ اس نے حضرت خسرو کی یہ غزل سنانی شروع کی کہ

از ہجر تو دل کباب تا کے، جاں در طلبت خراب تا کے

در مصحفِ روئے او نظر کن خسرو غزل و کتاب تا کے

اس کو سنتے ہی وہ وجد میں آیا اور بڑے زور سے تا کے۔ تا کے کہتا رہا یہاں تک کہ دل کی ساری بھڑاس نکل گئی اور مکمل سکون نصیب ہو گیا۔ اس کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے پھر شرفِ زیارت بخشا اور فرمایا کہ تم کسی سے بیعت ہو جاؤ۔ اس نے عرض کیا کہ حضور کس سے؟ فرمایا "جس سے اعتقاد ہو"۔ چنانچہ اس نے حضرت سے یہ خواب بیان کیا۔ آپ نے بھی اس کی تعمیل کرنے کو فرمایا کہ جس سے اعتقاد ہو۔ بیعت ہو جاؤ۔ اس نے کہا کہ مجھے تو آپ سے اعتقاد ہے۔ لہٰذا آپ بیعت فرما لیجئے چونکہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد تھا۔ اس لیے آپ نے بیعت کے تمام ضابطوں کو بالائے طاق رکھ کر اسے فوراً بیعت کر لیا۔ غرضیکہ حضرت کی توجہ ایسی ہوتی تھی کہ دیوانے بھی فرزانے ہی رہتے تھے اور ولایت کے ایسے مقامِ رفیع پر پہنچ جاتے تھے کہ خود سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم بہ مسرت ان کی دستگیری فرماتے تھے۔

کیفیت اضطرابیہ

مقامات محصلہ میں حضرت کو رسوخ حاصل ہو گیا۔ تو اب مقامات متوقعہ کی طلب شدید کا شوق دامن گیر ہوا۔ اور پھر وہی کیفیتِ اضطرابیہ والتہابیہ عود کر آئی جو کہ مکہ مکرمہ کے قیام سے پہلے تھی۔ لیکن ان دونوں میں زمین و آسمان کا فرق تھا۔

کیونکہ وہ کیفیتِ طلب ابتدائی سے ناشی تھی اور یہ طلب مزید سے۔ مگر یہ تشنگی طلب حقیقت شناس ولذت آشنا ہونے کے باوجود بھی پہلے سے زیادہ بڑھی ہُوئی تھی۔ اس لیے آپ کو حسب سابق اپنے پیر و مُرشد کے سمندر پار ہونے کی وجہ سے کسی دستگیری کی فوری اور شدید ضرورت محسوس ہُوئی۔ مگر سوائے اپنے شفیق ماموں پیر جی امداد علیؒ کے اور کوئی ایسا ولی اللہ نظر نہ آیا۔ جو ایسے وقت میں دستگیری کر سکتا۔ اس لیے آپ نے پھر بامر مجبوری ان کی طرف رجوع کیا۔ مگر ان کی توجہ خاص سے پُورا افاقہ نہ ہوا۔ بلکہ وہ عارضی ثابت ہُوا۔ کیونکہ پیر جی کی حالت بے تکلف شریعت پر منطبق نہیں ہوتی تھی۔ اسی لیے ہونے والے محی سنت۔ ماحی بدعت اور مجدّدِ ملت کی طبیعت پہ رنگ قبول نہ کر سکی۔

چونکہ اس اضطراب کا اصل سبب حسبِ ارشاد حضرت تھانویؒ حصول مقصود کی غایت عجلت اور احوال وکیفیات غیر اختیاریہ کی شدید طلب ورغبت تھی۔ اس لیے یہ اضطراب اتنا بڑھا کہ سارے مشاغل سے دل اچاٹ ہو گیا نہ درس و تدریس سے دلچسپی رہی نہ افاضہ ظاہری و باطنی کا شوق رہا۔ مشاہرہ پانے کی وجہ سے درس و تدریس کا فرض تو بدستور انجام دیتے رہے مگر وعظ و تلقین وغیرہ کا شغل قطعاً بند کر دیا۔ کہ جب انسان کو اپنی ہی فکر پڑی ہُوئی ہو۔ اسے دوسرے کی فکر کا کب ہوش رہتا ہے۔ اس لیے آپ نے سب غیر ضروری مشاغل ترک کر کے یکسوئی اختیار کر لی۔

غلبۂ عبدیت

یکسوئی اختیار کرنے کے بعد چونکہ آپ نے وعظ کہنا موقوف کر دیا۔ جس کے اہل کانپور بے حد دلدادہ و گرویدہ اور شروع قیام کانپور سے ہی لذت چشیدہ تھے اس لیے وعظ کے موقوف ہونے سے اہلِ کانپور میں سخت ہل چل مچ گئی۔ جو تشنگانِ علوم و معارف اس چشمۂ فیض سے سیراب ہوتے رہتے تھے۔ وہ ماہی بے آب کی طرح

تڑپنے لگے۔ مختلف اطراف سے حضرت پر وعظ کہنے کے لیے زور ڈالا جانے لگا۔ یہاں تک کہ خود بانیٔ مدرسہ جامع العلوم عبدالرحمٰن خان مرحوم و مغفور جو ایک معمر اور صالح بزرگ تھے۔ حضرت کی خدمت میں بے تابانہ پہنچے۔ اور والہانہ یہ شعر پڑھا ؎

نصابِ حسن در حدِ کمال است　　　　زکاتم وہ کہ مسکین و فقیرم

"حضرت میں تو خود ہی فقیر ہو رہا ہوں۔ دُوسرے کو کیا دوں"

کیونکہ حضرت سمجھتے تھے کہ وعظ کہنے میں بھی ایک صورت ترفع اور دعویٰ کی ہوتی ہے۔ اس لیے غلبۂ عبدیت کی وجہ سے اس کی جراُت نہ ہوتی تھی۔

غلبہ توحید

اسی زمانہ میں حضرت کے مدرسہ کا سالانہ جلسہ ہُوا۔ جس میں باہر سے بھی علما کرام تشریف لائے۔ جب اراکین مدرسہ کی درخواستِ وعظ کی شنوائی نہ ہوئی تو وُہ اکابر علمائ کو ساتھ لے کر حضرت کی خدمت میں حاضر ہُوئے اور ان کے واسطہ سے وعظ نہ کہنے کے فیصلہ پر نظرِ ثانی کی درخواست کی۔ ان حضرات نے بھی کم ازکم مدرسہ کے جلسہ کے لیے وعظ کہنے کے لیے اصرار فرمایا۔ اس سے حضرت کو بہت تنگی ہُوئی۔ ان کے ادب و احترام اور اپنی مجبُوری و معذوری کی وجہ سے زبان سے اقرار یا انکار کی ہمّت تو نہ ہُوئی۔ لیکن گردن جھکا کر رونے لگ پڑے۔ آپ کی یہ حالت دیکھ کر مولانا ظہورالاسلام فتحپوریؒ کا دل پانی پانی ہو گیا اور بے اختیار کہہ اُٹھے ؎

عشق نے غالبؔ نکما کر دیا　　　　ورنہ ہم بھی آدمی تھے کام کے

انھوں نے اپنے ساتھیوں کو اصرار سے روک دیا کہ بس انھیں اَب کچھ نہ کہو۔ ان کو اپنے حال پر چھوڑ دو۔ ایک موقعہ پر لوگوں نے مولوی شاہ سلیمان پھلواروی سے بھی سفارش کرانی چاہی۔ جو وہاں آئے ہُوئے تھے۔ مگر انھوں نے سفارش کرنے سے بریں وجہ انکار کر دیا کہ:۔

"اگر ایسی حالت میں اس شخص سے وعظ کہلوایا۔ تو بس ممبر پر بیٹھتے ہی اس کے مُنہ سے جو پہلا لفظ نِکلے گا۔ وُہ "انا الحق" ہو گا۔ ایسی حالت میں اصرار مناسب نہیں۔"

غرضیکہ حضرت تھانویؒ کا سکوت اس بات کا مصداق تھا کہ

ع خموشی معنی دارد کہ در گفتن نمی آید

چنانچہ حضرت خود فرمایا کرتے تھے کہ :-

"اس زمانہ میں مجھ پر توحید کا بہت غلبہ تھا۔ اس لیے مَیں نے وعظ کہنا چھوڑ دیا تھا کہ نہ جانے مُنہ سے کیا نِکل جائے۔ جس سے عوام کو غلط فہمی ہو کر دینی نقصان پہنچ جائے۔ صرف مولوی محمد اسحٰق صاحب بردوانی سے (جو ایک فہیم وجید عالم اور حضرت کے معتمد خاص شاگرد تھے) ان مضامین توحید کو جو قلب پر وارد ہوتے تھے۔ خلوت میں بیان کر دیتا تھا اُس زمانہ میں اُن پر شانِ علمی غالب تھی اور تصوّف سے زیادہ متاثر نہ تھے۔ لیکن پھر بھی ان پر اتنا اثر ہوتا تھا کہ آنکھوں سے بے اختیار آنسو بہنے لگتے تھے اور میرے مضامین کی تصدیق پر مضطر ہو جاتے تھے۔"

گویا حضرت کو غلبۂ حال میں بھی مُصلحتِ عامہ کا اتنا خیال تھا کہ اپنی زبان روک رکھی تھی۔

اعتراض واعتراف

غلبۂ حال کے اسی زمانہ میں آپ عید کے موقع پر وطن تشریف لائے اور بعد نماز عید حسب عادت اھلِ قصبہ درگاہ شاہ ولایتؒ میں بموجودگی مجمع عام بغرض فاتحہ حاضر ہوئے۔ وہاں سب کے سامنے ایک صاحب نے حضرت سے اعتراضاً

کہا کہ آپ کو اپنے ماموں پیرجی امداد علیؒ سے رجوع نہ کرنا چاہیئے تھا۔ یہ آپ کی شانِ علمی کے خلاف ہے۔ کیونکہ پیرجی کے حالات مطابق شریعت نہیں۔ حضرت تھانویؒ قیل وقال کرنے اور اعتراض کا جواب دینے کی بجائے سارے مجمع کے سامنے معترض کے قدموں پر گر پڑے اور قطع نزاع کے لیے اعترافِ قصور کرتے ہوئے فرمایا :۔

ہاں صاحب ہاں ! مَیں واقعی سرتاپا قصور وخطا ہوں۔ خدا کے لیے معاف کیجئے۔ قیل وقال نہ کیجئے۔ بس رہنے دیجئے۔ مَیں خود ہی تسلیم کرتا ہوں کہ مَیں اس سے بھی زیادہ برا ہوں۔ جتنا آپ مجھے سمجھ رہے ہیں۔"

یہ صُورتِ حال صرف غلبۂ عبدیت نے پیدا کر رکھی تھی۔ ورنہ حضرت تھانویؒ نے پیرجی صاحب کی طرف دوبارہ جو رجُوع کیا۔ اس کی معقُول وجوہات موجود تھیں۔

وجوہِ رجوع

۱۔ خود حاجی صاحب کی طرف سے اس کی اجازت تھی۔ جو اکثر اپنے متوسلین سے فرمایا کرتے تھے کہ :۔

"سب صاحبان سُن لیں۔ مَیں اپنا بندہ نہیں بنانا چاہتا۔ خدا کا بندہ بنانا چاہتا ہُوں۔ کیونکہ خدا مقصود ہے۔ شیخ مقصود نہیں۔ میرے پاس جو کچھ تھا وُہ حاضر کر دیا۔ اگر اس سے زیادہ کی طلب ہو تو میری طرف سے عام اجازت ہے۔ جہاں سے چاہیں مقصود حاصل کریں۔ اور اگر کسی دُوسرے شیخ سے بیعت کی ضرورت ہو۔ تو بیعت کی بھی اجازت ہے۔"

۲۔ اسی لیے حضرت تھانویؒ فرمایا کرتے تھے کہ :۔

"مجھے اِس زمانہ میں بہت ہی زیادہ شوق طلب عارض تھا۔ اور گو مَیں

نے اپنے ذہن میں طے کر رکھا تھا کہ اخیر میں اپنے حضرات ہی سے بالخصوص ہندوستان میں حضرت مولانا گنگوہیؒ قدس سرہ العزیز سے رجوع کروں گا۔ لیکن اس احتمال پر کہ شاید کوئی خاص دولت اور جگہ بھی ہو۔ تو لاؤ اسے بھی حاصل کرلیں اور یہ حضرات تو اپنے ہی ہیں۔ تو ان سے تو آخر میں بہرحال رجوع کرنا ہی ہے اور اگر اپنے حضرات سے پہلے رجوع کرلیا۔ تو پھر کسی دوسرے سے رجوع کرنا باعث بے ادبی ہوگا۔"

۳۔ حاجی صاحب سے خط و کتابت کرنے کے لیے بوجہ بعد مکانی بہت طویل مدت درکار تھی اور یہاں عجلت طلب اور پے در پے تغیرات احوال کا یہ متقضاد تھا کہ جلد بلد عرض حال کیا جائے اور جہاں کہیں سے بھی ہو۔ جلد سے جلد مقصود حاصل کیا جائے۔

اس لیے آپ کا پیرجی صاحب کی طرف رجوع کرنا جبکہ وہ آپ کے قریبی رشتہ دار یعنی ماموں بھی تھے۔ کوئی غلط اقدام نہ تھا۔ مگر اب حضرت تھانویؒ اس مقام پر پہنچ چکے تھے جو پیرجی کی دسترس سے باہر تھا۔ اس لیے ان کی تدابیر سے افاقہ و تسلی کی بجائے پریشانی و اضطراب میں متواتر اضافہ ہوتا گیا جس سے حضرت تھانوی بہت گھبرائے اور تمام صورتحال سے اپنے شیخ حضرت حاجی صاحب کو مطلع کیا۔

اضطراب شیخ

جس سے ان کو بھی از حد پریشانی ہوئی۔ حضرت کا خط لے جانے والے کا بیان ہے کہ:

"جس وقت آپ کا خط حاجی صاحب نے پڑھا۔ تو بہت گھبرائے۔ کبھی گھر کے اندر تشریف لے جاتے اور کبھی باہر تشریف لے آتے اور بار بار فرماتے کہ "جوان آدمی ہے۔ غلبہ ہوگیا ہے۔ تحمل نہیں ہوسکا۔ مگر میں اتنی

دُور ہوں کیا کروں ؟" میں نے عرض کیا کہ میں جلدی جانے والا ہوں۔ یہ سُن کر بہت خوش ہوئے اور اس خط کا جواب لکھوا کر میرے حوالے کیا اور زبانی فرمایا کہ ان سے کہہ دینا کہ جب تک تمہارا یہ خادم زندہ ہے۔ کیوں کسی دُوسرے کی طرف رجوع کرتے ہو ۔"

اس کے باوجود شیخ سے اپنے مرید کی حالتِ زار دیکھ کر تحمّل نہ ہوسکا اور فوراً خواب میں آکر فرمایا کہ :۔

"پیرجی کے پاس نہ بیٹھا کرو۔ ورنہ خارش ہوجائے گی۔"

سامانِ تسکین

جونہی خط کا جواب لانے والے واپس وطن پہنچے۔ حضرت تھانویؒ ان کی آمد کی خبر سُنتے ہی پروانہ وار گرمی کے موسم میں عین دوپہر کے وقت جبکہ سخت لُو چل رہی تھی اور دھوپ تیز تھی۔ ان کے پاس پہنچے۔ خط اور پیغام وصول کیا۔ خط کھولا تو اس میں لکھا تھا۔

"بعد دعوات زائد ذوق وشوق مع الجمیعت وانشراح وانبساط خاطر تواضح باد۔ خط آں عزیز رسید۔ کیفیت حالات معلوم شد۔ نوشتہ بودند کہ از تدبیر (پیرجی صاحب) قدرے افاقہ دست دادہ است۔ آری چنیں؛ افاقہ ظنی ومستعار است۔ قیام پذیر نیست۔ وبرقین نزد صاحب موصوف اجازت طلبیدہ بودند۔ از طرف فقیر اجازت است اما اورادو اشغال مختلف بحالت تلوین ہم زیان است۔ زیراکہ اثر ہریک جُداگانہ است ہرگلے رانگ وبوئے دیگر است۔ بدانکہ باعثِ تفرقہ وتشویشات خاطر بچند وجہ فرمودہ اند۔ الی قولہ ایں علاج درضیاء القلوب از صفحہ ۵۲ تا صفحہ ۵۵ مرقوم است۔ بعمل آرند۔ انشاء اللہ تعالیٰ طبیعت صلاح وفلاح پذیر خواہد شد۔ خاطر جمع دارند ثم الی قولہ باقی حالات ایں جا زبانی مولوی

عبدالرزاق صاحب معلوم خواہد شد۔ فقط

(مکتوبات امدادیہ نمبر ۲۳)

حضرت حاجی صاحب کی دعا و توجہ اور پیغام و خط کا اتنا اثر ہوا کہ حضرت فرماتے تھے :۔

"تدابیر مرقومہ مکتوب کے استعمال کی ضرورت ہی واقع نہ ہوئی۔ زبانی پیغام سنتے ہی اور خط پڑھتے ہی تسلی ہو گئی۔ مغرب تک مطلع بالکل صاف تھا اور پریشانی کا نام و نشاں بھی نہ رہا۔ کامل سکون ہو گیا۔"

اس طرح حضرت حاجی امداد اللہؒ نے کئی سمندر پار بیٹھے ہوئے حضرت کو بعجلت تمام بحرِ تحیر و توحش سے نکال کر ساحل سکون پر پہنچا دیا۔

اطلاعِ انقطاع

ساحلِ مراد پر پہنچتے ہی حضرت تھانوی نے پیرجی صاحب سے قطع تعلق کر لیا۔ اس کی اطلاع انھیں کرنی ضروری تھی تاکہ وہ بھی اپنی توجہ ہٹا لیں۔ مگر ادب مانع تھا۔ آخر ضرورتِ شرعیہ غالب آئی اور ایک تبلیغی خط کے ذریعہ آیندہ تعلق استفاضہ و استفادۂ باطنی رکھنے سے بر بناء شریعت مقدسہ صاف عذر فرما دیا۔ یہاں تک کہ بحیثیت مقتدائیت بمصلحت حفظ عوام قرابتِ قریبیہ کے باوجود آمد و رفت بھی ترک کر دی۔ اس اطلاع کے باوجود پیرجی صاحب نے ایک خط کے ذریعہ آپ کو مطلع کیا کہ :۔

امانتِ علیؓ

"مجھے ایک چیز حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے سینہ بسینہ بطور امانت پہنچی تھی۔ تم جوان صالح تھے۔ اور اس امانت کے اہل تھے۔ میں نے تمھیں وہ امانت دینی چاہی تھی۔ لیکن تم نے لینا ہی نہ چاہا۔ اگر اب بھی لینا چاہو۔ تو میں وہ امانت تمھیں دینے کو تیار ہوں۔"

جس کے جواب میں حضرت نے لکھا :۔

"اگر وہ چیز شریعت کے موافق ہے ۔ تو میں لینے کو تیار ہوں ۔ لیکن اگر وہ سرمو بھی شریعت کے خلاف ہے ۔ تو مجھے اس سے معاف رکھیں ۔"

اعترافِ حقیقت

غرضیکہ اس طرح حضرت تھانویؒ نے ہمیشہ کے لیے پیر جی سے قطع تعلق کر لیا ۔ لیکن ادب ہمیشہ غائبانہ بھی ملحوظ رکھا اور آپ کے ماموں صاحب نے بھی اس قطع تعلق کو محسوس نہ کیا ، بلکہ اپنے ایک مرید کو لکھا ، جس نے بعدہٗ وہ خط خود حضرت کو دکھایا کہ :۔

"بوجہ اختلاف مشرب ان (حضرت تھانویؒ) کی صحبت میں بیٹھنا تو مناسب نہیں ، لیکن بے ادبی کبھی نہ کرنا ۔ وہ اپنا کارِ منصبی انجام دے رہا ہے ۔ جو شریعت کی رُو سے اس پر واجب ہے ۔"

اثرِ اُنس

حضرت حاجی صاحب کی تدابیر سے جب آپ کا شوق مبدل بہ اُنس ہو گیا ۔ تو اس نے اپنا یہ اثر دکھانا شروع کیا کہ :۔

"ہر کہ از حق انس گیرد از خلق وحشت گیرد"

اور بقول مولانا رومی اس کا یہ نتیجہ نکلا ؎

از ہمہ کارِ جہاں بے کار ماند　　تا بدانی ہر کرا ایزد بخواند

چنانچہ انس مع اللہ کے ساتھ وحشت عن الخلق بھی روز بروز بڑھتی گئی ۔ یہاں تک کہ اس نے حضرت تھانویؒ کو کانپور جیسے محبوب مقام اور درس و تدریس جیسے دیرینہ دلچسپ شغل سے بھی متوحش کر دیا اور حضرت کو ہر طرح کامل و مکمل بنا کر خالص افاضۂ باطنی کے لیے منجانب اللہ وقف کر دیا ۔

ترکِ تعلق

اس طرح حضرت حاجی صاحب کی یہ پیشگوئی پوری ہو گئی کہ :۔

"جب کانپور سے دل برداشتہ ہو۔ تو تھانہ بھون جا بیٹھنا۔"

پہلے تو حضرت حاجی صاحب کی اس پیشگوئی پر حضرت تھانوی کو بہت حیرت ہوئی تھی اور آپ نے پریشان ہو کر ان سے عرض کیا تھا کہ :۔

"حضرت یہ کیوں فرما رہے ہیں ؟ میرا دل بھلا کانپور سے کیوں برداشتہ ہونے لگا۔ مجھے تو وہاں کے لوگوں کی محبت اور برتاؤ نے اس قدر مانوس کر دیا ہے کہ میں نے کانپور کو ہمیشہ کے لیے اپنا وطن ہی بنا لینا تجویز کر رکھا ہے۔"

اور اس کے ساتھ ہی اپنے دل کو یوں تسلی دی تھی کہ :۔

"یہ حضرت نے بہت ہی اچھی قید لگا دی۔ نہ میرا دل کبھی کانپور سے برداشتہ ہو گا نہ ترکِ کانپور کی نوبت آئے گی۔"

مگر قلندر ہر چہ گوید دیدہ گوید۔ جس بات کا اس وقت حضرت کو یقین نہ آ رہا تھا۔ اسے حضرت حاجی صاحب چشمِ فراست سے بخوبی دیکھ رہے تھے کہ ایک دن یہ نوبت آ کے رہے گی۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا اور حضرت تھانویؒ دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر پورے چودہ سال بعد شغل درس و تدریس اور تعلق کانپور بمصداق ؎

قال را بگذار مردِ حال شو

ہمیشہ کے لیے ترک کر بیٹھے۔

ترکِ ملازمت

چودھویں صدی کے مجدد حضرت تھانویؒ چودھویں صدی کے آغاز میں ہی یعنی صفر ۱۳۰۱ھ میں بسلسلہ ملازمت مدرسہ کانپور تشریف لائے تھے۔ جبکہ آپ کی جوانی کا آغاز تھا۔ ابھی ریش مبارک نہ آئی تھی۔ جس کی وجہ سے اوائل میں باریش طلباء آپ سے سبق پڑھتے ہوئے شرماتے تھے اور پورے چودہ سال بعد یعنی صفر ۱۳۱۵ھ میں آپ نے "حال" کے تقاضہ پر "قال" کا شغل ترک کرنے کا قطعی فیصلہ کر لیا۔ جس کا انھیں کبھی وہم و گمان بھی نہ تھا۔ بلکہ جب آپ کے شیخ نے کانپور سے دل برداشتہ ہونے کی طرف اشارہ فرمایا تو آپ نے حیرت و استعجاب کا اظہار فرمایا تھا کہ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ اسے تو میں وطن بنانا چاہتا ہوں۔

مجبوری روانگی

جب آپ ترک تعلق پر آمادہ ہوئے۔ تو اہلِ کانپور کی دل شکنی کا خیال دامنگیر ہوا جو چودہ برس سے آپ کے حسن معاملہ۔ حسنِ اخلاق۔ حسن تعلیم اور حسنِ تبلیغ کی وجہ سے آپ کو اپنا رہبر اور امیر سمجھتے تھے۔ اور ساتھ ہی نظام مدرسہ کے درہم برہم ہونے کا اندیشہ لاحق ہوا۔ جو چودہ برس سے آپ کے زیرِ اہتمام چل رہا تھا۔ اور ہر دل کے ہاتھوں اتنے مجبور ہو چکے تھے کہ کانپور کے قیام کی ایک ایک گھڑی پہاڑ معلوم ہوتی تھی۔ اور آپ یہاں سے جانے کے لیے سپند آسا بے قرار تھے۔ حضرت کی جگہ اگر کوئی اور ہوتا۔ تو ممکن ہے وہ اپنے ذاتی مفاد پر مصلحت عامہ کو قربان کر دیتا مگر حضرت تھانویؒ ہمیشہ ذاتی مفاد پر مصلحتِ عامہ کو ترجیح دینے کے عادی تھے۔ اس لیے آپ نے اپنے ارادہ ترک تعلق کو پردہ اخفا میں رکھ کر روانگی کی تیاری شروع کر دی۔

تدبیرِ فراغت

چونکہ حضرت تھانویؒ کو کانپور سے تھانہ بھون بھیجنا مشیتِ الٰہی میں طے شدہ تھا۔ اس لیے حق تعالیٰ نے کچھ اسباب غیب سے پیدا کر دیئے اور کچھ تدابیر حضرت کو بروقت سمجھا دی گئیں تاکہ حضرت باطمینان یہاں سے اس طرح واپس جا سکیں کہ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہو اور اصرار و تکدر کی نوبت نہ آئے۔ چنانچہ :۔

۱۔ غیبی امداد تو یہ ہوئی کہ اس عرصہ میں مدرسہ کی آمدنی کم ہو گئی۔ جس کی بنا پر آپ نے مدرسہ سے تنخواہ لینی بند کر دی۔ اراکین مدرسہ نے اسے محسوس کیا کہ جب آپ تنخواہ نہ لیں گے۔ تو مدرسہ سے تعلق کم کر دیں گے اور خود بھی مالی خسارہ میں رہیں گے۔ اس لیے انھوں نے حضرت کے تنخواہ نہ لینے کی مخالفت کی۔ مگر آپ نے انھیں یہ کہہ کر مطمئن کر دیا کہ :۔

"مدرسہ پر سب سے زیادہ بوجھ میری پچاس روپیہ تنخواہ کا ہے۔ اس لیے جب تک مدرسہ کو کافی آمدنی نہ ہونے لگے گی۔ میں تنخواہ نہ لوں گا۔"

۲۔ اُس وقت نہ صرف مدرسہ کا تمام اہتمام آپ کے سپرد تھا بلکہ صدر مدرس بھی آپ ہی تھے۔ اس منصب سے خود کو علیحدہ کرنے کے لیے آپ نے یہ تجویز کی کہ ماہانہ روئیداد کارکردگی میں بحیثیت مہتمم یہ اعلان شائع کرا دیا کہ :۔

"مدرسین کو بہت دنوں سے ترقیاں نہیں دی گئیں۔ لہٰذا مدرس اوّل (یعنی خود حضرت) کو تو سرپرست مدرسہ بنایا جاتا ہے اور ان کی جگہ موجودہ مدرس دوئم مولوی محمد اسحاق صاحب بردوانی کو مدرس اوّل مقرر کیا جاتا ہے۔ اور اسی ترتیب سے سب مدرسین کو ترقی دی جاتی ہے۔"

اس پر بھی بعض حضرات کو شبہ ہوا اور وہ اس تجویز کی مخالفت کرنے لگے، لیکن حضرت نے ان کو مصلحت اخفا فرمایا کہ :۔

"آپ لوگ میری ترقی اور میری سرپرستی کو پسند نہیں کرتے۔"

اس پر وہ لاجواب ہو گئے۔

۲۔ اسباق کے انتظام کے لیے آپ نے قریب الفراغ طلباء کے اسباق یہ کہہ کر اپنے ذمے لے لیے کہ

"اُن کے اسباق مختلف اساتذہ کے پاس ہیں اور وہ زیادہ وقت نہیں دے سکتے ان کو زیادہ وقت کی ضرورت ہے۔ تاکہ جلدی فارغ ہو سکیں۔ اور میرے پاس کافی وقت ہے۔ اس لیے ان کے اسباق مجتمعاً میں اپنے ذمہ رکھتا ہوں۔"

تاکہ آپ کے چلے جانے سے کسی طالب علم کا مطلق حرج نہ ہو۔ کیونکہ آپ کا خیال تھا کہ قریب الفراغ طلبہ کے اسباق سے تو بعد فراغ سبکدوشی ہو جائے گی اور پھر کوئی سبق آپ کے پاس نہ رہ جائے گا اور بقیہ طلباء بدستور دیگر مدرسین سے پڑھتے رہیں گے۔

۴۔ یہ مراحل طے کرنے کے بعد آپ نے اپنی نشست بدلنے کے لیے یہ صورت اختیار کی کہ مدرسہ کی عمارت کو چھوڑ کر مسجد میں آگئے اور وہیں بیٹھ کر پڑھانا شروع کیا اور اس کی وجہ یہ بیان کی کہ

"فارغین کی جماعت بڑی ہے۔ ان کے لیے مدرسہ کی درسگاہ تنگ ہے نیز چونکہ میں تنخواہ نہیں لیتا۔ مجھ کو مسجد میں تعلیم دینا جائز ہے۔ لہٰذا میں تو مسجد میں پڑھاؤں گا اور میری درسگاہ میں مولوی محمد اسحاق صاحب بردوانی مدرس اوّل ہو کر پڑھائیں گے۔"

۵۔ اس لطافت کے ساتھ آپ نے مولوی محمد اسحاق صاحب کو ہر طرح مدرسِ اوّل اور بہمہ وجوہ اپنا قائم مقام بنا کر مدرسہ ان کے سپرد کر دیا۔ یہاں تک کہ بعض

انتظامی اُمور بھی جو آپ سے متعلق تھے۔ وہ بھی کم فرصتی کا عذر ظاہر کر کے اس قید کے ساتھ ان کے سپرد کر دیئے کہ آخر میں نام میرا ہی لکھا جائے بقلم اپنے۔ یعنی اشرف علی بقلم محمد اسحاق۔ تاکہ لوگوں کو قطع تعلق کا شبہ نہ ہو۔

جب آپ کے طلباء فارغ التحصیل ہو گئے۔ اور آپ کے ذمہ کوئی سبق بقایا نہ رہا تو آپ نے اپنے مجوزہ پروگرام کے مطابق بایں عذر رخصت لے لی کہ :۔

"اتنی بڑی جماعت کو فارغ التحصیل کرنے میں مجھ کو بہت مشقت اٹھانی پڑی ہے جس سے تکان ہو گیا ہے لہٰذا اب مجھے کچھ دن آرام لینے کی ضرورت ہے۔"

اور اپنا تمام سامان گٹھڑیوں میں بند کر کے ایک کمرہ میں مقفل کر دیا۔ تاکہ جو یہ اٹھانے کے لیے آئے اسے پریشان نہ ہونا پڑے اور منگوانے میں سہولت رہے اور ساتھ اس لیے نہ رکھا کہ خواہ مخواہ شبہ ہو گا اور اس طرح خود کو ہر طرح سے آزاد کر کے کسی کو قطع تعلق کی اطلاع کیے بغیر کانپور سے تھانہ بھون کو روانہ ہو گئے۔ فرماتے تھے کہ :۔

مسرّتِ واپسی

"جس وقت کانپور سے ریل چلی۔ اس وقت میری مسرت کی کوئی انتہا نہ تھی۔ بس ایسا معلوم ہوتا تھا۔ جیسے قید سے رہائی ہو گئی ہو۔ اور اللہ تعالیٰ کا لاکھ لاکھ شکر ادا کیا۔"

جب اس امر کی اطلاع آپ کے شیخ حضرت حاجی صاحب کو پہنچی، تو انھوں نے خوش ہو کر لکھا کہ :۔

"بہتر ہوا کہ آپ تھانہ بھون تشریف لے گئے۔ اُمید ہے کہ آپ سے خلق کثیرہ کو فائدہ ظاہری و باطنی ہو گا۔ آپ ہمارے مدرسہ کو از سرِ نو آباد کریں۔ میں ہر وقت آپ کے حال میں دُعا کرتا ہوں اور خیال رہتا

ہے۔" (مکتوبات نمبر ۳۶- ۱۲ ربیع الثانی ۱۳۱۵ھ)

تعلق سرپرستی

تھانہ بھون تشریف لانے کے بعد آپ نے کئی ماہ تک اپنے واپس نہ آنے کے قصد سے اہلِ کانپور کو مطلع نہ کیا۔ مگر بحیثیت سرپرست مدرسہ کے حالات برابر دریافت فرماتے رہے اور مشورے دیتے رہے۔

قطع تعلق

جب آپ کو ہر طرح سے اطمینان ہو گیا کہ مدرسہ کے سب کام اچھی طرح سے چل رہے ہیں اور اب کسی کام میں آپ کی عدم موجودگی کی وجہ سے خلل پڑنے کا اندیشہ نہیں تو اس وقت آپ نے ان کو مطلع کر دیا کہ اب میرا ارادہ واپس آنے کا نہیں ہے اور حضرت حافظ شیرازی کا یہ شعر لکھ دیا ؎

از قیل و قال مدرسہ حالے دلم گرفت
یک چند نیز خدمت معشوق می کنم

سعیِ طالبین

بس اس خبر کا پہنچنا تھا کہ اہلِ کانپور میں غم و اندوہ کی ایک لہر دوڑ گئی۔ ہر شخص انگشت بدنداں رہ گیا کہ یہ کیا ہوا؟ انھوں نے حضرت کو واپس لانے کی بہت سی تدابیر کیں۔ یہاں تک لکھ دیا کہ آپ مدرسہ کا کام نہ کریں۔ صرف یہاں قیام پذیر رہیں اور پچاس روپے تنخواہ بھی لیتے رہیں ان کے اصرار پر حضرت نے انھیں خشک جواب دینے کی بجائے لکھا کہ :۔

"میں نے وطن کی سکونت حضرت حاجی صاحب کے ایما پر اختیار کی ہے۔ آپ نے جو کچھ لکھنا ہو۔ انھیں لکھیں۔"

چنانچہ اربابِ اشتیاق نے حضرت حاجی صاحب کو بھی مکہ معظمہ میں بڑی منت

سماجت سے لکھا کہ وہ حضرت کو واپس کانپور تشریف لانے کے لیے لکھیں۔ مگر وہ اپنی تجویز کے خلاف کیسے لکھ سکتے تھے۔ اس لیے انھوں نے اپنے مکتوب نمبر ۹۴ مورخہ ۵ امحرم ۱۳۱۷ھ میں حضرت کو لکھا کہ :-

"کانپور سے آپ کے وہاں کے قیام کے بارہ میں خط آیا تھا جواب ان کو لکھ دیا گیا تھا۔ آپ کو بھی تحریر ہے کہ فقیر کے نزدیک مستقل قیام آپ کا تھانہ بھون میں ضروری ہے۔ باقی تعطیل وغیرہ کسی فرصت کے وقت یا جس وقت طبیعت کچھ گھبرائے تو کانپور بھی دورہ کریں اور ان لوگوں کی خبر گیری کریں اور طالب کے لیے تو تھانہ بھون کانپور سے کچھ دور نہیں ہے۔ چنانچہ کانپور بھی یہی مضمون جواب میں لکھا ہے۔" گیا۔

چنانچہ اس کے بعد وہاں کے لوگ جب بھی حضرت کو بلاتے تو آپ بڑی خوشی سے وہاں جاتے۔ کیونکہ ان حضرات کی محبت اور خلوص کی وجہ سے حضرت کو وہاں کے لوگوں سے بہت محبت تھی۔

غرضیکہ اس طرح حضرت نے کمال دانشمندی اور حسنِ تدبیر سے ملازمت ترک کر کے افاضۂ ظاہری کا دور ختم کر کے افاضۂ باطنی کا دور شروع کر دیا۔

دَورِ خشیّت

تقاضائے بشریّت

نبوّت۔ ولایت۔ حکومت انعامات الٰہیہ میں سے ہیں۔ جنھیں ان اعزازات خصوصی سے نوازا جاتا ہے۔ ان کی جبلت میں بدو فطرت سے ہی ایسی خوبیاں پیدا کر دی جاتی ہیں۔ جو ان مناصبِ جلیلہ کا بارِ گراں برداشت کرنے اور ان کی ذمّہ داریوں

سے عہدہ برآ ہونے میں انسان کی ہر وقت ممد و معاون رہتی ہیں۔ مگر اس کے باوجود بھی اسے زندگی کے نشیب و فراز سے گزرتے وقت بحیثیت انسان موسمی تغیرات کی طرح قلبی تقلبات سے متاثر اور آلام و مصائب اور عقبات و بلیات سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ ان تاثرات و کیفیات یا عقبات و بلیات میں بمصداق حصّہ بقدر جُثّہ اپنے ظرف و رُتبہ کے مطابق حصّہ پاتا ہے۔ اسی لیے حضورؐ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلّم نے ارشاد فرمایا تھا کہ :۔

"لوگوں میں سب سے زیادہ مصائب انبیاءِ کرام پر آئے ہیں اور ان کے بعد پھر درجہ بدرجہ جو ان سے زیادہ مماثلت رکھتے تھے۔"

ایسے حالات کا صدور تعلیم و تربیت آزمائش و امتحان ترقی درجات کے لیے ہی ہوتا ہے۔

انسان کا کعبۂ مقصود حصولِ راحت ہے۔ جونہی اس کے سکون و اطمینان میں ذرہ بھر بھی خلل واقع ہوتا ہے وہ فوراً مضطرب و بے قرار ہو جاتا ہے اور ان اسباب کو رفع کرنے میں منہمک ہو جاتا ہے۔ جو اس کے سکون کو تباہ و برباد کرنے کے درپے ہوتے ہیں۔ اس فکر میں اسے دُنیا کی کوئی چیز اچھی نہیں لگتی۔ دراصل یہ غافل انسان کے لیے ذکرِ عقبیٰ کی ایک یاددہانی ہوتی ہے۔ کہ جب تم چند روزہ زندگی کی قلیل ترین عرصہ کی تکلیف کی تاب نہ لاکر حال سے بے حال ہو رہے ہو۔ تو تم آخرت کی دائمی زندگی سے کیوں غافل ہو۔ اگر وہاں بھی خدانخواستہ اسی طرح کسی مصیبت میں گرفتاری ہو گئی۔ تو پھر کیا حشر ہو گا۔ جبکہ یہاں تو رفعِ مصائب کے لیے ہر قسم کی سعی ممکن ہے۔ اور وہاں اس کا کوئی امکان نہیں۔ بس جب اس نقطۂ ماسکہ پر انسان کی توجہ مرتکز ہوتی ہے۔ تو وہ اس وقت کے حشر و نشر کے تصوّر سے کانپ اُٹھتا ہے۔ جس سے غلبۂ حال طاری ہو جاتا ہے۔ جسے اصطلاح صوفیہ میں "تغیرِ احوال" کہتے ہیں اور ان سے [illegible]

کے لیے کوئی بڑے سے بڑا مقام بھی مانع نہیں ہوتا۔ چنانچہ حضرت تھانویؒ خود فرماتے ہیں کہ :-

"کاملین پر بھی کبھی کبھی غلبۂ حال ہو جاتا ہے۔ لیکن وہ منافیِ کمال نہیں ہوتا۔ بلکہ حضرات انبیاء علیہم السلام پر بھی کبھی کبھی ان حضرات کی شان کے موافق غلبۂ حال طاری ہوا ہے۔ چنانچہ یومِ بدر میں حضور سرورِ کائنات سردارِ انبیاءؐ صلی اللہ علیہ وسلم نے جس ابتہال کے ساتھ دُعا فرمائی تھی۔ وہ بھی غلبۂ حال سے ناشی تھی۔ بلکہ گاہ گاہ فرشتوں سے بھی غلبۂ حال منقول ہے۔ حالانکہ ان میں انفعالِ بشری نہیں ہوتا۔ چنانچہ حضرت جبرائیل علیہ السلام کا فرعون کے مُنہ میں کیچڑ ٹھونسنا روایت ترمذی میں مذکور ہے۔ لیکن صاحبِ مقام پر جو غلبۂ حال طاری ہوتا ہے۔ اس میں وہ حدود سے خارج نہیں ہوتا۔ بخلاف صاحبِ حال کے وہ کبھی حدود سے خارج بھی ہو جاتا ہے۔ مگر اس کو گناہ نہیں ہوتا۔ کیونکہ بوجہ مغلوبیت وہ اس وقت مرفوع القلم ہوتا ہے۔"

اثرِ کیفیات

حضرت تھانویؒ بھی چونکہ سلوک کی منازل طے کر رہے تھے اور بفضلہٖ تعالیٰ حالت باطنی میں ایک مستحکم کیفیت تمکن و رسوخ پیدا ہو گئی تھی۔ لیکن صاحبِ مقام ہو جانے کے باوجود بھی تغیراتِ کیفیات سے متاثر ہونا لازمی تھا۔ جو لوازم سلوک سے ہے چنانچہ ایک روز آپ مسجد تھانہ بھون میں وعظ فرما رہے تھے۔ بدورانِ وعظ آپ نے نہایت جوش و کیف کے ساتھ مثنوی شریف کے یہ اشعار پڑھے۔

اے حریفاں راہ ہا را بست یار — آہوئے لنگیم داو شیرِ شکار

جز کہ تسلیم و رضا کو چارہ — در کفِ شیرِ نرِ خونخوارۂ

بس وُہ دوسرے شعر کا پڑھنا تھا کہ بے اختیار زور سے ایک چیخ نکل گئی اور دیر تک نہ صرف خود مضطرب رہے بلکہ سامعین کو بھی بے قرار رکھا۔ جس سے صاف ظاہر ہے کہ یہ کیفیت غلبۂ ہیبت سے ناشی تھی۔ بقول صاحب اشرف السوانح :-

" وُہ کیفیت بھی کس قوت کی کیفیت ہوگی ۔ جس نے حضرت تھانویؒ جیسے کوہِ استقلال کو بعد حصُولِ تمکین تام بھی از جارفتہ کر دیا۔ کیوں نہ ہو۔ صاحبِ مقام کے بھی صبر وسکُون کی ایک حد ہوتی ہے ۔ جب اس پر کسی ایسی قوی کیفیت کا ورود ہوتا ہے۔ جس کی قوّت اس کی حد سے فوق ہوتی ہے ۔ تو اس سے فی الحال مغلوب ہو جاتا ہے لیکن فی المآل جلدی ہی پھر اس پر غالب آ جاتا ہے ۔ امتداد نہیں ہونے پاتا۔ زیادہ اشتداد ہوتا ہے ۔ اور اس قسم کا غلبہ بھی کبھی کبھی ہوتا ہے ۔ بکثرت نہیں ہوتا۔ اور اگر ایسی قوی کیفیت کا ورود غیر صاحبِ مقام پر ہو تو اس کی جان کے لالے پڑ جائیں غرض اس قسم کا غلبۂ حال منافی تمکین۔ بلکہ اس کو بھی باعتبار حقیقت ایک درجہ کی تمکین ہی کہنا زیبا ہے ۔"

آثارِ خشیت

ترکِ ملازمت کے بعد جب حضرت تھانہ بھون میں مستقل قیام کی نیت سے سکونت پذیر ہوُئے تو اُنس مع اللہ کا اس قدر غلبہ ہُوا کہ مِلنے جُلنے والوں سے وحشت ہونے لگی۔ جس کی وجہ سے آپ نے آبادی چھوڑ کر باہر کسی سنسان جگہ میں نشیمن بنانے کا فیصلہ کیا۔ چونکہ آپ بزرگوں کے اشارہ کے بغیر کوئی قدم بھی نہ اُٹھاتے تھے ۔ اور خلق اللہ سے بے مروّتی بھی گوارا نہیں ہوتی تھی۔ اس لیے آبادی کو چھوڑنے کے سلسلہ میں مولانا گنگوہیؒ سے اجازت طلب کی۔ مولانا نے اس کی اجازت نہ دی اور فرمایا کہ ہمارے بزرگوں کا یہ طریق نہیں ۔ اور نہ ایسا کرنا مناسب ہے ۔ البتہ اگر لوگوں سے مِلنے جُلنے کو جی نہیں چاہتا۔ اور حرج

اوقات ہوتا ہے۔ تو پھر مروت اور لحاظ لازمی نہیں۔ اس پر آپ نے قصبہ سے باہر نکل جانے کا ارادہ تو ترک کر دیا۔ لیکن زیادہ تر وقت خلوت ہی میں اپنے محبوبِ حقیقی سے راز و نیاز میں گزارنے لگے۔ ہمہ تن مشغول بحق ہو گئے اور نہایت اطمینان و سکون اور انشراح و انبساط کے ساتھ وقت گزارنے لگے۔ چونکہ یہ منزل بھی کوئی آخری منزل نہ تھی اس لیے جب الانس مع اللہ کے درجات عالیہ ہو گئے۔ تو اب اگلی منزل کا سفر شروع ہُوا۔

قبض و ہیبت

اس دَور کے آغاز کا بہانہ یہ بنا کر آپ کی بڑی اہلیہ صاحبہ کے خالو کو دشمنوں نے شہید کر دیا۔ جس کی تجہیز و تکفین آپ کے ہی زیرِ اہتمام و نگرانی ہُوئی۔ بدورانِ غسل مرحوم مظلوم کے زخم رسیدہ سر اور ان کی نعش کے حسرتناک منظر نے حضرت کے پُرسوز و گداز قلب کو مجروح کر دیا۔ دفن سے فارغ ہو کر آئے۔ تو مستورات کے رونے دھونے کی آواز نے ان تازہ زخموں پر نمک پاشی کا کام کیا۔ جس سے سخت اضمحلال قلبی عارض ہو گیا اور اختلاج کی سی کیفیت محسوس ہونے لگی۔ ابھی یہ اثر زائل نہیں ہُوا تھا کہ آپ کو ایک اور عزیز کی موت پر سسرال جانا پڑا۔ جس نے پچھلے تاثرات میں اور اضافہ کر دیا۔ جس سے قلب ماؤف و متاثر ہُوا۔ ایک رات تہجد کے لیے وضو کرنے لگے تو یکایک بلا اختیار ایک "خطرہ منکرہ" وارد ہُوا اور چند الفاظ نے سکون و اطمینان کی زندگی میں ایک تلاطم برپا کر دیا۔ جس سے خوفِ آخرت کچھ اس انداز سے طاری ہُوا کہ زندگی سے بیزار ہو گئے اور خودکشی تک کے وسوسے آنے لگے۔ یہاں تک کہ خود فرماتے تھے۔ کہ ایک بار ایک صاحب ملنے آئے۔ ان کے پاس اس وقت بندوق بھری ہُوئی تھی۔ بار بار جی میں آتا تھا کہ ان سے کہہ دوں کہ خُدا کے لیے فیر کر کے میرے ناپاک وجود سے دُنیا کو پاک کر دو۔ کیونکہ میں اُس حالت کو بُعد اور اس بُعد کے وہم سے اپنے آپ کو

فرعون اور ہامان سے بھی بدتر سمجھتا تھا۔ حالانکہ اپنے مومن اور ان کے کافر ہونے کا یقین تھا اور چونکہ یہ ذوقیات ہیں اس لیے تقریب فہم کے لیے اس سے زیادہ شرح نہیں کرسکتا بس یوں سمجھتا تھا کہ جس بلا میں وہ لوگ مبتلا تھے۔ اس سے تو ایمان لانے کے بعد ان کا چھٹکارا ہوسکتا تھا۔ جس بلا میں مَیں مبتلا ہوں - اس سے سالہا سال بھی خلاصی ممکن نہیں بڑی مشکل یہ تھی کہ اگر ذکر کرنے بیٹھتا جو کہ قرب کی حالت تھی۔ تو ساتھ ساتھ وہ خطرہ منکرہ بھی عود کر آتا۔ اور اگر عود خطرہ سے بچنے کی غرض سے ذکر کو منقطع کرنا چاہتا جو کہ بُعد تھا۔ تو اس کا بھی دل کسی طرح گوارا نہ کرتا گویا یہ حالت تھی ؎

من شمعِ جانگدازم تو صُبحِ دِل کشائی
سوزم گرت نہ بینم میرم چو رُخ نمائی
نزدیک آنچنانم دور آنچناں کہ گفتم
نے تابِ وصل دارم نے طاقت جُدائی

غرض سخت کشمکش میں مبتلا تھا اور ایسی شدید حالت تھی کہ باوجود صحتِ بدنی کے موت کو حیات پر ہزارہا درجہ ترجیح دیتا تھا۔

اسباب خطرہ

حضرت تھانویؒ نے جنہیں حق تعالیٰ نے حکیم الامت بنا کر بھیجا تھا۔ اپنے مرضِ خطرہ منکرہ کے اسباب کی تشخیص بھی خود کرتے ہوئے فرمایا کہ "اس خطرۂ منکرہ کے اس درجہ مؤثر ہوجانے کے تین سبب تھے۔ اوّل تو پے درپے صدمات (جن کا ذکر اُوپر آچکا ہے) نے قلب کو پہلے سے گداز اور زخمی کر رکھا تھا۔ جس کی وجہ سے اس میں تاثر و انفعال کی کیفیت اور قبول خطرہ کی استعداد بدرجہ اتم پیدا ہوگئی تھی۔ پھر جب اس خطرہ منکرہ کا وقوع ہوا۔ تو قلب بوجہ غایت ضعف و اضمحلال نہ اس کی مدافعت کرسکا نہ مقاومت۔ لہٰذا وہ دلنشین ہو کر رہ گیا۔ دُوسرا سبب یہ ہُوا کہ مَیں نے بعد

ترک تعلق کا پورا ترکِ اشغالِ مباحہ میں بہت زیادہ مبالغہ کیا تھا۔ اور تعلقات سے اپنے قلب کو بالکل یکسو اور فارغ کر لیا تھا۔ حالانکہ بعد میں تجربہ سے یہ ثابت ہوا کہ اتنا مبالغہ مضر ہوتا ہے۔ کیونکہ ادھر تو قلب کو خالی کر لیا گیا اور اُدھر چونکہ عالمِ غیب کوئی مشاہدہ چیز نہیں۔ دُوسری شے اس میں اُسی قوت اور تمکین کے ساتھ بھری نہ جا سکی۔ لہٰذا اس خلوئے قلب کی حالت میں شیطان کو وساوس ڈالنے کا بسہولت موقع مل گیا۔ جیسا کہ حدیث شریف میں آیا ہے کہ جب حضرت آدم علیہ السلام کا پتلا بنا کر تیار کیا گیا تو اس کو ابلیس نے چاروں طرف سے گھوم پھر کر دیکھا اور جب اس کو اندر سے خالی پایا۔ تو اس سے خوش ہوا کہ اس کی فطرت ہی ایسی واقع ہوئی ہے کہ یہ اپنے قابو میں نہ ہوگا (یعنی جب یہ خالی ہے تو میں اس کے اندر آسانی سے حلول کر سکوں گا۔ چنانچہ مشہور بھی ہے۔ "خانہ خالی را دیو میگیرد") تیسرا سبب شدتِ تاثر کا یہ تھا کہ وہ خطرۂ منکرہ صورۃً کمالِ محبت کے منافی تھا۔ اس لیے بے انتہا شاق گذرا"۔

حالانکہ ایسے خطرہ پر جو صورۃً کمالِ محبت کے منافی نظر آتا تھا۔ اس درجہ غم واندوہ کا طاری ہونا بموجب ارشادِ نبویؐ "ذالك صریح الایمان" خود کمالِ محبت پر دال تھا۔ لیکن کمالِ محبت میں تو صورتِ بُعد بھی مضطرب کر دینے کے لیے کافی ہوتی ہے ؎

بر دل سالک ہزاراں غم بود　　گر زباغ دل خلالے کم بود

تدابیرِ انسداد

حسنِ اتفاق سے یہ ابتلا ابتداً تہجد کے وقت گنگوہ کے قیام میں ہی پیش آیا تھا۔ اس لیے صبح اُٹھتے ہی حضرت تھانویؒ مولانا گنگوہیؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور رات کا واقعہ بیان کیا۔ تو مولانا نے اس کے انسداد کی یہ تدبیر بتلائی کہ" اس کی طرف التفات نہ کیا جائے۔" چنانچہ حضرت واپس تھانہ بھون آگئے۔ چونکہ ابتدائی حملہ تھا اور قلب میں انفعال کی کیفیتِ انفعالیہ میں اور بھی ترقی ہوتی گئی۔ یہاں تک کہ اختلاجِ قلب کے دورے

پڑنے لگے اور چند ہی دنوں میں ایسے کمزور ہو گئے جیسے مدتوں کے مریض ہوں۔

انہی دنوں حکیم مولوی محمد صدیق گنگوہی اپنے مطب یعنی گڈھی پختہ سے تھانہ بھون آئے ہوئے تھے۔ ان سے بغرض معالجہ رجوع کیا اور اپنا قارورہ ملاحظہ کے لیے بھیجا۔ حکیم صاحب قارورہ کو دیکھتے ہی چونک پڑے اور حیرت سے کہا کہ "یہ شخص زندہ کس طرح ہے۔ کیونکہ قارورہ صاف ظاہر کر رہا ہے کہ حرارتِ عزیزیہ بالکل فنا ہو چکی ہے۔" قارورہ لے جانے والے مولوی محمد یونس مرحوم نے جو حضرت کے شاگرد اور حضرت سے ہی بیعت تھے۔ واپس آکر ازراہِ سادگی یہی الفاظ دہرا دئیے۔ جس سے قلب پر اور بھی اثر پڑا۔ جسے زائل کرنے کے لیے حضرت نے انھیں ڈانٹا کہ کہیں مریض سے بھی ایسی بات کہی جاتی ہے۔ جس سے وہ بہت نادم ہوئے۔ غلطی کا اقرار کر کے کہا کہ اب کیا ہو؟ فرمایا کہ اس قارورہ کو لے جاؤ اور تھوڑی دیر بعد لوٹ کر مجھ سے کہو کہ حکیم صاحب کے پاس پھر قارورہ لے گیا تھا۔ وہ کہتے ہیں کہ میری پہلی رائے غلط تھی۔ یہ تو اچھے خاصے ہیں۔ کوئی اندیشہ کی بات نہیں۔ اس پر مولوی صاحب نے طالب علمانہ اشکال پیش کر دیا۔ جب آپ خود ہی یہ بات سمجھا کر واپس بلا رہے ہیں تو اس سے کیا ہو گا۔ فرمایا تمہیں اس سے کیا۔ میں جیسے کہہ رہا ہوں تم ویسا کرو۔ کیونکہ الفاظ میں بھی اللہ تعالیٰ نے اثر رکھا ہے۔ چونکہ قلب کی حالت اس وقت بہت نازک تھی اور وہ ذرا ذرا سی بات سے اثر پذیر ہوتا تھا۔ اس لیے اس تدبیر سے اس وحشت میں کمی ہو گئی۔ جو پہلی خبر سے پیدا ہو گئی تھی۔ مگر حکیم صاحب کے علاج سے کوئی نفع نہ ہوا کیونکہ کوئی مرض حسی تو تھا نہیں۔

چونکہ آپ ماشاء اللہ امراض باطنی کے خود حکیم تھے اور اسباب مرض تشخیص کر چکے تھے۔ اس لیے اب اپنا علاج بھی خود ہی کرنا شروع کیا۔ غلو طبیعت کو غلو مشاغل مباح سے دور کرنے کے لیے بندوق مستعار لے کر باہر نکل جاتے اور بلا نشانہ فائر کرتے۔ جس

کی آواز سے طبیعت میں فرحت ہوتی ہے اور اس کے ساتھ ہی دوستوں سے ملنا جُلنا شروع کر دیا اور کبھی کبھی سفر میں نکلنے لگے۔ ان تدابیرِ خارجہ کے ساتھ ساتھ ان حالات سے حضرت مولانا گنگوہیؒ اور حضرت حاجی امداد اللہؒ کو آگاہ فرماتے رہتے اور ان سے درخواستِ دُعا کرتے رہتے۔ مولانا گنگوہیؒ تو دعا و توجہ کے باوجود بھی اسی پر مُصر رہے کہ "خطرات کی طرف التفات نہ کرو" جو بقول حضرت تھانویؒ ان کے امامِ فن ہونے کی دلیل تھی۔ اور ساتھ ہی تسلّی کے لیے خطوط بھی لکھتے رہے۔ جو "مکاتیب رشیدیہ" کے نام سے شائع ہو چکے ہیں۔ ایک مکتوب میں مولانا لکھتے ہیں :-

"آپ کا خط موصول ہو کر کاشف مافیہ ہوا۔ اگر یہ خوف و حزن امورِ آخرت سے ہے (جو فی الواقع امورِ آخرت سے ہی تھا) تو محمود ہے۔ بزرگوں کو اسی خوف سے بڑی بڑی شدت سے قبض واقع ہوا حتیٰ کہ بعض نے جان بھی دے دی۔ حضرت شیخ فرماتے ہیں ؎

جانِ صدیقاں ازیں حسرت بریخت

کآسماں بر فرقِ ایشاں خاک بیخت

پس ایسی حالت اور اس صورت میں تو جائے شکر ہے۔ نہ جائے غم امام غزالیؒ اسی غم میں بیت المقدس میں دس سال تک پریشان اور محزون رہے کہ اطباء ان کے علاج سے عاجز ہو گئے۔ آخر ایک یہودی طبیب نے ان کو دیکھا اور تشخیص کی کہ ان کو کوئی حسّی مرض نہیں ہے۔ بلکہ خوف آخرت ہے۔ اس کا کوئی علاج نہیں۔ پس مژدہ ہو کہ حق تعالیٰ نے آپ کو یہ دولت دی ہے۔ ایسے حزن پر ہزار فرحت قربان! اور اس حالت کی موت شہادتِ کبریٰ ہے اور اگر کوئی امر دیگر ہے۔ تو اس کا جواب بدون دریافت حقیقتِ حال میں نہیں لکھ سکتا۔ اور یہاں آنے کے باب میں جو آپ

استفسار فرماتے ہیں تو بقولے ؏

او خویشتن گم است کرا رہبری کند

مگر معہذا اگر آپ تشریف لا دیں گے تو خود ہی نفع کی اُمید رکھتا ہوں کہ صحبتِ صلحاء جس قدر میسّر آوے غنیمت ہے۔ فقط والسلام

مکتوبِ ثانی میں مولانا تحریر فرماتے ہیں کہ :-

" آپ کے خط سے کیفیت معلوم ہوئی۔ میں آپ کے لیے دُعاءِ خیر کرتا ہوں۔ وسوسۂ مذکورہ میں اندیشۂ سوءِ خاتمہ بھی منجملہ اوہام ہے۔ اس کو حتی الوسع دفع کرتے رہیں۔ اور اجر و تکفیر سیّیات بھی یقینی ہے۔ انشاء اللہ الخ " ۱۵ شعبان ۱۳۱۶ھ

اسی عرصہ میں حضرت حاجی صاحب کی طرف سے جو مکتوبات آتے رہے۔ ان میں وہ تحریر فرماتے رہے کہ

۱۔ الحمد للہ کہ آپ کے قلب کی حالت بہت اچھی ہے۔ یہ مقام خوف و رجا ہے۔ اسی کو ہیبت و انس کہتے ہیں کبھی ہیبت کبھی انس کا غالب ہو جاتا ہے۔ دونوں کو ایک سمجھنا چاہیئے۔ (مکتوب نمبر ۴۴ مؤرخہ یکم رجب ۱۳۱۶ھ)

۲۔ خط آپ کا دُوسرا ابھی پہنچا۔ حالت آپ کی بہت اچھی ہے۔ انشاء اللہ تعالیٰ کچھ ضرر نہ ہوگا۔ فقیر دُعا کرتا ہے۔ (مکتوب نمبر ۴۲ مورخہ یکم رجب ۱۳۱۶ھ)

۳۔ آپ کی حالت بہت اچھی ہے۔ پہلے بھی لکھ دیا گیا ہے۔ اس قسم کی گھاٹیاں طالب کو آیا کرتی ہیں۔ انشاء اللہ تعالیٰ سب سے پار ہو جائے گے۔ فقیر دعا کرتا ہے۔ انہ سمیعٌ قریب (مکتوب نمبر ۴۶ مورخہ ۸ شعبان ۱۳۱۶ھ)

۴۔ آپ کی حالت بہت اچھی ہے۔ اللہ تعالیٰ مبارک کرے۔ جو کچھ بقیہ قبض ہے وہ بھی انشاء اللہ رفع ہو جائے گا۔ اللہ تعالیٰ آپ کو مخلصین سے کرے۔
(مکتوب نمبر ۴۷ مورخہ ۲۲ شوال ۱۳۱۶ھ)

ان تدابیر سے بفضلہٖ تعالےٰ ایک سال سے جو حالتِ ہیبت طاری تھی۔ ہمیشہ کے لیے دُور ہو گئی

حقیقتِ ہیبت

جس طرح حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ابتداً نزولِ وحی سے خوف زدہ ہو گئے تھے تو ام المومنین حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا نے حضورؐ کی بہت تسلّی فرمائی تھی۔ اسی طرح اس غلبۂ ہیبت کے زمانہ میں جب پریشانی زیادہ بڑھتی تو حضرت اپنا غم غلط کرنے کے لیے اپنی غمگسار جاں نثار رفیقۂ حیات بڑی بیگم صاحبہ سے اپنے پردرد حالات بیان فرماتے۔ جو حضرت کی باتوں کا نہایت مناسب اور تسلّی بخش جواب دیتیں۔ حضرت فرمایا کرتے تھے کہ مجھے ان کے جوابات سے بہت تسلّی ہوتی تھی۔ محترمہ بیگم صاحبہ نے اس ابتلا کی ایک بہت اچھی مثال دی۔ فرمایا کہ " اس کی مثال بالکل ایسی ہے جیسے کسی کو کہیں جانا ہو اور راستہ باغ کے اندر سے ہو۔ لیکن اس کے برابر ہی جھاڑ جھنکار بھی ہوں اور وہ اتفاق سے جھاڑ جھنکار میں ہو کر چلنے لگا تو کانٹوں کی وجہ سے اس کا تمام بدن لہولہان ہو گیا اور نہایت پریشانی اٹھانی پڑی لیکن راستہ برابر قطع ہوتا رہا اور آگے چل کر پھر وہ اسی پر بہار راستہ پر پڑ گیا۔ ایسے شخص کو تکلیف تو بیشک سخت ہوئی۔ لیکن قطع مسافت میں کوئی حرج واقع نہیں ہوا اور اس تجربہ سے بڑا فائدہ یہ ہوا کہ وہ دوسروں کی بہت اچھی طرح سے رہبری کر سکے گا۔ اور اگر سالک اس قسم کی پریشانی میں مبتلا ہو جائے گا تو وہ اس کو بہت آسانی کے ساتھ اس سے نکال سکے گا۔ اس مثال سے یہ حقیقت بھی واضح ہو جاتی ہے کہ

"مبتلائے قبض و ہیبت کو تکلیف تو بے شک سخت ہوتی ہے۔ لیکن قطع طریق میں کوئی حرج واقع نہیں ہوتا"

خود حضرت نے مبتلائے ہیبت سالکین کے خطوط کے جوابات میں حقیقت ہیبت

سے یوں پردہ اٹھایا کہ :-

"یہ تغیرات طبعی و نفسانی ہیں نہ کہ روحانی و قلبی۔ سو ایسے تغیرات مضر تو کیا نافع ہی ہوتے ہیں۔ عجب کا علاج ان سے ہو جاتا ہے اور عبدیت کی حقیقت کا مشاہدہ ہونے لگتا ہے۔ فنا و تہیدستی رأی العین ہو جاتی ہے۔ فی الحقیقت یہ قبض کی قسم ہے۔ جس کی یہ حکمتیں ہیں"

• اکابر صحابہ پر یہ حالت گزری ہے۔ صحیح بخاری میں ستر صحابہؓ کی نسبت ہے۔ کلھم یخاف النفاق علی نفسہ۔ مخاطب (حضرت تھانوی) پر بھی یہ حالت گزری ہے جس سے ہزاروں منافع حاصل ہوتے ہیں۔ فعال عجب۔ مشاہدہ قدرت۔ معائنہ عجز خود وغیر ذالک"۔

"محققین نے اس کو بسط سے ارفع کہا ہے اس سے اخلاق رذیلہ کا معالجہ زیادہ ہوتا ہے"

"گو عین قبض کے وقت وہ منافع معلوم نہ ہوں۔ مگر بعد میں اکثر معلوم ہو جاتے ہیں۔ اور اگر معلوم نہ بھی ہوں۔ تب بھی حاصل تو ضرور ہوتے ہیں۔ اور حصول ہی مقصود ہے نہ کہ اس حصول کا علم"

(تربیت السالک باب پنجم)

شدتِ ہیبت

حضرت تھانویؒ پر جو حالتِ ہیبت طاری ہوئی۔ وہ تصور میں بھی نہیں لائی جا سکتی۔ گویا ؎

شبِ تاریک و بیمِ موج و گردابے چنیں حائل
کجا دانند حالِ ما سبکساران ساحلہا

والا معاملہ تھا۔ البتہ اس کی شدت کا اندازہ اس واقعہ سے لگایا جا سکتا ہے۔ کہ اس حالت

کے پورے پندرہ سال بعد ۱۸ محرم الحرام ۱۳۳۲ھ کو ایک سالک نے اپنی سخت ترین باطنی پریشانیوں کے متعلق حضرت کو ایک طویل خط لکھا جس کے جواب میں حضرت نے لکھا کہ :۔

جو مضایق و مصاعب و عقباب و بلیات آپ نے لکھی ہیں۔ یہ تو سو حصوں میں سے ایک حصہ بھی نہیں جو بعض کو پیش آتے ہیں۔ اس وقت مجھ کو بعض احوال یاد آ گئے اور سر سے پاؤں تک اس نے مجھ کو ہلا دیا۔ مشکل سے خود کو سنبھال کر لکھنے کو موقوف نہیں کیا۔ . . . الخ

(الابتلاء لاہل الاصطفاء)

اس سے صاف ظاہر ہے کہ جس کیفیت کے محض تصور نے اتنی طویل مدت گزر جانے کے بعد حضرت جیسے کوہِ استقلال کو سر سے پاؤں تک ہلا دیا۔ اس کے عین وقوع کے وقت حضرت پر کیا گزری ہو گی۔ یہ سب اعانت خداوندی اور توجہ بزرگانِ دین کا نتیجہ تھا کہ حضرت تھانوی اس شدت کو برداشت کر گئے۔ ورنہ اگر کوئی دوسرا ان کی جگہ ہوتا۔ تو ضرور بدحواسی میں اپنا نقصانِ جان و ایمان کر بیٹھتا۔

علتِ ہیبت

غلبۂ ہیبت کی یہ حالت بلاوجہ نہ تھی۔ چونکہ حضرت تھانویؒ کو مسندِ ارشاد پر بٹھانا مقصود تھا۔ اس لیے حق تعالیٰ نے آپ کو نشیب و فرازِ طریق کا ذاتی تجربہ کرانے اور اس میں ماہر کامل بنانے کی غرض سے آپ پر یہ حالتِ ہیبت طاری فرمائی تھی تاکہ مسندِ ارشاد پر بیٹھنے کے بعد ایسے سالکین کے معالجۂ روحانی میں آپ کو کسی قسم کی دقت پیش نہ آئے چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ حضرت تھانویؒ بطور تحدثِ نعمت فرمایا کرتے تھے کہ :۔

"مجھ کو چونکہ سخت سے سخت حالات پیش آ چکے ہیں۔ اس لیے احوالِ باطنی کا ایسا تجربہ ہو گیا ہے۔ کہ کسی سالک کی کتنی ہی اُلجھی ہوئی حالت ہو

اور وُہ کیسی ہی باطنی پریشانی میں مُبتلا ہو۔ بحمد اللہ مجھ کو اس کے معالجہ کے باب میں ذرا بھی تردد لاحق نہیں ہوتا۔ اور بفضلہٖ تعالیٰ ایسی ایسی تدبیریں ذہن میں آجاتی ہیں کہ ان کے استعمال سے وُہ نہایت سہولت اور سُرعت کے ساتھ اس حالت سے نکل جاتا ہے۔ بالخصوص وساوس و خطرات کی تشخیص ماہیت اور تجویز علاج میں تو اللہ تعالیٰ نے مجھ کو ایسی بصیرت عطا فرما دی ہے کہ آجکل کم لوگوں کو ہو گی ولا فخر۔"

اس ارشاد کے تائیدی واقعات "بتویب تربیت السالک" باب پنجم میں دیکھے جا سکتے ہیں۔

رشد و ہدایت

اہمیتِ دعوت و ارشاد

جس طرح کسی چیز کے موجد پر اس چیز کا نقص یا خامی واضح ہوتی ہے۔ جو دوسرے کو معلوم نہیں ہو سکتی۔ اسی طرح خالق پر بھی اپنی مخلوق کی خلقی کمزوریاں اور خامیاں روزِ روشن کی طرح عیاں ہیں۔ جن کا کوئی دُوسرا احاطہ نہیں کر سکتا۔

قرآن پاک کے استقصاء سے پتہ چلتا ہے کہ انسان اشرف المخلوقات ہونے کے باوجود بہ الفاظِ خالق بڑا تنگ دل۔ بے صبر۔ ناشکرا۔ جھگڑالو اور نادان واقع ہُوا ہے۔ اس کی ہدایت و رہنمائی کے لیے جو کتابِ ہدایت نازل ہُوئی۔ وُہ خود صاحبِ کتاب کے الفاظ میں نہایت آسان، عام فہم واضح مفصل اور اپنی تفسیر آپ ہے۔ مگر متذکرہ بالا انسانی کمزوریوں کے پیشِ نظر اس کتاب کو پڑھانے اور سمجھانے کی غرض سے حق تعالیٰ کی طرف سے ایک معلّم الکتاب بھی بھیجا گیا تاکہ یہ جھگڑالو انسان اپنی خواہش کے مطابق

اُس کی تشریح و تعبیر نہ کرنے لگے۔

نبی کریمؐ قرآن کے الفاظ میں رؤف و رحیم تھے اور فطرۃً منزہ عن الخطا اس کے ساتھ ہی وُہ رقیق القلب و وسیع الظرف متحمل مزاج و بردبار۔ صابر و شاکر اور دانا و بینا تھے۔ ان کی پشت پر مہر نبوت عیاں۔ رخِ انور پر نورِ نبوت درخشاں۔ اشارۂ انگشت پر قمر رقصاں۔ یہاں تک کہ مخالفین بھی ان کے امین و صادق ہونے میں متفق اللسان تھے سلیم الفطرت انسان بھی موجود تھے اس لیے حق تعالیٰ نے اپنے بندوں کی خلقی کمزوریوں کے پیشِ نظر ان جھگڑالو اور ناداں انسانوں کے سمجھانے کے لیے از راہِ ترحم اس شفیق و رحیم کو اس بات کی مزید تاکید بھی کر دی کہ آپ جب ان تک میرا پیغام پہنچائیں اور سمجھائیں تو ادع الیٰ سبیل ربّک بالحکمۃ والموعظۃ الحسنۃ وجادلھم بالتی ھی احسن سے کام لیں یعنی ان نادانوں کو اپنے ربّ کی طرف پر حکمت باتوں اور اچھی نصیحتوں کے ذریعہ بلائیں اور اچھے طریقہ سے ان کو سمجھائیں۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ رشد و ہدایت کا فریضہ کتنا اہم اور کتنا نازک ہے۔ اور اس کے لیے صاحب دعوتِ و ارشاد کو کن خصوصیات کا حامل ہونا چاہیئے۔

تربیتِ خاص

چونکہ حضرت تھانویؒ کو بھی حق تعالےٰ نے اس منصبِ جلیلہ پر فائز فرمانا تھا۔ اس لیے آپ کی تربیتِ خاص کے خصوصی اسباب پیدا کیے گئے۔ آپ کا ایک بزرگ کی دُعا اور برکتِ بشارت سے وجُود میں آنا۔ صالحین کی طرح بچپن گزارنا۔ غزالی و رازیٔ وقت اساتذہ کاملین سے تعلیم پانا۔ زمانہ طالب علمی میں وعظ و تبلیغ کی مشق فرمانا۔ اکابر صالحین کا غائبانہ آپ کو مرکز توجہ بنانا۔ بزرگانِ دین سے فیوض ظاہری و باطنی حاصل کرنا۔ شیخ العرب والعجم سے روحانی تربیت پانا۔ قبض و ہیبت کی دشوار گذار وادی سے بخیر و خوبی پار ہو جانا۔ تحریر و تقریر میں جذب و تاثیر کا پیدا ہونا۔ اور عند اللہ و عند الناس مقبول و محبوب

ہونا۔ اس بات کی بین دلیل تھی کہ قدرت نے آپ سے کوئی مہتم بالشان کام لینا ہے۔

ترغیباتِ امداد

تربیت کے اس اہتمامِ خصوصی کے ساتھ ساتھ آپ کے شیخ حضرت حاجی امداد اللہ قدس سرہٗ آپ کو اپنے مکتوبات میں دعوت وارشاد کے لیے تھانہ بھون تشریف لانے کی نہایت لطیف پیرایہ میں ترغیب و تلقین فرمارہے تھے کہ :۔

۱۔ "آپ لوگ یعنی علماء، ورثۃ الانبیاء ہیں۔ آپ لوگوں کو اللہ تعالیٰ نے اپنی مخلوق کی ہدایت کے لیے پیدا کر کے بڑے درجے عنایت کیے ہیں۔ بس اپنے مقصود کا خیال سب پر مقدم رکھنا چاہیئے۔ یعنی دین کو خوب مضبوط پکڑنا چاہیئے۔ دُنیا خود ہی اچھی صورت میں خدمت کو حاضر رہے گی۔

(مکتوب امدادیہ نمبر ۳)

۳۔ آپ ہمارے مدرسہ اور مسجد کو از سرِ نو آباد کریں۔ آپ سے خلائق کثیرہ کو فائدہ ظاہری و باطنی ہوگا۔" (مکتوب امدادیہ نمبر ۳۵)

۲۔ جب تک یہاں (کانپور) کا تعلق خدا تعالےٰ کو منظور ہے۔ رکھیئے۔ بعد ازاں محض توکل بخدا خدا کا نام لے کر تھانہ بھون میں بیٹھ جایئے اور کسی نوع کا کوئی تعلق ظاہری نہ کیجئے۔ (مکتوب امدادیہ نمبر ۳۵)

خواہشِ رشیدیہ

جب آپ کانپور سے تعلق قطع کر کے ۱۳۱۵ھ میں مستقل قیام تھانہ بھون کے ارادہ سے آگئے تو حضرت حاجی صاحب کے خلیفۂ خاص حضرت مولانا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ نے بمسرت دعا، یہ خواہش فرمائی کہ :۔

"بھائی میرا جی تو تب خوش ہوگا۔ کہ جب تمہارے پاس کچھ اللہ اللہ کرنے والے بھی جمع ہو جائیں گے۔ اور طالبین بکثرت رجوع کرنے لگیں گے۔"

مولانا نے نہ صرف دعا پر ہی اکتفا نہ کیا۔ بلکہ اپنے مریدین کو بھی اصلاح و تربیت کے لیے حضرت تھانویؒ کی خدمت میں بھیجنا شروع کر دیا اور اس طرح آپ کے شیخِ طریقت ہونے کا عملی اعتراف فرمایا :-

بشاراتِ منامیہ

ادھر اطلاعِ عام کے لیے صالحین کو عالمِ خواب میں بشارات دی جا رہی تھیں کہ :-

۱۔ حضرت تھانویؒ اپنے دَور کے اخص علماء وصلحا میں سے ہیں -

۲۔ ان کا مسلک عین مطابقِ سُنتِ نبویؐ ہے ۔

۳۔ اس دَورِ خرافات و بدعات کے لیے انھیں ہی مسندِ ارشاد پر فائز ہونا ہے ۔

جس کی تائید مندرجہ ذیل رویاء صادقہ سے ہوتی ہے جو صدق الرویاٗ اور "تبویب تربیّت السالک" باب ہفتم سے نقل کیے جاتے ہیں ۔

۱۔ " احقر نے حضور (حضرت تھانویؒ) کو خواب میں دیکھا کہ رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کچھ گفتگو فرما رہے ہیں اور بھی بہت سے علماء حاضر ہیں۔ لیکن سب کی طرف سے حضور ہی سوال فرماتے ہیں اور رسُول کریم صلی اللہ علیہ وسلم جواب ارشاد فرماتے ہیں اور سب سے اقرب رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ حضور ہی کو دیکھا "۔

۲۔ " احقر نے دیکھا کہ حضرت رسُول کریم صلی اللہ علیہ وسلم ایک راستہ سے چلتے ہیں اور ان کے پیچھے آنحضور (حضرت تھانویؒ) اور اُن کے بعد بندہ۔ غرضیکہ تینوں ایک ساتھ چلتے ہیں "۔

۳۔ کل شب میں نے ایک خواب دیکھا کہ حضور پُر نور سرور دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لا رہے ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم جس وقت تشریف لائے ۔ ہم سب کھڑے ہونے لگے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم سب کو بیٹھنے کے لیے ارشاد فرمایا

آپ اور جو تخت پر بیٹھے تھے ۔ یا تو اتر نے لگے اور یا صدر کی جگہ سے ہٹنے لگے ۔ حضور نے آپ کو فرمایا کہ آپ یہیں تشریف رکھیں اور حضور بھی ایک طرف تخت پر تشریف فرما ہوئے .... الخ

اِنعاماتِ الٰہیہ

ان خصوصی حالات میں آپ منصبِ ارشاد پر فائز ہوئے ۔ چونکہ اس منصب جلیلہ پر فائز ہونے کے بعد حکمت و سیاست سے کام لینے کی ضرورت تھی جیسا کہ حضرت شیخ اکبر محی الدین ابن عربی رحمتہ اللہ علیہ کا ارشاد ہے ۔

"شیخ کو انبیاء علیہم السلام کا دین ۔ المباء کی تدبیر اور بادشاہوں کی سیاست حاصل ہو تو اس وقت اس کو استاد کامل کہا جا سکتا ہے ۔"

اس لیے حق تعالیٰ نے حضرت تھانویؒ کو ان تینوں صفات کا بھی نمایاں طور پر جامع بنا دیا تھا تاکہ وہ بآسانی رشد و ہدایت کا فریضہ انجام دے سکیں اور یہ انہی انعاماتِ الٰہیہ کا نتیجہ تھا کہ :-

(ا)

انبیائی تعلیم

دربارِ اشرفیہ میں نہ تو روایتی صوفیوں کی طرح دعوے کیے جاتے تھے نہ مجذوبوں کے سے احکام جاری ہوتے تھے ۔ نہ کشف و کرامات کے چرچے سُننے میں آتے تھے ۔ نہ خوابوں اور کیفیتوں کے تذکرے ہوتے رہتے تھے نہ فرائض کی طرح ذکر و شغل کا اہتمام نظر آتا تھا ۔ بلکہ وہاں ہر وقت اور ہر حال میں کتاب و سُنت کی تعلیم دی جاتی تھی جو دراصل روحِ تصوّف اور جانِ طریقت ہے ۔ اسی لیے ایک مرتبہ حضرت تھانویؒ نے فرمایا تھا کہ :-

"یہاں تو ملّا پن ہے ۔ ہم نہیں جانتے کہ درویشی کیا چیز ہے طالبعلم ہیں ۔ صاحبِ علم بھی نہیں ۔ بس قرآن و حدیث پر عمل کرنا بتاتے ہیں ۔ پھر اس

میں جو کچھ کسی کو ملنا ہوتا ہے۔ مل جاتا ہے اور الحمد للہ ایسا ملتا ہے کہ مالا عینٌ رأت ولا اذنٌ سمعت ولاخطر علیٰ قلب بشر۔ مگر ظاہر میں کچھ نہیں۔ نہ ہو حق ہے نہ وجد و حال ہے اور نہ کشف و کرامت :

"میرے ہاں ضربیں لگوانے کا دستور نہیں کہ تھوڑی دیر محنت کر لی۔ پھر آزاد پھرتے رہے۔ میرے یہاں تو وہ آوے۔ جس کو رات دن اپنے نفس پر آرے چلانے ہوں۔ اور قدم قدم پر یہ فکر ہو کہ کون سا کام جائز ہے اور کون سا ناجائز۔"

یہاں تک کہ بعض صوفیاء کرام کی طرح آپ کے ہاں توجہ دینے کا بھی قطعاً کوئی التزام نہ تھا۔ بلکہ آپ نے ایک دفعہ اس کی بڑے زور سے تردید بھی فرمائی کہ :-

"مجھے تو اپنے ہی فکر سے فرصت نہیں۔ دوسروں کی طرف ہر وقت متوجہ رہنے کی مجھے کہاں توفیق! میں تو اس توجہ متعارف کو تکلف ہی سمجھتا ہوں۔ مجھے تو اپنی توجہ کو سب طرف سے ہٹا کر ایک خاص شخص کی جانب جو مخلوق ہے ہمہ تن متوجہ ہو جانے میں غیرت آتی ہے۔ کیونکہ یہ حق تو خاص اللہ تعالیٰ ہی کا ہے۔ کہ سب طرف سے توجہ ہٹا کر بس اسی ایک ذات واحد کی طرف ہمہ تن متوجہ رہا جائے۔ البتہ دلسوزی اور خیر خواہی کے ساتھ تعلیم کرنا اور دل سے یہ چاہنا کہ طالبین کو نفع پہنچے اور ان کی دینی حالت درست ہو جائے۔ یہ توجہ کا ماثور طریق ہے اور یہی حضرات انبیاء علیہم السلام کی سنت ہے اور یہ نفع اور برکت میں بھی توجہ متعارف سے کہیں بڑھ کر ہے۔"

بایں ہمہ اکثر لوگوں کا گمان بلکہ یقین تھا کہ جو لوگ حضرت سے طریقہ کے ساتھ اپنی اصلاح کے لیے رجوع کرتے ہیں۔ وہ سب کے سب انہی کے رنگ میں رنگے جاتے ہیں۔ دیکھتے دیکھتے ان کی زندگیوں میں انقلاب آجاتا ہے اور وہ اپنے قلوب میں بھی حاضرانہ بلکہ غائبانہ بلا کسی ظاہری سبب کے کیفیات خاصہ محسوس کرتے رہتے ہیں۔ یہ سب حضرت کی

نظر و توجہ کا ہی نتیجہ ہے چنانچہ اس طبقہ منخیال کے لوگوں کے شبہات کے ازالہ کے لیے آپ نے فرمایا کہ :۔

"یہ شبہ نہ کیا جائے کہ بغیر قصداً توجہ کیے ہُوئے اثر کیسے ہوتا ہے۔ بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بعض قلوب ہی کے اندر تعدیہ کی صفت رکھی ہے۔ جیسے کہ گو آفتاب کا یہ قصد نہیں ہوتا کہ اس کا نور دُوسروں کو پہنچے۔ لیکن پھر بھی اس کا نُور دُوسروں کو پہنچتا ہی رہتا ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اس کے اندر یہ صفت رکھ دی ہے کہ جو شے اس کے مقابل میں آجاتی ہے : وُہ منور ہو جاتی ہے"۔

یہ صرف کتاب وسُنت کے اتباع کامل اور انبیائی طریق پر تعلیم و تربیت کرنے کی برکت تھی کہ حضرت کے قصد وارادہ کے بغیر بھی لوگوں کو حضرت سے فیض پہنچتا رہتا تھا حضرت سے تعلق اصلاح قائم کرنے کے بعد وُہ اتباع شریعت کا اہتمام کرتے رہتے تھے اور انھیں ہر وقت جائز و ناجائز کی فکر دامن گیر رہتی تھی۔ جس سے لوگ فوراً سمجھ جاتے تھے کہ یہ حضرت تھانویؒ کے مرید ہیں۔

چنانچہ ایک دفعہ خواجہ عزیز الحسن مجذوبؒ کو حضرت مولانا حبیب الرحمٰنؒ مہتمم دارالعلوم دیوبند کے ہاں ٹھہرنے کا اتفاق ہُوا۔ وہاں ایک معمر جہاں دیدہ بزرگ امیر شاہ خاں بھی مقیم تھے۔ جو بڑے بڑے بزرگوں کی زیارت اور صحبت یافتہ تھے۔ ان سے مجذوب صاحب نے پُوچھا کہ یہ لالٹین جو آپ روشن کیے ہُوئے ہیں۔ مدرسہ کی تو نہیں۔ انھوں نے دریافت کیا کہ کیا تم مولانا اشرف علی کے مرید ہو؟ حضرت مجذوبؒ نے فرمایا جی ہاں! اس پر خان صاحب نے فرمایا کہ :۔

"مَیں نے ایسی باتوں کا خیال مولانا ہی کے مریدوں میں دیکھا ہے۔ اس لیے پہچان گیا تھا کہ تم مولانا کے مرید ہو"۔

اسی طرح فتح پور کے ایک صاحب نے جو حضرت تھانویؒ سے بیعت تھے صاحب اشرف السوانح سے اپنے ان پڑھ معمار کا ذکر کیا کہ جب سے وہ حضرت تھانوی سے بیعت ہوا ہے۔ اس کو یہ فکر لگی رہتی ہے کہ جس رفتار سے ٹھیکہ کا کام کیا جاتا ہے۔ اسی رفتار سے امانی کام بھی ہونا چاہیئے۔ یہ واقعہ بیان کر کے انھوں نے اعترافاً کہا کہ :۔

"حضرت مولانا کا یہ اثر ہم نے ضرور دیکھا ہے کہ جس کو حضرت سے تعلق ہو جاتا ہے اس کو شریعت پر عمل کرنے کا بہت اہتمام ہوتا ہے اور وہ ہر وقت جائز و ناجائز کا خیال رکھتا ہے"۔

یہ اسی اتباع و اتقاء کا نتیجہ تھا کہ حضرت کا قریب قریب ہر منتسب بفضلہٖ تعالیٰ مقتدا کی حیثیت رکھتا تھا۔ اور لوگ اس کے افعال سے تمسک کرتے تھے۔ جس کا حضرت تھانویؒ نے بہ مسرت ان الفاظ میں ذکر فرمایا تھا کہ :۔

"اللہ تعالیٰ کا فضل ہے کہ میرے یہاں حقیقتِ طریق سے کوئی ناواقف نہیں اور یہ میرے کھرے پن کی بدولت ہے۔ ورنہ میرے یہاں بھی غلط مبحث ہو جاتا۔ اب جتنے ہیں۔ ان پر بفضلہٖ تعالیٰ اطمینان تو ہے اور میرے نزدیک تو قریب قریب ہر شخص قابل اجازت ہے۔ میں سب کو اجازت دے دیتا لیکن مصالح دینیہ کا مقتضا یہ ہے کہ صاحبِ اجازت میں کسی نہ کسی قسم کی کچھ ظاہری وجاہت بھی ہو۔ دینی یا دنیوی۔ مثلاً اہلِ علم ہو یا کسی معزز طبقہ کا فرد ہو تاکہ اس کی طرف رجوع کرنے میں کسی کو عار نہ ہو اور نہ طریق کی بے وقعتی ہو"۔

(۲)

حکیمانہ تدابیر

مطبِ اشرفیہ میں بقول مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی :۔

"نسخے بڑے بڑے بدحال مریضوں کو بھی ملتے تھے۔ یہ نہ تھا کہ اس دربار میں صرف ابرار واتقیاء آئیں اور محض ذکر وشغل کی تعلیم لے کر چلے جائیں۔ یا فقط شب بیدار، تہجد گزار حاضر ہوں اور اوراد وتسبیحات میں اضافہ کر کرا کے واپس ہو جائیں۔ یہاں گنجائش اسی وسعت قلب۔ اسی خلق ولطف کے ساتھ اشقیاء واشرار کی بھی تھی۔" (حکیم الامت ص۵۸)

حکیم الامت کی نظر ہمیشہ مریض پر نہیں بلکہ مریض کی مرض پر رہتی تھی۔ وہ اپنے پرائے میں قطعاً کوئی امتیاز نہ فرماتے تھے بسلسلہ اصلاح اپنے مخلصوں۔ نیازمندوں اور خادموں کو ضرورت کے وقت دینی ضرر سے بچانے کے لیے بالکل اسی طرح روک ٹوکتے تھے۔ جس طرح دوسروں کو اور جہاں روکنے ٹوکنے کی ضرورت نہ سمجھتے وہاں بالکل محبت وشفقت سے پیش آتے اور نرم خوئی سے دلجوئی فرماتے۔ چنانچہ مولانا عبدالماجد دریابادی لکھتے ہیں کہ:

"تسکین قلب کا تو معلوم ہوتا تھا کہ ایک اتھاہ سمندر ہر وقت بہہ رہا ہے۔ بدتر سے بدتر اپنی حالت پیش کیجئے۔ اور جواب میں تسکین وتسلی ہی حاصل کیجئے مایوس کرنا تو گویا حضرت جانتے ہی نہ تھے۔" (حکیم الامت ص۱۳۰)

اسی طرح علاج میں مریض کی قوت برداشت اس کے مذاق اور دلچسپی کی بھی خاص رعایت فرماتے تھے۔ سب کے لیے ایک ہی نسخہ نہیں برتا جاتا تھا۔ بلکہ جونہی کوئی طالب آتا۔ تو آپ اپنے نور فراست سے مناسبت وعدم مناسبت کا حال معلوم کر کے اس کا ویسا ہی علاج شروع فرما دیتے۔ اگر دیکھتے کہ اسے آپ سے مناسبت نہیں ہو سکتی۔ تو آپ اس کا اور اپنا وقت ضائع کیے بغیر اسے فی الفور فرما دیتے کہ آپ علاج کسی دوسری جگہ سے کرائیں اور اگر کوئی رہنمائی کی درخواست کرتا۔ تو اسے اس کے مناسب حال کسی بزرگ کا پتہ بتا دیتے۔ اسے زنجیر ڈالنے کی کوشش نہ کرتے اور جس

سے مناسبت معلوم ہوتی اسے ٹھہرا لیتے ۔ اس سے موجودہ معمولات دریافت فرماتے اور ان میں ہی مناسب کمی بیشی فرما کر اوراد تجویز فرماتے۔ آپ اس کی وجہ یہ بتلاتے تھے کہ

"پُرانے معمولات سے چونکہ انس ہو جاتا ہے ۔ اس لیے ان کو چھوڑنے کو بھی دل گوارا نہیں کرتا ۔ اور ان سے دلچسپی بھی زیادہ ہو جاتی ہے ۔ اس لیے مَیں بلا ضرورت ان کو نہیں چھڑواتا ۔ نیز قدیم معمولات میں مداومت کی بدولت ایک خاص برکت بھی پَیدا ہو جاتی ہے ۔ چنانچہ ڈاکٹر عبدالرحیم صاحب مرحوم لکھنوی کو مَیں نے فقط تلاوتِ قرآن کی کثرت تجویز کی تو وہ شگفتہ ہو گئے ۔ اور کہنے لگے کہ یہ تو بالکل آپ نے میرے مذاق کی چیز بتلا دی ۔ مجھے تو تلاوت سے بہت ہی دلچسپی ہے ۔ اسی طرح ایک صاحب کے لیے مَیں نے کثرت نوافل تجویز کی تو انھوں نے بھی یہی کہا "

ایسے واقعات چونکہ روزمرہ پیش آتے رہتے تھے ۔ اس لیے حاضرین مجلس کو حضرت کے صاحب کشف ہونے کا بالکل یقین ہو گیا تھا ۔ جس کی حضرت بتاکید یوں نفی فرمایا کرتے تھے کہ :۔

"بات یہ ہے کہ جس سے اللہ تعالیٰ کو کوئی کام لینا ہوتا ہے اس کو اس کام کی سمجھ بھی عطا فرما دیتے ہیں ۔ اس میں میرا کوئی کمال نہیں ۔ چونکہ اللہ تعالیٰ نے یہ کام میرے سپرد فرما رکھا ہے ۔ اس لیے وہی میری دستگیری فرماتے ہیں ۔ ورنہ مَیں کیا چیز ہوں "

علاوہ ازیں حضرت کے ہاں اس بات کا بھی خاص خیال رکھا جاتا تھا کہ ذکر و شغل کی لذت میں پڑ کر کوئی تارک الدنیا نہ ہو جائے ۔ بلکہ پورے خلوص و تزکیہ قلب کے ساتھ امکان بھر حقوق اللہ ادا کرے ۔ فرائض و واجبات میں حتی الوسع غفلت نہ برتے ۔ اللہ کے بندوں سے میل ملاپ رکھے ۔ ماں باپ ۔ بہن بھائی ۔ بیوی بچوں ۔ استاد شاگرد ۔

ملازم آقا۔ دوست احباب اور ہمسائے کے حقوق پہچانے اور امکان بھر ادا کرے۔ بلا ضرورت دُنیا کے مخمصوں اور دُوسروں کے قضیوں میں نہ پڑے۔ بلاوجہ کسی کی دلآزاری۔ دل شکنی نہ کرے۔ اپنے احتساب و اصلاح کی فکر میں رہے اور موجودہ ذرائع معاش کو اس وقت تک ترک نہ کرے۔ جب تک اس سے بہتر ذریعہ معاش حاصل نہ ہو جائے۔ یہاں تک کہ آپ ایسی ملازمتوں کے اختیار کرنے کی بھی اجازت دے دیتے تھے۔ جن کا اختیار کرنا بظاہر محل نظر ہوتا۔ بشرطیکہ کسی نہ کسی مجتہد کے قول سے اس کے جواز کی گنجائش نکل سکتی۔ کیونکہ تنگیٔ معاش میں آپ شدید دینی ضرر محسوس فرماتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ آپ نے خواجہ عزیز الحسن مجذوب کو منشیات و مسکرات کے محکمہ آبکاری کی انسپکٹری قبول کرنے کی اجازت دے دی تھی۔ کیونکہ اس وقت اور کسی نوکری کی اُمید نہ تھی اور جونہی اس سے بہتر نوکری ڈپٹی کلکٹری کی صورت نکل آئی۔ تو آپ نے فوراً اسے قبول کرنے کا مشورہ دیا۔ حسن اتفاق ایسا کہ ڈپٹی کلکٹری میں انھیں قانون کے ہاتھوں مجبور ہو کر خلافِ شرع فیصلے کرنے پڑے۔ جس سے طبیعت پر بوجھ پڑنے لگا۔ اِدھر ذکر و شغل میں انہماک بڑھا۔ اِدھر ملازمت کی مستقلی کے لیے امتحان لازمی قرار دیا گیا۔ جس کی طرف بوجہ ذکر و شغل طبیعت راغب نہ ہوتی تھی۔ اس لیے انھوں نے امتحان نہ دینے کے سلسلہ میں حضرت کو خط لکھا آپ نے جواب دے دیا:۔

"ہمت نہ ہاریئے۔ گو طبعاً ناگوار ہو۔ لیکن دل کو بہ تکلف متوجہ کر کے امتحان کو پاس ہی کر لینے کی کوشش کیجئے اور پریشانی کو پاس نہ پھٹکنے دیجئے۔

مصرع:۔ حیف باشد دل دانا کہ مشوش باشد

امتحان کو ضرور پاس کر لینا چاہیئے۔ تاکہ اہلِ دُنیا کی نظر میں ذلت نہ ہو۔ اس مردارِ دنیا کو حاصل کر لینے کے بعد ہی چھوڑنا چاہیئے۔ تارک الدنیا ہونا چاہیئے۔ نہ کہ متروک الدنیا۔ [illegible] نہ کر سکے اور علیحدہ کر

دیئے گئے۔ تو آپ ڈپٹی کلکٹری کو کیا چھوڑیں گے۔ خود ڈپٹی کلکٹری ہی آپ کو چھوڑ دے گی۔ حالانکہ ہونا چاہیئے برعکس ۔"

چنانچہ خواجہ صاحب نے بہ ہمت امتحان پاس کر لیا اور اس کے بعد ڈپٹی کلکٹری چھوڑ دی۔ کیونکہ خلافِ شرع فیصلے کرنے آپ سے ممکن نہ تھے اور اس کے بعد انسپکٹر آف سکولز مقرر ہو گئے۔ غرضیکہ جس جرم میں سرسیّد مرحوم مطعون تھے وہ جرم یہاں بھی روا تھا۔ فرق صرف مصلحت وحکمت کا تھا۔ حضرتِ تھانویؒ بذیلِ دین ایسی ملازمتوں کے لیے آمادہ اور تیار کرتے رہتے تھے۔

یہ حضرت تھانوی کی حکیمانہ تدابیر کا ہی اثر تھا کہ لوگوں کو بے اختیار آپ کی طرف کشش ہونے لگتی۔ جہاں جاتے لوگ بہت بڑی تعداد میں آپ کے گرد جمع ہو جاتے۔ راستہ کے ہجوم و بے موقع مصافحوں سے تنگ آ کر آپ لوگوں کو ڈانٹ ڈپٹ بھی دیتے۔ لیکن پھر بھی لوگ آپ پر پروانوں کی طرح ٹوٹ پڑتے اور ایک جم غفیر ساتھ ہوتا۔

(۳)

شاہانہ سیاست

دینوی سلطنتوں کی طرح دینی ریاست بھی اصولِ سیاست پر ہی چلتی ہے بادشاہ کی طرح مصلح کی بھی ایک ذاتی زندگی ہوتی ہے اور ایک جماعتی اور اصولِ سیاست کے تحت دونوں کا ایک دوسرے کے ساتھ چولی دامن کا ساتھ ہوتا ہے۔ کیونکہ رعایا عموماً دینِ ملوک پر چلتی ہے۔ اس لیے اصولی طور پر بادشاہوں کو ایسے حالات پیدا کرنے لازمی ہوتے ہیں جن سے رعایا کے اخلاق وعادات پر اچھا اثر پڑے۔ مگر اس کے ساتھ ساتھ نظم ونسق بھی قائم رکھنا پڑتا ہے اور سعی صلاح وفلاح بھی جاری رہتی ہے۔ اس غرض کے لیے مختلف قسم کے اصول وضوابط پر عمل کرنا پڑتا ہے۔ کہیں نرمی سے کام نکل آتا ہے۔ اور کہیں سختی سے کام نکالنا پڑتا ہے۔ کیونکہ مختلف مزاج اور خیال کے

لوگوں سے واسطہ پڑتا ہے اور جن مصالح پر راعی کی نظر ہوتی ہے۔ رعایا کی نظر شاذ و نادر ہی ان تک پہنچتی ہے۔ اس لیے رعایا کو راعی کے انتظام میں کم ہی عمل دخل ہوتا ہے بعینہٖ یہی حالت دربارِ اشرفیہ میں تھی۔

حضرت تھانویؒ مصلح ہوتے ہُوئے بھی بشری اور خلقی کمزوریوں سے منزہ نہ تھے۔ دُوسروں کی اصلاح کے ساتھ ساتھ انھیں خود اپنی ذات کی اصلاح کی بھی فکر دامن گیر رہتی تھی۔ تاکہ ان سے کوئی ایسا فعل سرزد نہ ہو۔ جو عند اللہ و عند الرسولؐ ناپسند اور عند الناس مضر و مہلک ثابت ہو۔ اس لیے آپ نے اپنی اصلاح کے لیے بھی وہی طریقہ اختیار کر رکھا تھا جو دُوسروں کے لیے مفید سمجھتے تھے۔ جیسا کہ آپ کا ارشاد ہے کہ :-

"جب مَیں اپنے اندر کوئی امر قابلِ اصلاح محسوس کرتا ہُوں تو اس کے متعلق بھی وعظ کہہ دیتا ہوں۔ اس سے بہت فائدہ ہوتا ہے۔ کیونکہ بیان کے وقت جوش ہوتا ہے جس سے قلب پر اثر پڑتا ہے۔ نیز شرم بھی آتی ہے کہ جس بات کی نصیحت اوروں کو کر رہے ہیں۔ خود بھی تو اس پر کاربند ہونا چاہیئے۔" وعظ الغضب" اسی مصلحت سے ہی کہا گیا تھا۔"

اپنے اور دُوسروں کی اصلاح کے اس عمومی طریقِ کار کے علاوہ مخصوص حالات میں آپ کا طریق اس سے مختلف تھا اور وُہ بھی سُنت اللہ سے ناشی تھا۔ جس کی رو سے اکثر و بیشتر مشاہیر حکماء کو اس مرض سے موت دی گئی۔ جس کے وہ ماہر حکیم تھے۔ اس خصُوصی طریق کی وضاحت آپ کے اس بیان سے ہوتی ہے کہ :-

" اکثر میرا طریق اصلاح یہ ہے کہ جس شخص کو جس فن میں کمال کا دعویٰ ہوتا ہے۔ پہلے مَیں اس کو اُس فن میں مغلوب کر کے دکھلا دیتا ہُوں بشرطیکہ وُہ فن مقصود ہو۔ پھر تو مجھے حق حاصل ہو جاتا ہے کہ اصلاحی اُمور میں بھی اس

کو اپنا تابع بناؤں، پھر اس کو بھی ایسے شخص کے تابع بن جانے میں عار نہیں ہوتی۔ منازعت کا حق نہیں رہتا اور نہ تعلیم پر شبہ ہوتا ہے۔"

اس کے ساتھ ہی آپ کی طرف سے اس بات کی سخت تاکید تھی کہ ان کے طریقِ کار میں کوئی مخل یا مزاحم نہ ہو کہ یہ اصولِ سیاست کے خلاف ہے۔ اس لیے آپ فرماتے تھے کہ :۔

"امورِ تربیت میں میری رائے میں کسی کو مزاحمت نہیں کرنی چاہیئے۔ بس میں جس کے ساتھ جو معاملہ کروں۔ میرے سب احباب کو یہ سمجھ لینا چاہیئے کہ وہ شخص اس معاملہ کا ہی اہل ہے۔"

ایک دفعہ آپ الہ آباد میں پالکی گاڑی پر سوار ہوئے۔ اس وقت خواجہ عزیز الحسن مجذوب اور آپ کے محبوب ترین بھانجے مولانا سعیدؒ یعنی حضرت مولانا ظفر احمد صاحب عثمانی کے حقیقی بڑے بھائی آپ کے ساتھ تھے۔ مولانا سعید احمد سے آپ کو کس قدر محبت تھی۔ اس کا اندازہ آپ کے اس بیان سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے کہ

"مجھ کو ان کے ساتھ سب سے زیادہ محبت تھی، جس کو عشق کہہ سکتے ہیں۔"

مگر اتنی گہری محبت آپ کے طریقِ اصلاح میں حائل نہ ہو سکی۔ کیونکہ مولانا سعید احمد بوجہ قرابت داری آپ کے ساتھ ہی پالکی کے اندر بیٹھ گئے تھے اور خواجہ عزیز الحسن مجذوبؔ اندر جگہ نہ ہونے کے سبب بوجہ مرید ہونے کے ہانکنے والے کے برابر بیٹھ گئے۔ حضرت تھانویؒ چونکہ بات بات اور قدم قدم پر سبق دینے کے عادی تھے۔ اور وہ اپنے بھانجے کے مزاج سے بخوبی واقف تھے جو بقول حضرت تھانویؒ

"نہایت شاندار لباس پہنتے تھے اور دماغ اتنا بڑھا ہوا تھا کہ کہا کرتے تھے کہ اگر نوکری ہو تو کم از کم ہزار روپیہ ماہوار کی تو ہو۔"

اس لیے آپ نے خواجہ صاحب کو تو اندر بلا کر اپنے پاس بٹھا لیا۔ اور مولانا

کو باہر جاکر ان کی جگہ پر بیٹھنے کا امر فرمایا۔ ظاہر ہے کہ یہ تبدیلیٔ نشست آدابِ قرابت داری کے بالکل خلاف تھی مگر آپ کی نظر اس وقت قرابت و محبت پر نہ تھی۔ بلکہ اصلاحِ نفس پر تھی۔ جو اصل مقصود تھا۔ اس لیے آپ نے ازالۂ شبہ کے لیے اس وقت خواجہ صاحب سے فرمایا کہ

"اس میں دونوں کی مصلحت ہے۔ ان کی تو یہ مصلحت ہے کہ ان میں تواضع پیدا ہو اور آپ کی یہ مصلحت ہے کہ آپ میں ضرورت سے زیادہ تواضع پیدا ہو کر ترقیٔ معکوس نہ ہونے لگے یعنی آپ کو یہ عجیب نہ ہونے لگے کہ میں کس قدر متواضع ہوں۔"

یہ حضرت کی اس عجیب و غریب سیاست کا ہی نتیجہ تھا کہ مولانا سعید احمد کی تو بقول حضرت یہ حالت ہو گئی کہ

"بالکل مٹ کر فانی ہو گئے اور اپنے آپ کو چماروں اور بھنگیوں سے بھی زیادہ ذلیل و خوار سمجھنے لگے اور نہایت سادہ وضع میں رہنے لگے۔ یہاں تک کہ انتقال کے بعد جب ان کے کپڑے بغرض تقسیم نکالے گئے تو ان کی سادگی دیکھ کر سب کو حیرت و حسرت ہوتی تھی۔ بلکہ خود بھی ان کپڑوں کی حالت دیکھ دیکھ کر دل ہی دل میں رونا آتا تھا۔"

اور حضرت مجذوبؒ تو اپنے عشق و محبت کی وجہ سے خسروِ ثانی اور تعلیم و تربیت کے فیض سے خلیفۂ خاص بن گئے تھے۔ اس مجذوبی عشق کی کیفیت خود مجذوبؒ صاحب کی زبانی ہی لکھت دے گی وہ لکھتے ہیں کہ

"مشرف بہ بیعت ہو جانے کی برکت سے احقر کے اندر بھی بفضلہٖ تعالیٰ بہت زیادہ فکر جائز و ناجائز پیدا ہو گئی تھی جس کے بعض واقعات اوپر ذکر کیے گئے ہیں اور حضرت والا کے ساتھ عشق و محبت کا تو وہ عالم تھا کہ اس کو سن کر ایک ناآشنائے محبت اور ناواقفِ طریق دیوانگی سے تعبیر کرے گا۔ اور

ایک بے ذوق اور روکھا پھیکا شخص مضحکہ اڑائے گا۔ لیکن میں بفحوائے ؎

گرچہ بدنامیست نزدِ عاقلاں
مانمی خواہیم ننگ و نام را

ان دونوں قسم کے لوگوں کی کچھ پروا نہ کر کے اپنے اُن محبوب حالات کو بھی جو حضرت والا کی فرطِ محبت میں مجھ پر طاری ہوئے تھے۔ اہلِ محبت اور اہلِ ذوق کی ضیافت طبع کے لیے ضرور عرض کروں گا۔ اور کوئی ناآشنائے محبت ایسی محبت کو دیوانگی سے تعبیر کرے گا تو میں اس سے یہ کہوں گا ع

اوست دیوانہ کہ دیوانہ نشد

اگر کوئی بے ذوق ایسی محبت پر مضحکہ اڑائے گا تو میں اس کو ترکی بہ ترکی یہ جواب دوں گا ع

چہ داند بوزنہ لذتِ ادراک

اس مختصر مگر ضروری تمہید کے بعد میں اپنے مذکورہ بالا محبوب حالاتِ محبت میں سے بھی بطور نمونہ حالات کو بلحاظ کیفیت قدیمہ یہ اشعار پڑھتا ہوا بیان کرتا ہوں کہ ؎

ما اگر قلاش و گر دیوانہ ایم
مستِ آں ساقی و آں پیمانہ ایم
گفتگوئے عاشقاں در کارِ رب
جوششِ عشق است نہ ترکِ ادب

ایک بار عشق و محبت کے جوش میں حضرت والا سے بہت جھجکتے اور شرماتے ہوئے دبی زبان سے عرض کیا کہ حضرت ایک بہت ہی بیہودہ خیال دل میں بار بار آتا ہے۔ جس کو ظاہر کرتے ہوئے بھی نہایت شرم دامن گیر ہوتی ہے اور جرات نہیں پڑتی حضرت والا اس وقت نماز کے لیے اپنی سہ دری سے اٹھ

کر مسجد کے اندر تشریف لے جا رہے تھے۔ فرمایا کہیے کہیے۔ احقر نے نہایت شرم سے سر جھکائے ہوئے عرض کیا کہ میرے دل میں بار بار یہ خیال آتا ہے کہ کاش میں عورت ہوتا حضور کے نکاح میں اس اظہار محبت پر حضرت والا غایت درجہ مسرور ہو کر بے اختیار ہنسنے لگے اور یہ فرماتے ہوئے مسجد کے اندر تشریف لے گئے کہ یہ آپ کی محبت ہے ثواب ملے گا۔ ثواب ملے گا اِنشاء اللہ۔ حضرت والا اب تک اس واقعہ محبت کو بھولے نہیں۔ اپنی مجلس شریف میں احقر کے اس محبت آمیز قول کو بلطف نقل فرما کر مزاحاً فرمایا کرتے تھے کہ غنیمت ہے اس کے برعکس کی خواہش نہیں کی۔

احقر کو اس زمانہ میں حضرت والا کی محبت کا اس قدر جوش تھا کہ بس یہ جی چاہتا تھا کہ بغل میں حضرت والا کی کتابیں ہوں اور کس وناکس۔ اہل وناہل بلکہ در و دیوار، شجر و حجر۔ کفار و بہائم سب سے دیوانہ وار حضرت کا تذکرہ کرتا پھروں اور سب کو حضرت کی کتابیں سناتا پھروں۔

یہ عشق و محبت اور تعلیم و تربیت کا جوش و خروش اسی سیاستِ صالحہ کا نتیجہ تھا جس کا روزانہ دربارِ اشرفیہ میں مشاہدہ ہوتا رہتا تھا۔ دراصل حضرت مجذوبؒ نے موخر الذکر واقعہ بیان کر کے تو حضرت کے سینکڑوں مجازین و مسترشدین اور ہزاروں منتسبین کی ترجمانی کا حق ادا کر دیا ہے۔ حضرت مولانا سیّد سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ جیسے فاضلِ اجل اور مورخِ اسلام کی بھی بالکل یہی کیفیت تھی۔ گویا حضرت سیاست سے لوگوں کو اپنا گرویدہ نہ بناتے تھے۔ بلکہ سیاست کی محبت لوگوں کو حضرت کی گرویدگی پر مجبور کر دیتی تھی۔

غرضیکہ حضرت ہر شخص کے ساتھ اس کے حسبِ حال اخلاص و محبت سے سیاست برتتے تھے جہاں سختی کی ضرورت محسوس کرتے تھے۔ سختی فرماتے تھے اور جہاں نرمی کی ضرورت سمجھتے تھے۔ وہاں نرمی فرماتے تھے۔ بلا ضرورت شدت کے اور بلا مصلحت نرمی برتنے کے قطعاً عادی نہ تھے۔ چنانچہ ایک مرتبہ ایک لڑکے کو اس کے باپ وغیرہ حضرت کی خدمت میں

لائے کہ اس کا ایک بازاری عورت سے تعلق ہو گیا ہے۔ ساری جائداد تباہ کیے جا رہا ہے۔ اسے سمجھائیے۔ حضرت نے اپنے نورِ بصیرت سے اس کے تمام کوائف کا فی الفور جائزہ لے لیا۔ اسے نہ مارا نہ ڈانٹا، بلکہ نہایت محبت و پیار سے اسے رشتہ داروں سے الگ کر کے مسجد کے اندر تنہائی میں لے گئے اور اس کے ہمدرد ہمراز بن کر فرمانے لگے۔ کہ "میاں ان لوگوں کو عشق کی کیا خبر۔ یہ کیا جانیں کہ کسی کے دل کو کیا لگی ہوئی ہے۔ تم مجھے صرف اتنا بتا دو کہ وہ کون سی مجبوری ہے جس کی وجہ سے نہ تو تم کو اپنی عزت و آبرو کا خیال ہے۔ نہ اپنی جائداد کی تباہی کی پروا ہے۔" یہ باتیں ابھی ہو ہی رہی تھیں کہ اس کے اقربا وہاں آ کر سننے لگے کہ تخلیہ میں کیا بات ہو رہی ہے۔ آپ نے ان کو ڈانٹا کہ یہ کیا واہیات حرکت ہے تم اپنا کام کرو۔ اب میں جانوں یا یہ جانیں۔ تمھیں بیچ میں دخل دینے سے کیا مطلب؟" اس پر وہ اپنا سا منہ لے کر باہر چلے گئے اور اس لڑکے کو حضرت کی ہمدردی و خیر خواہی کا یقین ہو گیا۔ جب اس کے اقربا باہر چلے گئے۔ تو حضرت نے پھر اپنا سوال شفقت آمیز لہجہ میں دہرایا تو اس نے آپ کی ہمدردی سے متاثر ہو کر صاف صاف کہہ دیا کہ پہلے تو مجھے واقعی اس سے محبت تھی۔ لیکن اب تو محض نباہنے کی خاطر نباہ رہا ہوں۔ کیوں کہ ایک بار پیران کلیر شریف میں اس نے مزار شریف پر مجھ سے عہد لیا تھا کہ میں ہمیشہ اس سے تعلق رکھوں گا اور اس کو نہ چھوڑوں گا اور خانقاہ کے مجاور نے ہم کو قسم کھلائی اب مجھے ڈر ہے کہ اگر میں نے اس سے تعلق توڑ لیا تو میرے اوپر کوئی وبال نہ آ جائے۔ کیونکہ ایک بزرگ کے مزار پر قسم کھائی ہے۔

یہ حقیقت سننے کے بعد حضرت نے اس سے سوال کیا کہ تم مجھے اپنا خیر خواہ بھی سمجھتے ہو یا نہیں؟ اس نے کہا بیشک۔ آپ نے دوسرا سوال کیا کہ تم مجھے سچا بھی سمجھتے ہو یا نہیں؟ اس نے اس کا بھی اقرار کیا اس پر حضرت نے فرمایا کہ:

"میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ اگر تم اس عہد کو نہ توڑو گے۔ تب تو وبال آئے گا اور اگر توڑ دو گے تو اس کی وجہ سے ہرگز کسی قسم کا وبال نہ آئے گا۔ ایسے عہد

کا توڑنا ہی واجب ہے البتہ چونکہ عہد کر لینے سے قسم ہو گئی ہے۔ اس لیے قسم کے توڑنے کا کفارہ دینا پڑے گا اور وہ کوئی ایسی بات نہیں آسانی سے دیا جا سکتا ہے۔"

اس پر وہ کہنے لگا کہ بس اَب میری تسلی ہو گئی ہے اَب میں اس کو چھوڑ ہی دوں گا آپ مجھے صرف ایک بار اس کے پاس جانے کی اجازت دے دیں کہ میں اس کو اطلاع کر آؤں کہ اب مجھ کو تجھ سے کوئی تعلق نہیں یہ اجازت اس لیے چاہتا ہوں کہ اس کو میرا انتظار نہ رہے کیونکہ اس کو انتظار میں رکھنا ایک قسم کی بے مروّتی ہے نہ معلوم بیچاری کب تک میرا انتظار کرتی رہے اس کی حضرت نے اسے بمصلحت اجازت اس شرط پر دے دی کہ ہوا اطلاع کے اور کوئی گڑبڑ نہ ہو۔ جب اس کے اقربا کو اس اجازت کا پتہ لگا تو وہ کہنے لگے کہ حضرت یہ تو اس کا محض بہانہ ہے۔ آپ سے بھی کس چالاکی سے ملنے کی اجازت لے لی۔ یہ آنا جانا چھوڑے گا حضرت نے انھیں ایک اور ڈانٹ پلائی کہ تمھیں کیا خبر۔ مجھے ان پر اطمینان ہے۔ چنانچہ وہ وہاں سے چلے گئے اور کچھ دنوں کے بعد اس کے والدین نے خانقاہ میں آکر شیرینی تقسیم کی کہ واقعی ان کے لڑکے کا اس عورت سے تعلق چھوٹ گیا ہے۔

اب اس نرمی کے معاملہ میں سختی کا معاملہ دیکھئے کہ تھانہ بھون کے قریب کا ایک پابند صوم وصلوٰۃ ایک برہمنی بیوہ پر مفتون ہو گیا اور دودھ لینے کے بہانے سے روزانہ وہاں جا کر نظر بازی کرنے لگا۔ اسے اس بلا میں گرفتار دیکھ کر اس کے ایک دوست نے اسے حضرت تھانویؒ کے پاس جانے کا مشورہ دیا۔ چنانچہ وہ وہاں حاضر ہوا اور ایک پرچہ لکھ کر حضرت کے پیش کیا کہ :-

"مجھے اس سے اس قدر محبت ہو گئی ہے کہ اگر وہ مجھے اپنا پیشاب بھی پلائے تو بلا کراہت پی لوں۔"

حضرت نے اسے نرمی سے فرمایا کہ وہاں نہ جایا کرو۔ اس نے کہا کہ میں تو قصداً جاتا ہوں۔ اس پر حضرت کو غصہ آیا اور بے تحاشا ایک تھپڑ رسید کیا اور بڑے زور سے ڈانٹ کر فرمایا کہ :-

"نالائق جب تو قصداً بدپرہیزی کرتا ہے تو مجھ سے علاج پُوچھنے کیوں آیا ہے۔ چولھے میں جا۔ اپنے ہاتھوں کلہاڑی مارنے کا مَیں کیا علاج کروں۔"

بس اس تھپڑ نے اس کے نفس پر تازیانہ کا کام کیا۔ اس کے دماغ سے خناس نکل گیا اور اس نے ہمیشہ کے لیے وہاں جانا بند کر دیا۔

غرضیکہ اس طرح حضرت ہر ایک کی طبیعت اور مزاج کے موافق نرمی گرمی سے اس کی باطنی امراض کا علاج فرماتے رہتے تھے اور ایسا کرنا آپ کا اختیاری معاملہ نہ تھا۔ بلکہ قطعاً غیر اختیاری معاملہ تھا۔ دستِ قدرت ہی اس وقت مزاج کو نرم گرم کر دیتا تھا چنانچہ اس غیبی امداد کا ذِکر کرتے ہُوئے آپ نے ایک دفعہ فرمایا کہ :۔

"سختی کا طرز میری طبیعت کے بالکل خلاف ہے اور مجھے بعد کو بڑی کلفت و ندامت بھی ہوتی ہے اور رہ رہ کر سوچا کرتا ہُوں کہ بجائے اس طرح کہنے کے اس طرح بھی کہہ سکتا تھا۔ بجائے یُوں سمجھانے کے یُوں بھی سمجھا سکتا تھا۔ بجائے اس تجویز کے یہ تجویز بھی کر سکتا تھا۔ لیکن عین وقت پر مصلحتِ اصلاح کا ایسا غلبہ ہوتا کہ اور کوئی مصلحت پیشِ نظر رہتی ہی نہیں اور یہ جبھی تک ہے۔ جب تک مَیں نے اپنے ذمّہ اصلاح کی خدمت سمجھ رکھی ہے اور اگر کبھی اس سے قطع کر لی تو پھر مَیں انشاءاللہ تعالےٰ خوش اخلاق بھی بن کر دکھلاؤں گا۔ میرا اصلی مذاق تو یہی ہے کہ کسی سے کچھ تعرض ہی نہ کروں اور بقول احمد جامؒ اپنے آپ کو سب سے یکسو رکھوں

احمد عاشقی بہ مشیخت ترا چہ کار ؎

دیوانہ باش سلسلہ شد شد نہ شد نہ شد

یہ وہ حالات تھے جن کے تحت آپ مسندِ ارشاد پر بیٹھے اور تا زیست ہمہ تن تزکیہ و تصفیہ خلق اور رشد و ہدایت کے کام میں مشغول رہے جس کی تفصیل کے لیے ایک الگ دفتر کی ضرورت ہے ؏

بہارِ زندگی

کچھ ہوش ہے تو چشمِ حقیقت نگر سے دیکھ
محمود! ذرّے ذرّے میں حسنِ ایاز ہے

(حفیظ جالندھری)

شمائل

حلیہ

نورانی صورت ۔ گندمی رنگ ۔ شاہانہ چہرہ ۔ گول اور بھرا ہوا ۔ سر بڑا مگر موزوں ۔ پیشانی متوسط ۔ آنکھیں نہایت شرمیلی نیچی اور اندر سرخ ڈورے ۔ ابرو گنجان مگر خمیدہ ۔ دہن متوسط ۔ دندان پیوستہ ۔ لب رسیلے ۔ بینی موزوں ۔ سینہ کشادہ ۔ قد درمیانہ ۔ ہاتھ قوی اور پُر گوشت ۔ شانے اور بازو بھرے ہوئے ۔ ہڈیوں کے جوڑ بڑے بڑے اور اُبھرے ہوئے ۔ گردن نہ بہت پتلی نہ بہت موٹی نہ بہت اونچی ۔ ہاتھوں کی انگلیاں نہ بہت لمبی نہ بہت موٹی نہ پتلی ۔ ہتھیلیاں نہایت نرم ۔ پاؤں کی ایڑیاں بھاری ۔ ڈاڑھی بھری ہوئی اور گنجان ۔

بال

سر کے بال نہ بالکل سیدھے نہ بہت گھنگر والے ۔ ان کی وضع مختلف اوقات میں مختلف رہی ۔ جوانی میں پٹھے تھے ۔ اس وقت مانگ اور کنگھی وغیرہ کی عادت تھی ۔ ان کو دھونے وغیرہ کی پابندی سے پٹھے کٹوا دیئے ۔ پھر صرف قینچی سے بال کٹوانے کی عادت آخر تک رہی ۔ ڈاڑھی کے بال کچھ سیاہ اور کچھ سفید ۔ سینہ پر بال زیادہ ۔

چال

چال نہ بہت تیز نہ ہی بہت آہستہ اور جب کوئی ہمراہی ہوتا ۔ تو اس کی رعایت

چال میں ضرور فرماتے۔ کیوں تمام افعال میں اپنے مقابلہ میں دوسرے کی آسائش کو ترجیح دیتے تھے۔ قدم نہ بڑے بڑے رکھتے تھے نہ متضاد نہ چھوٹے چھوٹے۔ بناوٹ سے حضرت کی طبیعت کو مس ہی نہ تھا اور ترک لایعنی اس درجہ طبیعت میں داخل تھی کہ اگر غور سے دیکھا جاتا تو چال ڈھال۔ جملہ حرکات و سکنات اور تمام اقوال و افعال میں کوئی جزو بھی ایسا نہ تھا جو وجہ اور غائز وجہ سے خالی ہو۔ اور جس میں شرعی اور عقلی دونوں قسم کی حکمت بلکہ متعدد حکمتیں جمع نہ ہوں یعنی حکیم الامت کا لقب حضرت کے لیے بالکل اسم با مسمیٰ تھا ۔

اے قبائے رہنمائے راست بر بالائے تو
علم و حکمت را شرف از گوہر والائے تو

آواز

آواز نہ اتنی پست تھی اور نہ اتنی بلند کہ ناگواری پیدا ہو جائے۔ بلکہ نہایت شیریں اور مردانی تھی۔ خشوع اور جذبۂ محبت آواز سے ہی پیدا تھا۔ چلا کر بات کرنے کی قطعاً عادت نہ تھی بقدر ضرورت جہر کے ساتھ کلام فرماتے اور وعظ میں تمام مجمع کو آواز پہنچتی تھی۔

مزاج

مزاج دموی مائل بحرارت تھا۔ آنکھوں میں سرخ ڈورے اعضا کی خوشنمائی۔ جسم کا دہرا ہونا۔ افعال کا اعتدال اس کے دلائل ہیں۔ مزاج میں حرارت کچھ تو طبعی زیادہ تھی۔ جیسا کہ دموی مزاج کا مقتضا ہے اور کچھ اس وجہ سے کہ عنفوان شباب میں کسی طبیب نے سنکھیا کا دھواں پلایا تھا اس وجہ سے مبردات کا استعمال مفید اور مرغوب تھا پھر ذکر الٰہی اور جوشِ محبتِ خداوندی نے حرارت میں اور اضافہ کر دیا۔ لیکن یہ حرارت چونکہ حرارت غریبہ نہیں ہوتی۔ بلکہ حرارت غریزی کی بھی روح ہوتی ہے۔ اس واسطے

بجائے پیوست بڑھانے کے لطافت مزاج وقوت، صحتِ ادراک، سلامتِ فہم، نورانیتِ حواس اور اعتدال و افعال کا باعث ہو گئی۔

قوت

ورنہ جس قدر کام حضرت کے دماغ سے لیا گیا تھا۔ قوی سے قوی خلقت کا انسان بھی کرتا تو دماغ کبھی کا ختم ہو جاتا اور اختلال حواس بلکہ جنون کی نوبت آجاتی۔ ماہرین اس امر پر متفق تھے کہ ایسے قوی الجثہ، صحیح الفہم اور سلیم الحواس آدمی کم ہوتے ہیں۔

گفتگو

نہ تیز۔ نہ ٹھہر ٹھہر کر بلکہ بہت صاف کرتے تھے۔ جس میں تسلسل ہوتا تھا۔ گنجلک مطلق نہ ہوتی تھی۔ اگر خود ضرورت سمجھتے یا کوئی سوال کرتا۔ تو پھر بات دہرا دیتے تھے۔ ورنہ گفتگو اتنی واضح اور صاف فرماتے تھے کہ دہرانے کی ضرورت ہی نہ پڑتی تھی۔ اس لیے دہرانے کی عادت نہ تھی مجالس میں بشاش اور گویا رہتے تھے۔ جیسے دریائے معارف وحقائق جوش و خروش سے بہہ رہا ہو۔ جس کی وجہ سے اتنے کثیر ملفوظات اور مواعظ جمع ہو گئے۔ جن سے لاکھوں انسان فیض یاب ہوئے اور ہو رہے ہیں۔

تفکّر

عام مجالس میں کبھی متفکر نظر نہیں آتے تھے۔ البتہ حسب حالات باطنی خلوت میں کبھی کبھی متفکر رہتے تھے۔ ویسے اکثر مسرور ہی دکھائی دیتے تھے۔

اشارہ

اشارہ کرنے کے قطعاً عادی نہ تھے۔ جو کچھ بھی کہنا ہوتا۔ زبان سے صاف فرماتے۔

تبسّم

مجالس میں چہرہ پر مسکراہٹ کھیلتی رہتی تھی۔ ہنسی کی بات پر ہنستے بھی ہنساتے بھی تھے۔ مگر مطابق سنت قہقہہ مار کر کبھی نہ ہنستے تھے۔

ہیئت

اعضا کے تناسب۔ چہرہ کی نورانیت اور آنکھوں کی سرخی نے جسمانی خوبی کے علاوہ ایسا رُعب پیدا کر دیا تھا کہ جلدی کسی کو بات کرنے کی ہمت نہ پڑتی تھی۔ مگر تہذیب و تواضع اور شرافت و بے تکلفی اتنی بڑھی ہوئی تھی کہ جو لوگ ہیبت کے مارے بات کرتے ڈرتے تھے وہ بھی بات کرنے کے بعد دل و جان سے نثار ہونے لگتے تھے۔ گویا مَنْ لَمْ یَرَہٗ ھَابَہٗ وَ اِذَا رَاٰہُ اَحَبَّہٗ کے پورے مظہر تھے۔ مجموعی حالت جسم کی خوش قطع واقع ہوئی تھی کہ جو لباس پہنتے وہی موزوں ہو جاتا۔ جس وضع حالت میں ہوتے زیبائی یکساں جلوہ گر ہوتی۔ جس مجمع میں جاتے نظروں کے کیمرے فوراً حضرت کی طرف رُخ کر لیتے اور سِیْمَاھُمْ فِیْ وُجُوْھِھِمْ مِنْ اَثَرِ السُّجُوْدِ کا نظارہ ہونے لگتا۔ اقوال۔ افعال اور معمولات سے اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُکِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ کا ظہور ہونے لگتا۔

غذا

ماش کی دال اور گوشت مرغوب غذا تھی۔ اکثر ایک وقت میں ایک کھانا کھاتے اور زنانخانہ میں کھاتے اور اگر مہمان کے ساتھ کھانا ہوتا۔ تو بھی مکان کے اندر کسی حصہ کا پردہ گرا کر اور اسے اندر بلا کر کھانا کھاتے۔ رات کو آدھ سیر دودھ اکثر نوش فرمایا کرتے۔ بلا اشتہائے صادق کھانا نہ کھاتے تھے۔ مجمع کے ساتھ خواہ ایک آدمی ہو۔ کھانے کی مقدار کا اندازہ نہیں رہتا تھا اور تنہا بے فکری سے مگر اندازہ سے زیادہ نہیں کھاتے تھے۔ مطابق سنت مختلف کھانوں سے قطعاً رغبت نہ تھی۔ جو چیز مل جاتی۔ وہی کھا لیتے اور طبیعت خوش ہو جاتی۔ ناشتہ کرنے کی قطعاً عادت نہ تھی۔

لباس

عام طور پر کرتہ صرف گھٹنوں تک لمبا۔ پاجامہ شرعی۔ ٹوپی چوگوشہ۔ جوتہ سلیم شاہی کرتے کے نیچے میل خوری بنڈی سردی میں۔ چھ کلی کی اچکن پہننے کا عام معمول تھا۔ جو

اس طرف کے شرفا اکثر پہنا کرتے ہیں اور وہ بھی صرف سردی سے بچنے کے لیے۔ ورنہ صرف کرتہ۔ پاجامہ پہنتے۔ سردی میں عمامہ باندھتے۔ مگر گرمی میں بوجہ حرارت مزاج عمامہ کا متحمل نہ ہوتا تھا۔ اس لیے عام طور پر چوگوشیہ ٹوپی۔ کرتہ اور پاجامہ میں ہی رہتے۔ خواہ کیسے ہی بڑے سے بڑے مجمع میں بھی جانا ہوتا۔ معمولِ پوشاک نہ بدلتے۔ سردی میں موزے بھی پہنتے تھے۔

شلوار۔ قمیض۔ کوٹ یا چوغہ کبھی نہیں پہنا۔ بلکہ اپنے اسلاف کی طرح ہمیشہ سادہ لباس میں رہتے تھے۔ نہ اچکنوں کے عادی اور نہ چوغوں کے دلدادہ تھے۔ جیسے اکثر علماء کا معمول ہے اور کوٹ۔ قمیض۔ شلوار کا تو ذکر ہی کیا۔ آپ کو دیکھنے والا لباس سے آپ کو صرف ایک دیندار مسلمان تو سمجھ سکتا تھا۔ مگر عالم یا شیخ سمجھنا تو درکنار۔ بعض اوقات تو ایسا سادہ لباس ہوتا تھا کہ لوگ لکھا پڑھا آدمی بھی بمشکل سمجھتے تھے۔ مگر

مردِ حقانی کی پیشانی کا نور
کب چھپا رہتا ہے پیشِ ذی شعور

بس پیشانی کا نور ہی سب کچھ عیاں کر دیتا تھا۔ باوجودیکہ اپنے کو بہت چھپاتے تھے مگر چھپ نہ سکتے تھے۔ خود کو جتنا مٹاتے تھے۔ حق تعالیٰ اتنا ہی سر بلند فرماتے جاتے تھے ان جیسی سادگی آج بھی کہیں نظر نہیں آتی۔ ممکن ہے موجودہ زمانہ کے لوگ اپنے اکابر کو سادہ سمجھتے ہوں۔ مگر جس نے آپ کو دیکھا ہے وہ یہی کہتا ہے کہ

ہمہ شہر پُر ز خوباں منم و خیالِ ماہے
چہ کنم کہ چشمِ یک بیں نہ کند بہ کس نگاہے

سَیر

سَیر کرنا آپ کے معمول میں داخل تھا۔ مگر پیدل۔ جب تک معذوری (جو اخیر عمر میں ہو گئی تھی) نہ ہوتی۔ روزانہ صبح کو تین چار میل پیدل چلتے تھے اور فرماتے تھے کہ

"حفظِ صحت کی مصلحت کسی مستحب کی تحصیل سے مقدم ہے۔ مثلاً صبح کی ہواخوری کے لیے جنگل کی طرف جانا۔ مسجد میں اشراق کی نماز کے لیے تاطلوعِ آفتاب بیٹھے رہنے سے افضل ہے۔"

(کمالاتِ اشرفیہ صہ ۲۶۴)

سواری

آپ سواری کے شوقین نہ تھے۔ اکثر پیدل چلنے کے عادی تھے یہاں تک کہ اسٹیشن سے مکان تک بھی اکثر پیدل ہی جایا کرتے تھے۔

اخلاق

صفاتِ فاضلہ

حضرت تھانویؒ کی صفاتِ فاضلہ بے شمار ہیں۔ اور اگر ہر صفت کے شواہد بھی بیان کیے جائیں۔ تو اس کے لیے دفتر کے دفتر بھی شاید ناکافی ہوں ؎

نہ جنبش نہایتے وارد نہ سعدی را سخن پایاں
بمیرد تشنہ متسقی و دریا ہم چناں باقی

صاحبِ "اشرف السوانح" نے بیان کردہ واقعات کی بنا پر آپ کی صفاتِ حمیدہ کی حسب ذیل فہرست مرتب کی ہے:۔

(۱) ادب (۲) اخلاص (۳) استقلال (۴) استغنا (۵) استقامت (۶) استحضار (۷) اعتدال (۸) احتیاط (۹) امانت (۱۰) ایثار (۱۱) برکت (۱۲) بصیرت (۱۳) تدبّر (۱۴) توکل (۱۵) تقویٰ (۱۶) تواضع (۱۷) تأثر (۱۸) ترحم (۱۹) تہذیب (۲۰) تدین (۲۱) تیقظ (۲۲) تحمل (۲۳) حیا (۲۴)

حکمت (۲۵) خشیت (۲۶) عبرت (۲۷) سخاوت (۲۸) شجاعت (۲۹) ذہانت (۳۰) قناعت (۳۱) ذکاوت (۳۲) متانت (۳۳) فراست (۳۴) عبدیت (۳۵) محبت (۳۶) شفقت (۳۷) مروت (۳۸) شکر (۳۹) صبر (۴۰) درگزر (۴۱) زہد (۴۲) رفق (۴۳) عدل (۴۴) سادگی (۴۵) ہمدردی (۴۶) دلسوزی (۴۷) دانشمندی (۴۸) انضباط اوقات (۴۹) اہتمام حقوق (۵۰) اہتمام اصلاح امت (۵۱) آزادطبعی (۵۲) اہتمام دین (۵۳) احاطہ نظر (۵۴) بے ساختگی (۵۵) بلند نظری (۵۶) ترک مالایعنی (۵۷) تعلق مع اللہ (۵۸) تصلب فی الدین (۵۹) حسن خلق ۔ (۶۰) حسنِ معاشرت (۶۱) حسن تدبر (۶۲) حفظ حدود (۶۳) حفاظت امت (۶۴) حق پسندی (۶۵) حقیقت پسندی (۶۶) حق گوئی (۶۷) خیر خواہی (۶۸) خوش طبعی (۶۹) خلوت وجلوت (۷۰) فراخ حوصلگی (۷۱) حاضر جوابی (۷۲) اولوالعزمی (۷۳) سہولت پسندی (۷۴) خوش انتظامی (۷۵) وسعتِ خیال (۷۶) صفت شناسی (۷۷) رسائی فہم (۷۸) شانِ تحقیق (۷۹) شانِ تربیت (۸۰) مخالفتِ نفس (۸۱) نگرانیِ نفس (۸۲) قوتِ حافظہ (۸۳) لطافتِ طبع ۔ (۸۴) رعایتِ جذبات (۸۵) صفائی معاملات (۸۶) زندہ دلی (۸۷) رقیق القلبی (۸۸) دقتِ نظر (۸۹) رجوع الی الحق (۹۰) ملکۂ تحریر وتقریر (۹۱) سلامتِ صدر (۹۲) سلامتِ فطرت (۹۳) رضا وتفویض (۹۴) مجاہدہ ومراقبہ (۹۵) بیم ورجا (۹۶) قلتِ کلام (۹۷) شانِ کرم (۹۸) شانِ تحقیق (۹۹) اصابت رائے ۔

ان صفاتِ حمیدہ کے تائیدی واقعات کچھ تو آپ کو اس کتاب میں مختلف ابواب میں منتشر حالت میں ملیں گے اور کچھ درج ذیل کیے جاتے ہیں :۔

ادب

ادب تمام حسنات وبرکات کا چشمہ ہے۔ اسی لیے حضرت تھانویؒ اپنے استاد ول

بزرگوں اور بڑوں کا انتہائی ادب کرتے تھے اور کسی کو ایک منٹ کے لیے بھی ناراض ہونے کا موقع نہ دیتے تھے۔ چنانچہ آپ فرماتے تھے کہ :۔

"الحمد للہ میں نے اپنے بزرگوں کے ساتھ کبھی ظاہراً یا باطناً اختلاف نہیں کیا اور ہر طرح ادب ملحوظ رکھا۔ حالانکہ مجھ کو سینکڑوں احتمالات سوجھتے تھے لیکن میں نے ہمیشہ یہی سوچا کہ ہم کیا جانیں اور اگر کبھی کوئی بات سمجھ میں بھی آتی۔ تب بھی دل کو یہ کہہ کر سمجھا لیتا کہ یہ کیا ضروری ہے۔ کہ کوئی بات بھی بلا سمجھے نہ رہے۔ دراصل طالبِ تحقیق کے لیے پہلے تقلید ہی ضروری ہے۔ بعدہٗ تقلید کی برکت سے تحقیق کا درجہ حاصل ہو جاتا ہے۔ جیسے اگر بچہ اپنے استاد کی تقلید نہ کرے اور پڑھانے وقت اسے کہے کہ اس بات کی کیا دلیل ہے کہ یہ الف ہے۔ ب نہیں ہے تو بس وہ پڑھ چکا۔"

(کمالاتِ اشرفیہ صہ ۲۰۱)

ادب کے معاملہ میں آپ ہم مسلک اور مختلف المشرب بزرگوں میں قطعاً کوئی امتیاز نہیں فرماتے تھے۔ جب آپ خانوادۂ نقشبندیہ کے بزرگ حضرت مولانا شاہ فضل الرحمان قدس سرہ العزیز کو دوسری بار ملنے کے لیے مراد آباد کو روانہ ہوئے تو آپ نے سوچا کہ :۔

"ہم لوگوں کے اعمال اچھے نہیں اور اکثر بزرگوں کو قلب کی تاریکی کا احساس ہو جاتا ہے۔ مولانا بھی شاید اسی وجہ سے ڈانٹ ڈپٹ فرمایا کرتے ہوں۔ اس لیے اپنے قلب کو پاک وصاف کر کے حاضرِ خدمت ہونا چاہیئے۔"

یہ خیال آتے ہی آپ سواری سے اتر پڑے۔ وضو کیا اور استغفار پڑھتے ہوئے پا پیادہ اس طرف چل کھڑے ہوئے۔ حالانکہ وہ گرمی کا موسم تھا۔ دوپہر کا وقت تھا اور

آپ روزہ سے تھے۔

احتیاط

احتیاط انسان کو بہت سے مضرات و مفاسد سے بچالیتی ہے۔ اسی لیے حضرت ہر معاملہ میں احتیاط فرمانے کے عادی تھے۔ یہ اس احتیاط کا نتیجہ تھا کہ :۔

۱۔ آپ نے اس بات کی تاکید کر رکھی تھی کہ اگر کوئی عورت خط لکھے تو شادی شدہ ہونے کی صورت میں اپنے خاوند کے دستخط کرا کر بھیجے۔ ورنہ اپنے کسی محرم کے دستخط کرائے۔ شوہر کے ہوتے ہوئے کسی دوسرے محرم کے دستخط معتبر نہیں سمجھتے تھے۔ تاکہ بصورت اختلاف عقائد میاں بیوی میں بعد میں لڑائی نہ ہونے لگے۔ کہ ان کو کیوں خط لکھا۔ فرماتے تھے کہ :۔

"میں میاں بیوی میں خوشگوار تعلقات قائم رکھنے کو اپنے ساتھ خط و کتابت رکھنے سے زیادہ ضروری سمجھتا ہوں۔"

۲۔ بیعت کے لیے مستورات کے سفر کو ناپسند فرماتے تھے اور خط کے ذریعہ بیعت کرنے کو ترجیح دیتے تھے اور اگر کوئی مستورہ دربار اشرفیہ تک پہنچ جاتی تو اس سے اس وقت تک گفتگو نہ فرماتے۔ جب تک اس کا کوئی محرم پاس نہ بٹھا لیتے۔

۳۔ کثرت مشاغل۔ ضعف قویٰ اور نو واردین کی بے اصولی باتوں سے تکلیف پہنچنے کے سبب مخلصین نے تجویز کی کہ کوئی معین مقرر فرمایا جائے جو متفرق کاموں کے علاوہ نئے آنے والے کے حالات سن کر ان کی ضروری باتوں سے آپ کو آگاہ کر دیا کرے۔ تاکہ ان کی بے تمیزی و بے اصولی سے جو تکلیف پہنچتی ہے۔ اس سے نجات مل جائے۔ مگر آپ نے اس وقت اس خیال سے اس تجویز کو منظور نہ کیا کہ :۔

"اس کا دماغ خراب ہو جائے گا۔ وہ اپنے آپ کو مقرب سمجھنے لگے گا۔ اس سے لوگوں کو طرح طرح کی اذیتیں پہنچیں گی۔ ان سے فرمائشیں کیا کرے گا۔ اس طرح لوگ اسکو مقرب سمجھ کر حاجات و معروضات کا واسطہ بنائیں گے۔ اور خوشامد میں اس کی خدمت کریں گے۔ یہ ام المفاسد ہے۔ مجھے ساری تکلیفیں تو گوارا ہیں۔ لیکن یہ گوارا نہیں کہ اس کا بھی دینی نقصان ہو اور دُوسروں کو بھی تکلیف پہنچے"۔

پھر آپ نے اس کی مثال دیتے ہوئے فرمایا:۔

"اور تو اور حضرت مولانا گنگوہیؒ کے ایک خادم تھے جو عامی تھے۔ مگر خادمِ خاص سمجھے جاتے تھے۔ وہ خود مجھ سے فرمائشیں کیا کرتے تھے اور وہ بھی قیمتی قیمتی چیزوں کی گنگوہیؒ میں نہیں بلکہ یہاں تھانہ بھون آکر بھی چونکہ محبوب کے کوچہ کا کتا بھی محبوب ہوتا ہے۔ اس لیے میں ان کی فرمائشیں پوری کرتا تھا۔ ویسے وہ تہجد گزار۔ ذاکر و شاغل آدمی تھے۔ مگر قرب کی وجہ سے ان کو یہ مرض لاحق ہو گیا۔ ایسے ہی حاجی عابد حسینؒ کے ایک مقرب تھے۔ ایک شخص نے ان سے ملاقات کرنی چاہی تو اس نے اس سے کہا کہ روپیہ دو۔ ابھی ملاقات کرا دیتا ہوں۔ اس شخص نے خود یہاں آکر مجھ سے کہا کہ تمھارے ہاں یہ اچھا قاعدہ ہے کہ کسی کی روک ٹوک نہیں براہِ راست معاملہ ہے۔ بس انہی تجربہ کی بنا پر میں نے اپنے یہاں کسی کو مقرب یا دخیل نہیں بنا رکھا۔"

بعد میں جب حدیث شریف سے اس کا جواز معلوم ہو گیا اور تکلیف بھی ناقابلِ برداشت ہونے لگی تو اس وقت آپ نے باصرار اعزہ و خدام ایک بوّاب مقرر کر لیا اور دُوسرے ملازمین کی طرح سخت تاکید کر دی کہ وہ کسی سے ہدیہ قبول نہ کرے اور دینے

والوں کو بھی بذریعہ اعلان مطلع کر دیا کہ اسے کچھ نہ دیا جائے اور اگر کسی کو کچھ دینے پر اصرار ہو تو وہ میرے ذریعہ سے دے۔ میں خود کسی حاجت کے بہانہ اس کو پہنچا دوں گا۔ مگر اس پر آپ کا نام ظاہر نہ کروں گا۔ ورنہ یہ نہ دینے والوں کی طرف سے بے التفاتی برتے گا۔ اس احتیاط کے علاوہ آپ خود بھی اس پر کڑی نگرانی رکھتے تھے اور اسے بھی حضرت کی "سخت گیری" سے بے عنوانی کی کبھی ہمت نہ ہوتی۔

استغناء

استغناء بھی آپ کی طبیعت کا ایک خاصۂ خاص تھا۔ اور آپ اس ارشادِ نبوی کے مظہر تھے۔ لا اسئلکم علیہ من اجر ان اجری الا علی اللہ کہ میں تم سے قطعاً کوئی اجر نہیں چاہتا میرا اجر صرف اللہ پر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کو امراء وزراء اور مال و زر تو کیا عوام سے بھی استغناء تھا اور آپ دوسروں کی طرح نام نہاد حلم و مروت سے قطعاً کام نہ لیتے تھے اور جس سے کوئی بیہودہ یا ناگوار حرکت ہوتی تو اسے فوراً مجلس سے اُٹھا دیتے۔ مگر اس اُٹھا لینے میں بھی اسے کوئی نہ کوئی سبق ایسا مل جاتا۔ جو عمر بھر نہ بھولتا۔ جس کی پیچھے مثال گزر چکی ہے:

عوامی استغناء سے مشکل تر مالی استغناء ہے اور خصوصاً ایسے زمانہ میں جبکہ رائج الوقت پیری مریدی نے ایک مستقل معاشی فن کی حیثیت اختیار کر کے لوگوں کو "دینے کا عادی" بنا دیا ہو۔ یہ بہت ہی دشوار امر ہے۔ اسی لیے آپ کے ہاں ہدایا قبول کرنے کی سخت حدود و قیود تھیں اور اس وقت تک کسی سے کچھ قبول نہ فرماتے تھے۔ جب تک یہ معلوم نہ ہو جاتا کہ اسے کوئی غرض نہیں ہے۔ حتیٰ کہ دُعا کی بھی۔ آپ کا یہ معمول صرف اپنی ذات کے لیے ہی نہ تھا۔ بلکہ مدرسہ خانقاہ کے لیے بھی تھا۔ چنانچہ ایک مرتبہ ایک صاحب نے مدرسہ کے لیے دو سو روپے بھیجے جو آپ نے قبول فرما کر مدرسہ کے حساب میں جمع فرما لیے۔ کیونکہ جو بھی کوئی رقم آتی تھی۔ آپ فوراً اسے اسی مد کی تھیلی میں رکھ کر اسی

مد کے حساب میں جمع فرما دیتے تھے اور حساب کے معاملہ میں جو احتیاط یہاں برتی جاتی تھی اس کی مثال کسی ادارہ میں بھی نہ ملتی تھی۔ چنانچہ دوسرے سال بھی اُس نے دو سو روپے بھیج دیئے۔ مگر اس کے ساتھ یہ بھی لکھ دیا کہ اگر سال گذشتہ کی طرح اس مرتبہ بھی رسید نہ آئی تو آیندہ بند کر دوں گا۔ اس پر آپ نے منی آرڈر وصول نہ فرمایا اور صاف لکھ دیا کہ "تم آیندہ سال بند کرو گے۔ ہم امسال ہی بند کرتے ہیں۔"

امراء سے استغناء کا یہ عالم تھا کہ جہاں حیدر آباد دکن جانے والے اکثر علماء و مشائخ والی دکن کی خدمت میں باریابی اور وظیفہ و منصب کی آرزو لے کر جاتے تھے۔ وہاں حضرت کو ملنے سے بھی عار تھا۔ جس کی تفصیل خود حضرت کی زبانی لطف دے گی۔ فرماتے تھے کہ :-

"اہلِ علم کے لیے یہ بات بہت ہی ناپسندیدہ ہے کہ وُہ امرا سے خلط کریں۔ اس لیے غربا کو جو مصلح سے نفع ہوتا ہے۔ امرا سے وُہ بھی گیا ہو جاتا ہے۔ قلوب پر مصلح کا وہ اثر نہیں رہتا۔ مجھ کو حیدر آباد دکن میں ایک دوست نے مدعو کیا تھا۔ دیوبند کے بعض احباب خاص اہلِ علم نے مشورہ دیا کہ وہاں نواب صاحب سے ملاقات ضروری ہے۔ مَیں نے کِسی کو کوئی جواب نہ دیا۔ وہاں پہنچ کر سات ہی روز گزرے تھے کہ فلاں نواز جنگ کا ایک پرچہ آیا جس میں لکھا تھا کہ عرصہ سے مجھ کو زیارت کا اشتیاق تھا۔ مگر بدقسمتی سے تھانہ بھون کی حاضری نصیب نہ ہوئی۔ برائے زیارت حاضر ہونا چاہتا ہوں۔ فلاں فلاں وقت اپنے فرائض منصبی سے فرصت ملتی ہے۔"

یہ "فلاں نواز جنگ" صاحب اس وقت نواب کی ناک کے بال اور ارکانِ سلطنت میں سے تھے۔ آپ نے انھیں لکھا :-

وبے حد مسرت ہوئی کہ آپ کے دل میں دین اور اہلِ دین کی نسبت و عظمت ہے مگر نیچے کی سطر پڑھ کر افسوس کی بھی کوئی حد نہ رہی کہ اس میں فہم سے کام نہ لیا گیا۔ جس کے ملنے کو زیارت سے تعبیر کیا گیا۔ اس کو تو اپنے اوقاتِ فرصت تبلا کر پابند کیا گیا اور خود آزاد رہے یہ کونسی فہم و تہذیب کی بات ہے۔"

اس پر نواز جنگ صاحب نے اپنی بدفہمی کی معافی چاہی اور لکھا کہ حضرت والا ہی اپنی ملاقات کے اوقات تحریر فرمادیں۔ حضرت نے اس پر ایک اور سبق دے دیا کہ :۔

"اب بھی پورے فہم سے کام نہیں لیا گیا۔ مردہ بدست زندہ کی طرح مہمان میزبان کے ہاتھ میں ہوتا ہے۔ اس لیے سفر میں اوقات کا ضبط ہونا غیر اختیاری ہے۔ آپ ساتھ رہیں۔ جس وقت مجھ کو فارغ دیکھیں۔ ملاقات کرلیں۔"

اس پر انھوں نے لکھا کہ بدفہمی ہوتی چلی جا رہی ہے۔ میں نہ اب اپنے اوقات کو ظاہر کرتا ہوں نہ حضرت سے معلوم کرتا ہوں۔ جس وقت فرصت ہوگی۔ حاضرِ خدمت ہو کر زیارت سے مشرف ہو جاؤں گا اگر فرصت نہ ہوئی تو لوٹ آؤں گا۔ جب حضرت نے دیکھا کہ سبق کارگر ہوا ہے۔ تو پھر انھیں دلجوئی کے طور پر لکھا :۔

"اب پورے فہم سے کام لیا گیا ہے۔ جس سے اس قدر مسرت ہوئی کہ پہلے آپ کا میری زیارت کو جی چاہ رہا تھا۔ اب میرا آپ کی زیارت کو جی چاہنے لگا۔ اگر فرصت ہو تو آپ تشریف لے آئیں۔ ورنہ مجھ کو اجازت فرمائیے خود حاضر ہو جاؤں گا۔"

اس افہام و تفہیم کی غرض آپ نے اپنی مجلس میں یہ بیان فرمائی کہ :۔

"میرا طرزِ عمل اس لیے تھا کہ یہ دنیا کے جس قدر بڑے لوگ ہیں۔ اہلِ دین

کو بے وقوف سمجھتے ہیں۔ ان کو یہ دکھلانا تھا کہ اہلِ علم و دین کی یہ شان ہے کہ پہلے تو تذلل سے بچنا مقصود تھا۔ مگر جب وہ اپنی کوتاہی تسلیم کر چکے تو اب کھینچنا تکبر تھا۔ اللہ کا شکر ہے کہ دونوں سے محفوظ رکھا۔"

غرضیکہ وہ صاحب خود آئے۔ اہلِ مجلس میں بعضوں نے دُور سے دیکھ کر کہا کہ فلاں صاحب آ رہے ہیں۔ حضرت ڈاک لکھ رہے تھے برابر لکھتے رہے۔ جس وقت انھوں نے پہنچ کر السلام علیکم کہا۔ تب حضرت مخاطب ہوئے فرماتے ہیں کہ :۔

"مَیں نے سلام علیکم کا جواب دیا اور کھڑے ہو کر مصافحہ کیا۔ بیچارے بہت ہی مہذب تھے دو زانو ہو کر سامنے بیٹھ گئے۔ مَیں نے اپنے برابر جگہ دے کر کہا بھی کہ اس طرف آ جائیے۔ اس پر کہا کہ مجھ کو یہیں آرام ملے گا۔ کچھ دیر بعد میرے سوال پر نواب صاحب کی بیدار مغزی اور انتظام سلطنت کے واقعات بیان کرتے رہے اس کے بعد کہا کہ اگر نواب صاحب سے ملاقات ہو جائے تو بہت مناسب ہے۔

مَیں نے پُوچھا کہ یہ خواہش آپ کی ہے یا نواب صاحب کی۔ کچھ سکوت کے بعد کہا میری ہی خواہش ہے۔ مَیں نے سوال کیا کہ جس وقت آپ نے ملاقات کے مناسب و نامناسب ہونے پر غور فرمایا ہوگا۔ اس پر بھی ضرور غور فرمایا ہوگا کہ ملاقات سے نفع کس کا ہے؟ کہا نواب صاحب کا۔ مَیں نے کہا کہ نفع نواب صاحب کا اور ملاقات کی ترغیب مجھ کو دی جا رہی ہے۔ طالب کو مطلوب اور مطلوب کو طالب بنایا جا رہا ہے اس پر کوئی جواب نہ دیا۔

اب مَیں خود اس کے متعلق عرض کرتا ہُوں کہ اس صورت میں کہ مَیں خود ملاقات کو جاؤں مضرت ہی مضرت ہے۔ نفع کچھ نہیں۔ اگر ملاقات کو گیا تو وہ

مطلوب اور میں طالب ہوں گا تو اس صورت میں ان کو مجھ سے کوئی نفع نہ ہوگا۔ ہاں ان سے مجھ کو نفع ہو سکتا ہے اس لیے کہ جو چیز ان کے پاس ہے وہ مجھے ملے گی۔ یعنی دنیا۔ وہ بقدر ضرورت بحمد اللہ میرے پاس بھی ہے اور جو میرے پاس ہے وہ بقدر ضرورت بھی ان کے پاس نہیں۔ یعنی دین۔

اور اگر میں گیا بھی۔ اور جو ان کے پاس ہے (یعنی دنیا منصب وظیفہ وغیرہ) وہ مل بھی گئی۔ تو اس صورت میں ایک خاص ضرر بھی ہے۔ اگر قبول کرتا ہوں تو اپنے مسلک کے خلاف اگر قبول نہیں کرتا۔ تو آداب شاہی کے خلاف۔ کیونکہ قبول نہ کرنے میں ان کی سبکی اور اہانت ہوگی اور چونکہ میں اس وقت ان کے حدود میں ہوں۔ اس کی پاداش میں (اخراج وغیرہ) جو چاہیں میرے لیے تجویز کر سکتے ہیں۔ تو نواب صاحب کو کوئی نفع نہ ہوگا اور میرا نقصان ہوگا۔

یہ امر بھی شان سلاطین کے خلاف ہے کہ وہ اپنی رعایا کے مدعو کیے ہوئے شخص سے ملاقات کریں۔ اس میں کم فہم لوگ ان کو تنگدلی کی طرف منسوب کریں گے۔ جس میں ان کی اہانت ہے کہ کیا خود نہیں مدعو کر سکتے تھے۔

خلاصہ یہ کہ خیر اس میں ہے کہ نہ ان کے پاس جاؤں نہ وہ میرے پاس آئیں۔ اگر ان کا جی چاہے تو تھانہ بھون سے مجھ کو بلا لیں میں خاص شرائط طے کر کے آجاؤں گا۔ کچھ عذر نہ ہوگا"

یہ سن کر نواز جنگ کی آنکھیں کھل گئیں اور کہا کہ :-

"ان چیزوں پر تو ہم لوگوں کی نظر بھی نہیں پہنچ سکی"

اسی لیے حضرت فرمایا کرتے تھے کہ :-

"امرا سے علماء کا خلط کرنا (ملنا جلنا) اس میں امراء کا تو کوئی (معتدبہ) نفع نہیں، بلکہ اہلِ علم کے اور غربا کے دین کا نقصان ہوتا ہے اس لیے میں اس کو ناپسند کرتا ہوں۔"

(آفات الیومیہ حصّہ چہارم صـ ۵۶ تا ۶۳)

استقلال

حق تعالیٰ نے آپ کو اتنی قوتِ استقلال بخشی تھی کہ بڑے بڑے حادثات میں بھی از جا رفتہ نہیں ہوتے تھے۔ نہ ایسے مواقع پر اپنے ضروری مشاغل و معمولات میں کوئی معتدبہ فرق آنے دیتے تھے۔ نہ بشرہ سے غیر معمولی صدمہ کا اظہار ہوتا تھا۔ البتہ مقتضائے بشریت طبعی قلق ضرور ہوتا مگر اس پر بھی بڑا تحمل فرماتے تھے۔

آپ کو اپنے خواہر زادہ مولانا سعید احمدؒ سے اتنی محبت تھی کہ عشق کی حد تک پہنچ چکی تھی جب ان کا انتقال ہوا۔ تو ان کی موت کے صدمہ سے فرماتے تھے کہ قلب میں بار بار یہ تقاضا پیدا ہوتا ہے کہ کام چھوڑ کر قبر پر جاؤں لیکن میں بتکلف اس تقاضے کو روکتا ہوں۔ اس کے مقتضا پر عمل نہیں کرتا۔ اور اپنے آپ کو برابر کاموں میں مشغول رکھتا ہوں کیونکہ میں خوب جانتا ہوں کہ اگر ایک بار اس کے تقاضے پر عمل کیا تو پھر عادت پڑ جائے گی۔ یہ عزم و استقلال اس مراقبہ کا نتیجہ تھا کہ:۔

"اللہ تعالیٰ حاکم بھی ہیں اور حکیم بھی۔ حاکم ہونے کی حیثیت سے تو انھیں اپنی مخلوق محکوم کے ظاہر و باطن میں ہر طرح کے تصرفات فرمانے کا ہر وقت کامل اختیار اور پورا حق حاصل ہے۔ کسی کو مجال نہیں کہ چون و چرا کر سکے۔ اور حکیم ہونے کے اعتبار سے ان کا ہر تصرف حکمت پر مبنی ہوتا ہے۔ گو وہ حکمت ہماری سمجھ میں کبھی نہ آوے۔ چونکہ بفضلہٖ تعالیٰ اللہ جل شانہٗ کا حاکم اور حکیم ہونا اچھی طرح ذہن نشین ہو گیا ہے۔ اس لیے بڑے سے بڑے

حادثہ میں بھی جس کو پریشانی کہتے ہیں۔ وہ الحمد للہ مجھ کو کبھی نہیں ہوتی۔ طبعی اثر ہونا اور بات ہے۔"

اعتدال

قوم اس وقت افراط وتفریط کے جس دور سے گذر رہی ہے۔ اس کا نقشہ مولانا عبدالماجد دریا بادی نے ان الفاظ میں کھینچا ہے۔

"قوم عجیب افراط وتفریط کے مرض میں اندھا دھند مُبتلا ہے۔ کسی سے خوش ہوئے تو اسے پُوجنے لگے۔ خفا ہُوئے تو گالیاں دینے اور لعنت برسانے لگے۔ گویا ان کا لیڈر یا امیر فرشتہ ہو اور اگر فرشتہ نہیں تو پھر شیطان کے ادھر کوئی درجہ نہیں۔ توازن و اعتدال کا گویا قحط پڑ گیا ہے اور اشخاص و رجال کو ان کے صحیح مقام پر رکھنا ہم لوگ بھول ہی گئے ہیں۔"

(حکیم الامت صـ۹۱)

مگر حضرت تھانوی کے ہاں یہ بات نہ تھی۔ بلکہ بقول مولانا دریا بادی :-

"حضرت کے ہاں دنیوی حکام۔ رؤسا۔ عہدہ داروں کے ساتھ معاملت میں بھی خاص اعتدال ملحوظ رکھا جاتا تھا۔ یعنی نہ ان لوگوں کی طرف گرنا جیسا کہ بعض مشہور آستانوں اور خانقاہوں میں دستور سا پڑ گیا ہے۔ اور نہ ان سے اپنے کو بالکل کھینچے رکھنا جیسا کہ بعض غیر محقق مشائخ نے تقوٰی اور درویشی کا مقتضا سمجھ لیا ہے۔" (حکیم الامت صـ۲۱۱)

چنانچہ ایک مرتبہ ایک خلاف شرع تحریک کے سلسلہ میں بڑے بڑے ذی وجاہت حضرات حضرت کی خدمت میں گفتگو کرنے کے لیے حاضر ہُوئے۔ جن کو ہر قسم کی دنیوی جاہ حاصل تھی حضرت نے پُورے اعزاز واکرام سے بٹھایا۔ گفتگو فرمائی اور وہ حضرت کو مل کر بہت ہی متاثر و محظوظ ہُوئے۔ آپ سے رخصت ہو کر جب وہ واپس جانے کے لیے

اسٹیشن پر پہنچے تو حضرت بھی ٹہلتے ہوئے ان کے پیچھے انہیں چھوڑنے کے لیے اسٹیشن پر پہنچ گئے جو صرف دس منٹ کے فاصلہ پر تھا۔ وہ حضرت کو دیکھ کر بہت ہی شرمندہ ہوئے۔ حضرت نے ان کے احساسِ شرمندگی کو دور کرنے کے لیے فوراً فرمایا کہ :۔

"میں آپ صاحبان کے تشریف لانے کے وقت تو استقبال کے لیے حاضر نہ ہوا کہ اس وقت حاضری کا منشار جاہ ہوتا ہے اور اس وقت رخصت کرنے کے لیے حاضر ہونے کا منشار چاہ ہے۔ کیونکہ آپ حضرات کی محبت اور اخلاق نے میرے دل میں آپ صاحبان کی محبت پیدا کر دی ہے اور ساتھ اس لیے نہ آیا کہ آپ صاحبان مجھ کو آنے ہی نہ دیتے۔"

انکسار

حضرت تھانویؒ پرلے درجہ کے منکسر المزاج تھے۔ مشہور آفاق ہونے کی وجہ سے لوگوں نے آپ کے جاہ وجلال کے متعلق عجیب عجیب تصورات قائم کر رکھے تھے۔ اس لیے ایک دن آپ کے چھوٹے بھائی منشی اکبر علی نے آپ سے کہا کہ اب آپ بڑے آدمی سمجھے جاتے ہیں معمولی آدمی نہیں رہے۔ کم سے کم سیکنڈ کلاس میں سفر کیا کریں۔ حضرت نے جواب دیا :۔

"میں کیا کروں۔ یہ میری طبیعت کے خلاف ہے۔ میں ریل میں گنواروں، بھنگیوں اور چماروں کے ساتھ بیٹھتا ہوں۔ شان کیا چیز ہے۔ دو دن بعد بھنگی چمار بھی مٹی ہوں گے اور میں بھی۔" (کمالاتِ اشرفیہ صـ ۳۷۵)

مولانا عبدالماجد دریابادی نے ایک مرتبہ خط میں یہ بھی لکھ دیا کہ مرض کا مفصل حال حکیم الامت کی خدمت میں بہ امید واستدعا علاج پیش کیا۔ اس کے جواب میں لکھا :۔

"میں کیا۔ میری حکمت کیا۔ عوام کے لقب دینے سے کیا ہوتا ہے۔ لیکن خدمت سے عذر نہیں۔"

(حکیم الامت صـ ۲۲۸)

ایک دوسرے خط میں مولانا موصوف نے لکھا کہ کبھی بعض چیزوں کو دیکھ کر اور سُن کر دل یہ کہنے لگتا ہے کہ بس یہ بھی ہمارے ہی جیسے بشر ہیں۔ اس کے جواب میں لکھا کہ :۔

" یہ بالکل مطابق واقع ہے بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ واقع کے قریب ہے اگر اس میں یہ قید نہ ہوتی کہ "ہم ہی جیسے"۔ تو مطابق واقع کے ہوتا۔ اور اب قدرے واقع سے بعد ہو گیا۔ کیونکہ واقع میں تو میں دوسروں سے بھی کم ہوں اور یہ کوئی تکلف نہیں اس پر حلف کر سکتا ہوں۔ کیونکہ اپنی حالت کا خود اوروں سے زیادہ مشاہدہ کرتا ہوں۔" (حکیم الامت صد ۳۰۲)

ایثار

حضرت تھانویؒ مدت دراز تک مدرسۂ دیوبند کے سرپرست رہے مگر آخر میں کچھ اختلاف پیدا ہو گئے۔ ایسی حالت میں آپ نے دنیاداروں کی طرح اس منصب سے چمٹے رہنے کی بجائے کمال نیک نفسی سے خود کو اس منصب سے ہٹانے کا فیصلہ کر لیا اور استعفےٰ دے دیا۔ جسے ارکان مدرسہ نے نامنظور کر دیا۔ اس پر حضرت نے خود کو اس منصب سے معزول کرنے کا فیصلہ فرمایا۔ چونکہ آپ کو علم تھا کہ ارکان مدرسہ اس علیحدگی کو بھی گوارا نہ کریں گے۔ اس لیے آپ نے مولانا عبدالماجد دریابادی کو اس سلسلہ میں ۸ اکتوبر ۱۹۳۵ء کو یہ خط لکھا :۔

از اشرف علی عفی عنہ

بخدمت مکرمی جناب مولوی عبدالماجد صاحب سلمہٗ

السلام علیکم۔ ایک ناگوار تکلیف بادلِ نخواستہ خلافِ عادت دے رہا ہوں۔ آپ کی عنایت سے امید ہے کہ گوارا فرمائیں گے۔ یہ ایک مسودہ دارالعلوم کی باضابطہ خدمت سے یکسوئی کا ہے۔ جس کو مدرسہ میں بھی بھیج چکا ہوں۔ مگر وہ شاید شائع نہ فرمائیں یا جلدی شائع نہ فرمادیں اور خیرخواہانِ مدرسہ کے سکون کے لیے ضرورت ہے کہ جلدی اشاعت

ہو۔ اس لیے آپ کو تکلیف دیتا ہوں کہ آپ جس پرچہ میں مصلحت سمجھیں۔ شائع فرمادیں۔ خواہ الصدق میں یا کسی اور میں۔ میرا تعارف مدیران جرائد سے خاص طور پر نہیں۔ اس لیے شاید میرے لکھنے سے شائع نہ کریں۔ آپ کے ایسے صاحبوں سے تعلقات ہیں۔ یہ بھی اختیار ہے خواہ اپنی رائے کے ساتھ شائع فرمادیں یا بدوں رائے کے۔ اور رائے میں بھی بالکل آزاد ہیں۔ بس اتنا لحاظ ضروری ہے کہ مدرسہ کو گزند نہ پہنچے۔ بلکہ اگر کسی قدر مدرسہ کی خدمت کی ترغیب ہو تو مصلحت ہے۔ ورنہ نہ نفع ہو نہ ضرر والسلام"۔

(حکیم الامت ص ۴۶۲)

اس خط کے ساتھ جو اعلان بغرض اشاعت روانہ فرمایا وہ یہ تھا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

انما المومنون اخوۃ فاصلحوا بین اخویکم الایۃ

حامداً و مصلیاً۔ احقر اشرف علی اس آیت کی بنا پر عرض رسا ہے۔ چونکہ آج کل مدرسہ دیوبند کے ارکان میں نیز بعض مسائل انتظامیہ میں غیر معمولی اختلاف ہے جس کو بنا بر حسن ظن اختلاف اجتہادی کہنا احوط ہے اور منجملہ ان مسائل کے احقر کی سرپرستی کی نوعیت کا مسئلہ بھی ہے جو میری آزادی پسند طبیعت پر سب سے زیادہ گراں بھی ہے۔ اور آئندہ ناگوار آثار کے ترتب کا بھی احتمال ہے۔ اس لیے احتیاطاً و اخذاً بالعزیمہ حضرت سیدنا حسنؓ کی سُنّت کے اتباع میں نفس سرپرستی ہی سے اپنے کو معزول کرتا ہوں۔ جو حقیقت میں تجدید اعادہ استعفاء سابق ہے۔ اُمید ہے کہ اس کے بعد بقیہ مسائل جلد ہی سہولت سے حل ہو جاویں گے۔ لیکن مدرسہ کی ہر خدمت مقدورہ سے انشاء اللہ تعالیٰ تقاعد نہ ہوگا۔ واللہ الموافق فقط تھانہ بھون ۴ رجب جمعہ ۱۳۵۴ھ۔ (حکیم الامت ص ۴۶۳)

مولانا عبدالماجد اس سلسلہ میں لکھتے ہیں :۔

"حضرت عالی ظرفی اور شرافتِ نفس کے بادشاہ تھے۔ خود تنگ ہو کر مدرسہ سے الگ ہو رہے ہیں۔ مگر یہ گوارا نہیں کہ مدرسہ کو کسی طرح بھی ضرر پہنچے بلکہ کوشش اسی کی ہے کہ ہو سکے تو نفع ہی پہنچ جائے۔ یہ شرافتِ نفس مولانا کا حصہ تھی۔" (حکیم الامت صـ ۴۶۲)

ایسے ایثار کا نمونہ اربابِ اختیار کی بجائے اہلِ حق میں ہی نظر آسکتا ہے۔

توکل

حضرت تھانویؒ فرماتے ہیں کہ :۔

"توکل یہ ہے کہ تدبیر کر کے اللہ تعالےٰ پر بھروسہ کرے، مگر شرط یہ ہے کہ وہ تدبیر مباح ہو۔ اور اس میں انہماک نہ ہو۔ غیر متصرفِ حقیقی سے قطع نظر کرنا اور یہ قطع نظر اعتقاداً کرنا تو فرض ہے اور عملاً اسباب ظنیہ کے ترک سے بشرط تحمل مستحب ہے اور جو اسباب عادۃً یقینی یا مثل یقینی کے ہیں۔ ان کا ترک کرنا معصیت ہے بجز اہلِ حال کے کہ ان کو اس کی بھی اجازت ہے اور یہ سب تفصیل اسباب دنیویہ میں ہے۔ اسباب دینیہ کو ترک کرنا توکل نہیں۔" (کمالاتِ اشرفیہ صـ ۸۲ و صـ ۱۱۵)

حضرت تھانویؒ کی تمام تر زندگی اسی حقیقت کی مظہر رہی۔ مالی توکل کی تفصیل تو "بابِ معیشت" میں آرہی ہے۔ آلی توکل کی یہ کیفیت تھی کہ بمبئی میں حضرت پر ایک دفعہ شام کو قاتلانہ حملہ ہوا۔ احباب کے تقاضا کے باوجود آپ نے تھانہ پر کوئی رپورٹ وغیرہ نہ کی اور صبح بلا کسی احتیاطی تدبیر کے کھلے بندوں بازار میں پھرتے رہے۔ اسی طرح بریلی میں جو آپ کے معاندین کا مرکز تھا۔ آپ اصرار کے باوجود آزادانہ پھرتے رہے اور دل میں کسی خوف کو جاگزیں نہ ہونے دیا چنانچہ آپ فرماتے تھے کہ :۔

"بمبئی میں بہت مخالفین ہیں مگر وہاں بھی لوگوں نے اصرار کیا کہ بیان کیجیے۔ میں نے وہاں بھی کھل کر بیان کیا اور ہر جگہ کھلے بندوں آزادی کے ساتھ اِدھر اُدھر آتا جاتا رہا۔ تنہا بھی۔ جمع کے ساتھ بھی۔ اسی طرح بعض احباب نے بریلی میں منع بھی کیا یہاں معاندین اور مخالفین کی بہت بڑی کثرت ہے۔ حفاظت کا کچھ انتظام کر کے کہیں آنا جانا چاہیئے۔ اس طرح اِدھر اُدھر نہ پھرنا چاہیئے۔ لیکن میں نے کہہ دیا کہ یہ سب فضول اوہام ہیں بلاحکم خدا کچھ نہیں ہو سکتا۔ اور اگر خدا کو بھی منظور ہو۔ تو پھر لاکھ حفاظت کیجئے۔ کیا ہو سکتا ہے۔"

تقویٰ

تقویٰ کے لیے صرف زہد و ورع ہی کافی نہیں بلکہ معاملات و معاشرت میں صحیح ہونا بھی ضروری ہے۔ جو نہایت ہے معرفت کی۔ کہ دُنیا کی دل میں قدر نہ ہو اس سے دل کو خالی رکھے اور بے ضرورت سامان جمع نہ کرے۔ اس لیے حضرت تھانویؒ فرماتے تھے کہ :۔

"دنیا کو آدمی جس قدر مختصر کرے۔ اسی قدر راحت ہے۔"

(کمالات اشرفیہ صہ ۱۶۴)

"جس کی نظر اللہ اور ما عند اللہ پر ہے۔ اس کی نظر میں سونا چاندی تو کیا دُنیا و مافیہا بھی کچھ نہیں۔ حضورؐ نے اپنے لیے۔ اپنے جگر گوشوں اور خاص لوگوں کے لیے دنیا کو پسند نہیں فرمایا اور ایک دینار بھی رکھنا گوارا نہ فرمایا۔"

(کمالات اشرفیہ صہ ۳۱۰)

حضرت تھانویؒ کا شروع سے اخیر تک اسی پر عمل رہا۔ آپ عرفی عبادات سے زیادہ معاملات و معاشرت میں متقی تھے۔ جس کی نظیر تاریخ مشاہیر پیش نہیں کر سکتی۔ آپ پر خوف محاسبہ اتنا طاری تھا کہ ۱۳۰۵ھ میں آپ نے والد ماجد کے انتقال

کے بعد اور زکوٰۃ وصول کرنے سے قبل حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی سے دریافت فرمایا کہ اگر جائیداد نہ رکھوں تو کیسا ہے ؟ مولانا نے لکھا :-

" اگر رکھو رخصت ہے ۔ نہ رکھو ، جب بھی حق تعالےٰ روزی سے تم کو پریشان نہ کرے گا ۔"

اس پر آپ نے اپنے حصہ کی متروکہ اراضی کی نقد قیمت لے لی ، جس سے مکان بنوایا اور حج ثانی کیا حالانکہ وہ جائیداد مستقل آمدنی کا ذریعہ تھی ۔ مگر اس کو قبضہ میں رکھنے سے بہت سے حقوق کی ادائیگی کا بوجھ بڑھ جاتا تھا اور ایک دن اس کا حساب دینا پڑتا تھا ۔ اسی لیے آپ کی نظر پیسہ پائی سے زیادہ پائی پائی کے حساب لینے والے پر رہتی تھی ۔ جس کی کچھ تفصیل حالاتِ سفر میں گزر چکی ہے ۔ کچھ معاملات و معمولات کے باب میں آئے گی ۔ یہاں صرف دو مزید واقعات کا ذکر اس ضمن میں کر دینا کافی ہوگا ۔

۱۔ آپ کو نواب ڈھاکہ نے اونچے درجہ کا کرایہ روانہ کیا ۔ مگر آپ نے تیسرے درجہ میں سفر کیا ۔ کیونکہ وہاں اونچے درجہ کی نسبت آپ کو زیادہ آرام معلوم ہوا ۔ اس طرح موصولہ رقم کا کافی حصہ بچ رہا ۔ جو آپ نے نواب صاحب کو اس صورت میں واپس کر دی کہ نواب صاحب کی طرف سے اس رقم کی ٹین کی چادریں خرید کر مسجد کے وضو خانہ کا سائبان بنوا لیا اور نواب صاحب کو لکھ دیا کہ بقیہ رقم واپس کرنا آپ کے احترام کے خلاف تھا اور واپس نہ کرنا اپنی وضع کے خلاف تھا ۔ اس لیے ایسا کیا گیا ۔

۲۔ ایک مرتبہ مولانا عبد الماجد نے خط نہ ملنے کی اطلاع دی ۔ اس کے قریب ہی زمانہ میں حضرت کو انھیں ایک ضروری خط لکھنا پڑا جس کا ذکر " ایثار " کے ضمن میں گزر چکا ہے ۔ آپ نے وہ خط رجسٹری کرنے کی بجائے اس پر کم ٹکٹ لگا کر اسے بیرنگ بنا دیا اس طرح پیسے بھی کم خرچ ہوئے اور خط پہنچنے کا امکان رجسٹری سے بھی کچھ زائد ہو گیا ۔ مگر ان دو پیسوں کا بوجھ آپ نے مکتوب الیہ پر ڈالنا گوارا نہ کیا ۔ حالانکہ

یہ معمولی بات تھی۔ مگر تھی بے اصولی۔ اس لیے آپ نے اس خط میں ۲ کے ٹکٹ ڈال کر لکھا دیا کہ :۔

"مَیں نے خط کو حفاظت کے لیے ۲ کا بیرنگ کر دیا ہے۔ اگر ڈاک والے لیں تو ٹکٹ حاضر ہے۔ اگر ڈھول سے نہ لیں۔ ان ٹکٹوں کو چاک کر دیجئے (تاکہ محصول ہمارے ذمہ بقایا نہ رہے) اگر چاک کرنے کو دل گوارا نہ کرے۔ تو کسی خط میں جو خاص اس غرض کے لیے نہ بھیجا جائے۔ مجھ کو اطلاع کر دی جائے۔ مَیں خرید کر کے چاک کر دوں گا۔" (حکیم الامت صہ ۴۶۳)

اس پر مولانا عبد الماجد لکھتے ہیں :۔

"خط میں ٹکٹوں کے بارہ میں احتیاط کا کمال۔ سچ یہ ہے کہ تقویٰ و تدین کا اب تک نام ہی سُنا تھا۔ عملی نمونہ حضرت ہی کے ہاں دیکھا۔" (بحوالہ صدر)

حیاء

حیاء کا حضرت تھانویؒ پر اتنا غلبہ تھا کہ فرماتے تھے :۔

"حیاء کے غلبہ سے کبھی ایسا ہو جاتا کہ پَیر پھیلا کر سونا مشکل ہو جاتا اور بیت الخلاء میں ستر کھولنا اور بھی زائد باعثِ شرم معلوم ہوتا ہے۔ یہ حالت رفیعہ ہے۔ پھر غلبہ کے بعد اعتدال ہو جاتا ہے۔ جو اس سے ارفع ہے۔"

یہی وجہ تھی کہ آپ کسی عورت سے دوبدو ہو کر بے تکلف گفتگو نہ فرما سکتے تھے۔ سواری پر بیٹھتے وقت حتی الامکان ایسی جگہ بیٹھتے جہاں سامنے کوئی اور نہ بیٹھا ہو۔ کیونکہ اس سے آپ کو طبعاً الجھن ہوتی تھی ریل گاڑی گزرتے وقت عام دستور کے مطابق نظر اُٹھا کر مسافروں کو نہ دیکھتے تھے کہ مبادا کسی عورت پر نظر پڑ جائے۔ بیعت کے وقت اکثر عورتوں کی حضرت کے سامنے بے پردہ آنے کی خواہش ہوتی، بلکہ ان کے سرپرست بھی اس پر مصر ہوتے اور آپ ان کو ڈانٹ دیتے۔

ایک مرتبہ ایک بڑی ریاست کی وزیر زادی اپنے شوہر کے ساتھ بغرض بیعت تھانہ بھون حاضر ہوئیں اور آپ کی چھوٹی اہلیہ محترمہ کی معرفت بے پردہ حاضر ہونے کی اجازت چاہی حضرت نے صریحاً انکار کرنا تو خلاف مصلحت سمجھا کیونکہ

"اگر آزاد لوگوں کو شرعی حکم بتایا جاتا ہے تو وہ اس کی بے قدری کرتے ہیں۔ اور ان کے دل کو بات نہیں لگتی۔ بلکہ شریعت کا نام سُن کر عجب نہیں کہ شریعت کے متعلق کچھ طعن یا استخفاف کا کلمہ کہہ بیٹھیں۔"

اس لیے حضرت تھانوی جو تدبر کے بھی بادشاہ تھے۔ یہ لطیف تدبیر فرمائی کہ "اگر ان کو کچھ کہنا سُننا نہ ہو۔ تو خیر اجازت ہے۔ میں خود اپنی نظریں نیچی کر لوں گا۔ میرا کیا حرج ہے۔ اور اگر انھوں نے کچھ کہنا سُننا ہو تو میری طبیعت ہی کچھ ایسی ہے کہ میں کسی عورت سے دو بدو گفتگو کرتے ہوئے شرماتا ہوں اگر تم مجھ سے چہرہ کو کھول کر گفتگو کرو گی۔ تو میں گفتگو ہی نہ کر سکوں گا۔ میں اپنی طبیعت سے مجبور ہوں۔ لہٰذا اگر گفتگو کرنی ہے تو پردہ کی آڑ میں کرے۔"

چنانچہ اسے مجبوراً حضرت کی تجویز ماننی پڑی اور پردہ میں گفتگو کی۔

حفظِ حدود

سلطان ابن سعود کے زمانۂ اقتدار میں جب مزارات وقبور کا انہدام وقوع میں آیا۔ تو اس کے خلاف ہر طرف سے احتجاج ہونے لگا۔ اور رسائل وغیرہ لکھے جانے لگے۔ ایک صاحب نے اپنے دو ایسے رسالے بھی بغرض مطالعہ حضرت کی خدمت میں بھیجے۔ جن میں انھیں خبیث تک لکھا گیا۔ حضرت تھانویؒ نے انھیں لکھا کہ :۔

"رسائل مرسلہ سے اُمید قوی ہے کہ وہ مجھ کو مستفید کریں گے۔ مگر جو دو رسائل اہلِ نجد کے متعلق ہیں ان سے غالباً میں محروم رہوں گا۔ کیونکہ بوجہ فقدان ذرائع مخالفت یا موافقت میرا مسلک ان کے طرزِ عمل کے باب میں سکوت ہے۔ البتہ ان کے جو مسائل مجھ کو معلوم ہیں ان میں سے بعض میں ان کے ساتھ

بھ کو سخت اختلاف ہے۔ جیسے مفہوم شرک میں غلو اور توسل یا شد رحال میں میں تشدد۔ مگر ان کے رد کے وقت بھی میں سخت الفاظ استعمال نہیں کرتا۔ ہمارے لیے یہ مشکل ہے کہ ہم کھل کر کسی کو کچھ نہیں کہہ سکتے۔ کیونکہ حدود رد کتے ہیں۔ یہاں تک کہ مخالفین کو بھی نہیں کہہ سکتے۔ مجھ سے نجدیوں کے بارے میں ایک صاحب نے پوچھا۔ تو میں نے جو حقیقت تھی ظاہر کر دی کہ وہ لوگ نجدی ہیں وجدی نہیں۔ حالانکہ وجدی ہونے کی بھی سخت ضرورت ہے۔"

اظہارِ افسوس کرتے ہوئے مزید فرمایا کہ:-

"کسی کو کیا کہا جائے۔ بعض اہلِ حق بھی آجکل بدعات کی رو میں حدود کی پوری رعایت نہیں رکھتے۔ جس بدعت کا جو درجہ ہے۔ مثلاً اعتقادی یا عملی یا اجتہادی و غیر اجتہادی وغیرہ۔ اس کو اسی درجہ پر رکھ کر منع کرنا چاہیے۔ حدود سے کیوں تجاوز کیا جائے۔"

حفاظتِ اُمت

حضرت تھانویؒ ہمیشہ قومی مفاد پر ذاتی مفاد قربان کر دیتے تھے۔ ایک مرتبہ ایک صاحب گنے کے رس کا گھڑا ہدیۃً لائے۔ حضرت نے وہ بدیں وجہ لینے سے انکار کر دیا کہ یہ "اس زمین میں کاشت شدہ گنوں کا رس ہے۔ جو رہن پڑی ہے۔ اگرچہ وہ خاص صورت رہن کی جو یہاں واقع تھی۔ جائز ہے۔ لیکن میں کس کس سے کہتا پھروں گا کہ یہ وہ رہن ہے جو جائز ہے سب یہی کہیں گے کہ رہن کی زمین کا رس لے لیتا ہے۔ لہٰذا رہن رکھنا جائز ہے۔ اپنا تو دُنیا کا فائدہ کر لوں اور دُوسروں کے دین کا نقصان کروں۔ یہ مجھ سے نہیں ہو سکتا۔"

آپ کو طالب علمی کے زمانہ میں تو مناظرہ کا بڑا شوق تھا۔ مگر بعدازاں اس سے اتنی ہی نفرت ہو گئی فرماتے تھے کہ کسی مناظرہ کی جب خبر سُنتا ہوں کہ اہلِ بدعت کے

مقابلہ میں اپنی جماعت غالب آگئی ہے۔ تب بھی صدمہ ہوتا ہے کہ عوام کیا کہتے ہوں گے کہ مولوی آپس میں لڑ رہے ہیں۔ ایسے مناظروں سے عوام کو بہت ضرر پہنچتا ہے۔ مناظروں اور جوابی رسالوں نے اہلِ باطل کو بہت فروغ دے دیا ہے ورنہ اگر بے پروائی برتی جاتی اور ان کے رد میں کچھ التفات ہی نہ کیا جاتا۔ تو ان کو اتنی اہمیت حاصل نہ ہوتی جتنی اب حاصل ہو گئی ہے۔ البتہ اہلِ باطل کا اثر مٹانے کے لیے حق کی تقریر و اشاعت بار بار اول جا بجا کرنا نافع ہے۔" اسی لیے آپ اپنے مواعظ میں رد بدعات و خرافات کے دوران میں اہلِ باطل کا نام تک لیے بغیر سب کچھ فرماتے جاتے تھے۔

خیر خواہیِ خلق

حضرت تھانویؒ ہر نماز میں امتِ مسلمہ کے لیے یہ دعا مانگا کرتے:-

اللھم عافنا واعف عنا اللھم اعط کل خیر لکل مسلم ومسلمۃ
اللھم اعز الاسلام والمسلمین واجعلنا منھم واخذل الکفرۃ والمشرکین
ولا تجعلنا منھم اللھم اصلح امۃ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللھم
انصر امۃ محمد صلی اللہ علیہ وسلم ارحم امۃ صلی اللہ علیہ وسلم۔

یہاں تک کہ جانوروں تک کے لیے بھی دعا فرمایا کرتے تھے۔

ترکوں کی شکست کی خبر سن کر آپ کو از حد صدمہ ہوا۔ فرماتے تھے: "اللہ تعالےٰ نے مجھ کو ہمیشہ راحت ہی راحت میں رکھا۔ اس لیے میں نے کبھی یہ نہ جانا کہ غم کیسا ہوتا ہے۔ لیکن اب معلوم ہوا کہ غم اس کو کہتے ہیں۔ کیونکہ ترکوں کی شکست اور مسلمانوں کی ذلت و خواری کا قلب پر اتنا شدید صدمہ ہوا کہ کھانا پینا بھی تلخ ہو رہا ہے۔"

اس طرح بہار کے قیامت خیز زلزلوں کے حالات سن سن کر اس درجہ متاثر تھے کہ بے چین ہو جاتے تھے اور بار بار بے اختیار منہ سے ایسے پردرد دعائیہ الفاظ نکلتے تھے کہ پاس بیٹھنے والوں کے کلیجے بھی منہ کو آجاتے تھے۔ بسا اوقات تو اتنا تاثر ہوتا کہ فرماتے

زیادہ دل برا کرتے ہوئے بھی ڈر لگتا ہے کہ کہیں یہ ہمدردی نعوذ باللہ اللہ تعالیٰ کی شکایت کی حد تک نہ پہنچ جائے۔ بڑا مشکل معاملہ ہے۔ اگر دل برا نہ ہو۔ تو منفعت علی الخلق میں کمی ہوتی ہے۔ اگر دل برا کرتے ہیں تو شکایت کا اندیشہ ہوتا ہے۔ واقعی حدود کے اندر رہنا پل صراط پر چلنا ہے۔ بس اللہ تعالیٰ ہی عنایت فرماتے ہیں۔ ورنہ حدود کے اندر رہنا بڑا دشوار معاملہ ہے۔"

دلجوئی

حضرت تھانویؒ گو اصلاحی امور میں قدرے سختی سے کام لیتے تھے۔ مگر طالبین و سالکین کی باطنی پریشانیوں کے دور میں اور عین یاس کی حالت میں ایسی تسلی اور دلجوئی فرماتے تھے کہ آپ کی تحریر پڑھتے یا تقریر سنتے ہی وہ اپنے اندر بھی حالاً حالت تسلی محسوس کرنے لگتے تھے اور ایسے مختصر مؤثر اور دل نشین پیرایہ میں تسلی دیتے تھے کہ الجھی ہوئی طبیعت فوراً سلجھ جاتی تھی۔ جیسا کہ ان مثالوں سے ظاہر ہے۔

۱۔ ایک صاحب نے حسرت بھرے لہجہ میں کہا کہ حضرت جو کچھ صفائی باطن حضور کی صحبت کی برکت سے حاصل ہوتی ہے۔ وہ حضرت سے جدا ہونے کے بعد مکروہات دنیا میں پھنس کر رفتہ رفتہ سب غت ربود ہو جاتی ہے۔ یہ کیفیت سن کر آپ نے تسلی آمیز لہجہ میں فرمایا کہ :-

"جی پھر مضائقہ ہی کیا ہے۔ آپ اپنے کپڑے میلے کر ڈالتے ہیں۔ دھوبی ان کو دھو دیتا ہے۔ آپ پھر میلے کر ڈالتے ہیں۔ دھوبی پھر دھو دیتا ہے۔"

۲۔ ایک صاحب نے عرض کیا کہ حضرت میرے قلب کی بڑی ڈانواں ڈول حالت ہے۔ فرمایا کہ "اصلی قلب تو آپ ہی کا ہے۔ کیونکہ قلب کے معنی ہی یہ ہیں کہ جو ایک حالت پر نہ رہے۔ منقلب ہوتا رہے۔"

۳۔ ایک صاحب نے عرض کیا کہ انضباط اوقات کا پختہ عزم کر لیا تھا مگر ٹوٹ گیا۔ جواب میں فرمایا۔ غیر اضاعتِ وقت میں بھی اطاعتِ بخت کا مسئلہ حل ہوا کہ انسان تقدیرِ حق کے سامنے عاجز ہے۔ کہ ارادہ تو کیا تھا کہ ضبط اوقات کا اور ہو گیا خبط اوقات۔ انشاء اللہ اس مسئلہ کا منکشف ہونا بھی ترقی کا زینہ ہے۔

۴۔ ایک صاحب نے لکھا کہ اس دفعہ حاضرِ خدمت ہونے سے جو کیفیت پیدا ہوئی۔ وہ پہلے کبھی پیدا نہ ہوئی تھی۔ مگر افسوس کہ وہ اب رفتہ رفتہ زائل ہو گئی ہے۔ آپ نے لکھا کہ "کسی کیفیت کا طاری ہونا اور چندے جاری رہنا یہ بھی بسا غنیمت ہے۔ ہمیشہ رہنے کی چیز تو صرف عقل اور ایمان ہے۔ باقی سب آمد و رفت ہے۔"

صاحب اشرف السوانح لکھتے ہیں کہ :۔

"موافقین اور مخالفین منتسبین اور غیر منتسبین سب کو اقرار ہے کہ حضرت کے ہاں طالبین کی بڑی تسلی ہوتی ہے۔ چنانچہ حال ہی میں اپنے حضرات کے سلسلہ کے ایک شیخ نے اپنے کچھ اُلجھے ہوئے حالات بغرض حل اپنے ایک دوسرے ہم سلسلہ شیخ کو لکھے تو موخرالذکر شیخ نے باوجود حضرت والا سے بعض اُمور میں سخت اختلاف ہونے کے فرمایا کہ "ایسے اُلجھے ہوئے حالات کا حل تو بس تھانہ بھون میں ہی ہو سکتا ہے۔ سچ ہے۔ الفضل ما شہدت بہ الاعداء۔"

رجوع الی الحق

یہ ایک ایسی صفت ہے جو بہت ہی کم لوگوں میں پائی جاتی ہے۔ ورنہ عام طور پر خود رائی کے تحت لوگ قبولِ حق سے گریز کرتے ہیں۔ حضرت تھانوی اس معاملہ میں سب سے پیش پیش تھے۔ "ترجیح الراجح" کا سلسلہ قائم کرنے کے علاوہ (جس کا ذکر اگلے باب "عادات" میں آ رہا ہے) آپ نے بعض اعتراضات کا جواب لکھنے کا باضابطہ انتظام

فرما لیا تھا جس کا مجموعہ "حکایات الشکایات مع روایات الحکایات" کے نام سے شائع ہوا۔

آپ پر اگر کوئی کسی قسم کا علمی اعتراض کرتا اور وہ قابلِ قبول ہوتا۔ تو اس کو قبول فرما کر اپنی تحقیق سابق سے بلا تاملِ رجوع کر کے اپنا "رجوع ترجیح الراجع" میں شائع فرما دیتے تاکہ دیکھنے والے خود جس کے قول کو چاہیں۔ ترجیح دے سکیں۔

اگر اعتراض معاندانہ ہوتا۔ تو اس کی مطلق پروانہ کرتے اور نہ اپنی بریت جتلانے کی کوشش کرتے اگر ایسا اعتراض بذریعہ جوابی خط کے موصول ہوتا تو بجائے اپنا تبریہ فرمانے کے نہایت ہی استغناء کا جواب اس عنوان سے تحریر فرماتے کہ معترض کو اپنے اعتراض کے بالکل لغو اور ناقابل التفات ہونے کا احساس ہو جاتا۔ چنانچہ ایک شخص نے اپنے خط میں بہت ہی بیہودہ اعتراضات لکھ کر بھیجے۔ تو آپ نے اسے جواباً لکھا کہ:۔

"مجھ میں اس سے بھی زیادہ عیوب ہیں۔ مگر مجھے تو اپنے عیوب کی اشاعت کی توفیق نہیں ہوتی۔ تم ان کو مشتہر کر دو۔ تاکہ لوگ دھوکا میں نہ رہیں۔"

صرف ایک مرتبہ ایک علمی سوال کے ساتھ معاندانہ اعتراض بھی آیا۔ تو اس اجتماع کی وجہ سے موخر الذکر اعتراض کے متعلق بھی وہی معاملہ فرمایا۔ جو علمی رنگ کے اعتراضات سے فرماتے تھے یعنی ان اعتراضات کو مع جوابات اس مصلحتِ دینیہ کی بنا پر شائع فرما دیا کہ:۔

"بناء عقیدت وعدم عقیدت کے متعلق لوگ دھوکا میں نہ رہیں۔ اور ان سب اعتراضات کو مع ان کے جوابات کے دیکھ کر آزادی سے جو چاہیں فیصلہ کریں اور جو چاہیں رائے قائم کریں۔"

اس سلسلہ میں حضرت کے مذاق کی تفصیل اس کتاب کے تیسرے حصّہ "اصول زندگی" میں آپ کو ملے گی۔

منّت شناسی

آجکل تو منت شناسی یا ادائے حق کا جذبہ سرے سے ہی ناپید نظر آتا ہے مگر حضرت تھانویؒ اس کا بہت خیال رکھتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ آپ اپنے سارے کمالات کو حضرت حاجی امداد اللہ قدس سرہٗ کی طرف سے منسوب فرماتے تھے اور نہایت وثوق سے فرمایا کرتے تھے۔ کہ "مجھے تو اپنی حالت اچھی طرح معلوم ہے آخر حضرت حاجی صاحبؒ کی خدمت میں حاضری سے قبل بھی تو میں تحصیل علوم اور مدرسی کیے ہوئے تھا۔ لیکن وہ باتیں جو حضرت حاجی صاحب کی خدمت میں حاضری کے بعد ذہن میں آنے لگیں۔ وہ اس سے پہلے کبھی خواب وخیال میں بھی نہ آتی تھیں۔ لہٰذا یہ حضرت حاجی صاحبؒ کا فیض نہیں تو اور کیا ہے اور بقائے فیض کی شرط یہ ہے کہ اپنے شیخ کے ساتھ عمر بھر اعتقاد اور امتنان کا تعلق قائم رکھا جائے۔"

ہمدردی

آج کل زبانی انسانی ہمدردی کا تو عام چرچا ہے مگر عملی ہمدردی کا جذبہ عنقا ہے۔ مگر حضرت تھانویؒ کے قول وفعل میں کبھی تضاد نہیں پایا گیا۔ آپ کے ہاں صرف زبانی ہمدردی کا دستور ہی نہ تھا بلکہ عملی ہمدردی میں پیش پیش رہتے تھے۔ اپنے سفر بہاولپور کے سلسلہ میں فرمایا کہ جب میں بہاولپور گیا تو سخت گرمی تھی۔ جیل خانے کے قیدیوں کو پنکھا کھینچنے کے لیے بلایا گیا۔ پہلے یہ بات مجھے ناگوار گزری اور چاہا کہ ان کو واپس کر دوں لیکن اس کے ساتھ یہ خیال بھی آیا کہ جیل کی زندگی سے ان بے چاروں کو تھوڑی دیر کے لیے اس ذریعہ سے رہائی تو مل جاتی ہے۔ یہ سوچ کر میں نے ان کو واپس کر دینے کا خیال تو دل سے نکال دیا اور انتظار کرتا رہا۔ جب سب لوگ چلے گئے تو میں نے ان قیدیوں سے کہا کہ پنکھا بند کر دو۔ پھر جی چاہے تو سو رہو۔ یا بیٹھے رہو۔ کیونکہ بیگار لینا جائز نہیں ہے۔ جب کھانا آیا تو ان قیدیوں کو بھی کھانا دلوایا۔ پھر تو ہر قیدی یہ خواہش کرتا تھا کہ میں بلایا جاؤں۔"

عادات

دوستی کو ترجیح

آپ کی عادت تھی کہ جو حضرات آپ سے دوستانہ یا عقیدت مندانہ تعلقات استوار کیے ہوئے تھے۔ اور ساتھ ہی ساتھ فقہی مسائل میں آپ کے فرمودات سے اختلاف بھی کرتے جاتے تھے۔ صرف اختلاف ہی نہ کرتے تھے بلکہ ان پر اصرار بھی کرتے تھے۔ تو آپ بوجہ شفقت دُوسروں کی طرح ان کو دھتکار نہ دیتے تھے۔ بلکہ انہیں ایسے معاملات میں دُوسرے بزرگانِ دین کی طرف رجُوع کرنے کی ترغیب دیتے تھے۔ تاکہ دوستی بھی قائم رہے اور ان کی اصلاح بھی ہوتی رہی۔ ایسا سوائے مردانِ حق کے اور کوئی نہیں کر سکتا۔ کہ اپنے مرید باصفا کو کہے کہ عقیدت تو مجھ سے رکھو اور معاملت دُوسرے سے۔ یہ شرف صرف آستانِ اشرفیہ کو ہی حاصل تھا۔ کیونکہ وہاں دکانداری نہ تھی۔ ایمانداری تھی۔

حضرت تھانوی کی فہرست میں ایسے یہ تین بزرگ تھے۔ جو عقیدت کے ساتھ ہی فقہی مسائل میں اختلاف بھی کرتے تھے۔

۱۔ حضرت مولانا سید سلیمان ندویؒ۔ ۲۔ حضرت مولانا عبدالماجد دریابادیؒ۔

۳۔ حضرت مولانا عبدالباری ندویؒ۔

ان حضرات کا علم وفضل کے لحاظ سے جو مقام ہے وُہ کسی سے مخفی نہیں۔ پھر ماسوائے سید صاحب کے دونوں فلسفی تھے۔ اور یہی علم وفضل فلسفہ ہی اختلاف کی جرات پیدا کر رہا تھا جس کا مولانا عبدالماجد نے ان الفاظ میں اظہار فرمایا ہے :۔

"حضرت کی تصانیف۔ ملفوظاتِ مواعظ کے مطالعہ کا سلسلہ برابر تیزی۔ سرگرمی و مستعدی سے جاری تھا۔ خوب خوب نکتے ملتے تھے۔ بڑی بڑی بصیرتیں حاصل ہوتیں تھیں۔ برسوں کے جمے ہُوئے عقائد و خیالات پر بار بار نظرثانی کرنی پڑتی تھی۔ بعض بعض مسائل پر طبیعت بھڑک اُٹھتی تھی زبان سے بے اختیار داد اور دعا دونوں نکلتیں۔ دل کبھی کبھی اُنھیں عزائی وقت ٹھہراتا اور کبھی چپکے چپکے اللہ سے اُن کی عمر و صحت میں برکت طلب کرنے لگتا۔ غرض عقیدت و عظمت کی ہر منزل دل

میں گھر کیے ہوئے تھی۔ اس پر بھی طبیعت کی کجی کہیے یا فہم کی کمی یا شاعر کی زبان میں

ٹیڑھا لگا ہے فقط قلم سرنوشت کو

سیاسیات تو پھر خیر دُور کی چیز تھی۔ فقہیات تک میں انقیاد کامل اور سو فیصدی انقیاد کا درجہ کسی طرح حاصل نہ ہوا سیاسیات میں تو یہ غیر مقلدی خوب نمایاں تھی، فقہیات میں بھی کچھ ایسی شاذ نہ تھی۔"

(حکیم الامت صت ۱۳۰)

پھر یہ حضرات سوالات بھی ایسے کرتے تھے جن کی معقولیت میں بظاہر کوئی شبہ نہیں ہو سکتا تھا۔ مثلاً مولانا عبدالماجد نے آپ کو اپنا ایک اشکال ان الفاظ میں بھیجا :-

"ملفوظات "حسن العزیز" جلد ۲ صد ۲۳۹ پر یہ عبارت نظر آئی کہ ایک شخص تھے اصحاب فقہ سے۔ انھوں نے اپنا پیام اصحاب حدیث میں کسی کے یہاں دیا۔ انھوں نے قید لگائی کہ تم کو رفع یدین وغیرہ کرنا ہوگا۔ انھوں نے منظور کر لیا۔ ایک بزرگ نے فرمایا کہ اس شخص کے بارے میں مجھے اندیشہ ہے کہ مرتے وقت اس کا ایمان نہ سلب ہو جائے محض مردار دنیا کے لیے ایسی چیز کو بلا تحقیق ترک کر دیا۔ جس کو دین سمجھتا تھا۔

سوال یہ ہے کہ رفع یدین اس شخص کے نزدیک معصیت تو نہ تھا۔ بس غیر افضل تھا تو ایک مقصد مباح کے لیے اس نے ایک سُنت کی بجائے دوسری سُنت پر عمل شروع کر دیا۔ تو اس میں سلب ایمان کے اندیشہ کی کون سی بات پیدا ہو گئی؟"

سوال کی اہمیت و شدت اس کی عبارت سے واضح ہے اور کسی غیر حکیم کے ماتھے پر تیوڑ لانے کے لیے کافی ہے۔ مگر آپ نے اس فلسفی کے اس سوال کا ایسا حکیمانہ جواب دیا کہ اسے آیندہ کے لیے اپنے فلسفہ پر ایمان نہ رہا۔ آپ نے لکھا :-

"یہ قصہ رد المختار شرح در مختار باب التعزیر قبیل باب السرقہ میں مذکور ہے۔ اور یہ بزرگ ابوبکر جوزجانی ہیں۔ جن کے قول کے خلاف تحقیق کہنے میں مبارزت نہیں ہو سکتی۔ اور وہ تحقیق انما الاعمال بالنیات سے ظاہر ہے۔ کیونکہ بناء اس ترک سُنت کی دوسری سُنت کا من حیث السنت اختیار کرنا نہ تھا۔ بلکہ محض جیفہ دنیا کا دین پر ترجیح دینا تھا۔ جس کی حقیقت استخفاف دین اور استعظام دُنیا ہے۔ اور اس کا وہی اثر ظاہر ہے۔ جو ان بزرگ نے فرمایا

ورنہ سوال کے سبب مقدمات نماز بقصد ریا میں بدرجہ اولیٰ جاری ہیں۔ کیا ریا بھی مباح ہو جائے گا۔"

اس کافی وشافی جواب کے ساتھ آپ نے انھیں اپنے دستور العمل سے ان الفاظ میں آگاہ فرمایا :۔

"میں نے مدت سے یہ فیصلہ کر لیا ہے کہ جن احباب سے محض دوستی ہے۔ ان سے عقائد و احکام میں گفتگو نہ کروں گا۔ یا تو خیریت کی اطلاع و استطلاع کا تعلق رکھوں گا یا دعا کا اور یا معالجہ نفسیات کی تحقیق کا اور ایسے احباب کی فہرست میں جناب کا اور مولانا عبد الباری صاحب (ندوی) اور جناب سید سلیمان صاحب (ندوی) کا نام ذہن میں تجویز کیا ہے۔ ان دونوں صاحبوں کو بھی اس کی اطلاع دے چکا ہوں۔ ایسی تحقیقات کے لیے مولانا حسین احمد صاحب و مولانا انور شاہ صاحب کی طرف توجہ دلاتا ہوں۔" (حکیم الامت صہ ۱۳۴)

یہ مباحث بہت گنجائش رکھتے ہیں۔ ان میں کلام کہیں ختم نہیں ہوتا۔ دوستوں میں ایسا کلام جو کبھی ختم نہ ہو۔ کشاکشی کی صورت پیدا کر دیتا ہے۔ اس لیے ایسے بزرگ سے تحقیق مناسب ہے جس سے زیادہ کلام نہ کیا جا سکے۔" (ایضاً صہ ۱۳۴)

"اب بے تکلفی کے سبب اپنی اس تجویز کا راز بتلاتا ہوں۔ وہ یہ کہ ہر فن میں اس شخص سے پوچھنا چاہیئے۔ جس میں اس شخص کے ماہر ہونے پر اعتماد ہو۔ سکون میں اس کو بڑا دخل ہے۔ اور یہ واقعہ ہے کہ مجھ کو فقہیات میں ماہر نہیں سمجھا جاتا۔" (ایضاً صہ ۱۳۶)

مردِ درویش کا یہ جواب پڑھ کر اس ماہرِ فلسفی کو وجد آ گیا اور بے ساختہ ان کی زبانِ قلم سے نکلا :۔

اے لقائے تو جواب ہر سوال
مشکل از تو حل شود بے قیل و قال

اللہ تعالیٰ آپ کی عمر میں اتنی برکت تو ضرور عطا فرمائے کہ جب تک ہم طالبین مسترشدین کا جی چاہے ہمارے درمیان ارشاد و افادہ کے لیے سلامت باکرامت رہنے دے۔" (ایضاً)

آپ کے دستور العمل کی ندرت دیکھئے کہ تحقیق مسائل دین کے لیے مولانا حسین احمد صاحب کی طرف رجوع کرنے کا امر فرما رہے ہیں۔ جن سے سیاسی مسائل پر آپ کو شدید اختلاف تھا۔ جو آپ کی وسعت قلبی اور وسیع الظرفی پر دال ہے۔ اور اس کی کرامت دیکھئے کہ مولانا عبدالماجد جیسے ماہر فلسفی یہ کہنے پر مجبور ہو گئے کہ:-

"فقہ اور فقہا دونوں کے خلاف تو تعصب کا زنگ برسوں سے جما ہوا تھا اور ہر فقیہ اپنے خیال میں نرا کٹھ ملا تھا۔ یہ علم مولانا ہی کی مجلس میں بیٹھ کر اور ان کی زبان سے مختلف فقہی مسائل کی توضیح و تشریح بار بار سن کر حاصل ہوا تھا کہ فقہا کی جماعت حمقاء کی نہیں۔ درحقیقت حکماء کی جماعت ہوتی ہے اور فقہ اٹکل پچو باتوں کا نام نہیں قرآن و سنت ہی کی حکیمانہ تشریح و استنباط کا نام ہے۔" (ایضاً ص ۱۳۲)

مخالفین سے حسن سلوک

اب تصویر کا دوسرا رخ دیکھئے۔ متذکرہ صدر واقع تو اس بات کا شاہد ہے کہ آپ نے محض دوستی برقرار رکھنے کے لیے اپنے معتقد خاص کو اختلافی مسائل میں ان کی طرف رجوع کرنے کی ترغیب دی۔ جن سے آپ کو شدید سیاسی اختلاف تھا۔ مگر شدت اختلاف کے باوجود آپ کو اپنے معتقد خاص کے مقابلہ میں اپنے مخالف کی رعایت کتنی مطلوب تھی اس کی حقیقت مندرجہ ذیل واقع سے کھلتی ہے۔

مولانا حسین احمد مدنی سے وجہ اختلاف کانگرس میں مسلمانوں کی شرکت تھی۔ جسے مولانا مدنی فرض بتلاتے تھے اور جس کے مولانا تھانویؒ نہ صرف "تارک" تھے بلکہ مخالف بھی تھے۔ مولانا عبدالماجد دریابادی کو حضرت تھانوی نے ہی اس زمانہ میں جبکہ ابھی مولانا

مدنی نے مسلمانوں کی شرکت کانگرس کو فرض قرار نہیں دیا تھا۔ ترغیب دے کر اور مولانا مدنی کو تاکید فرما کر مولانا عبدالماجد کو ان کے ہاتھ پر بیعت کرایا تھا۔ حالانکہ خود سلسلہ بیعت رکھتے تھے۔ مولانا عبدالماجد کے گو ضابطہ کے مرشد مولانا مدنی تھے۔ اور وہ ان سے فیوض ظاہری و باطنی بھی حاصل کر رہے تھے۔ مگر رشد و ہدایت کے سلسلہ میں ان کا قلبی رجحان زیادہ تر حضرت تھانوی کی طرف تھا۔ جب ان ہر دو بزرگوں کے سیاسی اختلاف بڑھے۔ تو اس حکیم فطرت نے مولانا عبدالماجد کو مشورہ دیا کہ :-

"معتبر ذرائع سے معلوم ہوا ہے کہ حضرت مولانا حسین احمد صاحب کانگرس کی شرکت کو فرض فرماتے ہیں۔ اس صورت میں معلوم نہیں اپنے خاص متعلقین کے لیے "تارکین فرض" سے خاص تعلقات رکھنے کو عقلاً یا شرعاً یا طبعاً پسند فرماتے ہیں یا نہیں۔ اس لیے خاص عقیدت رکھنے والوں پر لازم ہے کہ مولانا سے ایسے طریقہ سے کہ مولانا اپنا اصلی خیال ظاہر فرماویں۔ ضرور تحقیق کرلیں کہ مجھ جیسے تارکِ فرض سے اُن صاحبوں کا ملنا ان کے قلب لطیف پر گراں تو نہ ہوگا۔ کیونکہ گرانی کی صورت میں باطنی فیوض منقطع ہو جاتے ہیں جو ضررِ عظیم ہے اور اگر ملنا گراں ہو تو چند روز کے لیے مجھ سے ملنا بند کر دینے سے ضرر کچھ نہیں۔ پھر جب موقع ہوگا۔ عود ہو جائے گا۔ اور میں زمانۂ بے تعلقی میں بھی دُعاگو رہوں گا۔" (حکیم الامت صہ ۱۶۱)

دوست کے مفاد اور مخالف کے مزاج کی اس سے بڑھ کر رعایت اور کیا ہو سکتی تھی آپ نے صرف مشورہ پر ہی اکتفا نہیں کیا۔ بلکہ استصواب بھی خود ہی تجویز کر کے بھیجا کہ :-

"اشرف کا ایک فتویٰ ممانعتِ شرکت کانگرس میں نظر سے گزرا۔ جس سے انگریزوں کو قوت پہنچنے کا احتمال ہے۔ اس لیے ملنے کو دل نہیں چاہتا۔ لیکن چونکہ پہلے سے ملتا تھا۔ اس لیے شبہ یہ ہوتا ہے کہ شاید نہ ملنا مضرِ دین ہو۔ اس صورت میں اولیٰ کیا ہے۔ ملنا یا نہ ملنا مضر ہوگا یا نہ ملنا ؟" (ایضاً صہ ۱۷۲)

اس ہدایت نامہ اور استصواب نامہ کا اس فلسفی کے قلب و دماغ پر کیا اثر پڑا۔

یہاں اس سے بحث نہیں۔ ہمیں تو صرف اتنا دیکھنا ہے کہ حضرت تھانوی کا اپنے مخالفین سے کس قسم کا سلوک اور برتاؤ تھا؟ سیاسی مخالف سے حضرت کی رعایت و سلوک کی مثال آپ کے سامنے گزر چکی ہے۔ اب ایک مثال اب آپ کے مذہبی مخالف سے حسن سلوک کی پیش کی جاتی ہے۔

حضرت تھانوی کے حاشیہ نشینوں میں ایک بزرگ ایسے بھی تھے جو زبان اور قلم دونوں کو بے لگام رکھتے تھے۔ وہ نہ صرف حضرت کی بعض تحریروں کی تنقید و تنقیص کرتے بلکہ کچھ غیر ضروری باتیں بھی کر گزرتے۔ جو حضرت کے معتقدین پر گراں گزرتیں۔ آخر مولانا عبدالماجد نے ہی ان کے خلاف حضرت تھانوی کو شکایت لکھ بھیجی۔ جس کے جواب میں آپ نے لکھا :-

"وہ عنایت کرتے ہیں اور میں رعایت۔ آپ کو شاید اس کا علم نہ ہوا ہو کہ وہ میری تحریرات پر بھی ایسی ہی آزادی سے کلام کرتے ہیں۔ جن میں اگر مضمون صحیح ہوا قبول کر کے اپنے قول کو واپس لے لیتا ہوں۔ ورنہ قبول نہیں کرتا۔ لیکن برا نہیں مانتا۔ صرف نیت پر نظر کر کے۔"

دشمنوں سے درگزر

مخالفین سے ایسے نرم۔ مہذب اور متین سلوک کی مثال شاید تاریخ مشاہیر پیش نہ کر سکے۔ مخالفین سے ایسا نرم سلوک کرنے کے ساتھ ساتھ آپ ان لوگوں کے جذبات کا بھی بڑا احترام کرتے تھے۔ چنانچہ ایک اور موقعہ پر آپ نے ایک ایسی شکایت کے جواب میں لکھا :-

"میں اپنے مخالفین اور موذیوں (ایذا دینے والوں) کے جذبات کی بھی رعایت کرتا ہوں کہ ان پر نیک نیتی کا بھی احتمال رکھتا ہوں۔ اور صبر تو ہر حال میں کرتا ہوں۔ احمد رضا خاں (بریلوی) کے جواب میں کبھی ایک سطر بھی نہیں۔ کافر۔ خبیث۔ ملعون سب کچھ بنتا رہتا ہوں۔

ابھی ابھی ایک عنایت فرما کا خط آیا تھا۔ اس میں مجھ کو گدھا تک لکھا ہوا

ہے۔ مگر میں ان مراقبات کو اپنا امام بناتا ہوں:۔

۱۔ اپنی زبان، قلم یا قلب کو ملوث کیا۔ میرا کیا بگڑا۔ رہا رنج وہ کوئی بگاڑ نہیں محض خیال کے تابع ہے۔

۲۔ ممکن ہے اس شخص کی نیت اچھی ہو۔ مثلاً امر بالمعروف ونہی المنکر۔ اس لیے وُہ معذور ہو گو ہم بھی اس لیے معذور ہوں کہ ہم اپنے کو حق پر سمجھتے ہوں یا اپنی غلطی بھی نظر میں ہو۔ مگر اصلاح کا طریق ہماری رائے میں اس سے سہل اور اسلم ہو۔

۳۔ اگر اس نے ہم کو ناحق بھی رنج دیا۔ تو اپنی عاقبت خراب کی۔ ہم کو صبر کا ثواب مِلا۔

۴۔ نیز ایسے واقعات سے بھی بعض اوقات اپنی کوتاہیوں پر نظر ہو کر اِصلاح کی توفیق ہو جاتی ہے۔ اگر یہ بھی نہ ہو۔ تو کم از کم معتقدین کی عنایت سے جو عجب و کبر پیدا ہو گیا تھا یا ہو سکتا تھا۔ اس کا ازالہ یا انسداد ہو جاتا ہے۔

۵۔ نیز خود بھی ایسے مخاطبات اپنے سے سرزد ہو جاتے ہیں۔ اپنی ناگواری سے ان کی ناگواری سامنے آجاتی ہے۔ اور ایسے مخاطبات سے اجتناب کی توفیق ہو جاتی ہے۔ (حکیم الامت ص۱۸۵)

احکم الحاکمین کا حکم ہے کہ دُوسروں کے متعلق زیادہ بدگمانی سے کام نہ لو کہ یہ گناہ ہے اور رحمۃ اللعالمین کا ارشاد ہے کہ خطا کا جواب عطا سے دو۔ مخالفین اور ان کی انتہا درجہ کی ایذا رسانی کے مقابلہ میں ان کے جذبات کی رعایت کرتے ہوئے حضرت تھانویؒ نے ان سے نپٹنے کے جو مندرجہ بالا اصُول بنا رکھے تھے۔ وہ آبِ زر سے لِکھنے کے قابل ہیں مگر ایسی عالی ظرفی اور شرارتِ نفس کا ثبوت آپ کو بڑے بڑے مدعیانِ رشد و ہدایت کے ہاں نہیں مِلے گا۔ کیونکہ انتقام و انتظام کی یہ صلاحیتیں کسبی نہیں۔ وہبی تھیں اور یہ انہی کی برکت تھی کہ اگر کوئی شخص آپ سے اپنے مخالفین سے افہام و تفہیم کی

درخواست کرتا۔ تو آپ اس سے انکار نہیں کرتے تھے۔ بلکہ بعض شرائط ضابطہ کے ساتھ فوراً تیار ہو جاتے۔ جیساکہ واقعہ ذیل سے ظاہر ہے۔

مفاہمت میں مسابقت

ہندوستان میں جس قدر سیاسی طوفان آئے۔ ان میں خلافت اور کانگرس کی سول نافرمانی کی تحاریک یادگار زمانہ تھیں۔ سول نافرمانی کی تحریک میں مقتدر علماء کی ایک جماعت بھی کانگرس کے ہمنوا تھی۔ جن میں سے مولانا محمد علی جوہر پیش پیش تھے۔ مگر مولانا اشرف تھانوی اصولی طور پر اس کے مخالف تھے۔ اس وقت بعض مخلصین ایسے بھی تھے جو ایک طرف تو مولانا محمد علی سے عقیدت رکھتے تھے اور دوسری طرف انھیں حضرت تھانوی سے محبت تھی۔ ان پر یہ امر بہت گراں گزرتا تھا کہ دین وملت کے ان دو خادموں کے درمیان اختلافات کی خلیج وسیع رہے۔ کیونکہ اس اختلاف نے ان کی اپنی حالت نازک بنا رکھی تھی کہ وہ اپنے سیاسی مقتدا کا کہا مانیں یا اپنے مذہبی پیشوا کی پیروی کریں۔ اس لیے ان میں سے بعض نے ان کے درمیان مفاہمت ومصالحت کی خاطر ان کی آپس میں افہام وتفہیم کرانے کی کوشش کی اور اس میں سب سے زیادہ حصہ مولانا عبدالماجد صاحب نے لیا۔ جن کے دل میں مولانا محمد علی کی عظمت ومحبت اگر مولانا تھانویؒ سے زیادہ نہ تھی۔ تو کم بھی نہ تھی۔ اس لیے انھوں نے جرأت کر کے حضرت تھانویؒ سے کہہ ہی دیا کہ :۔

"حضرت! ایک مرتبہ تو ملاقات حضرت اور مولانا محمد علی کے درمیان ہی ہو جانا چاہیئے۔ حضرت تو سفر کرنے سے رہے۔ اجازت ہو تو ان کو ہی کبھی اپنے ہمراہ یہاں لے آؤں۔ جیسا آپ کی خدمت میں گستاخ ہوں۔ ویسے ہی انھوں نے بھی منہ لگا رکھا ہے۔ اُمید کیا بلکہ یقین ہے کہ عرض رائیگاں نہ جائے گی۔ انشاء اللہ کچھ تو غلط فہمیاں دونوں طرف کی ملاقات ہی سے دُور ہو جائیں گی۔" (حکیم الامت صہ ۱۳۶)

حضرت تھانوی ان "بزرگوں" میں سے نہ تھے۔ جو کسی سے اختلاف رائے کی وجہ سے اس کی شکل دیکھنے کے بھی روادار نہ ہوں۔ بلکہ وہ تو ایسے مواقع کی تلاش میں رہتے تھے اور مخالفین کو بھی سینے سے لگانے سے انکار نہ کرتے تھے۔ چونکہ حکیم روحانی تھے۔ اس لیے ایسے مواقع پر بھی حکمت ہی سے کام لیتے تھے۔ حضرت تھانویؒ نے پہلے تو از راہ تواضع و انکسار فرمایا کہ :۔

"وہ بڑے آدمی ہیں۔ یہاں کہاں آئیں گے۔ یہاں آنے کی انہیں دعوت دینا ہرگز مناسب نہیں۔ بڑی زحمت ہوگی۔"

اس سے صاف ظاہر ہے کہ انہیں ملنے سے انکار نہ تھا مگر وہ ان کو تکلیف دینا بھی گوارا نہیں کرتے تھے کہ دہلی سے چل کر تھانہ بھون تک آئیں۔ ایسی فضا میں اگر مولانا عبدالماجد حضرت تھانویؒ سے درخواست کرتے کہ اچھا آپ خود ہی جا کر ملیں تو وہ یقیناً اس سے بھی انکار نہ کرتے۔ مگر وہ غایت محبت و عقیدت کی وجہ سے اتنی جرأت نہ کر سکے اور فوراً کہا :۔

"اس سے حضرت کو کیا بحث۔ لانے والا اور بلانے والا تو میں ہوں۔ اُن کے آنے کی ساری ذمّہ داری میرے سر۔ میں صرف آپ کی اجازت چاہتا تھا۔ رہی ان کی زحمت و تکلیف۔ تو اس سے کہیں بڑھ چڑھ کر تکلیف وہ مقامات اور ٹھیٹھ دیہات میں جانے اور ٹھہرنے کے وہ عادی ہیں۔ ان کی زحمت کا تو خیال بھی نہ فرمایئے۔"

اس وقت اگر حضرت تھانوی کی جگہ کوئی اور ہوتا تو وہ اس میں فخر محسوس کرتا اور فوراً مان جاتا۔ مگر اس مصلح اور حکیم نے عجیب ضابطہ کا جواب دیا فرمایا :۔

"عرصہ ہوا فلاں صاحب نے بھی اس قسم کی تحریک کی تھی۔ پہلے تو میں نے ان کو بھی یہی جواب دیا تھا کہ بڑے آدمی کو یہاں بلانا مناسب نہیں لیکن ان صاحب کے اصرار پر میں نے جو کہا تھا۔ وہی آپ کے سامنے

دہرائے دیتا ہوں۔ میری تجویز ہے کہ اگر وہ تشریف لائیں تو اتنا وقت بہرحال دیں کہ درمیان میں ایک رات یہاں گزار سکیں۔ پہلے دن جب وہ تشریف لائیں گے۔ میں اٹھ کر ان کی تعظیم کروں گا۔ عزت سے اپنے قریب ہی بٹھاؤں گا۔ لیکن اتنی عنایت وہ کریں کہ مسائل پر وہ اس روز گفتگو نہ فرماویں۔ بلکہ میرے معروضات خاموشی کے ساتھ بلاقصد جواب سُن لیں۔ آدمی ذہین ہیں۔ اگر طبیعت فوراً جواب پر آمادہ ہوگئی۔ تو میری ہر بات کا کچھ نہ کچھ جواب دیتے ہی جائیں گے اور میری کوئی بات بھی قبول نہ کریں گے۔ بس اس وقت صبر و خاموشی سے سُن لیں۔ شب میں آرام کریں۔ اور طبیعت کو خلوے ذہن کے ساتھ میرے معروضات پر سوچنے کا موقعہ دیں پھر دوسرے روز جو چاہیں اور جتنی دیر تک چاہیں ارشاد فرمائیں۔ میں بھی اُسی خاموشی کے ساتھ سُننے کو تیار ہوں گا۔"

(حکیم الامت ص ۱۴۷)

آپ جس خوشی سے مولانا سے افہام و تفہیم کے لیے تیار ہو گئے تھے۔ اس کے مقابلہ میں مولانا محمد علی کی طرف سے ایسا مظاہرہ نہ کیا گیا۔ جیسا کہ مولانا عبدالماجد کے اپنے ان الفاظ سے ظاہر ہے :-

"دلی جا۔ خوش خوش یہ پیام میں نے اپنی طرف سے مولانا محمد علی کو پہنچایا اور عرض کیا کہ تھانہ بھون کا پروگرام میرے وہاں قیام کے زمانہ میں بنائیں اس پر مولانا خوشی سے آمادہ تو خیر کیا ہوتے۔ کچھ نیم راضی سے ہو چلے۔"

(بحوالہ صدر)

قانون قدرت بسا اوقات یوں بھی جاری ہوتا ہے کہ اگر انسان کسی کارِ خیر کی طرف نیم دلی کا مظاہرہ کرتا ہے۔ تو اسے قبول نہیں کیا جاتا۔ بلکہ اس کے ذرائع مسدود کر

دیئے جاتے ہیں ۔ چنانچہ ایسا ہی ہُوا ۔ مولانا عبدالماجد کی تدبیر تقدیر کے ہاتھوں پٹ گئی عین اسی زمانہ میں مولانا محمد علی کی طبیعت زیادہ علیل ہوگئی ۔ جس کی وجہ سے وہ دہلی سے شملہ چلے گئے ۔ وہاں سے وقتِ موعود کی کشش نے انھیں بھوپال اور بمبئی کا چکر دے کر لندن پہنچا دیا ۔ جہاں سے وہ اپنے آقا و مولا کے دربار میں جا پہنچے ۔

مخالفین کے لیے دعائے خیر

مولانا تھانویؒ انتقام سے زیادہ انتظام کے عادی تھے اور انتظام بھی ایسا جس کے مؤثر ہونے کی ضمانت خود ناظمِ کائنات کی طرف سے موجود ۔ یعنی دُعا جس کا سرورِ کائنات کے ہاں بھی مخالفین کے لیے خاص اہتمام تھا ۔ چنانچہ جب حضرت تھانویؒ کو مولانا محمد علیؒ کی علالت کی خبر ملی ۔ تو آپ نے یہ خبر پڑھ کر مولانا عبدالماجد کو لکھا کہ "اس سے میرا دل دکھا ۔ دل سے دُعائے خیر کرتا ہوں ۔" اس کے کچھ عرصہ بعد جب وفات کی خبر پہنچی تو انھوں نے ان کے لاڈلے مولانا عبدالماجد کو یہ تعزیتی خط لکھا :-

"مکرمی السلام علیکم

محمد علی کی وفات کا میرے قلب پر جو اثر ہے ۔ بیان نہیں کر سکتا ۔ خدا جانے کتنی دفعہ دُعا کر چکا ہوں ۔ اور کر رہا ہوں ۔ مجھ کو مرحوم کی جس صفت کا اعتقاد اور اس اعتقاد کی بنا پر محبت ہے ۔ صرف ایک صفت ۔ مُسلمانوں کی سچی بے غرض محبت ہے ۔ باقی دُوسری صفات دیکھنے والے جانتے ہیں ۔ مَیں نے کبھی دیکھا نہیں ۔ اس لیے ایک ہی صفت سے محبت ہے اور اس کو میں رُوح الصفات سمجھتا ہوں ۔ اشرف علی"

(حکیم الامت صفحہ ۱۷۶)

اپنے مخالفین کی تکلیف پر حضرت تھانوی کا دل دکھنا اور ان کی مخالفت کے علی الرغم ان کی کسی صفت محمودہ کی وجہ سے ان سے محبت کرنا اور دست بدعا رہنا ۔

آپ کے "کریم عظیم" ہونے پر دال ہے۔

حضرت تھانویؒ کا یہ سلوک اپنے ہر مخالف سے تھا۔ خواہ وہ کسی طبقہ سے تعلق رکھتا ہو تحریک خلافت کے بڑے پرجوش کارکن اور جمعیتہ العلماء کے ممتاز رکن۔ خوش بیان مقرر۔ عالم۔ شیخ مولانا عبدالماجد قادری بدایونی غالی قسم کے صوفیا میں سے تھے۔ مگر ان کا دل حضرت تھانویؒ کی نسبت صاف نہ تھا۔ اکثر وہ آپ کا ذکر نازیبا اور نا ملائم الفاظ میں کرنے کے عادی تھے۔ جب ۱۹۳۱ء کے اخیر مہینہ میں ان کا انتقال ہوا اور اس کی اطلاع حضرت تھانویؒ کو ہوئی۔ تو آپ نے اطلاع دینے والے کو لکھا :-

"ایک محب اسلام و اہل اسلام کی مفارقت ناسوتی کا علم ہو کر قلق ہوا۔ رائے کا اختلاف میری نظر میں کچھ زیادہ وزنی نہیں ہے۔ اصول اور نیت پر نظر رہتی ہے۔ سو مرحوم کے متعلق اس کے خلاف کوئی بات نہیں سنی گئی۔ اس لیے خاص قلق ہے۔ اللہ تعالیٰ اُن کے ساتھ رحمت و مغفرت کا معاملہ فرماویں۔ اور اُمت کو ان کا نعم البدل عطا فرماویں۔ مجھ سے جو فرمائش ان کی گفت و شنید معاف کرنے کے متعلق فرمائی ہے۔ میں اس کا اس لیے بھی شکر گزار ہوں کہ اس میں دو مسلمانوں کا بھلا ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ میرے قلب میں بحمد اللہ تعالیٰ کسی کی طرف سے غل نہیں ہے۔ اور ایسی گفت و شنید میں میرا عقیدہ ہے کہ اُن کو گناہ بھی نہ ہوتا تھا۔ کیونکہ وہ روایات کے تحت میں معذور ہیں۔ اس لیے معافی کی حاجب بھی نہیں۔ لیکن اس سے آپ کی طبیعت خوش نہ ہوگی۔ اس لیے آپ کے مذاق کا اتباع کر کے صریح الفاظ میں دعا کرتا ہوں کہ اے اللہ میں نے سب کچھ ان کو معاف کیا ہے۔ آپ بھی معاف فرماویں۔" (حکیم الامت صنہ۲۲)

اپنے مخالف کے نعم البدل کی دعا کرنا یہ صرف حضرت تھانویؒ پر ہی ختم تھا۔ اس لیے

توخسروِ دربارِ اشرفیہ خواجہ عزیز الحسن مجذوب فرمایا کرتے تھے ؎

ہم جس پہ مر رہے ہیں وہ ہے بات ہی کچھ اور
تم سے جہاں میں لاکھ سہی ۔ تم مگر کہاں

مخالفین کا ادب و احترام

۱۹۲۹ء میں مسٹر ہربلاس شاردا نے مرکزی اسمبلی میں کم سنی کی شادی کے انسداد کے لیے ایک مسودہ قانون پیش کر رکھا تھا کہ ایک مخصوص سن تک پہنچنے سے قبل لڑکے اور لڑکیوں کی شادی جُرم قرار دی جائے ۔ بعض نافہم مسلمانوں نے اس قانون کے مسلمانوں پر اطلاق کی تحریک کر دی ۔ چونکہ عمر ازدواج کی قید مداخلت فی الدین تھی ۔ اس لیے مسلمانوں نے اس کے خلاف خوب شور مچایا ۔ جلسے کیے ۔ قرار دادیں پاس کیں ۔ حضرت تھانویؒ ایسے جلسوں جلوسوں میں شرکت کے عادی نہ تھے ۔ مگر آپ کے مخالفین مخالفت کے باوجود آپ کی شرکت ضروری سمجھتے تھے ۔ ۲۲ دسمبر ۱۹۲۹ء کو زیرِ صدارت مولانا محمد علیؒ کانپور میں اس ایکٹ کی مخالفت میں ایک عظیم الشان جلسہ ہونا قرار پایا ۔ جس میں شمولیت کے لیے انہی مولانا عبدالماجد قادری بدایونی نے حضرت تھانوی کی خدمت میں اپنی طرف سے یہ خصوصی دعوت نامہ شرکت جلسہ کے لیے بھیجا ۔

"ذوالمجد والکرم عظیم القدر جناب مولانا شاہ اشرف علی صاحب

السلام علیکم ۔ فقیر عبدالماجد القادری البدایونی عارض مدعا ہے ۔

ضروریات مذہب وحالات اسلامیہ کا تقاضا ہے کہ میں جناب سے گذارش کروں کہ ۲۲ دسمبر کو کانپور تشریف لا کر قانون خلاف شریعت کے انسداد و امحار کی مجلس میں اپنے مذہبی اور عالی خیالات سے ہماری امداد فرمائیے ۔

میں سُنتا ہوں کہ جناب سفر کے کم عادی ہیں اور موسم بھی تلخ ہے ۔ شاید

مسافت بھی زیادہ جناب کے حالات و اوقات بھی مشغول اور گھرے ہوئے ہیں۔ مگر باوجود اس کے جو امر داعی باعث زحمت دہی بنا رہا ہے۔ وہ ایک اور فقط ایک ہے یعنی خدمتِ تحفظ شریعت۔ اور اس کے لیے ہر طبقہ کے مسلمانوں کا ایک مرکز ثقل اشرف پر مجتمع ہو جانا بہ یقین ہے۔ اس امر کی اہمیت کا ممتاز لحاظ فرما کر اور فقیر کی تحریک کو درجۂ اختصاص و قبول دے کر محض دین و مذہب کے لیے۔ باوجود مشاغلِ کثیرہ یا اعذار واقعیہ تکلیف سفر گوارا فرمائی جاوے گی۔ اور نوید تشریف آوری سے اطلاع بخشی جائے گی۔

میرا مسلک و عمل۔ اس مقصد و جہد کے لیے ہر محافظ و خادمِ شریعت اور مخالفِ قانونِ زیر نظر (شاردا ایکٹ) کو وسعتِ قلب کے ساتھ شریک کار و رفیقِ عمل و مشیرِ تدابیر بناتا ہے اس کی اہمیت آپ کے ذہن و فکر میں بھی مجھ سے کم نہ ہوگی اور یقین ہے کہ اس بار آپ غیر معمولی ہمت سے کام لے کر۔ اپنے عزم صمیم اور شرکت کے وعدہ سے مطلع فرماویں گے۔ مطبوعہ دعوت نامہ بھی حاضر کیا جائے گا۔ مگر یہ عریضہ فقیر کے خصوصی جذبات کا ترجمان ہے۔

فقیر عبدالماجد القادری البدایونی از کانپور۔ بانس منڈی،

یہ خط اس زمانہ میں حضرت کی خدمت میں بھیجا گیا تھا۔ جب کہ آپ۔ آنت اترنے کی وجہ سے ہر قسم کا سفر ترک کر چکے تھے اور مدعو کرنے والوں کی اطلاع میں ایک باضابطہ معذرت نامہ بھی چھپا رکھا تھا جو خاص و عوام میں تقسیم بھی ہو چکا تھا۔ اس کے علاوہ ترک سفر کے اور عذرات بھی معقول تھے۔ جن کا خود مولانا بدایونی کو اعتراف تھا۔ جیسا کہ خط کے الفاظ سے ظاہر ہے۔ اس لیے آپ نے مندرجہ ذیل خصوصی معذرت نامہ انھیں

روانہ کیا۔

"از ناکارہ و آوارہ اشرف علی غفرلہ'

بہ گرامی خدمت عالی درجت مخدومنا معظمنا ادام اللہ تعالیٰ افاداتہم و افاضاتہم۔

السلام علیکم ورحمتہ اللہ برکاتہ'

باوجود میرے ناقابلِ خطاب ہونے کے مجھ کو خطاب سے سرفراز فرمایا، میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اس کا کیا اور کس طرح شکریہ ادا کروں۔ بجز اس کے کہ ؎

از دست گدائے بینوا ناید، ہیچ
جز آنکہ بصدقِ دل دعائے بکند

جس خدمت کے لیے مجھ کو ارشاد ہوا ہے۔ اوّل تو اس کا دینی خدمت ہونا پھر مزید براں جناب کا حکم ہونا فی نفسہٖ کسی عذر کا متحمل نہیں۔ لیکن اگر کوئی عذر حد عذر سے متجاوز ہو کر حدِ عجز تک پہنچ گیا ہو۔ غالباً اس کا پیش کر دینا نقص امر نہ ہوگا۔

اس غرض سے چھپا ہوا عذر نامہ پیش کرنے کی جسارت کرتا ہوں اور بجائے شرکت روحانی پر جس کا ظہور بصورت دعا ہو رہا ہے۔ اکتفا کرنے کی اجازت چاہتا ہوں۔

اور علاوہ دُعا کے اور خدمات متحملہ کے متعلق شیخ شیرازی رحمتہ اللہ علیہ کے ارشاد کو اپنے کچے چھٹے کا کاشف اور شفیع بناتا ہوں ؎

آں را کہ عقل وہمت وتدبیر درائے نیست
خوش گفت پردہ دار کسے در سرائے نیست

والسلام از تھانہ بھون ۴ رجب ۱۳۴۸ھ

حضرت تھانویؒ کے متعلق بقول مولانا دریابادی مولانا بدایونی کے دل میں :-

"بالکل صفائی نہ تھی۔ اوّل تو عقائد میں دیو بندی و بریلوی اختلاف مدتوں سے پشتوں سے سدراہ بنا ہوا تھا۔ نوبت تکفیر تک آچکی تھی۔ پھر ذاتی طور پر سیاسی اختلافات بھی شدید قسم کے حائل رہ چکے تھے۔"

(حکیم الامت ص ۹۷)

ایسے حالات میں ایسے مخالف کی زبانِ قلم سے اعتراضاً حضرت تھانویؒ کے حق میں "ذوالمجدد الکرم عظیم القدر" کے الفاظ نکلنا خواہ ضرورتاً ہی سہی جہاں آپ کے "کرمِ عظیم" ہونے کی تائید غیبی ہے۔ وہاں اپنے سے کم عمر اعتقادی و سیاسی مخالف کو "بہ گرامی خدمت۔ عالی درجت۔ مخدومنا معظمنا ادام اللہ تعالےٰ افاداتہم و افاضا[تہم] سے خطاب کرنا اور اس کے عقائد کی رعایت ملحوظ رکھتے ہوئے خود کو" ناکارہ۔ آو[ارہ] اشرف علی" لکھنا اور انتہائی محبت و شفقت سے جواب دینا اس بات کی کھلی شہادت ہے کہ آپ کے دل میں اپنے مخالفین کا کتنا احترام تھا۔ اگر ہر شخص اپنے مخالف سے ایسے احترام و احسان کا مظاہرہ کرے۔ تو بہت سی خرابیاں دیکھتے دیکھتے دُور ہو جائیں۔

مفتریوں سے مروّت

حق تعالیٰ جنہیں محبوب و مقبول بناتا ہے۔ ان کے حاسد بھی بڑے پیدا ہو جا[تے] ہیں۔ حضرت تھانویؒ کے بدخواہوں کا ایک طبقہ تو وہ تھا جو انہیں کافر۔ زندیق ملعون وغیرہ بنانے میں مصروف رہتا تھا۔ اور دوسرا طبقہ ان لوگوں پر مشتمل تھا جو عوام کی جہالت سے فائدہ اٹھا کر ان میں حضرت تھانوی کے خلاف ان کی بعض تحریروں کا غلط مطلب بیان کر کے آپ کے خلاف افتراء و بہتان لگانے میں مصروف رہتا تھا جس سے آپ کے خیر خواہوں کو سخت روحانی تکلیف پہنچتی۔ گو وہ بالا بالا ہی حقائق کی روشنی میں ا[...]

کی تردید و تکذیب کر دیتے۔ مگر بعض اس کی شکایت حضرت تھانوی سے ہی کرتے۔
چنانچہ ایک مرتبہ مولانا دریابادی نے حضرت تھانویؒ کو لکھا کہ :۔

"پچھلے دنوں جناب والا سے متعلق عجیب عجیب اتہامات سننے میں آئے ایک صاحب نے ایک مشہور مولوی صاحب کے حوالہ سے بیان کیا کہ جناب نے یہ فتویٰ دے رکھا ہے کہ جب تک جسم پر ولایتی کپڑے کا کوئی جزو نہ ہوگا۔ نماز درست نہ ہوگی۔ معاذ اللہ۔ ایک دوسرے صاحب نے بیان کیا کہ آپ نے بیان القرآن میں سورۃ المائدہ کی آیت وَلَتَجِدَنَّ اَشَدَّ النَّاسِ عَدَاوَةً کے تحت میں گورنمنٹ انگریزی کے ساتھ موالات و مودّت فرض قرار دی ہے۔ پہلے افتراء کی تو زبانی تردید کر کے خاموش رہا۔ اس دوسرے افتراء کی تردید اصل تفسیر سے اقتباس دے کر اب کی ہفتہ کے پرچۂ سچ میں کر رہا ہوں۔"

جس کے جواب میں آپ نے تحریر فرمایا :۔

"یہ آپ کی محبت ہے۔ مگر مجھ کو تو طبعاً اچھا نہیں معلوم ہوتا۔ اس اتہام میں نہ ان کا ضرر نہ میرا۔ بلکہ جواب دینے میں ان کا یہ ضرر ہے کہ اب تو وہ اتہام میں معذور ہیں اور جب وہ جواب پر مطلع ہو کر قبول نہ کریں گے۔ تو عاصی ہوں گے۔ تو ایک مسلمان کو عاصی بنانا کیا فائدہ؟"
(حکیم الامت ص ۲۳۴)

اس طرح آپ نے اپنی دشمن نوازی سے مخالفوں کی افترا پردازیوں کی تردید کا ایک لطیف پیرایہ میں ہمیشہ کے لیے دروازہ بند کر دیا۔

متوسلین کی وکالت

ایک طرف تو حضرت تھانوی کو اتنا بھی گوارا نہ تھا کہ جو ان پر افترا و اتہام کے تیر و نشتر چلانے کے عادی ہیں ان کی تردید کر کے ان کے معاصی میں اضافہ کیا جائے۔ دوسری طرف وہ اس بات کے عادی تھے کہ جو لوگ ان کی بجائے ان کے منتسبین یا متوسلین کو کو کشتنی و گردن زدنی ٹھہراتے۔ وہ ان کی ذمہ داری اپنے اُوپر لے لیتے۔ ایک مرتبہ مولانا عبدالماجد دریا بادی کو یہ خط لکھا :-

" آنجناب کی توجہات کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ واقعہ یہی ہے کہ یہ ناکارہ تو حضرت تھانوی دامت برکاتہم کا نہایت معتقد اور ان کی تعظیم و احترام کو نہایت ضرور سمجھتا ہوں۔ اُن کی قابلیت اور ان کے کمالات کے سامنے اتنی بھی نسبت نہیں رکھتا جو کہ طفل دبستان کو افلاطون سے ہو سکتی ہے۔ البتہ تحریک حاضرہ سے متعلق جو چیزیں وہاں سے شائع کرادی جاتی ہیں۔ اور وہاں کے متوسلین جو کچھ گاتے ہیں وہ نہایت دلخراش ہیں۔ میں مولانا کو اپنا مقتداد اور اپنے اکابرین میں سے سمجھتا ہوں " (م-۱-ص ۲۵۱)

اگرچہ اس خط میں ہر طرح کا ادب و احترام ملحوظ رکھا گیا ہے۔ مگر ایک شدید قسم کا الزام بھی ساتھ ہی لگا دیا گیا ہے کہ تحریک سول نافرمانی سے متعلق چیزیں وہاں سے شائع کرادی جاتی ہیں۔ جس سے یہ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ خدانخواستہ حضرت تھانویؒ اس تحریک کے مخالفین کے ہاتھ میں کٹھ پتلی بنے ہوئے تھے۔ جیسا وہ چاہتے لکھ دیتے تھے۔ چنانچہ اس کا حضرت تھانویؒ نے وہ تاریخی جواب دیا کہ ان کی جگہ اگر کوئی اور ہوتا۔ تو شاید نہ دے سکتا۔ مولانا عبدالماجد نے یہ خط حضرت تھانویؒ کو "بہ صد مسرت و انبساط" بھیج دیا تھا۔ جس کے جواب میں حضرت تھانویؒ نے انھیں لکھا :-

نیَں تواس قابل نہیں۔ خود ان کی بزرگی ہے۔ مگر بزرگی پر نظر کرکے یوں جی چاہتا ہے کہ میری سوانح عمری میں دوسروں کی اشاعت اور دلخراشی کا ذکر فرمایا جاوے اور اگر ان میں مَیں بھی حصہ لیتا ہُوں۔ خواہ فعلاً یا رضاً تو خود میری اصلاح فرمائی جاوے اور میری ہی طرف منسوب فرمایا جاوے۔ کیونکہ متوسلین کے آثار متعدیہ دونوں طرف مشترک ہیں۔ مگر مَیں اپنے جمود ذہن کے سبب ایسے آثار سے متاثر نہیں ہوتا۔ بہر حال مَیں خود کسی کا شاکی نہیں۔ اور سب کی شکایات سر پر رکھتا ہُوں اور باعث ان سطور کی تحریر کا محض انبساط اور ناز اور بے تکلفی ہے۔ آپ کی خدمت میں بھی اور مولانا کی خدمت میں بھی حسب ضرب المثل اذا جاءت الالفۃ رفعت الکلفۃ نہ کہ شکایت یا حکایت یا روایت۔"

(بحوالہ صدر)

تنقیص پر اعتراف

حضرت تھانوی اپنے متوسلین کی جائز وکالت میں تو پیش پیش تھے مگر جہاں خود ان کی ذات پر اعتراضات کیے جاتے۔ وہاں مدافعت کی بجائے مساعت یعنی چشم پوشی سے کام لیتے۔ حالانکہ اپنی صفائی یا بریت حقائق کی روشنی میں بآسانی کر سکتے تھے۔ مگر دُوسرے کے خجل ہونے کے اندیشہ سے کہہ دیتے تھے کہ معصوم تو مَیں بھی نہیں۔ حضرت تھانوی کا ایک مقالہ الاعتدال فی متابعۃ الرجال اخبار "سچ" لکھنؤ میں شائع ہُوا تو اس پر ایک صاحب نے مدیر سچ کی وساطت سے حضرت تک اپنے الزامات ان الفاظ میں پہنچائے :۔

"حضرت مولانائے محترم کا مضمون نہایت شوق سے پڑھا۔ الحمدللہ دل سے بیاختہ دُعا نکلتی ہے کہ اللہ تعالیٰ حضرت مولانا کی عمر اور دل و

دماغ میں بہت بہت وسعت اور برکت دیں اور مُسلمانوں کو ان کے ملفوظات وافادات سے مستفید ہونے کی توفیق۔ آمین ثم آمین۔ سچ تو یہ ہے کہ حضرت کو اللہ نے عجیب و غریب جامعیت عطا فرمائی ہے۔ بر کفِ جامِ شریعت الخ یہ مولانا ہی کی شان ہے شریعت و طریقت دونوں کا ہی سر رشتہ کہیں بھی ہاتھ سے چھوٹنے نہ پائے۔ اور ان دونوں کے واجبی احترام میں ذرا بھی فرق نہ آنے پائے۔

لیکن خود حضرت مولانا کا طرزِ عمل اپنی اس تعلیم سے مختلف کیوں نظر آتا ہے۔ آپ کے علم و مشاہدہ میں متعدد واقعات ایسے ہوں گے کہ ادنیٰ سے اختلاف پر مولانا سخت ناخوش ہو گئے۔ اور یہ بھی نہیں کہا جا سکتا کہ یہ انقباض اور تکدّر محض طبعی رہا بلکہ اس کا اثر تعلقات تربیّت پر پڑا۔ ایک آدھ مثال میرے علم میں ایسی ہے کہ حضرت نے ایک صاحب علم وفضل اور غایت درجہ معتقد سے محض اتنی بات پر قطع تعلق فرما دیا کہ انھیں ایک اجتہادی فرعی مسئلہ بلکہ اس کے ایک جزئیہ میں دیانۃً مولانا سے اختلاف تھا۔ ایسے واقعات کی کیا توجیہ کی جائے۔"

حضرت تھانویؒ نے اس کے جواب میں مدیر سچ کو لکھا کہ :-

" اصل میں تو میرا مذاق ایسے سوالات کا جواب دینے کا نہیں۔ کیونکہ اپنی ذات کے متعلق جواب دینا مرادف ہے کہ ہم اس نقص سے بری ہیں۔ سو ایسا دعویٰ کرنا خود فَلَا تُزَكُّوا أَنفُسَكُمْ کے خلاف ہے۔ اس لیے ان کو اتنا ہی جواب کافی ہے مگر آپ پر کشف واقعہ کی غرض سے اتنا جواب کافی اور دے سکتا ہوں کہ گول بات

کا جواب ہو نہیں سکتا۔ نہ مجھ کو کوئی ایسا واقعہ یاد۔ اگر ان سے اس صاحب علم و فضل کا نام اور اجتہادی فرعی مسئلہ کی تعیین اور نوعیت اختلاف کی تحقیق فرما لیجئے اور مجھ کو ابھی یاد آجائے تو بے تکلف عرض کر دوں گا۔ خواہ اُن کی غلطی ہو، خواہ میری غلطی ہو۔" (حکیم الامت ص۳۵۵)

شاکی سے شفقت

ایسی ہی شکایت ایک دفعہ خود مدیر سیچ نے ۱۹۲۲ء میں حضرت سے ان الفاظ میں کی :۔

"مولوی صاحب سے میری ملاقات ۴-۵ سال کی ہے۔ صالح دیندار تو انھیں ہمیشہ ہی پایا تھا۔ اب کی حیدر آباد میں ان کی کثرت عبادت دیکھ کر براہ راست سوال کر بیٹھا۔ بیعت سے متعلق پہلے تو ٹالا۔ پھر آخر کو کھلا۔ بڑی پر درد روئیداد تھی اُن کے اور اُن کے شیخ کے موجودہ تعلقات کی نوعیت کو بجز اُن کی حرماں نصیبی کے اور کس چیز سے تعبیر کروں۔ اللہ سے دعا ہے کہ اب ان کے حال پر رحم ہو اور جس چشمہ فیض تک ان کی رسائی ہو چکی تھی۔ اس سے وہ پھر سیراب ہونے لگیں۔

یہ دعا تو اس سے تھی۔ جو معصوموں اور سیہ کاروں دونوں کی سنتا ہے۔ باقی جناب والا کی خدمت میں گذارش صرف اتنی ہے کہ مولوی صاحب موصوف کو جناب کی ذات کے ساتھ خلوص و عقیدت اب تک جوں کی توں ہے اور اپنی معتوبی و مہجوری کا ذکر اس حسرت کے ساتھ کرتے تھے کہ دل اُن کی ہمدردی میں بے اختیار ہو جاتا تھا۔"

شکایت و سفارش کے الفاظ پر اگر غور کیا جائے تو قصور سراسر حضرت تھانوی کا ثابت کیا گیا ہے۔ مگر حضرت تھانویؒ نے بہ کمال شفقت یہ جواب لکھا :۔

"میں خود ان کو صالح سمجھتا ہوں۔ مگر صالح کے چند اقسام ہیں۔ اعتقاد تو سب اقسام سے ہے مگر مناسبت بعض ہی اقسام سے ہے۔ آپ کی خیر خواہی و رحم دلی میں تو شبہ نہیں۔ لیکن اس میں کچھ کام ان کے کرنے کا بھی ہے۔ انھوں نے نہیں کیا۔ اور نہ مجھ سے پوچھا کہ مجھ کو کیا کرنا چاہیئے۔ اب آپ غور فرمایئے۔ اس حالت میں میرے ذمہ کیا ہے کیا وہ اتنا نہیں سمجھتے کہ اپنے مرض پر صرف حسرت کافی ہے یا معالجہ بھی ضروری ہے۔ آپ نے تو اتنا بھی فرمایا۔ انھوں نے اتنا بھی نہ کیا۔" (ح ۱۰۶ - صـــ۱۵)

تربیّت میں شدّت

حضرت تھانوی صرف پیر روشن ضمیر یا مشیر با تدبیر ہی نہ تھے، حکیم و مصلح بھی تھے۔ جو ان کا اصل منصب تھا۔ اب ایک حکیم کے لیے یہ بڑا مشکل ہوتا ہے کہ وہ علاج کے وقت مریض کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے اس کی خواہشات کی رعایت کرے کہ دوا میٹھی ہو۔ کڑوی نہ ہو۔ پرہیز ضروری قرار نہ دیا جاوے یا اپریشن کے وقت نشتر اور چھری سے کام نہ لیا جاوے۔ ظاہر ہے کہ جو حکیم ایسا کرے گا۔ وہ ہمدرد نہ ہوگا۔ بیدرد ہوگا اگر کوئی حکیم شربت و مغزیات کی جگہ تلخ و ترش ادویات دیتا ہے۔ یا اگر کوئی سرجن پٹھوں کو چیرتا پھاڑتا ہے اور نشتر کو اندر ہی اندر گہرائیوں میں اتارتا چلا جاتا ہے۔ تو وہ ایسا بے دردی، شقاوت یا قساوت سے نہیں کرتا۔ بلکہ وہ محض مریض کی ہمدردی۔ ہوا خواہی اور دلسوزی کے جذبہ سے کرتا ہے۔ تاکہ مواد فاسدہ خارج ہو کر یہ جلد صحت یاب ہو جائے۔ ایسے موقع پر مریض کا ہال ہال یا چیخ و پکار کرنا لازمی ہے اور اگر مریض حکیم سے انتہائی عقیدت رکھنے کے باوجود اپریشن کرانے کے بعد اس کی آیندہ کے لیے مرہم پٹی کرانے سے اس لیے احتراز کرے کہ حکیم نرمی کی بجائے سختی سے کام لیتا ہے۔ تو اس صورت میں حکیم کا کیا قصور ہو سکتا ہے۔ حضرت تھانوی کی بدنامی کا باعث زیادہ تر ان کی

یہی حکمت ہے اور ان کو بدنام کرنے والے غیروں سے زیادہ اپنے ہیں جو نافہمی و نادانی کے باعث خواہی نخواہی کہے دیتے تھے کہ :-

"یہ کوئی کٹر قسم کے مولوی ہیں۔ تشدد میں بسے ہوئے۔ تقشف میں رچے ہوئے بات بات پر گھرکی۔ قدم قدم پر جھڑکی۔ فلاں عمل حرام۔ فلاں عمل بدعت یہ چیز ناجائز وہ چیز معصیت"

حالانکہ بقول مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی :-

"مولانا کا تشدد یا ظاہری تشدد جو کچھ بھی تھا۔ وہ اصلاح کی غرض سے اور ان ہی لوگوں کے لیے تھا۔ جو خود طالب اصلاح ہو کر آتے تھے۔ یہ نہ تھا کہ کوئی شخص محض ملاقات یا محض علمی تحقیق کے لیے آئے اور اس پر بے تحاشا دار و گیر۔ زجر و ملامت ہونے لگے" (حکیم الامت ص۱۴۰)

مولانا نے ایسے لوگوں کی فلاح کے لیے جو بغرض اصلاح آتے۔ چند قاعدے اور ضابطے بنا رکھے تھے۔ جن کی تفصیل اپنے مقام پر آئے گی۔ آپ ان قاعدوں کے نفاذ اور ان ضابطوں کی پابندی۔ مریدوں۔ طالبوں اور متوسلوں سے سختی سے کراتے تھے۔ جس کی وجہ سے یہ لوگ آپ کو بُرا بناتے تھے۔ اگر آپ مریض کے مرض پر نظر رکھنے کی بجائے مریض کی مرضی پر چلتے۔ تو یقیناً پھر بدنام نہ ہوتے مگر اس کی توقع حضرت تھانوی ایسے مصلح سے رکھنی عبث تھی۔ چنانچہ اس کی وضاحت ان کے اپنے اس ارشاد سے ہوتی ہے کہ :-

"امر اجتہادی میں کیونکر کسی کو دبایا جائے اگر آج کوئی شافعی یا غیر مقلد مجھ سے بیعت ہو (اور ہیں بھی) تو میں ان کو فروع اجتہادیہ میں کیسے مجبور کردوں۔ گو طبیعت کے بھی خلاف ہو۔ جیسے خود ترک تقلید میرے ذوق کے بالکل خلاف ہے اور طبعاً گراں بھی۔ مگر میں زور سے نہیں کہہ

سکتا۔ البتہ جو محل تربیت ہو۔ اس میں سختی کرتا ہوں۔ اور بدنام ہوں۔"

(حکیم الامت ص ۲۹۳)

پھر لطف یہ ہے کہ اس بدنامی کا آپ پر کوئی اثر نہ ہوتا تھا۔ جیسا کہ خود فرماتے تھے :-

۱- "بدنامی کا تو مجھ پر بحمد اللہ دانۂ خردل کے برابر بھی اثر نہیں ہوتا۔"

(ح-۱- ص ۱۵۵)

۲- "مجھ کو جیسا چاہیں اور جو چاہیں کہہ لیں۔ انشاء اللہ دلگیر نہ ہوں گا۔"

(ح-۱- ص ۱۵۱)

اگر آپ ایسا نہ کرتے تو پھر اصلاح و تربیت کا فریضہ بھی ادا نہ کر سکتے۔

عمل میں مداومت

با اخلاق و بامروت ہوتے ہوئے ہر کام کو ہمیشہ اپنے وقت اور اپنے موقعہ پر کرنا بہت بڑی کرامت ہے۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ کوئی ملنے والا ناواقفیتِ اوقات مشغولیت کی وجہ سے ایسے وقت آجاتا ہے۔ جو کسی خاص کام کے لیے مخصوص ہوتا ہے۔ معمول کی مشغولیت کے ساتھ ساتھ آنے والی شخصیت بھی ایسی ہوتی ہے کہ اس کا ادب و احترام لازم ہوتا ہے۔ اور اخلاق و مروّت کا تقاضا یہ ہوتا ہے کہ انسان وہ کام چھوڑ کر خود آنے والے کے استقبال و احترام میں مشغول ہو جائے۔ ایسا کرنے سے اس کام کی مداومت میں رکاوٹ ہوتی ہے۔ جسے معلم الاخلاق صلی اللہ علیہ وسلم نے بے برکتی پر محمول فرمایا ہے۔ اس لیے ایسے مواقع پر بفضلِ ایزد متعال حضرت تھانویؒ اخلاق و مروّت سے مغلوب نہ ہو جاتے تھے۔ اور نہ ہی ایسے معزز مہمان کو خواہ مخواہ ضابطہ کی پابندی کا شکار بناتے۔ بلکہ ایسے اوقات میں آنے والے کی مدارات بھی کرتے اور معمول کی مداومت کو بھی برقرار رکھتے تاکہ اس میں بے برکتی نہ ہو۔ چنانچہ ایک مرتبہ آپ کے اُستاذ شیخ الہند حضرت مولانا

محمود الحسن رحمتہ اللہ علیہ آپ کے مہمان ہوئے۔ آپ نے ان کی راحت و آرام کے تمام انتظامات کیے تھے کہ آپ کی تصنیف و تالیف کا وقت آگیا تو آپ نے اپنے معمول کو جاری رکھنے کے لیے اپنے استاد محترم سے بہ صد ادب عرض کیا کہ :۔

"حضرت میں اس وقت کچھ لکھا کرتا ہوں۔ اگر حضرت اجازت دیں تو کچھ دیر لکھ کر بعد کو حاضر ہو جاؤں۔"

حضرت شیخ الہند نے معمول کی مداومت پر خوشی کا اظہار فرماتے ہوئے فوراً اجازت دے دی کہ :۔

"ضرور لکھو۔ میری وجہ سے اپنا حرج نہ کرو۔"

گو اس روز آپ کا کام میں دل نہیں لگا۔ لیکن بے برکتی کے خوف سے ناغہ نہیں ہونے دیا۔ تھوڑا سا لکھ کر پھر حاضر خدمت ہو گئے۔

عزم و استقامت

حضرت تھانوی کو جہاں دوسروں کے لیے ہر قسم کی آسانیاں پیدا کرنے کی فکر رہتی تھی۔ وہاں وہ خود ہر قسم کی دشواریاں برداشت کرنے کے لیے تیار رہتے تھے۔ آپ کے عزم و ارادہ اور ثبات و استقامت پر حوادث ارضی و سماوی کا کوئی اثر نہ ہوتا تھا اور نہ ہی عمر کا تقاضا یا طبعی کمزوری مانع ہوتی تھی۔ چنانچہ اکتوبر ۱۹۳۳ء میں برسات کا موسم ختم ہونے کے بعد سہارنپور و مظفر نگر کے اطراف میں ایسی بے فصلی مگر شدید بارش ہوئی جیسے آسمان سے پانی کے دریا بہا دیئے گئے ہوں۔ تھانہ بھون بھی اس کی لپیٹ میں تھا۔ وہاں کوئی خاص پختہ سڑکیں تو تھی نہیں۔ معمولی کھڑنجے کی سڑکیں تھیں۔ جن پر کثرت باران کی وجہ سے ڈیڑھ ڈیڑھ فٹ پانی چل رہا تھا۔ حضرت تھانویؒ کے مکان سے مسجد کوئی دو فرلانگ کے فاصلے پر تھی۔ مکان سے مسجد تک پہنچنے کا ایسا کوئی راستہ ہی نہ تھا جس پر گھٹنے گھٹنے پانی نہ ہو۔ خانقاہ میں بڑے بڑے عالم۔ فاضل۔ مرید۔ مہمان

موجود۔ مگر ان میں سے اکثر نے اپنی اپنی جگہ ہی مختصر سی جماعتیں کرالیں کہ رات کے اندھیرے میں موسلادھار بارش کے اندر مسجد تک کون جائے اگر اس عالم میں مسجد تک جانے والا کوئی نکلا تو وہ صرف ۷۰ سالہ بوڑھے وجواں ہمت حضرت تھانوی ؒ تھے۔ عشاء کی نماز مسجد میں باجماعت پڑھ کر اس موسلادھار بارش میں پانی کو چیرتے ہوئے واپس گھر پہنچے۔ اور جب صبح ہوئی تو بارش کی شدت اتنی بڑھی کہ لوگ الامان والحفیظ پکار رہے تھے۔ خود خانقاہ والوں کے لیے سائبان کے سایہ میں چند منٹ ڈنڈا تھامے پانی کو چیرتے پھاڑتے مسجد میں پہنچ رہے تھے۔ یہ نظارہ دیکھ کر مولانا عبدالماجد کی زبانِ قلم سے بے ساختہ نکلا کہ :۔

"اہلِ طریق سچ کہتے ہیں کہ رسوخ فی الدین اگر حاصل کرنا ہے۔ تو محض کتابیں کافی نہیں۔ بزرگوں کی صحبت میں عرصہ تک رہ کر ان کے عملی نمونوں سے سبق حاصل کرنا ضروری ہے۔" (حکیم الامت ص۲۹۵)

سفارش میں احتیاط

فطری طور پر ہر صاحبِ غرض کی خواہش ہوتی ہے کہ کسی طرح اس کا کام جلد نکل آئے۔ خواہ منت سے۔ خواہ رشوت سے۔ اور خواہ سفارش سے۔ سفارش کے لیے اربابِ غرض گوشہ نشینوں تک کو بھی آرام و اطمینان سے نہیں بیٹھنے دیتے۔ حضرت تھانوی ؒ بھی اس "خدمت" سے مستثنےٰ نہیں تھے۔ انھیں بھی گاہے گاہے اس کام کے لیے مجبور کر ہی دیا جاتا تھا۔ مگر اس معاملہ میں وہ انتہائی احتیاط سے کام لیتے تھے اول تو ناجائز یا بے جا سفارش کبھی نہیں کرتے تھے۔ جائز اور حق معاملات میں بھی سفارش اس انداز سے کرتے تھے کہ جس سے سفارش کرنی ہے۔ اس کی طبیعت پر بار نہ پڑے۔ اور فرائضِ منصبی کی انجام دہی میں مداخلت نہ ہو۔ چنانچہ آپ اس سلسلہ میں فرمایا کرتے تھے کہ :۔

• لوگ اس بارہ میں صرف ایک پہلو کو دیکھتے ہیں - یعنی صاحب غرض کا کام کسی طرح نکل جائے - اور اس رُخ پر غور ہی نہیں کرتے کہ جس حاکم یا صاحب اختیار کے پاس سفارش کی جا رہی ہے - اس کی طبیعت پر کیا اثر پڑے گا - کسی کا کام نکال دینا ایک امر مستحب ہے لیکن مسلمان کو اذیتِ قلب سے بچانا تو درجۂ واجب میں ہے - استحباب کے لیے یہ ترکِ واجب کیسے جائز ہو گا ؟

نظر کی اس گہرائی کے ساتھ احتیاط کے انتہائی مقام کا اندازہ ان کے حسب ذیل سفارش نامہ سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے -

از اشرف علی عفی عنہ

بخدمت مکرمی جناب ڈپٹی صاحب دام لطفہم

السلام علیکم - ایک صاحب میرے ملنے والے ہیں - ان کے ایک عزیز کا مقدمہ آپ کے اجلاس میں ہے - مجھ کو واقعہ معلوم نہیں - دوسرے پرچہ پر مجمل یادداشت کے ہاتھ کی لکھی ہوئی ہے - میری عادت اپنے عنایت فرماؤں کو مجبور کرنے کی نہیں لیکن جائز رعایت سے مسلمان کو نفع پہنچانا مستحسن ہے - یہ دونوں پرچے چاک فرما دیجئے

والسلام - از تھانہ بھون

حقوق العباد کا خیال

آپ کو ہر وقت یہ خیال دامنگیر رہتا تھا - اس خیال نے اتنی اہمیت حاصل کر لی تھی کہ آپ نے اپنی وفات سے قریباً سترہ برس پہلے ۳ اپریل ۱۹۲۶ء کو ایک معذرت نامہ چھپوا کر تقسیم کرایا - جس پر لکھا تھا :-

" یہ احقر افقر اذل ارذل کام کا اکثف - نام کا اشرف - تمام ان حضرات

کی خدمت میں جن کا کوئی حق میرے ذمہ ہو۔ خواہ وہ حق مالی ہو (جس کا احتمال ضعیف وقلیل ہے) اور خواہ وہ حق غیر مالی ہو۔ جیسے کسی کو ناحق کچھ کہہ لیا ہو یا انتقام میں حدِ مساوات سے متجاوز ہو گیا ہو۔ یا کسی کو ناحق بدنی ایذا پہنچائی ہو (اور ایسے غیر مالی حقوق کا احتمال قوی اور کثیر ہے) ان سب اہلِ حقوق کی خدمت میں دست بستہ۔ نہایت لجاجت وسماجت سے درخواست کرتا ہے کہ ان حقوق کا خواہ مجھ سے عوض لے لیں۔ (بشرطیکہ مدعی کا صدق میرے دل کو لگ جائے) اور خواہ حسبۃً للّٰہ معاف فرماویں میں ان دو حالتوں میں ان کا شکرگزار ہوں گا کہ مجھ کو محاسبۂ آخرت سے بری فرمایا۔ اور معافی کی صورت میں بھی دعا کرتا رہوں گا کہ میرے ساتھ مزید احسان فرمایا۔

خدا کے واسطے اہلِ حقوق میری حیات تک خواہ اپنے گذشتہ اور آیندہ حقوق معاف فرماویں۔ خواہ شرعی طریق اور شرائط پر اس کا عوض بالمثل لے لیں اور حیات کے بعد معاف ہی فرماویں۔"

اور جن کے ذمہ آپ کے حقوق تھے ان کو یوں بشارت دی :۔

"بہ اُمید عفوِ خداوندی میں اپنے حقوق غیر مالیہ جو کسی کے ذمہ ہوں۔ بلا استثناء سب کو معاف کرتا ہوں۔ اور حقوق مالیہ میں غیر مستطیع کو اجازت دیتا ہوں کہ مجھ سے خاص طور پر گفتگو کرے۔ انشاء اللہ کوئی سبیل سہل نکال دوں گا۔ خواہ معافی۔ خواہ تخفیف۔ خواہ مہلت یا کچھ اور۔

جس کو اس دُعا پر ختم کیا کہ

اَب آخر میں ناظرین سے اس دُعا کی درخواست کرتا ہوں کہ اللہ تعالےٰ قبل سفرِ آخرت تمام حقوق ومظالم سے اداءً یا ابراءً سبکدوش فرمائے

اور ایمان پر خاتمہ فرما دے اور آخرت میں ہر قسم کے مواخذہ سے محفوظ فرما دے

ویرحم اللہ عبداً قال آمینا۔

اس پر یہ تاکید بھی درج تھی :۔

خود بھی ملاحظہ فرمایئے اور جہاں تک ممکن ہو دوسروں کو بھی دکھلا کر ثواب لیجئے۔ میری حیات میں بھی اور بعد حیات بھی۔ (العذر والنذر)

گرانی سے گریز

آپ طبعاً اس بات کے عادی تھے کہ آپ کی وجہ سے کسی پر گرانی نہ ہو۔ نہ خیالی۔ نہ واقعی۔ نہ قولی نہ فعلی۔ اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ ایک صاحب سینکڑوں میل چل کر تھانہ بھون کی خانقاہ امدادیہ میں محض اصلاح و تربیت کے لیے جاتے ہیں اور فرصت کے ایسے اوقات کے متلاشی رہتے ہیں۔ جب آپ کی خدمت میں حاضری کا موقعہ مل سکے۔ آپ ان کو بلانے کے لیے خادم کی زبانی پیغام بھیجتے ہیں :۔

"میں اس وقت خالی ہوں۔ اگر آپ کو بھی فرصت ہو اور جی چاہے۔ تو آجایئے اور کبھی اس مضمون کا رقعہ بھیجتے ہیں کہ :۔

مکرمی ! السلام علیکم۔ میں اس وقت فارغ ہوں۔ اگر جی چاہے۔ تشریف لایئے لیکن اگر اس وقت کوئی شغل ایسا ہو۔ جس کا انقطاع تشویش کا سبب ہو تو تکلیف نہ کیجئے۔ دوسرا وقت مل جائے گا۔

اشرف علی

اس معمول کی نسبت آپ اکثر فرمایا کرتے تھے :۔

احقر کا طرز طبعی یہ ہے کہ جس امر میں شبہ بھی ہو کہ دوسرے پر گرانی ہوگی گو وہ خدمت اور تعظیم ہی کیوں نہ ہو۔ اس امر کو اختیار نہیں کرتا۔ کوئی امر جو کسی کی آزادی میں مخل ہو۔ نہیں کیا۔" (حکیم الامۃ۔ صہ ۸۳)

کبھی یُوں فرماتے تھے کہ :-

خود بھی بار بار بطور تحدث بالنعمۃ کے کہا کرتا ہوں کہ یہاں کسی پر کوئی گرانی نہیں ڈالی جاتی نہ خیالی۔ نہ واقعی۔" (حکیم الامت ص۱۰۱)

رجُوع کا اہتمام

حضرت تھانویؒ ہر معاملہ میں وسیع الظرف تھے۔ عفو و درگذر میں بھی اور غلطی کے اعتراف میں بھی۔ غلطی کا اعتراف آپ محض دفع الوقتی کے لیے نہیں کرتے تھے بلکہ اس کا آپ کے ہاں باقاعدہ انتظام تھا۔ ۱۳۳۹ھ سے ایک رسالہ "النور" خانقاہ امدادیہ اشرفیہ سے زیرِ ادارت مولانا شبیر علی صاحب ہر قمری مہینہ کے اخیر ہفتہ میں شائع ہُوا کرتا تھا اس میں حضرت تھانوی کے ہر قسم کے جدید مضامین شائع ہوتے رہتے تھے۔ اس رسالہ میں ایک مستقل عنوان "ترجیح الراجح" بھی تھا۔ حضرت کو جب کبھی اپنی تحقیق سابق میں کچھ ترمیم کرنی ہوتی یا کسی قسم کی تصحیح کرنی ہوتی تو وُہ اس عنوان کے تحت شائع کی جاتی اور وہ ترمیم، تنسیخ یا تصحیح بڑی ہی اصطلاحی قسم کی ہوتی۔ جیسے حضرت تھانوی نے بہشتی زیور میں کہیں نظرِ بد کا یہ علاج تحریر فرمایا ہُوا تھا کہ اس کی شرمگاہ کو دھو کر مریض پر پانی چھڑکا جائے۔ ایسا ہی حضرت سے بہت قبل حضرت شاہ عبدالحق دہلوی بھی لکھ چکے تھے۔ ایسے محققین کی تحقیقاتوں کی خامیاں نکالنے اور ان میں موشگافیاں پیدا کرنے والے بھی ہر دور میں موجود ہوتے ہیں چنانچہ ایک صاحب نے لکھا کہ اس علاج میں حدیث نبوی کے لفظ "داخلۃ الازار" سے آپ کو دھوکہ ہُوا ہے۔ جس کے معنی شرمگاہ کے کیے گئے ہیں۔ تو اس کے جواب میں آپ نے فوراً لکھا کہ :-

"میرے ذہن میں تو یہی تفسیر ہے۔ اگر کسی نے اس کے خلاف لکھا ہو تو مَیں رجُوع کرلوں گا۔" (حکیم الامت ص۲۶۳)

چنانچہ اس نکتہ کی صحت کے لیے مولانا عبدالماجد صاحب نے جو اعتقاد کامل رکھنے کے باوجود حضرت کی علمی تحقیقاتوں پر برملا شبہات پیش کرتے رہتے تھے۔ فوراً داخلۃ الازار" کی نسبت قاموس۔ صراح اور لسان العرب وغیرہ سے حوالہ جات تلاش کر کے بھیج دیئے جس پر آپ نے لکھا :۔

"مَیں نے بھی احتیاطاً مجمع البحار میں دخل وغسل کے مادہ میں دیکھا ہے مختلف فیہ تفسیر ہے۔ البتہ ترجیح غسل ثوب ہی کی تفسیر کو ہے۔ مجھ کو کبھی شبہ ہی نہ ہوا تھا۔ اب ترجیح الراجح میں لکھوا دیا ہے۔ اور وقت پر شائع ہو جائے گا۔ اور یہ ترجیح تو قواعد روایت سے ہے۔ لیکن قوائد درایت سے ترجیح معنی مجازی کو معلوم ہوتی ہے۔ کیونکہ اس تدبیر میں بقیہ مغولات سب اعضاء ہیں۔ دوسرے اگر کوئی صاحب ازار نہ ہو تو وہاں یہ تدبیر مکمل نہ ہو سکے گی۔" (حکیم الامت صہ ۲۶۹)

اس طرح ایک مرتبہ مولانا عبدالماجد صاحب نے لکھا کہ :۔

"جناب والا کے ترجمہ قرآن میں جزاء المحسنین وغیرہ کے مواقع پر جزاء کا ترجمہ "پاداش" سے فرمایا گیا ہے۔ آج کل بیان القرآن کی نظر ثانی جاری ہے۔ بہ ادب گذارش ہے کہ اس لفظ پر بھی نظر ثانی فرمائی جائے۔ پاداش فارسی میں تو بیشک مطلق جزاء کے معنی میں ہے۔ لیکن اردو میں اس کا استعمال میری فہم ناقص میں عموماً ذم ہی پر آتا ہے۔ اگر خیال والا میں بھی یہ تحقیق طلب ہو۔ تو کسی صاحب سے مشورہ فرمالیا جائے۔
(حکیم الامت صہ ۳۲۱)

حضرت نے بلاقیل وقال اس کے جواب میں لکھا :۔

مَیں کس کو ڈھونڈھتا پھروں گا۔ میرے جی کو یہ مشورہ لگ گیا۔ لفظ

صلہ بدل دیا گیا اور یہ معلوم نہیں کہ آیا ہر جگہ یہی ہُوا ہے۔ یا صرف اسی آیت میں اگر دو چار مواقع ذہن میں ہوں تو اطلاع فرمانے سے تلاش سے بچ جاؤں گا۔" (حکیم الامت صـ۳۲۲)

مناظرہ سے نفرت

طالب علمی کے زمانہ میں تو حضرت تھانویؒ مناظروں کے بڑے شوقین تھے۔ اور ایسے مواقع کی تلاش میں رہتے تھے۔ مگر مسندِ ارشاد پر بیٹھنے کے بعد آپ کی طبیعت مناظروں اور مباحثوں سے نفرت کرنے لگی۔ فرماتے تھے کہ:۔

"مجھے جتنا اس زمانہ میں مناظروں کا شوق تھا۔ اب بوجہ مضرتوں کے اتنی ہی اس سے نفرت ہے۔"

کیونکہ تجربہ سے ثابت ہو چکا تھا کہ عام طور پر مناظرے نیک نیتی سے نہیں کیے جاتے۔ ان کا مقصد خواہی نخواہی دُوسرے فریق کو نیچا دکھانا ہوتا ہے۔ اور اس کی تہہ میں اغراض فاسدہ ہوتی ہیں۔ جن کی وجہ سے بجائے نفع کے ضرر واقع ہوتا ہے۔ کج بحثی۔ ہٹ دھرمی کی عادت پڑ جاتی ہے اور حقیقت شناسی کی استعداد جاتی رہتی ہے۔

چندے سے احتراز

"درس و تدریس" کے باب میں "غیرتِ دینی کے تقاضا" کے تحت آپ پڑھ چکے ہیں کہ حضرت تھانویؒ نے بحیثیت مدرس مدرسہ کے لیے چندہ مانگنے سے صاف انکار کر دیا تھا۔ کیونکہ آپ اِسے غیرتِ دینی کے خلاف سمجھتے تھے اور تحریک خاص سے دباؤ ناجائز کی صورت پیدا ہوتی تھی۔ اس لیے آپ نے ملازمت سے استعفاء دے دیا مگر چندہ مانگنا گوارا نہ کیا۔

حضرت تھانویؒ کا موقف یہ تھا کہ:۔

"میں چندہ کی تحریک کا مخالف نہیں ہوں۔ میرے نزدیک طریق یہ ہے کہ اس کی تحریک رؤسا کریں۔ مولوی نہ کریں۔ کیوں رؤسا خود بھی دیتے ہیں اور ان کی تحریک سے کوئی شبہ پیدا نہیں ہوتا اور مولوی صاحب چونکہ خود نہیں دیتے اس لیے شبہ ہوتا ہے کہ اپنے کھانے کے واسطے کر رہے ہیں۔"

(کلمۃ الحق صہ ۳۲)

چنانچہ اگر کسی مقصد کے لیے آپ خود چندہ دیتے تھے تو اس کے لیے دوسروں سے مانگنے میں بھی گریز نہ کرتے تھے۔ آپ کے قیام کانپور میں جب وہاں قحط پڑا تو آپ نے اپنے ہمسایوں کو اس بلائے ناگہانی سے بچانے کے لیے کئی بار چندہ کیا۔ جیسا کہ آپ کے اس ارشاد سے ظاہر ہے :۔

"میں خود ہی وہاں (کانپور) کے غربا کی خاص خاص مواقع پر امداد کرتا رہتا تھا ایک بار قحط پڑا تو حقوق جوار کی بنا پر میں نے کئی بار چندہ کر کے غربا کو اناج اور کپڑا تقسیم کیا۔"

مشورہ میں احتیاط

مشورہ دینے کے معاملہ میں آپ بڑے محتاط تھے۔ کیونکہ آپ کا خیال تھا کہ آجکل مشورہ دینے میں بڑی خرابی یہ ہے کہ معتقدین بوجہ غلو فی الاعتقاد کے مشورہ کے متعلق یہ غلط عقیدہ رکھتے ہیں کہ شیخ کے قلب میں مضر یا غلط بات آہی نہیں سکتی۔ اور اس میں یقینی خیر سمجھتے ہیں۔ اور اس کے خلاف کرنے میں یقینی ضرر سمجھتے ہیں اس احتیاط کی دوسری وجہ یہ فرماتے تھے کہ :۔

"لوگوں کو مشورہ کی حقیقت معلوم نہیں۔ اس کی حقیقت یہ ہے کہ اگر دو شقوں میں تردد ہوا اور ہر شق میں مصالح و مفاسد جمع ہوں اور خود کسی شق کو ترجیح نہ دے سکے۔ تو دونوں شقوں کو اور ان کے منافع و مضار کو اور تردد کی وجہ کو پیش کر کے مشورہ

طلب کرلے۔ اب لوگ نہ دونوں شق تحریر کرتے ہیں اور نہ شقوں کے منافع و مضار تحریر کرتے ہیں اور میں خالی الذہن ہوتا ہوں۔ تو کیسے مشورہ دوں۔ فی الواقع اس میں عقیدہ کا فساد ہے یہ خیال کرتے ہیں کہ یہ شخص جو کہہ دے گا وہی خیر ہوگا۔ تو ان کی نیت مشورہ کی ہوتی ہی نہیں۔"

(کلمۃ الحق صـ۱۵)

دنیوی امور کے متعلق مشورہ دینے میں آپ عموماً عذر فرما دیتے تھے۔ کیونکہ حضرت کو نہ ایسے امور سے دلچسپی تھی۔ نہ ایسے امور کا تجربہ ہوتا تھا۔ اگر کسی خصوصی موقع پر مشورہ دیتے بھی تو اکثر اس عنوان سے کہ "اگر آپ کی جگہ میں ہوتا۔ تو یہ کرتا۔"

معاملات

تربیّت گاہ

آجکل عام طور پر یہ سمجھ لیا گیا ہے کہ اسلام صرف نماز۔ روزہ۔ حج۔ زکوٰۃ کی تعلیم اور حشر و نشر۔ جنت و دوزخ وغیرہ کے متعلق خبریں دیتا ہے۔ اس کا معاملات و معاشرت سے کوئی تعلق ہی نہیں اس لیے جو چاہو کرو۔ جس طرح چاہو رہو۔ ہر طرح کی آزادی ہے۔ اگر بعض کو بعض معاملات میں بعض اصولوں کی پابندی کا خیال بھی آتا ہے۔ تو وہ غیر قوموں کی تقلید کرنے لگتے ہیں اور اتنا معلوم کرنے کی کوشش نہیں کرتے کہ اس معاملہ میں اسلام کیا تعلیم دیتا ہے اور نہ ہی ہمارے ہاں سرکاری یا غیر سرکاری۔ مذہبی یا غیر مذہبی اداروں میں کہیں بھی اسلامی اخلاق و آداب و معاملات معاشرت کی عملی تعلیم و تربیت کا اہتمام ہے۔ حالانکہ یہ نصوص صریحہ سے ثابت ہے کہ منجملہ اجزائے دین کے تصحیح معاملات بھی ہے۔ بلکہ بعض اعتبار سے یہ اہم جز ہے۔ اور سب سے زیادہ کوتاہی اور بے التفاتی بھی

اسی سلسلہ میں برتی جاتی ہے۔ اسی لیے حضرت کے ہاں اس کا زیادہ اہتمام تھا۔ جیساکہ آپ کے اس ارشاد سے ظاہر ہے کہ :۔

"مجھے علم پڑھانے لکھانے کا اتنا زیادہ اہتمام نہیں ہے۔ جس قدر تہذیب اخلاق و دیانت پر نظر ہے۔ کیونکہ پڑھنے لکھنے کا تو ہر جگہ انتظام ہوتا ہے۔ لیکن اخلاق کی طرف کسی کو خیال نہیں۔ اس طرح میں اپنے متعلقین یعنی جو لوگ میرے ذریعہ سے داخل سلسلہ ہیں۔ ان کے لیے اوراد و وظائف و اذکار و اشغال کا اتنا زیادہ اہتمام نہیں کرتا۔ جتنا اخلاق کی درستی کا اہتمام کرتا ہوں۔ کیونکہ اخلاق کا سنوارنا زیادہ ضروری ہے۔ کوئی ذکر و شغل کرتا ہو تو مجھے اس وقت تک اس کی قدر نہیں ہوتی۔ جب تک کہ اس کے اعمال درست نہ ہوں "

یوں تو ہندوستان میں بڑے بڑے جلیل القدر اولیاء کرام گزرے ہیں جو اپنے اپنے وقت کے تقاضوں کے مطابق اصلاح اُمت کے فریضہ میں مشغول رہے۔ مگر کسی نے "خانقاہ امدادیہ" جیسی کوئی ایسی تربیت گاہ قائم نہ کی جس میں کتاب و سنت صرف معاملات و معاشرت کی عملی تعلیم و تربیت دی جاتی ہو۔

رازِ کامیابی

اس تربیت گاہ کی کامیابی اور اس کے تربیت یافتگان کی مثالی زندگی کا راز صرف یہ تھا کہ اس کا ناظم الامور جن اصول قواعد کی پابندی دوسروں سے کراتا تھا۔ ان کا خود بھی پابند تھا عوام تو کیا خاص بھی چونکہ معاملات و معاشرت کی اسلامی تعلیمات سے ناآشنا تھے۔ اس لیے ان پر حضرت تھانوی کی تربیتی پابندیاں بہت گراں گزرتی تھیں۔ اور وہ ان کی حقیقت و اہمیت معلوم کرنے کے بجائے ناحق حضرت کو بدنام کرنا شروع کر دیتے تھے۔ جیساکہ حضرت کے اس بیان سے ظاہر ہے۔

"کوئی یہاں رہ کر واقعات کو بنظرِ غور و انصاف دیکھے۔ تو اس کو حقیقت منکشف ہو جائے معترضین کا زیادہ حصہ اہلِ سماع میں۔ اہلِ مشاہدہ نہیں۔ مشاہدہ میں تو ہر واقعہ کی ترتیب سامنے ہوتی ہے۔ جس سے حقیقت واضح ہو جاتی ہے اور میں فقط دوسروں کو ہی اصولِ صحیحہ کا پابند نہیں بناتا، بلکہ اپنے آپ کو بھی پابند کرتا ہوں اور یہ تکلف یا تصنع نہیں بلکہ اللہ کا شکر ہے کہ اصولِ صحیحہ کی پابندی میرا مقتضائے طبعی ہو گیا ہے یہاں تک کہ اکثر اہلِ معاملہ کو میری رعایت اصول کا علم بھی نہیں ہوتا۔ لیکن میرے قلب کو تو تسلی ہوتی ہے کہ میں نے اصولِ صحیحہ کی رعایت کی۔ کسی کو جتلانا تھوڑا ہی مقصود ہے۔"

وجۂ حاضری

یہی وجہ ہے کہ حضرت تھانوی بیعت کے لیے تو کسی کا خانقاہ میں آنا ضروری نہیں سمجھتے تھے۔ مگر اصلاح و تربیت کے لیے کم از کم ایک مرتبہ کی حاضری لازمی قرار دیتے تھے۔ تاکہ آنے والے پر آپ کے مزاج۔ مسلک۔ بے تکلفی۔ سادگی۔ صفائی۔ آزادی۔ رعایت۔ مروّت۔ شفقت۔ محبت۔ سخاوت۔ شجاعت۔ خشیت۔ عبدیت۔ استقامت وغیرہ کا حال روشن ہو جائے۔ اسی لیے آپ بعض شرعی رخصتوں پر قصداً عمل فرماتے۔ جیسے کبھی کبھی نوافل کا بیٹھ کر پڑھ لینا۔ اکثر بچوں سے خوب ہنسنا بولنا اور مزاح فرمانا۔ غصہ کی باتوں پر خوب کھل کر غصہ فرمانا اور دُور دراز سے نہایت عقیدت مندانہ حاضر ہونے والوں کو بھی خلافِ اصول امور پر "ادنیٰ پروائے زوالِ عقیدت" نہایت آزادی سے روک ٹوک دینا۔ تاکہ آنے والے تمام حال و قال دیکھ لیں اور آپ کو ضرورت سے زیادہ عابد و زاہد نہ سمجھیں۔

اس سے دوسرا فائدہ یہ تھا کہ حضرت اپنی مجلس عام میں طالبین کے خاص خاص خطوط کے خاص خاص مضامین مع جوابات کے حاضرین مجلس کو بلا اظہارِ نام سناتے رہتے تھے اور ان کی غلطیوں پر زبانی توضیح فرماتے رہتے تھے۔ جس سے حاضرین کو اپنی اصلاح کرانے کا صحیح

طریق معلوم ہو جاتا تھا اور اپنی اصلاح کے متعلق خط و کتابت کرنے اور اپنے امراضِ نفس کے پیش کرنے کا سلیقہ آجاتا تھا اور دُور سے حقائق پر روایات کا جو کہر سا پڑا ہوا دکھائی دیتا تھا۔ قریب آکر دیکھنے سے وہ خود بخود ہٹ جاتا تھا۔

اعترافِ مخالفین

حضرت کا چونکہ ہر قول اور ہر فعل مطابق کتاب و سنت ہوتا تھا۔ اس لیے اس اتباع کامل کی برکت سے دیکھنے والوں پر بھی گہرا اثر پڑتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کے مخالفین کو بھی اس بات کا اعتراف تھا کہ نہ صرف حضرت تھانوی بلکہ ان کے منتسبین بھی صحیح المعاملہ ہیں۔

ایک مرتبہ ایک غیر مقلد کسی کام کے سلسلہ میں حضرت تھانوی کی خدمت میں حاضر ہوئے واپس جاکر انھوں نے اپنے مشاہدہ کی بنا پر اپنے ایک ملنے والے سے کہا کہ :۔

"ہم لوگوں میں تو اتباع سنت کا فقط دعویٰ ہی دعویٰ ہے۔ اتباعِ سنت تو ہم نے وہاں دیکھا ایک کتاب کی ضرورت ہوئی تو خود اُٹھ کر کتب خانہ سے لائے۔ کسی سے نہیں کہا کہ لے آؤ۔ اپنا کام خود کیا کہ دوسرے کو تکلیف نہ دی۔ سبحان اللہ! کیا اتباع سنت ہے اور کتنی تواضع کہ بلا تکلف خود اٹھ کر لے آئے۔"

انھوں نے اس بات کا حضرت سے ذکر کیا تو آپ نے فرمایا کہ انھیں اس معمولی سی بات پر بھی بڑا تعجب ہوا۔ میرے ہاں تو روز کا یہی معاملہ ہے۔ مَیں تو سب کی اتنی رعایت کرتا ہوں کہ ان کی نظر و فائق رعایت تک بھی نہیں پہنچ سکتی۔ جس کی تائید آپ کے حسب ذیل ارشادات و ملفوظات سے ہوتی ہے۔

اہلِ خانہ سے معاملہ

۱۔ سہواً کبھی خلاف ہو گیا ہو تو ہو گیا ہو۔ لیکن مجھے یاد نہیں کہ مَیں نے کبھی گھر میں کھانا کھا کر یہ کہا ہو کہ برتن اُٹھالو۔ بلکہ یہ کہتا ہوں کہ برتن اُٹھوا لو۔ گو وہ محکوم ہیں۔ لیکن

ان کی حاکمیت کا جو ان کو گھر میں اپنے محکومین پر حاصل ہے۔ لحاظ رکھتا ہوں۔ کیونکہ محکومین کا بھی احترام چاہیئے۔ پھر چاہے وہ خود اُٹھالیں یا کسی اور سے اٹھوالیں۔ مَیں نوکرانی سے بھی خود کسی کام کے لیے نہیں کہتا۔ بلکہ مَیں تو گھر میں کہہ دیتا ہوں اور وہ نوکرانی سے کہتی ہیں۔ کیونکہ نوکرانی براہِ راست انہی کی محکوم ہے۔ اس میں بھی ان کی حاکمیت کو محفوظ رکھتا ہوں۔ نیز اجنبی عورت سے بلا ضرورت خطاب بھی ایک درجہ میں خلافِ حیا ہے۔

۲۔ گھر میں جو چیز اُٹھاتا ہوں بعد فراغت اس کو وہیں جا کر رکھتا ہوں۔ جہاں وہ رکھی تھی تاکہ جس نے رکھی ہے۔ وہ پریشان نہ ہو اور اس کو ڈھونڈھنا نہ پڑے۔

۳۔ گھر میں رات کو سوتے وقت احتیاطاً لوٹا میں پانی بھر کر رکھ لیتی ہیں۔ اگر کبھی مجھے پانی کے استعمال کرنے کی ضرورت پڑ جاتی ہے۔ تو مَیں پھر لوٹا کو بھی اسی جگہ رکھ دیتا ہوں تاکہ اگر ان کو ضرورت ہو۔ تو لوٹا بھرا ہُوا ہی ملے۔ دوبارہ ان کو نہ بھرنا پڑے۔

اقربائے سے معاملہ

۱۔ مولوی شبیر علی سے بڑھ کر میرا کس پر زور ہوگا۔ میری اولاد ہیں۔ بھتیجے ہیں اور بچپن سے ہی میرے پاس رہے ہیں۔ لیکن مَیں ان کی بھی اتنی رعایت کرتا ہوں کہ جب کبھی مجھ کو ان سے کچھ کہنا ہوتا ہے۔ تو ان کو اپنے پاس نہیں بلاتا کہ نہ معلوم کسی ضروری کام میں مشغول ہوں بلکہ مَیں خود ہی اُٹھ کر ان کے پاس جاتا ہوں۔ یہاں تک کہ اگر وہ خود کسی کام سے میرے پاس آئے ہوئے ہوتے ہیں۔ اور مجھے بھی ان سے کچھ کہنا ہوتا ہے۔ تو مَیں اس وقت ان سے کچھ نہیں کہتا بلکہ جب وہ اپنی جگہ واپس پہنچ جاتے ہیں۔ تب اُن کے پاس جا کر جو بات کہنی ہوتی ہے۔ کہتا ہوں۔ تاکہ جب وہ میرے پاس کسی ضرورت سے آیا کریں۔ تو آزادی سے آیا کریں۔ اس کا خطرہ بھی نہ ہو کہ اگر مَیں وہاں جاؤں گا۔ تو میرے ذمہ کوئی نہ کوئی کام لگا دیا

جائے گا:

۲۔ میرے چھوٹے گھر میں کے والد پیر جی ظفر احمد صاحب میرے ساتھ اپنے پیر کا سا برتاؤ کرتے ہیں۔ لیکن میرے قلب میں ان کی ویسی ہی عظمت ہے جیسی خسر کی ہونی چاہیئے اور جیسی اپنے بڑے خسر صاحب کی تھی۔ لیکن پیر جی صاحب کو اس کا علم بھی نہیں۔ نہ مجھ کو یہ اہتمام ہے کہ ان کو اس کا علم ہو۔ مجھے تو اپنی تسلی کرنی ہوتی ہے کہ میں ان کا حق عظمت ادا کر رہا ہوں۔ ان پر کوئی احسان تھوڑا ہی رکھنا ہے۔

۳۔ حسن العزیز جلد الملفوظ نمبر ۳۴ امیں خواجہ عزیز الحسن صاحب لکھتے ہیں :۔
ایک بار احقر کے یہاں حضرت کی دعوت تھی۔ حضرت کے ایک عزیز نے نوکر سے پانی اس طرح مانگا کہ پانی لاؤ۔ حضرت نے فوراً تنبیہہ فرمائی کہ میزبان کے نوکر سے ایسے حاکمانہ لہجہ میں پانی نہیں مانگنا چاہیئے۔ بلکہ اخلاق کے ساتھ کہنا چاہیئے کہ تھوڑا پانی عنایت کیجئے۔

۴۔ ایک بار حضرت کے مردانہ کمرہ میں چند مہمان حضرت کے ساتھ کھانا کھانے کو پہنچے۔ وہاں حضرت کے ایک عزیز اپنے بچہ کو لیے چارپائی پر لیٹے تھے۔ حضرت نے ترش رو ہو کر فرمایا کہ یہ کیا بدتہذیبی ہے کہ چند بھلے آدمی تو نیچے بیٹھے ہوں اور تم چارپائی پر لیٹے رہو (پھر فرمایا) کہ میں اپنے عزیزوں کو اپنے ساتھ خود بہت بے تکلف رکھتا ہوں کیونکہ ان کو میرے ساتھ بے تکلفی کے برتاؤ کرنے کا حق ہے لیکن مجھے یہ ہرگز گوارا نہیں ہوتا کہ میرے مہمانوں کے ساتھ بے تہذیبی کا برتاؤ کیا جائے۔

۵۔ اشرف المعمولات کے ملفوظ نمبر ۳۴ میں درج ہے کہ حضرت نے فرمایا :۔
کہ بفضلہٖ تعالےٰ جیسا ہم سب بھائیوں میں اتفاق ہے۔ ایسا بہت کم دیکھا گیا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم سب علیحدہ علیحدہ ہیں کسی کا کوئی بار دوسرے پر نہیں۔ حتیٰ کہ میں نے تو اس کی یہاں تک رعایت کی ہے کہ حتی الامکان بھائیوں سے کوئی چیز

عاریۃً بھی نہیں لیتا۔ بلکہ اگر وہ چیز کرایہ کی ہوئی تو کرایہ پر لیتا ہوں۔ چنانچہ جب تک ریل نہ تھی۔ اس وقت جب کبھی گاڑی کی ضرورت ہوتی تو اپنے بھائی کی گاڑی بھی کرایہ پر لیتا تھا۔ اس کا نفع یہ تھا کہ اگر کبھی ان کو خود ضرورت ہوتی تو وہ صاف کہہ دیتے تھے کہ اس وقت گاڑی خالی نہیں ہے۔ کیونکہ جانتے تھے کہ اس سے بھائی کا کوئی نقصان نہ ہوگا۔ کیونکہ کرایہ ہر حال میں دینا ہوگا۔ اگر میں عاریۃً لیتا۔ تو ہرگز وہ اس صفائی سے نہ کہہ سکتے اور اس سے طبیعت پر گرانی ہوتی۔

اسی طرح میں اپنے بھائی کے نوکروں سے بھی کوئی کام نہیں لیتا کہ ممکن ہے کبھی تنگ دلی پیدا ہو۔ نیز جلانے کی لکڑی کہ جس کی حقیقت نہیں۔ ایک بار ان کے یہاں بہت بچ گئیں میں نے وہ بھی بہ قیمت لیں۔ کیونکہ اس سے مفت خوری کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ "آج لکڑیاں آئیں۔ کل پیاز آئے گی۔ پرسوں ترکاری آئے گی"۔ وقس علیٰ ہذا

اہلِ خصوصیّت سے معاملہ

مزید فرمایا کہ اگر اہلِ خصوصیت کو بھی اپنے کسی کام کے لیے کچھ لکھتا ہوں تو جوابی لفافہ بھیجتا ہوں۔

مہمانوں سے معاملہ

کوئی کیسا ہی محبوب مہمان ہو اور اس کے ٹھہرانے کو کتنا ہی جی چاہتا ہو۔ کبھی میں اس کی مرضی کے خلاف اصرار نہیں کرتا۔ اور جب جانے کو کہتا ہے۔ تو نہایت فراخ دلی سے کہہ دیتا ہوں کہ جیسی مرضی ہو اور جس میں راحت ہو۔

میں کھانے پر بھی اصرار نہیں کرتا اور اسے بہت بُرا سمجھتا ہوں۔ کیونکہ کسی کو بے بھوک کھلانا زہر دینا ہے۔ لوگوں میں یہ عام مرض ہے کہ اصرار کرکے کھلایا کرتے ہیں۔

طالبین سے معاملہ

بفضلہٖ تعالیٰ بمصلحت طالب یہ خاص رعایت صرف میرے ہی یہاں ہے کہ جس کے

ساتھ مناسبت پیدا ہونے کی مجھ کو توقع نہیں رہتی۔ مَیں اس سے صاف کہہ دیتا ہُوں کہ کسی دوسرے سے رجُوع کرو اور یہ بھی کہہ دیتا ہُوں کہ اگر کسی مصلح کا پتہ مجھ سے پوچھا جائے گا۔ تو مَیں بتلا دونگا۔ اور اگر اس پر وہ نام پوچھتا ہے تو مَیں وہ بھی بتا دیتا ہُوں۔ اس عین قطع تعلق کے وقت بھی اس کی اتنی رعایت کرتا ہُوں کہ سارا بوجھ اس پر نہیں ڈالتا۔ اور مَیں جو عدمِ مناسبت کی صُورت میں قطع تعلق کر لیتا ہُوں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ بغیر مناسبت کے شیخ سے نفع نہیں ہوتا۔

اسی طرح میں جو کسی طالب سے قطع تعلق کرتا ہُوں تو اس کے نقص کی وجہ سے نہیں بلکہ باہم مناسبت نہ ہونے کی وجہ سے۔ ورنہ درحقیقت مَیں تو اس کو اپنے سے ہزار درجہ افضل سمجھتا ہُوں۔ کیونکہ اپنی حالت تو جیسی ہے معلوم ہے۔ اس کے بارہ میں خبر نہیں۔ ممکن ہے وہ عند اللہ مقبول ہو۔ اسی بنا پر مَیں ہر مُسلمان کو اپنے سے افضل سمجھتا ہُوں اور قطع تعلق اس کے نفع کی خاطر کرتا ہُوں۔ جیسے حضرت خضر علیہ السلام کا حضرت موسیٰ علیہ السلام سے یہ فرما دینا مصرح ہے۔ ھٰذا فراقُ بینی و بینکَ جس کی بنا محض عدم مناسبت ہی تھی۔ نہ کوئی معصیت۔

غرض عدمِ مناسبت کی صُورت میں بھی طالب کو اپنے ہی ساتھ الجھائے رکھنا کہ اپنی جماعت میں کمی نہ ہونے پائے۔ اس کو مَیں خیانت سمجھتا ہُوں۔ یہاں تک کہ بعضوں کو مَیں نے دیکھا کہ کسی بزرگ سے بھی ان کو مناسبت نہ ہوتی اور نہ کسی سے مناسبت ہونے کی توقع رہی۔ تو ان کے لیے بھی مَیں نے ایک راہ نکال دی۔ کیونکہ یہ اللہ تعالیٰ کا راستہ ہے۔ اس میں کوئی طالب محروم نہیں رہ سکتا۔ ان کے لیے مَیں نے یہ طریقہ تجویز کیا کہ تم ضروری احکام کا علم حاصل کرتے رہو خواہ مطالعہ سے۔ خواہ اہلِ علم سے پُوچھ پُوچھ کر۔ اور سیدھا سادہ نماز روزہ کرتے رہو۔ جو امراض نفس تم کو اپنے اندر محسوس ہوں۔ ان کا علاج جہاں تک ہو سکے اپنی سمجھ کے موافق بطور خود کرتے رہو۔ اور جو موٹے موٹے گناہ ہیں ان سے بچتے رہو۔ اور

بقیہ سے استغفار کرتے رہو اور دُعا بھی کرتے رہو کہ اے اللہ ان کا بھی مجھے احساس ہونے لگے اور ان کے معالجات بھی میری سمجھ میں آنے لگیں اور اگر مجھ میں سمجھنے کی استعداد نہ ہو تو بلا اسباب ہی محض اپنے فضل سے ان عیوب کی اصلاح کر دے۔ بس یہ بھی نجات کے لیے کافی ہے۔ اور نجات ہی مقصود ہے۔"

حضرت کا یہ طریق بھی عین سُنت نبوی کے مطابق ہے کیونکہ ایک دفعہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک بدوی نے پوچھا کہ میرے لیے اسلام کا کیا حکم ہے۔ حضورؐ نے اسے قریباً ایسی ہی باتیں تبلائی تھیں۔

ممکن ہے بعض قارئین کے دل میں مناسبت و عدم مناسبت کا فرق معلوم کرنے کا شوق پیدا ہو۔ ان کے لیے حضرت تھانوی کا مندرجہ ذیل ارشاد راہنمائی کے لیے کافی ہوگا۔ فرمایا کہ :-

"بعض نے مجھ سے سوال کیا کہ شیخ کے ساتھ مناسبت ہونے نہ ہونے کی علامت کیا ہے تو میں نے ان سے کہا کہ گو یہ امر ذوقی ہے۔ لیکن میں الفاظ میں اس کی تعبیر کیے دیتا ہوں۔ مناسبت کی علامت یہ ہے کہ شیخ کے کسی قول یا فعل پر شیخ کے خلاف طالب کے قلب میں کوئی اعتراض یا شبہ جزم یا تردد یعنی احتمال صحت جانبین کے ساتھ پیدا نہ ہو۔ یہاں تک کہ اگر اس کے کسی قول یا فعل کی تاویل بھی سمجھ میں نہ آئے۔ تب بھی اس کی طرف سے دل میں انکار پیدا نہ ہو۔ بلکہ اپنے آپ کو یوں سمجھا جائے کہ آخر یہ بھی تو بشر ہے اگر اس کا کوئی قول یا فعل گناہ بھی ہو۔ تب بھی کیا ہُوا۔ توبہ سے یا محض فضل سے اس کی معافی ہو سکتی ہے۔"

اسے حضرت کا کمال سمجھئے یا کرامت کہ امور وجدانیت یعنی تردد وخطرہ کے درمیان ایسا رقیق فرق بیان فرمایا۔ جو بڑے بڑے اربابِ علم وفضل بھی نہیں تبلا سکتے۔

عامتہ المسلمین سے معاملہ

اس سلسلہ میں آپ کا ارشاد ہے کہ :۔

مُیں نے خانقاہ میں قاعدہ مقرر کر دیا ہے کہ نہ کسی سے دوستی بڑھاؤ۔ نہ دشمنی پیدا کرو۔ نہ زیادہ مجلس آرائی کرو۔ کیونکہ یہ مجلس آرائی فساد کی جڑ ہے۔ لوگ سمجھتے ہیں کہ دین میں انتظام نہیں حالانکہ یہ بالکل غلط ہے۔ ترمذی شریف کے باب الشمائل میں مروی ہے کہ کان لہ عتاد فی کل شئی یعنی حضور صلی اللہ علیہ وسلّم کا ہر امر میں ایک ضابطہ مقرر تھا۔ (ا

(اشرف المعمولات ص۱۳۳، ۷۴)

میری عادت ہے کہ اوّل تو حتی الوسع کسی کی چیز عاریت نہیں لیتا اور اگر کبھی کسی مجبوری سے کوئی چیز لینی پڑی تو فراغت کے بعد اس کو فوراً ہی پہنچا دیتا ہوں۔ تاکہ قلب مطمئن ہو جائے۔ اکثر لوگ اس سے غافل ہیں۔

میری یہ بھی عادت ہے کہ اگر مستعار چیز کسی وجہ سے جلدی واپس نہ کر سکوں۔ تو اس کی بہت حفاظت کرتا ہوں اور گھر میں سب چیزوں سے علیحدہ محفوظ جگہ میں اس کو رکھ دیتا ہوں اور گھر میں سب کو منع کر دیتا ہوں کہ اس کو استعمال نہ کریں۔ کیونکہ اس کا استعمال درست نہیں۔ فقہا نے لکھا ہے کہ اگر کوئی شخص دُوسرے کے پاس کھانا بھیجے۔ تو اس کے برتن میں کھانا کھانا جائز نہیں۔ کیونکہ اجازت نہیں ہے۔ البتہ اگر کھانا ایسا ہو کر برتن کے بدلے سے متغیر ہو جائے۔ تو اس قرینے کی وجہ سے اجازت سمجھی جائے گی۔ مگر اَب تو لوگ بدون تقاضا کے برتن واپس ہی نہیں کرتے۔ بلکہ ایک گھر سے دُوسرے گھر چلے جاتے ہیں۔ یا چند روز کے بعد انکار ہی کر دیتے ہیں۔

ایک روز مَیں نے قصابوں کو بلایا اور پُوچھا کہ ہمارے ہاں تم گوشت غریبوں کے بھاؤ سے کیوں نہیں دیتے؟ قصابوں نے کہا کہ آپ مولوی صاحب ہیں۔ مَیں نے کہا کہ بس میری مولویت کا نرخ چار پیسے ہُوا۔ سچ سچ ایمان سے بتلاؤ کہ اگر مَیں باوجود مولوی ہونے کے اس قوم میں نہ ہوتا۔ بلکہ کسی غریب قوم میں ہوتا۔ جب بھی تم اس نرخ سے دیتے۔ قصابوں

نے کہا حضور آپ کے سامنے مکر و فریب کہاں چلتا ہے۔ سچی بات یہ ہے کہ اُس وقت تو ہم اس بھاؤ نہ دیتے۔ مَیں نے کہا ایسا گوشت کھانا حرام ہے۔ ہم کو تو جولاہوں، تیلیوں کے بھاؤ سے دیا کرو۔ تو ہم لیں گے۔ ورنہ گوشت کھانا چھوڑ دیں گے۔ قصابوں نے بڑا اصرار کیا۔ مَیں ہرگز نہ مانا۔ اس روز سے ہمارے ہاں دو آنہ سیر گوشت آتا ہے۔ یہ ظلماً ارزاں گوشت خریدنا ریاست نہیں ہے۔ اس ریاست کی حقیقت عنقریب معلوم ہو جائے گی۔

ہمراہی سے معاملہ

ساتھ چلنے والے کے لیے اچھا راستہ چھوڑ دیتا ہوں اور سڑک کے کنارے چلتا ہوں تاکہ دُوسرے چلنے والے کو تکلیف نہ ہو۔

مریدوں سے معاملہ

فرمایا کہ حکیم محمد ہاشم صاحب مرحوم کو مجھ سے بہت ہی تعلق تھا۔ یہاں تک کہ آخر میں مجھ سے بیعت بھی ہو گئے تھے۔ لیکن جب کبھی مجھ کو اپنا کوئی حال کہنا ہوتا۔ تو گو بعض اوقات بوجہ ضعف تکلف بھی ہوتا۔ لیکن خود اُن کے گھر جا کر اپنا حال کہتا۔ وہ بہت شرمندہ ہوتے۔ لیکن مَیں کہہ دیتا کہ اس میں شرمندگی کی کوئی بات نہیں۔ جو محتاج ہو اسی کو محتاج الیہ کے پاس آنا چاہیئے نہ کہ برعکس۔ البتہ جب گھر میں کی نبض دکھانی ہوتی۔ تو پھر بے تکلف ان کو بلا لیتا تھا۔ کیونکہ وہ موقع مجبوری کا ہوتا۔ وہاں اصُول صحیحہ کا یہی مقتضا تھا۔

نوکروں سے معاملہ

فرمایا کہ نوکروں کو دو کام ایک ساتھ نہیں بتاتا۔ پہلے ایک بتاتا ہوں۔ جب اس سے فراغت ہو جاتی ہے۔ پھر دُوسرا تاکہ ایک دم بار نہ پڑے اور یاد رکھنے کی زحمت نہ ہو۔ یاد رکھنے کی زحمت کو خود برداشت کرتا ہوں۔ ان پر بوجھ نہیں ڈالتا اگر کوئی کام الجھن کا ہوتا ہے۔ تو اس میں خود بھی شریک ہو جاتا ہوں۔ تاکہ انھیں کچھ سہولت ہو جائے۔

اگر کوئی کام ابتدا ہی سے الجھن کا ہوتا ہے۔ تو اوّل اپنے ہاتھ سے اس کا اشکال رفع

کرکے اور اس کو خود ترتیب دے کر مرتب صورت میں نوکروں کے سپرد کرتا ہوں تاکہ اس کا کرنا ان کو سہل ہو جائے اس طرح جس سے کوئی کام لیتا ہوں۔ مثلاً کوئی مضمون نقل کرانا ہوا۔ تو اس مضمون کو اس طرح واضح صورت میں حوالہ کرتا ہوں کہ ناقل کو کسی طرح کی اُلجھن نہ ہو۔ پارسلوں کے ذریعہ سے جو میں نے ہدایا بھیجنے کی ممانعت کر رکھی ہے۔ اس کی ایک بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ نوکروں کو پارسل لانے کی زحمت نہ ہو۔

ملازموں کو تنخواہ بھی توقیر سے دیتا ہوں۔ پھینک کر نہیں دیتا۔ جیسا کہ متکبرین کا شعار ہے۔ بلکہ ان کے سامنے رکھ دیتا ہوں۔

جب گھر کے لوگ نہیں ہوتے اور صبح کو ملازم کے ساتھ گھر سے باہر جانا ضروری ہوتا ہے تو ملازم کے بیدار ہونے کے بعد قصداً کسی کام میں مشغول ہو جاتا ہوں تاکہ وہ باطمینان اپنی ضروریات سے فارغ ہو جائے اور میرا تہیہ اور انتظار دیکھ کر اس کو عجلت نہ ہو۔

غرضیکہ بہت سی جزئیات ہیں۔ کہاں تک بیان کی جائیں۔ کیا ان حالات میں یہ کہنا سو فیصدی صحیح نہیں کہ ؏

تجھ سے جہاں میں لاکھ سہی۔ تو مگر کہاں

اس مختصر تفصیل سے بقول مولانا عبدالماجد دریابادی :۔

"یہ تو بہرحال معلوم ہی ہو گیا ہوگا کہ حضرت اُس رنگ کے صوفی صافی بالکل ہی نہ تھے جس میں درویشی کے معنے یہ سمجھے جاتے ہیں کہ انسان خلق سے بالکل کنارہ کرکے تنہا کسی جنگل میں رہنا شروع کر دے اور انسان سے کوئی واسطہ نہ رکھے۔"

(حکیم الامت صـ۱۹۷)

معمولات

پابندیٔ معمولات

جیسا کہ آپ اوراق ماسبق میں ملاحظہ کر چکے ہیں کہ حضرت تھانوی کے ہاں ہر بات اور ہر کام کے لیے اصول و قواعد مقرر تھے۔ اسی طرح آپ کے معمولات بھی سُنت نبوی کے مطابق باقاعدہ منابطہ تھے اور آپ کی مرتب و منظم زندگی میں شاذ ہی کوئی ایسا موقع آیا ہو۔ کہ کسی معمول میں فرق آگیا ہو۔ ورنہ جس طرح روزانہ سورج اپنے وقت پر طلوع اور غروب ہوتا ہے۔ وہاں بھی بالعموم یہی حالت تھی۔

معمولِ روزمرّہ

حضرت تھانوی نماز خود پڑھایا کرتے تھے۔ کیونکہ آپ کا خیال تھا کہ بار بار امام بدلنے سے جماعت کے نظم میں فرق آجاتا ہے۔ اگر کبھی کسی مجبوری کی وجہ سے مسجد آنے میں دیر ہو جاتی۔ تو اصرار کر کے دوسرے امام سے نماز پڑھوا دیتے اور خود وضو وغیرہ سے فارغ ہو کر بعد میں مقتدیوں میں شامل ہو جاتے۔ آپ نے یہ اصول مقرر فرما رکھا تھا کہ وسیع وقت میں زیادہ سے زیادہ پندرہ منٹ انتظار کیا جائے اور غیر وسیع وقت میں اتنا بھی نہیں تاکہ مقتدیوں کا حرج یا ان کو تکلیف نہ ہو۔ اکثر عادت صبح کی نماز میں کسی قدر طویل قرأت کی تھی۔ مثلاً۔ سورۃ دہر اور منافقون۔ وقس علی ہذا۔

بعد نماز فجر سب سے پہلے خانقاہ میں مقیم طالبین وسالکین کا جو گروہ ذکر و شغل میں مشغول رہتا۔ ان کے کام کی طرف متوجہ ہوتے۔ یہ لوگ اپنے اپنے باطنی حالات لکھ لکھ کر سہ دری میں لگے ہوئے لیٹر بکس میں ڈال دیتے۔ بعد نماز فجر حضرت خود اپنے ہاتھ سے

اسے کھولتے۔ ایک ایک پرچہ کو پڑھ کر ہر ایک کے مناسب حال اس پر جواب اور ہدایتیں لکھ کر پرچوں کو مسجد کے منبر پر رکھا دیتے تھے۔ مگر اس سلسلہ میں یہ تاکید تھی کہ ان کے پرچوں یا خطوں کو اُوپر نیچے نہ رکھا جائے بلکہ الگ الگ رکھا جائے تاکہ ہر شخص نظر ڈالتے ہی اپنا پرچہ یا لفافہ پہچان کر اُٹھا لے۔ اور اسے تلاش کی زحمت نہ ہو۔

اس سے فارغ ہو کر کلام مجید کی تلاوت فرماتے۔ اکثر چھوٹی حمائل ہاتھ میں لے کر سیر و ہوا خوری کے لیے آبادی سے باہر نکل جاتے۔ چاشت سے لے کر قریب دوپہر تک گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ کے لیے مجلس خاص منعقد فرماتے۔ اس کا پہلے دستور نہ تھا۔ جب سے مولانا عبدالماجد دریابادی تھانہ بھون حاضر ہونے لگے۔ تب سے ان کی خاطر اس مجلس کا انعقاد شروع ہُوا۔ جسے بعد میں مستقل کر دیا گیا۔ اس میں عموماً اہلِ تخصیص ہی ہوتے۔ بڑا مجمع کبھی نہ ہوتا۔

۱۱ بجے سہارن پور کی طرف سے گاڑی آتی۔ زیادہ ڈاک اسی سے آیا کرتی تھی۔ اسٹیشن چونکہ وہاں سے ڈیڑھ ہی فرلانگ پر تھا۔ اس لیے گاڑی کی آواز سُن کر کبھی گھڑی دیکھ کر چند منٹ بعد آپ اُٹھنے کا قصد فرماتے اور بڑے ہی ملتجیانہ انداز میں حاضرین سے یہ کہہ کر اجازت چاہتے کہ:-

"ذرا گھر ہو آؤں یا" اجازت ہو تو ذرا گھر ہو آؤں "

اور ڈاک دیکھنے۔ کھانا کھانے اور تھوڑی دیر سستانے کے لیے زنانخانہ میں تشریف لے جاتے۔ جو وہاں سے دو فرلانگ کے فاصلہ پر تھا۔

دو سوا دو گھنٹے بعد جب ظہر کی اذان ہوتی۔ تو آپ واپس تشریف لاتے۔ نماز سے فارغ ہو کر سہ دری میں آ بیٹھتے۔ اسی وقت سے مجلس عام شروع ہو جاتی۔ جو عصر کی اذان تک رہتی اور اذان ہوتے ہی برخاست ہو جاتی۔

نمازِ عصر سے فارغ ہو کر آپ واپس گھر تشریف لے جاتے۔ اگر کسی نے کوئی خاص بات کرنی ہوتی یا کسی کو بیعت کرنا ہوتا۔ تو اس کے لیے مغرب کے بعد بھی باہر تشریف لاتے۔

معمولِ عبادت

حضرت کے ہاں عبادات کا اہتمام بھی بالکل معمول نبوی کے مطابق تھا۔ ان میں قطعاً کوئی غیر معمولی فرق نہیں تھا۔ چنانچہ حضرت کی شہرت سُننے والے بھی حضرت کے معمولاتِ عبادت جاننے کے بہت مشتاق تھے اور بعض صرف اتباع کی غرض سے معلوم کرنا چاہتے تھے کہ چونکہ یہ بہت بڑے بزرگ ہیں۔ اس لیے ان کے ہاں عبادات کا بھی خاص اہتمام ہوگا۔ چنانچہ ایک اہلِ قلم کے ایسے ہی استفسار کے جواب میں حضرت نے فرمایا :۔

"اول تو معمولات بزرگوں کے ہوتے ہیں۔ میں تو ایک طالب علم آدمی ہوں۔ بجز اوراق سیاہ کرنے کے میرے معمولات ہی کیا ہوتے۔ دُوسرے یہ کہ اگر کوئی صاحبِ معمولات بھی ہو تو اس کے معمولات کی تفتیش اس لیے بھی عبث ہے کہ اتباع امتی کے افعال کا نہیں ہوتا۔ صرف انبیاء علیہم السلام کے افعال کا ہوتا ہے۔ یا جس کے افعال کے اتباع کا سُنت میں امر وارد ہُوا ہو۔ جیسے حضرات خلفاء راشدین یا اکابر صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم۔ غرضیکہ باستثناء مذکور غیر نبی کی تعلیمات قولیہ کا اتباع ہوتا ہے نہ کہ اس کے معمولات فعلیہ کا۔ کیونکہ ممکن ہے۔ بلکہ غالب ہے کہ اس کے معمولات فعلیہ اس کی خصُوصیات میں سے ہوں اور وہ اتباع کرنے والے کے مناسب حال نہ ہوں۔ مثلاً اگر ان کی مقدار زیادہ اور متبع کے تحمل سے باہر ہُوئی تو اس کو وُہ مضر ہوں گے۔ اسی طرح اگر کسی صاحب معمولات کے معمولات اس کی خصُوصیّتِ حال سے کم ہوئے۔ تب بھی ان کا اتباع دُوسروں کو مضر ہوگا۔ جیسے کتابوں میں لکھا ہے کہ ابدال کی نماز بہت مختصر ہوتی ہے مگر بلا نقص۔ اور ان کے ظاہری اعمال نافلہ بھی بہت کم ہوتے ہیں۔ تو جو اس درجہ کا نہ ہوگا۔ اس کے لیے یہ کمی معمولات مضر ہوگی۔

بہرحال کسی کے معمولاتِ فعلیہ کا اتباع نہیں چاہیئے۔ اور جب اتباع نہیں کرنا۔ تو پھر پوچھنا بھی ایک فعلِ عبث ہے بلکہ اس تفتیش میں صاحبِ معمولات کے انقباض کا احتمال ہے۔ کیونکہ ممکن ہے وہ اپنی بعض عبادات کو اوروں سے پوشید رکھنا چاہتا ہو۔ اس لیے تفتیش نہیں چاہیئے۔ اتفاق سے علم ہوجائے تو اور بات ہے لیکن اس صورت میں بھی بلا پوچھے ان پر عمل ہرگز نہ کرے۔ البتہ انبیاء کے قول و افعال سب متبوع ہیں تاوقتیکہ کوئی تخصیص کی دلیل قائم نہ ہو؛

معمول اوقاتِ نماز

حضرت کے ہاں اوقاتِ نماز کا بھی خوب انتظام تھا۔ بڑے اہتمام کے ساتھ دھوپ گھڑی کے حساب سے نقشہ تبدیل اوقات بنا رکھا تھا۔ اور اس کو چھپوا بھی لیا تھا۔ ایک روز قبل نماز کی اوقات کی تبدیلی کا اعلان بذریعہ موذن کرا دیا جاتا تھا۔ اور مسجد میں بھی موجود اوقاتِ نماز کا نقشہ ہر وقت آویزاں رہتا تھا۔ گھڑی جلد جلد دھوپ گھڑی سے ملائی جاتی تھی تاکہ زیادہ تفاوت نہ ہونے پائے۔

عیدین کی نمازوں کے وقت کا اعلان کچھ دن قبل آویزاں کرادیا جاتا تھا۔ بالخصوص جمعہ پیشیں کے دن۔ تاکہ دیہات سے آنے والوں کو بھی وقت کا علم ہوجائے۔ عیدین کی نماز کا وقت قصبہ کی عیدگاہ کے وقت سے بہت متقدم ہوتا تھا۔ تاکہ یہاں کی جماعت میں کم پہنچ سکیں اور وہاں کی جماعت میں زیادہ لیکن پھر بھی مجمع زیادہ ہوجاتا تھا۔ چونکہ نمازِ عیدالاضحیٰ میں تعجیل مستحب ہے اور نماز عیدالفطر میں تاخیر۔ اس لیے ان دونوں نمازوں کے اوقات میں بھی فرق رکھا جاتا تھا۔ یعنی عیدالاضحیٰ کی نماز طلوعِ آفتاب کے ڈیڑھ گھنٹہ بعد ہوتی تھی اور عیدالفطر کی دو گھنٹہ بعد۔

معمول ماہِ رمضان

ماہ رمضان میں عام طور پر عوام تو کیا خواص کے بھی معمولات بدل جاتے ہیں۔ مگر حضرت

کے ہاں قطعاً ایسا نہ ہوتا تھا۔ چنانچہ عام تاثر کے ماتحت ایک مرتبہ غالباً ۱۹۳۰ء میں حضرت مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی نے اس سلسلہ میں حضرت کو لکھا کہ:۔

"معلوم نہیں ماہِ مبارک (رمضان) میں حضرت کا نظامِ اوقات کیا رہتا ہے؟"

جس کے جواب میں آپ نے تحریر فرمایا:۔

"کچھ بھی نہیں۔ جو پہلے ہوتا ہے۔ وہی رہتا ہے۔ ایک آدھ سیپارہ کی تلاوت اکثر بڑھ جاتی ہے۔ لیکن مجلس عام اور ڈاک کا انتظام بالکل بحال رہتا ہے۔"

(ح۔ا۔ص ۱۲۵)

"شنید" بعض اوقات ارباب "دید" کو بڑا پریشان کرتی ہے۔ مشہور و معروف مصنف اور عالم مولانا عبدالسلام صاحب ندوی نے دسمبر ۱۹۳۳ء کو مولانا عبدالماجد کی خدمت میں ایک طویل استفسار بھیجا کہ:۔

"ماہِ رمضان اہلِ قدرت کے دستر خوان تو گویا رنگین غذاؤں کا گلدستہ بن جاتے ہیں۔ دعوتوں کا ہنگامہ گرم ہو جاتا ہے۔ روزہ کشائی کی رسم تو خالص شادی کی تقریب بن جاتی ہے۔ یہ حالت معمولی دنیاداروں کی نہیں۔ عُلماء و صوفیہ بھی اسی رنگ میں رنگے ہُوئے ہیں۔" (حکیم الامت ص ۳۶۶)

پھر ایک مرکزِ تصوف کی طرف اشارہ کرتے ہُوئے لکھا کہ:۔

"مغرب سے سحر کے وقت تک تمام لوگ جو اس مرکز سے روحانی فیض اٹھاتے ہیں۔ بیدار رہتے ہیں۔ اور زیادہ تر عمدہ غذاؤں کا لطف اُٹھاتے ہیں۔ تراویح سے پہلے تراویح کے بیچ میں اور تراویح کے بعد تین بار چائے کا دَور چلتا ہے۔ چونکہ آپ نے زیادہ تر عُلماء و صوفیہ کا فیض اٹھایا ہے۔ اس لیے براہِ کرم مجھ کو اور ادارہ ناظرین "سچ" کو اس معاملہ میں اپنی معلومات سے فائدہ پہنچائیے اور یہ بتائیے کہ اس کی سند کیا ہے۔ اور یہ حالت مقاصدِ صوم کے منافی ہے۔

یا نہیں۔" (بحوالہ صدر)

مولانا عبدالماجد ان دنوں "صدق" کی بجائے "سچ" نکالا کرتے تھے۔ چونکہ ان کا ہندوستان کے سب سے بڑے روحانی مرکز یعنی خانقاہ امدادیہ سے بھی تعلق تھا۔ اس لیے انھوں نے اس روحانی مرکز کا اشارہ اس طرف ہی سمجھا اور وہ مضمون بجنسہٖ حضرت تھانوی کی خدمت میں آیۂ یعنہٖ کے ساتھ بھیج دیا۔ مضمون کا جواب تو حضرت نے بعنوان "کلمۃ القوم فی حکمۃ الصوم" میں لکھا۔ جو تحقیق مطالب وجامعیت بیان کے لحاظ سے اپنا نظیر آپ تھا۔ اور "سچ" میں شائع کردیا گیا تھا۔ بلکہ "حکیم الامت" کے صفحات ۳۲۷ تا ۳۳۴ پر بھی درج ہے۔ لیکن ہمارے لیے حضرت کا وہی جواب کافی وشافی ہے۔ جو آپ نے مولانا عبدالماجد صاحب کے جواب میں لکھا کہ ماہ رمضان کے متعلق جو کچھ مضمون نگار نے لکھا ہے۔ اس سلسلہ میں :۔

"یہاں کوئی بات نہیں ہوتی۔ عام عادت یہ ہے کہ نماز سے پہلے معمولی طور پر فرداً فرداً کھانا کھالیتے ہیں جس میں نہ اجتماع ہوتا ہے۔ نہ اہتمام ہوتا ہے۔ پھر نماز سے فارغ ہوکر اپنے کام میں یا آرام میں مشغول ہوجاتے ہیں۔ نہ چائے کا دور ہوتا ہے نہ اور کسی قسم کا اہتمام ہوتا ہے۔ اپنے طور پر کسی کو چائے کی عادت ہو۔ وہ انتظام کرلیتا ہوگا۔ جس کی کسی کو خبر نہیں ہوتی۔" (حکیم الامت صہ ۳۲۳)

معمولِ مجلس

جیسا کہ اُوپر ذکر کیا جاچکا ہے کہ حضرت روزانہ تین مرتبہ مجلس منعقد فرماتے تھے پہلی بعد نماز صبح طالبین کے لیے۔ دوسری بعد چاشت مخصوصین کے لیے تیسری بعد نماز ظہر عامۃ المسلمین کے لیے۔ ان میں کیا کچھ ہوتا تھا۔ اس کی تفصیل مولانا عبدالماجد دریابادی نے یہ لکھی ہے :۔

"دوسری نشست چاشت کے وقت شروع ہوتی۔ اس میں عموماً اہل تخصیص

ہی ہوتے ہر قسم کی باتیں ہوتی رہتیں۔ گفتگو کا بیشتر حصہ مولانا خود فرماتے۔ لیکن ہم لوگوں کو بھی بے تکلف بولنے چالنے۔ پوچھنے پاچھنے۔ سوال وجواب کرنے کی اجازت تھی۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا کہ کسی سائل کے سوال پر یا خود ہی مولانا کسی فقہی۔ کلامی۔ تفسیری یا سلوکی مسئلہ پر کوئی مستقل و مسلسل تقریر ذرا لمبی فرما دیتے۔ جسے حاضرین بڑے انشراح قلب کے ساتھ سنتے لیکن ایسا بہت کم ہوتا۔ عموماً اور بیشتر یہ تھا کہ معمولی طرز پر دوستوں کے درمیان جیسے گفتگو ہوا کرتی ہے۔ یہی رہتی اور بغیر اس کے کہ سننے والوں کے دماغ پر کسی قسم کا بار پڑے۔ اور بغیر اس کے کہ وہ محسوس بھی کرنے پائیں کہ انھیں کوئی خاص تعلیم دی جا رہی ہے۔ خدا جانے کتنے مسائل کتنی کام کی باتیں۔ باتوں باتوں میں اُن کے کان میں پڑ جائیں۔

(حکیم الامت صہ ۹۴)

تیسری نشست عام بعد ظہر اس سہ دری میں ہوتی اور مجمع اچھا خاصا ہو جاتا۔ ڈاک کثرت سے ہوتی۔ روزانہ اوسط ۳۰۔۴۰ خطوط کا تھا۔ یہ وقت جواب لکھنے کا ہوتا۔ حضرت خطوط کے جوابات لکھتے جاتے (کبھی کوئی خط اہل تخصیص کو مع اپنے جواب کے سُنا بھی دیتے) لوگوں سے گفتگو بھی کرتے جاتے اور جو اہل حاجت تعویز و نقوش کے طالب ہو کر آتے۔ ان کی حاجت روائی بھی کرتے جاتے۔ حاضر دماغی کی ایسی مثال بھی کمتر دیکھنے میں آئی۔"

(ح۔ا۔ صہ ۱۸۵)

عتاب کے منظر بھی اس مدت میں بار بار دیکھے۔ مولانا کے ہاں کوئی چیز راز کی یا پوشیدہ نہ تھی۔ یہ منظر اکثر وہی بعد دوپہر والی مجلس عام میں پیش آتے۔ مولانا بڑے ہی لطیف الحس اور ذکی الحس تھے۔ کسی بے ڈھنگی بے قاعدہ

بات کی برداشت نہ تھی۔ لوگ آتے اور ذرا بھی بے قاعدہ باتیں کرتے۔ کہ موردِ عتاب ہو جاتے۔ تکلف اور مصنوعی ادب و تعظیم تو گویا حضرت کی چڑ تھی۔ لوگ عموماً اسی کے عادی۔ خیر جس پر جو گذرنا ہوتی گذر جاتی لیکن اتنا فائدہ بہرحال ہوتا۔ کہ خود اس کو بھی آئندہ کے لیے سبق مل جاتا اور دیکھنے والوں کو بھی ہدایت ہو جاتی۔ مجذوب کے اس مصرع میں کہ ؎

میخانہ کا محرم بھی محروم نہیں ہے

شاعری نہیں۔ واقعہ بیانی ہے۔ مجلس میں سب سے زیادہ ڈھیٹ اور بے لحاظ یہی نامۂ سیاہ تھا۔ بارہا عین عتاب کے وقت، مجرم کی طرف سے کچھ عرض معروض کی جرأت کر گزرتا۔ حضرت کا کمال حلم تھا کہ تبسم کے ساتھ نرم لہجہ میں کچھ جواب ارشاد فرما دیتے۔" (ح۔۱۔ص ۹۴)

لطف یا کمال یہ تھا کہ علالت کے دوران میں بھی معمولاتِ مجلس میں کوئی خاص فرق نہ آیا تھا۔ آپ کو بغرضِ علاج چونکہ کئی مرتبہ لکھنؤ جانا پڑا۔ یہاں مولانا عبدالماجد صاحب بھی اکثر پہنچ جایا کرتے۔ چنانچہ وہ علالت کے زمانہ کے معمولات مجلس کے متعلق لکھتے ہیں کہ :۔

" انتظامات حضرت کی اس علالت کے زمانہ میں بھی قابلِ دید تھے نشست کے اوقات مقرر۔ ہر آنے جانے والے کے لیے حصول اجازت کی ضرورت چھوٹی بڑی ہر شے میں ایک قاعدہ اور انتظام۔" (ح۔۱۔ ص ۵۲۳)

" شدید ضعف و نقاہت و لاغری کے باوجود افادات عالیہ جاری ہیں۔ صبح سویرے کی نسبتہً مختصر اور بعد ظہر کی طویل اور بڑی۔ دونوں مجلسوں میں گویا حکمت و عرفان کا دریا جاری رہتا ہے۔ اور حکیمانہ و عارفانہ مسائل و مضامین مسلسل بیان ہوتے رہتے ہیں۔ مصلح ملت و حکیم الامت کی کوئی بات اصلاحی

شان سے خالی نہیں ہوتی یہاں تک کہ اپنے مرض کی کیفیت بیان کرتے ہیں بعیادت کرنے والوں کو جو جو جوابات مرحمت فرماتے ہیں۔ اپنے کو جس شان تسلیم و رضا کے ساتھ طبیب حاذق و مشفق کے سپرد کیے ہوئے ہیں۔ ان سب میں اصلاحی پہلو اور بہت سے سبق۔ ہر دیکھنے والے کو ہر وقت ملتے رہتے ہیں اور لطائف و ظرائف کا سلسلہ طبیعت کے اس قدر بے کیف و مضمحل ہونے پر بھی منقطع نہیں۔" (ح-۱-۳-۵۷۲)

معمولِ مکاتبت

مولانا عبدالماجد دریابادی لکھتے ہیں کہ:۔

" ڈاک لانے والی اصل گاڑی سہارنپور کی طرف سے دوپہر یا ذرا قبل تھانہ بھون ٹاؤن اسٹیشن پر پہنچتی اور کچھ دیر بعد ڈاک کی تھیلی اسٹیشن سے ڈاک خانہ پہنچ جاتی۔ کچھ منٹ چھانٹنے میں لگتے اور اس کے بعد مولانا کی ڈاک ٹین کے جنگلے میں بہ حفاظت روانہ ہو جاتی۔ ڈاک کا اس قدر اہتمام تھا کہ حضرت کے تنخواہ دار ملازمین (یہ تعداد میں عموماً دو رہا کرتے) میں سے ایک صاحب ضرور وقت مقررہ پر ڈاک خانہ پہنچ جاتے اور پوسٹ مین (ڈاکیہ) کے ذریعہ سے تقسیم کا انتظار کیے بغیر اُسے لے کر چستی و مستعدی کے ساتھ حاضرِ خدمت ہو جاتے۔ حضرت کبھی تو اس وقت تک سہ دری میں تشریف رکھتے ہوتے اور کبھی زنان خانہ تشریف لے جا چکے ہوتے۔ ڈاک آتے ہی جن تحریروں سے حضرت مانوس ہوتے خصوصاً پوسٹ کارڈ ان کو اسی وقت پڑھ ڈالتے۔ اور ڈاک کا جواب اُسی کے دو گھنٹے کے بعد۔ ظہر کی مجلس کے لیے اُٹھ رہتا۔ خطوط کی تعداد روزانہ ۳۰۔۲۵ سے کیا کم ہوتی۔ بعض دن اور زائد۔ پھر خط بھی مختصر یا چند سطری نہیں۔ بڑے لمبے

چوڑے اور فقہ۔ سلوک۔ کلام وغیرہ کے مسائل سے متعلق۔ اَب حضرت ہیں اور خطوط کا پشتارہ۔ اور گرد حاضرین بزم حلقہ کیے ہُوئے خواص بھی عوام بھی۔ مسئلے بڑے اور چھوٹے ہر قسم کے چھڑے ہُوئے۔ حضرت لوگوں سے مخاطب بھی ہیں۔ حاجت مندوں کو تعویذ بھی لکھ لکھ کر دیتے جاتے ہیں اور ساتھ ہی خط کا جواب اُسی حاشیہ پر یا بین السطور تحریر کرتے جا رہے ہیں۔ جواب کی جامعیت سُبحان اللہ۔ جوابات جس طرز کے ہوتے۔ اس کی مثالیں تو اُوپر کے صفحات میں دو چار نہیں۔ بکثرت گزر چکیں۔ اللہ اللہ دماغ کتنا حاضر پایا تھا۔ عموماً یہ سارے جوابات اس طرح قلم برداشتہ لکھ دیئے جاتے اور اتنے جامع و محققانہ ہوتے کہ دُوسروں سے شاید پُورے غور و فکر کے بعد نہ بن پڑتے۔ خال خال خط ایسے بھی ہوتے۔ جن کو جوابات کے لیے مولانا دُوسروں کے حوالے کر دیتے۔ یہ وہی خط ہوتے جن میں حوالوں کی ضرورت ہوتی۔ بارہا ایسا بھی ہوتا کہ ابھی یہ انبار نپٹنے نہ پاتا کہ دُوسری ڈاک سہ پہر کو ۔ ای طرف سے بھی آجاتی اور دو چار خط اس میں بھی ہوتے جواب کے لیے یہ التزام رہتا کہ حتی الامکان سب دُوسرے ہی دن نکل جائیں اور یہ منظر بھی ان آنکھوں نے دیکھا ہُوا ہے کہ دن ختم ہو گیا اور حجم و ضخامت والی ڈاک ختم نہ ہو پاتی۔ اَب مولانا اس سن و سال میں بعد نماز مغرب و اوراد مغرب۔ لالٹین سامنے رکھ اور قلم ہاتھ میں لے بیٹھ گئے ہیں۔ اور رات گئے تک کام کر کے ڈاک کو اپنے ہاتھ سے ختم ہی کر کے اُٹھے ہیں :

(حکیم الامت ص۱۹۶ـ۷)

اس ڈاک کو جلد نپٹانے کی وجوہ حضرت کے ملفوظات کی رُو سے یہ تھیں :۔

۱۔ فرمایا کہ حدیث میں جو اجابت الداعی آیا ہے۔ مَیں خطوں کے جواب دینے کو بھی

اس کے عموم میں داخل سمجھ کر جواب دینے کو حتی المقدور ضروری سمجھتا ہوں۔ اور جلد دیتا ہوں۔ لوگوں کو اس کا بہت کم خیال ہے۔ (مقالات حکمت ملفوظ ۲۳)

۲۔ اسی لیے آپ روز کی ڈاک روزانہ نکالنے کے عادی تھے۔ مگر ڈاک کا کام باقی رہ جاتا تو نیند نہ آتی۔ فرماتے تھے کہ

"اگر میں سونا بھی چاہوں تو سو نہیں سکتا۔ جب تک کہ ڈاک کو اتنا نہ نمٹا دوں کہ وہ قابو میں آجائے۔"

چنانچہ سفر میں اکثر ایسا ہوتا کہ آدھی آدھی رات تک وعظ فرماتے اور اس سے فارغ ہو کر ڈاک لے کر بیٹھ جاتے اور جب تک اسے ختم نہ کر لیتے ہرگز نہ سوتے۔ بعض اوقات تو سفر میں کئی کئی دن کی ڈاک جمع ہو کر اکھٹی ملتی تھی تو عشاء کے بعد سے صبح کی اذان تک ڈاک لکھنے میں مشغول رہتے تھے۔ اور آپ کے پاس جواب لکھنے کے لیے کوئی محرر یا مختصر نویس نہیں ہوتا تھا۔ یہ سب کام خود فرماتے تھے۔ مولانا عبدالماجد لکھتے ہیں کہ :۔

"مولانا کا دستور یہ تھا کہ خط کا جواب عموماً فوراً ہی مرحمت فرماتے تھے۔ ہاں خط کا مضمون ہی اُلجھا ہوا ہو یا جواب کے لیے کتابوں کی اُلٹ پلٹ کی ضرورت ہو۔ تو اس کی بات دوسری تھی۔ مولانا کی ڈاک گڈ گی لدّ ہوا کرتی تھی۔ لیکن مولانا جواب ایک ایک کا اپنے ہی قلم سے لکھتے۔ آخر تک جب تک ضعف نے بالکل ہی معذور نہ کر دیا۔ یہی روش قائم رہی۔" (ح۔ ا۔ ص۵)

"خط کا جواب فوراً دینا مولانا کی اگر کرامت نہیں۔ تو نظم و ضبط کا اعلیٰ ثمرہ اور عزم و ہمت کا حیرت انگیز کرشمہ تو ضرور ہے۔" (ح۔ ا۔ ص۱۱۹)

آپ کو خط بھیجنے کا طریق یہ تھا کہ خط جب بھیجا جاتا۔ تو لفافہ کے اندر ایک جوابی لفافہ بھی پتہ لکھا ہوا ملفوف کرنا ہوتا۔ اور اصل خط پر جواب کے لیے ایک چوتھائی حصہ خالی چھوڑنا پڑتا۔ جس پر آپ جواب تحریر فرماتے اور اُسی لفافہ میں جواب کے ساتھ اصل خط بھی واپس آ

جاتا۔ عموماً جواب اسی ہی خط پر تحریر فرماتے۔ اس سلسلہ میں ایک دفعہ فرمایا :۔

"میرے پاس ڈاک کثرت سے آتی ہے۔ لیکن جس قدر دقت پتہ لکھنے میں ہوتی ہے جواب خط لکھنے میں نہیں ہوتی۔ کیونکہ بعضے تو خط کے شروع میں پتہ لکھ دیتے ہیں۔ بعضے درمیان میں لکھتے ہیں۔ بعضے آخر میں لکھتے ہیں۔ بعضے ایسا کرتے ہیں کہ لفافہ پر کچھ پتہ لکھتے ہیں اور خط کے اندر اس کے خلاف۔ بعض پتہ لکھنا ہی بھول جاتے ہیں بعض میری یادداشت پر بھروسہ کر کے کہ کسی پہلے خط کا لکھا ہوا یاد ہوگا۔ نہیں لکھتے۔ بعض لکھتے ہیں مگر وہ پڑھا نہیں جاتا۔ مناسب یہ ہے کہ ایک لفافے پر اپنا پتہ لکھ کر خط کے اندر رکھ دیں۔ اگر خط میں لکھا جائے تو نام اور پتہ شروع ہی میں لکھے۔ نام کا شروع میں لکھنا حدیث شریف سے ثابت ہے۔ اہل یورپ کا بھی اسی پر عمل ہے۔ جنہیں آج معلم الاخلاق سمجھا جاتا ہے۔"

(مقالاتِ حکمت حصّہ پنجم ملفوظ ص۲۰۶)

فرمایا :۔

"میں اپنے شاگردوں کو بھی اگر خط لکھتا ہوں تو اپنے کام کے لیے جوابی خط بھیجتا ہوں۔ بعض لوگ کسی کو اگر اپنے ہی کام کے لیے خط لکھتے ہیں تو بھی ٹکٹ کا بار مکتوب الیہ پر ڈالتے ہیں۔ جو خلاف عقل ہے کہ ایک تو وہ جواب دینے کی زحمت گوارا کرے۔ دوسرے ٹکٹ کا بار بھی برداشت کرے۔"

(مقالاتِ حکمت حصّہ ششم ملفوظ ۹۳)

طالب علمی کے زمانہ میں جب آپ ایک دفعہ ایک استفتاء کا طویل جواب لکھ لائے تو آپ کے اُستاد حضرت مولانا محمد یعقوب صاحبؒ نے فرمایا۔ "معلوم ہوتا ہے تم کو فرصت بہت ہے اور ہم تو اس وقت دیکھیں گے جب خطوں کا ڈھیر تمہارے سامنے رکھا ہوگا اور پھر بھی تم اتنے لمبے لمبے جواب لکھو گے۔" گویا اس وقت کے کام کی تربیت آپ کے صاحب

فراست اُستاد نے اُسی وقت شروع کرادی۔ جس کی وجہ سے آپ جامع و مختصر جواب دینے کے عادی ہو گئے تھے۔ چنانچہ اتنے لمبے چوڑے خطوط کے جواب دینے کے سلسلے میں آپ کا اپنا ارشاد ہے :۔

"مَیں یہ چاہتا ہوں کہ روزانہ کی ڈاک اسی دن پوری ہو جائے۔ آج کا کام کل پر نہ رہے۔ کیونکہ اگلے دن پھر دوسری ڈاک آجاتی ہے اور یہ صورت تو مختصر ہی جوابات میں ہو سکتی ہے۔ لیکن الحمد للہ میرے جوابات باوجود اختصار کے کافی ہوتے ہیں۔ کسی جز و سوال کا جواب رہ نہیں جاتا۔" (ذم النسیان صہ۴۶)

اس کی مزید وضاحت آپ کے اس بیان سے بھی ہوتی ہے کہ :۔

"مَیں نے مختصر الفاظ سے طالب علمی کے وقت میں بہت علوم حل کیے ہیں۔ مجھے ابتداء سے اختصار محبوب ہے۔ کچھ طبیعت ہی اختصار پسند واقع ہوئی ہے ہے۔ جس کا سبب میری کاہلی بھی ہو سکتی ہے۔ کیونکہ مجھے طول طویل کاموں کی ہمت نہیں پڑتی۔ خیر کچھ ہی سبب ہو۔ باقی یہ تجربہ بالکل صحیح ہے کہ بعض دفعہ مختصر الفاظ سے بڑے بڑے کام نکل جاتے ہیں۔ اور مَیں نے تو اس سے بہت ہی کام لیا ہے۔" (الاسعاد والابعاد صہ۴۲)

ڈاک کے معمولات کے سلسلہ میں جو ایک خاص بات حضرت کے ہاں مروج تھی اور جس کی نظیر اور کہیں نہیں ملتی۔ یہ تھی کہ :۔

"مجھ کو یہ واقعہ بکثرت پیش آتا ہے کہ ڈاک میں اکثر خطوط ایسے آجاتے ہیں۔ جن کی ٹکٹوں پر مہر نہیں ہوتی۔ مگر مَیں سب سے پہلے ایسے ٹکٹوں کو چھڑا کر چاک کر ڈالتا ہوں اس کے بعد خط پڑھتا ہوں۔ گو مَیں خلوت میں ہوتا ہوں۔ اگر مَیں اس ٹکٹ کو دوبارہ استعمال کروں تو کسی کو پتہ بھی نہ چل سکے۔ مگر خدا تو دیکھتا ہے۔" (مواعظ التبلیغ صہ۲۳)

نیز حضرت کا یہ بھی معمول تھا کہ اگر کسی مقام سے متعدد خطوط مختلف اشخاص کے آتے تو سب کا جواب ایک ہی ڈاک میں روانہ فرماتے۔ تاکہ وہاں پہنچنے پر تقدیم و تاخیر نہ ہو اور ایک دوسرے کو ناز کرنے کا موقعہ نہ ملے۔ نہ کسی کی دل شکنی ہو۔

معمولِ ملاقات

جس زمانہ میں حضرت سفر فرمایا کرتے تھے۔ اس زمانہ میں حضرت کا یہ معمول تھا کہ جن جن تاریخوں میں جو جو صاحب اپنے آنے کی اطلاع کرتے۔ ان ملاقاتیوں کے نام اپنے پاس لکھ لیتے تاکہ ان تاریخوں میں سفر نہ کیا جائے اور آنے والے کو مایوسی نہ ہو۔ اسی لیے بلا اطلاع آنے کی حضرت کی طرف سے عام ممانعت تھی۔

حضرت کو تعارف وغیرہ کی گفتگو کرنے میں تو واردین کی طرف سے بالعموم بہت اذیتیں پہنچتی تھیں جس سے جانبین کو کلفت ہوتی تھی۔ اور ضعف پیری کی وجہ تو آخر میں اس اذیت کا بالکل تحمل دشوار ہو گیا تھا اور صحت پر بُرا اثر پڑنے لگا تھا۔ اس لیے اعزہ و خدام نے حضرت پر بوّاب یعنی دربان مقرر کرنے کا زور دیا۔ تاکہ اس کے واسطہ سے گفتگو کی جائے۔ مگر حضرت نے بدیں وجہ شروع میں اس کی ممانعت فرمائی کہ اس سے شانِ مخدومیت ظاہر ہوتی ہے۔ لیکن بعد میں بعض مصالح کی بناء پر یہ تجویز منظور فرمائی اور اس کی تائید متعدد احادیث سے بھی نکل آئی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دربار میں بھی بڑے بڑے صحابہ کو خاص وقت میں بدوں توسطِ بوّاب کے رسائی نہ ہوتی (اس پر تحقیق اشرف السوانح جلد سوم صہ ۱۳، صہ ۱۴ پر ملاحظہ کی جا سکتی ہے) چنانچہ بوّاب مقرر کرنے کے بعد جو بھی نیا ملاقات کے لیے آتا۔ وہ پہلے بوّاب کے ذریعے اپنا ضروری تعارف کراتا۔ اور جب سب ابتدائی مراحل طے ہو جاتے اس وقت حاضر خدمت ہونے کی اجازت ملتی۔ جس سے جانبین کو بڑی سہولت اور راحت ہوتی۔

اگر حضرت کو اپنے عزیزوں کے ہاں ملاقات کی غرض سے جانا ہوتا۔ تو ان کے

گھروں میں کبھی اس وقت تشریف نہ لے جاتے (نہ از خود نہ بلانے سے) جب تک ان گھروں کا کوئی محرم مرد یا شوہر ساتھ نہ ہوتا۔

معمولِ استیذان

حضرت کا اپنے گھروں میں جانے کا ہمیشہ یہ معمول رہا کہ پہلے کُنڈی کھٹکھٹاتے پھر کسی کا نام لے کر پکارتے۔ اور جب تک اندر سے بلایا نہ جاتا۔ انتظار فرماتے رہتے۔ اگر کوئی بچہ بلا لیتا۔ تو اس کے بلانے کو کافی نہ سمجھتے۔ جب تک کوئی بڑا نہ بلاتا اندر تشریف نہ لے جاتے چونکہ آپ کسی کی ادنیٰ تکلیف بھی گوارا نہیں تھی۔ اور ہر وقت راحت رسانی خلق کی فکر میں مستغرق رہتے تھے۔ اس لیے اگر مستورات پردہ کرنے میں عجلت کرتی ہوئی معلوم ہوتیں۔ تو نہایت شفقت سے فرماتے کہ کچھ جلد نہیں۔ اطمینان سے پردہ کر لیں۔ میں کھڑا ہوں۔ کسی کے گھر تشریف لے جاتے وقت اگر اندر پہلے سے بھی پردہ ہوتا۔ تب بھی احتیاطاً صاحب خانہ سے فرما دیتے کہ مکرر دیکھ لیا جائے کہ پردہ ہے یا نہیں۔

غرضیکہ جب تک پورا اطمینان نہ ہو جاتا۔ تب تک مکان کے اندر تشریف نہ لے جاتے پھر بھی احتیاطاً صاحبِ خانہ کو پہلے داخل ہونے کے لیے فرماتے۔ مبادا کسی نے ابھی تک پردہ نہ کیا ہو۔ تو وُہ مطلع کر دے۔

معمولِ بیعت

حضرت تھانویؒ کا معمولِ بیعت مندرجہ ذیل ملفوظات سے ظاہر ہے۔

۱۔ فرمایا کہ بزرگوں کے اخلاق بہت بڑھے ہُوئے ہوتے ہیں۔ اس لیے ان کے ہاں بہت نرمی برتی جاتی ہے۔ جس کی وجہ سے وُہ کسی کی روک ٹوک نہیں کرتے۔ اس سے مُسلمانوں کو ضرر ہوتا ہے۔ اس لیے ان کی اصلاح کے خیال سے میرے یہاں ایک گونہ سختی برتی جاتی ہے۔ پس جس کو جونسا مذاق پسند ہوتا ہے۔ وُہ وہاں چلا جاتا ہے۔ دُوسروں کے ہاں نہ بیعت میں تنگی نہ مریدین کے افعال پر گرفت۔ اور نہ معمولات و

قواعد معین ہوتے ہیں۔ مگر میرے ہاں ہر بات قاعدہ سے ہوتی ہے۔ جو بعض طبائع پر ناگوار گزرتی ہیں۔ (معمولات اشرفیہ ص ۴۳)

۲۔ جس وقت مولانا حسین احمد صاحب مدنی نے مولانا عبدالماجد دریابادی اور مولانا عبدالباری ندوی کو بیعت کرانے کے لیے حضرت تھانویؒ سے سفارش فرمائی۔ تو اس کے جواب میں حضرت نے فرمایا :۔

" اچھا تو آپ کے فرمانے سے یہ معلوم ہوا کہ یہ دونوں صاحب مجھ سے بیعت کرنا چاہتے ہیں۔ میں تو خیال کر رہا تھا کہ آپ ہی مناسب ہوں گے۔ باقی میرا معمول تو آپ کو معلوم ہی ہوگا۔ میں بہت سی مصلحتوں کی بنا پر عجلت اس باب میں پسند نہیں کرتا ہیں تو یہ چاہتا ہوں کہ جو صاحب اس کے خواہشمند ہوں۔ ان کا اور میرا سابقہ کم از کم چھ ماہ کا رہ لے اور جانبین ایک دوسرے کو خوب جانچ اور پرکھ لیں۔ تاہم اگر طویل مدت تک نہ رہ سکے تو کم از کم مراسلت ہی رہے۔ بغیر طویل سابقہ کے۔ ایک دوسرے کی مناسبت کا علم نہیں ہو سکتا اور اس طریق میں اہم اور مقدم شرط مناسبت ہی ہے۔ بغیر اس کے محض بزرگی یا حسنِ اعتقاد بالکل ناکافی ہے۔ آپ میرا یہ پیغام ان حضرات کو پہنچا دیجئے گا۔"

اصول کی پابندی ہو تو ایسی ہو۔ مرید ہونے والے کوئی بچے نہ تھے۔ ماشاء اللہ دونوں صاحب علم اور فلسفی تھے۔ آپ کے علم و فضل۔ شیخوخت و خشونت کا شہرہ سن کر ہی گئے تھے اور سفارش کے لیے خود ایک شیخ الحدیث اور شیخ طریقت کو لے گئے جنھیں حضرت تھانویؒ بقول مولانا عبدالماجد اس طرح ملے :۔

" دعا مانگ کر جوں ہی حضرت اٹھے ہیں۔ نگاہ پہلی صف میں مولانا حسین احمد صاحب پر پڑ گئی۔ ان کی طرف خود ہی بڑے تپاک سے بڑھے اور بڑے التفات

سے ملے تعظیم و تکریم مولانا حسین احمد صاحب کی طرف سے تو خیر ہوتی ہی۔ عادت طبعی ہونے کی بناء پر بھی اور سن میں چھوٹے ہونے کی بناء پر بھی لیکن مشاہدہ یہ ہو رہا تھا کہ اوپر سے بھی آداب و رہ درسم تعظیم و تکریم میں کوئی کمی نہ تھی"۔ (حکیم الامت صہ ۱۶)

مگر جب بات معاملہ کی آئی۔ تو آپ نے مروت پر قاعدہ کو ترجیح دی۔ کیونکہ خود مرید ہونے والے کے قول کے مطابق :۔

"حضرت کے بدنام کرنے والوں نے مشہور کر رکھا ہے کہ آپ بڑے خشک مزاج اور تُند خو تھے۔ اس جھوٹ میں صرف اتنا سچ ہے کہ مریدوں۔ طالبوں متوسلوں پر۔ ان ہی کی اصلاح و فلاح کی خاطر آپ قاعدوں کے نفاذ میں۔ ضابطوں کی پابندی میں یقیناً سخت تھے لیکن خود ان قاعدوں اور ضابطوں کے بنانے میں ہرگز سخت نہ تھے بلکہ وہ قاعدے ضابطے تو ہوتے ہی ہر فریق کی راحت و سہولت کے لیے تھے"۔ (حکیم الامت صہ ۲۰)

۳۔ فرماتے تھے کہ میں ایسے شخص کو مرید نہیں کیا کرتا۔ جس کا مجھے ادب کرنا پڑے۔ بلکہ ایسے کو مرید کرتا ہوں۔ جس کو جو جی چاہے کہہ سکوں۔ (مقالات حکمت حصہ ہفتم۔ ملفوظ ۸۰)

۴۔ فرمایا کہ لوگوں نے بیعت کو خراب کر دیا ہے۔ اس وقت مصلحت یہی ہے کہ اس میں کچھ قیود رکھنی چاہئیں۔ یہ نہیں کہ جو آئے۔ انکار ہی نہیں۔ میں نے اس غرض کے لیے ایک پرچہ ہدایات چھپوا رکھا ہے۔ (جس کا ذکر حصہ سوم میں اپنے مقام پر آئے گا) جو آتا ہے۔ اس کو یہ پرچہ دے دیتا ہوں۔ اگر اس نے منظور کیا۔ تو بیعت سے انکار نہیں۔ ورنہ جہاں چاہے۔ جائے۔ یہ اچھا ہے کہ بجائے سو (مریدوں) کے دس ہوں۔ مگر ہوں کام کے۔ (مقالات حکمت حصہ سوم ملفوظ ۶۳)

۵۔ فرمایا کہ جو شخص مجھ سے بیعت کی درخواست کرتا ہے تو میں اوّل اسے کتابیں دیکھنے کو

لکھ دیتا ہوں بالخصوص مواعظ کے مطالعہ کے لیے اکثر لکھتا ہوں اور اس سے بہت نفع ہوتا ہے۔ جب کوئی کتابیں دیکھ لینے کی اطلاع دیتا ہے۔ تو پھر اس سے دریافت کرتا ہوں کہ کتابیں دیکھنے کے بعد تم نے اپنی حالت میں کیا تغیر کیا؟ اس سے وُہ نفع ہوتا ہے۔ جو برسوں کے مجاہدوں سے بھی نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ اصل چیز فکر ہے۔ جب انسان فکر میں پڑتا ہے۔ تو اسے راستہ کی تلاش شروع ہو جاتی ہے۔ اسی لیے مَیں اوّل ہی گفتگو یا خط و کتابت میں طالب کے سر پر بوجھ رکھ دیتا ہوں۔ جس کی وجہ سے اسے فکر پیدا ہوتی ہے۔ اور اس فکر کی وجہ سے راستہ خود بخود منکشف ہونے لگتا ہے۔ مگر لوگوں کو اس کی قدر نہیں۔ (ملفوظ مزید المجید صہ ۱۰۴)

معمولِ ھدیہ

ہدیہ کے متعلق آپ کے معمولات کا حسب ذیل ملفوظات سے بخوبی پتہ چلتا ہے:۔

۱۔ فرماتے تھے کہ ہدیہ پیش کرنے والے اپنے مذاق کا اتباع کرتے ہیں۔ حالانکہ پیشِ نظر اس شخص کا مذاق رکھنا چاہیئے۔ جس کے سامنے ہدیہ پیش کیا جا رہا ہے اور بہتر تو یہ ہے کہ کسی طریقہ سے اس کا عندیہ پہلے سے معلوم کر لیا جائے اور یہ معلوم کر لیا جائے کہ اسے ضرورت یا رغبت آج کل کس چیز کی زیادہ ہے یہ بھی فرمایا کرتے تھے کہ ہدیہ مقدار۔ تعداد یا قیمت میں بہت زائد نہ ہونا چاہیئے۔ ہمیشہ پیش کرنے والے کی حیثیت کے اندر ہی ہو۔ اگر بہت زائد یا بالکل بلا ضرورت ہو گا۔ تو قبول کرنے والے پر ایک بار ہو جاتا ہے۔ (حکیم الامت صہ ۲۹۸)

۲۔ مَیں نے اپنا یہ معمول مقرر کر لیا ہے۔ کہ جو نیا شخص آتا ہے۔ اس سے ہدیہ نہیں لیتا۔ البتہ اگر قرائن قویہ سے خلوص ثابت ہو جائے تو مضائقہ نہیں۔ رسم پرست لوگوں نے اس ہدیہ لے جانے کی یہ وجہ نکالی ہے کہ اگر پیر کے پاس خالی ہاتھ جاوے گا۔ تو خالی ہاتھ آئے گا۔ (تجارت آخرت صہ ۲۳)

۲۔ فرمایا کہ جو اصحاب واجبات میرے تحائف و ہدایا لاتے ہیں۔ مناسب ہے کہ لانے سے پہلے مجھ سے دریافت فرما لیا کریں۔ پوچھنے سے شرمائیں نہیں۔ دوستوں سے شرمانا کیسا۔ میں انھیں منع نہیں کروں گا۔ مگر پوچھنے سے یہ فائدہ ہو گا کہ ہدیہ کے حدود کی رعایت حاصل ہو سکے گی۔ ورنہ جب اس کو حدود سے خارج دیکھوں گا۔ عذر کر دوں گا اور قانون کے تحت مروّت کو چھوڑنا پڑے گا۔ کیونکہ قانون اور مروّت ایک جگہ جمع نہیں ہو سکتے۔ گو میرے قوانین و ضوابط کو خلاف مروّت سمجھا جاتا ہے۔ لیکن ان کی قدر بعد میں معلوم ہوتی ہے۔ جب مفاسد پیش آتے ہیں۔

(ملفوظات ہفت اختر ۱۲۲)

۳۔ میرا قاعدہ ہے کہ آس پاس کے گاؤں والوں کی جمعہ کی مہمانی موقوف ہے۔ نیز ایسے لوگ جو جمعہ کو ہدیہ لاتے ہیں۔ وہ بھی قبول نہیں کرتا۔ کیونکہ اکثر لوگ جمعہ کی نماز پڑھنے آتے تھے۔ اور خواہ مخواہ مہمان بن کر ٹھیرتے تھے۔ جس سے دقت ہوتی تھی۔ اس لیے یہ قاعدہ رکھا گیا کہ جس کو مجھے ملنا مقصود ہو۔ وہ جس وقت چاہے۔ آئے۔ سر آنکھوں پر۔ اس کے لیے کوئی قدغن نہیں ہو گی۔ اور جمعہ کو ہدیہ قبول کرنا اس لیے موقوف رکھا گیا کہ اس میں خود غرضی تھی۔ کہ مہمانی تو موقوف ہو اور ہدیہ قبول ہو۔ اس لیے مہمانی کے ساتھ اسے بھی موقوف کر دیا۔

پھر بعض لوگ آ کر پہلے ہدیہ پیش کرتے ہیں۔ پھر کوئی اپنا کام تبلا دیتے ہیں۔ یہ بہت ناگوار معلوم ہوتا ہے۔ جب کوئی کام لینا ہے۔ مثلاً وعظ یا تعویز وغیرہ بے تکلف لو۔ اس کے ساتھ کچھ دینے کی کیا ضرورت ہے۔ میں نے کوئی خرید و فروخت کی دکان تھوڑا ہی کھول رکھی ہے۔ جب کوئی ہدیہ دے کر کام کرانا چاہتا ہے۔ تو میں کام تو کر دیتا ہوں۔ لیکن ہدیہ واپس کر دیتا ہوں۔ اگر کوئی محض محبت سے ہدیہ دے تو اس کے قبول کرنے میں مضائقہ نہیں کیونکہ اس کا قبول کرنا سنت ہے۔ مبادلہ

کی صورت اچھی معلوم نہیں ہوتی۔ (مقالاتِ حکمت حصہ ہفتم ملفوظ ۶۵)

۴۔ ایک مرتبہ ایک شخص نے بذریعہ ریلوے پارسل حضرت کی خدمت میں کوئی چیز بھیجی۔ پارسل وصول کرتے وقت بابو نے چار آنہ دستوری کے طلب کیے اور رسید دینے سے انکار کیا۔ اس پر ارشاد فرمایا کہ :۔

"اب ہم کوئی پارسل ہی نہ لیا کریں گے۔ سب واپس کر دیا کریں گے۔ یہ ہمارے پاس ہدیۃً آتے ہیں۔ بیعاً نہیں آتے۔ کوئی وجہ نہیں کہ ہم اپنے پاس سے اس قسم کے بیہودہ مصارف گوارا کریں۔ ہمارے پاس بلا محصول جو کچھ آئے گا۔ لے لیں گے۔ ورنہ واپس کر دیں گے۔ اسی لیے میں نے مولوی عبداللہ صاحب سے کہہ دیا ہے کہ جو پرچہ ہدایات لوگوں کی اطلاع کے لیے چھپنے والا ہے۔ اس میں یہ بھی لکھ دیا جائے کہ آئندہ کوئی صاحب ریل کے ذریعہ ہمارے نام کوئی چیز روانہ نہ کریں۔ ہمیں دقت ہوتی ہے۔"

اس کے بعد فرمایا کہ

"لوگ سمجھتے ہیں کہ مولوی کھانے کمانے کے ہی لوگ ہیں۔ آئی ہوئی چیز کبھی واپس نہ کریں گے۔ ان کو ذلیل سمجھتے ہیں۔ میرا بڑا مقصود یہ ہے کہ اہلِ علم کی ذلت نہ ہو۔ اسی لیے میں نے پارسلوں کی ممانعت کر دی ہے۔"

چنانچہ اس روز کے بعد جو پارسل آئے۔ ان کی بلٹی واپس کر دی اور جب لوگوں کو "پرچہ ہدایات" کے ذریعہ حضرت کے اس معمول کا علم ہو گیا۔ تو انھوں نے پارسل بھیجنے بند کر دیئے۔ اس سے عیاں ہیں کہ حضرت کے دل میں دُنیا کی کچھ وقعت نہ تھی۔ ورنہ وُہ اس طرح آئی ہوئی نعمت کو واپس نہ کرتے۔ اور یہی اللہ والوں کی پہچان ہے۔ دُنیا خود چل کر ان کے پاس آتی ہے وُہ دُنیا کے پیچھے نہیں دوڑتے۔ اور انہی کے ہاں رہ کر ہی دین و دُنیا کی حقیقت واضح ہوتی ہے۔ اہلِ دُنیا۔ دولتِ دُنیا سمیٹنے کے لیے ہزاروں پاپڑ بیلتے

ہیں۔ اور اللہ کی راہ میں خرچ کرنے سے حتی الامکان بخل سے کام لیتے ہیں۔ مگر اہلِ اللہ کے ہاں جن پر حقیقتِ دُنیا روزِ روشن کی طرح عیاں ہے۔ دولتِ دُنیا سے انتہائی بے رغبتی برتی جاتی ہے۔ جیساکہ مندکرہ بالا ملفوظات سے ظاہر ہے۔ اور راہِ خدا میں اتنی کشادہ دلی سے خرچ کرتے ہیں۔ جس کی مثال اہلِ دُنیا میں ملنی ناممکن ہے۔ جیساکہ مندرجہ ذیل معمولات سے ظاہر ہے۔

معمولِ خیرات

حضرت تھانوی کا ابتدا ہی سے یہ معمول تھا کہ علاوہ صدقاتِ واجبہ کے اپنی آمدنی کا چوتھائی حصہ مصارفِ خیر میں بطور صدقات نافلہ صرف فرما دیتے تھے۔ جس کی اس زمانہ میں نظیر ملنی ناممکن ہے۔ اس ضمن میں آپ اکثر فرمایا کرتے تھے کہ :۔

"صدقاتِ نافلہ کے لیے اپنی تنخواہ یا آمدنی کا کچھ حصہ مثلاً فی روپیہ ایک پیسہ یا دو پیسہ آنہ۔ دو آنہ۔ چار آنہ۔ جتنا بھی بے تکلف نکال سکیں۔ ایک معین مقدار مقرر کر کے نکالتے رہنا چاہیئے۔ تاکہ ضرورت کے موقع پر نفس کشاکشی نہ کرے۔ بلکہ ایسے موقع کا منتظر رہا کرے۔ کیونکہ مصارفِ خیرات کے لیے اپنے پاس رقم جمع ہونے کی صورت میں کشاکشیِ نفس سے سبکدوش ہو کر طبیعت خود بخود مصارفِ خیر کی فکر اور تلاش میں رہے گی۔ اور اس کے خرچ کرنے میں مسرت محسوس ہوگی۔ لیکن مقدار معین کرتے وقت زبان سے کچھ نہ کہے۔ ورنہ نذر ہو جائے گی۔ اور اس رقم کا مصارفِ خیر پر خرچ کرنا واجب ہو جائے گا۔ صرف دل ہی دل میں سوچ لے کہ میں محض اپنی سہولت کے لیے انتظاماً اپنی آمدنی کا فلاں حصہ مصارفِ خیر میں صرف کرنے کے لیے مقرر کرتا ہوں۔ لیکن اپنے ذمہ واجب نہیں کرتا۔"

کسی کی مالی امداد کرتے وقت آپ اس بات کا بڑا خیال رکھتے تھے کہ اس کو

حرص یا مفت خوری کی عادت نہ پڑ جائے۔ جب وہ اپنی تمام تدابیر ختم کرنے کے بعد صاحب احتیاج رہتا۔ تب اس کی امداد فرماتے اور وہ بھی ایک ساتھ نہیں۔ تاکہ اسے بے فکری نہ ہو جائے۔ اور جو کچھ ملے اس کی دل سے قدر ہو۔ چنانچہ جن کی اعانت کرتے ان کو بھی یہ فرماتے کہ :۔

"بھائی یہاں تو توکل کا معاملہ ہے۔ میرے پاس کوئی خزانہ تو جمع ہے نہیں۔ اگر کوئی شخص مصارف خیر کے لیے کوئی رقم بھیج دیتا ہے۔ اور وہ میرے اصول کے مطابق ہوتی ہے۔ تو مستحقین پر خرچ کر دیتا ہوں اور تھوڑی تھوڑی سب مستحقین کی خدمت کرتا ہوں۔ اس لیے میری اعانت کے بھروسہ پر نہ رہو۔"

وقتاً فوقتاً جو حضرات مصارف خیر کے لیے رقوم بھیجتے وہ اسی صورت میں قبول فرماتے جو اصول صحیحہ اور قواعد شرعیہ کے مطابق ہوتیں (جس کی تفصیل انشاء اللہ حصہ سوم میں آئے گی) ورنہ نہایت استغنائے کے ساتھ قبول کرنے سے صاف انکار فرما دیتے۔ جب کوئی بڑی رقم مصارف خیر کے لیے آتی۔ تو اس کا حساب از خود رقم بھیجنے والے کے پاس روانہ فرما دیتے۔ اس سلسلہ میں ایک مرتبہ فرمایا کہ :۔

"اس مدرسہ میں متفرق مدوں میں چندہ آتا ہے۔ میں نے سب کے لیے متفرق تھیلیاں تیار کر رکھی ہیں۔ اور سب کا حساب جداگانہ ہر وقت صاف اور پاکیزہ رکھتا ہوں اور آمدنی اور یافتنی کو لکھتا ہوں۔ خواہ چند پیسے ہی ہوں۔"

(مقامات حکمت حصہ پنجم ملفوظ ۱۷۹)

لیکن اگر کوئی خود حساب طلب کرتا۔ تو اسے یہ لکھ کر رقم واپس بھیج دیتے۔ کہ جس کو ہم پر اطمینان نہیں۔ وہ ہم سے یہ خدمت ہی کیوں لے۔

رقوم موصولہ کے صرف کرنے میں آپ بہت تعب فرماتے۔ صاحب السوانح لکھتے ہیں کہ اس وقت۔

"کہیں مستحقین کی فہرستیں تیار ہو رہی ہوتیں۔ کہیں تخمینے لگائے جا رہے ہوتے کہیں

تقسیم کے لیے نظامِ عمل تجویز کیا جا رہا ہوتا۔ کہیں کارِ خیر کی تعیین کے متعلق تحقیق فرمائی جا رہی ہوتی۔ لیکن بلا اظہار نام معطی۔ تاکہ لوگ اس کو جا جا کر تنگ نہ کریں غرض کیا مجال کہ کوئی بے عنوانی یا بد انتظامی یا بے اصولی ہونے پائے۔ کیونکہ جو خدمت حضرت والا اپنے ذمہ لیتے تھے۔ اس کا پورا حق ادا فرماتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت والا کے ہاتھوں بڑے بڑے کام اس سکون اور حسنِ انتظام سے انجام پاتے۔ کہ نہ کوئی ہلچل نظر آتی۔ نہ ضروریات روزمرہ میں کوئی خلل واقع ہوتا۔ نہ کسی قسم کی کوئی گڑبڑ ہونے پائی۔ حضرت والا خود فرمایا کرتے تھے کہ جو علمی کام اور جگہ بڑے بڑے محکموں کے ذریعہ سے اور ہزاروں روپوں میں ہو سکتے۔ وہ یہاں بفضلہٖ تعالےٰ چند غرباء کے ذریعہ سے اور تھوڑے سرمایہ سے ہو گئے اور ہو رہے ہیں۔"

اختیاری رقوم سے حضرت نے علاوہ دیگر ضروری کارہائے خیر کے بعض مساکین و مستحقین کی ماہوار تنخواہ بھی مقرر فرما رکھی تھی۔ جو تیس روپیہ ماہوار سے زیادہ نہ ہوتی تھی۔

معمولِ کفایت

حضرت نے جہاں اپنی آمدنی کا چوتھائی حصہ خیرات کے لیے مخصوص فرما رکھا تھا۔ وہاں کفایت شعاری کا بھی خصوصی اہتمام فرماتے تھے۔ تاکہ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کی بے قدری نہ ہو۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کسی ادنیٰ سے ادنیٰ چیز کو بھی ضائع نہیں ہونے دیتے تھے۔ جس کا اندازہ اس واقعہ سے لگا لینا کافی ہوگا۔ کہ آپ کے ہاں جو بکثرت دستی یا بذریعہ ڈاک پارسل اور لفافے آتے تھے۔ آپ ان کی ستلی۔ ڈورا۔ پن۔ چھوٹی کیلیں۔ ٹین کے ڈبے۔ بوتلیں۔ زنبیلیں وغیرہ سب محفوظ فرما لیتے تھے۔ جنھیں عام طور پر بیکار سمجھ کر پھینک دیا جاتا ہے۔ اور حسب ضرورت ان چیزوں کو چھ استعمال میں لایا کرتے تھے۔ اسی طرح ٹکٹوں پر سے جو دبیز کاغذ اترتے۔ وہ تعویذ وغیرہ لکھنے کے لیے رکھ لیے جاتے یا پھر پیکٹوں کے لیے ہی استعمال

کیے جانے اور عام لفافے الٹوا کر دوبارہ استعمال کے لیے رکھ لیے جاتے۔ جن میں سے مقیمین خانقاہ کو بھی اپنے حالات لکھنے کے لیے لینے کی اجازت تھی۔ بقیہ ردی کے کاغذ ایک بکس میں جمع ہوتے رہتے اور وہ خواہشمندوں کو دے دیئے جاتے۔ جو انھیں پانی میں گلا کر ٹوکنی وغیرہ بنا لیتے یا دیگر جائز مصرف میں لے آتے۔

جب سرکاری دفتروں میں کاغذوں اور لفافوں کی کفایت کا اوّل اوّل مسئلہ پیش ہوا تھا۔ تو حضرت کے بھائی منشی اکبر علی مرحوم نے جو اس وقت ایک کورٹ شدہ ریاست کے مینیجر تھے۔ انگریز کلکٹر سے جوان کا افسر تھا۔ حضرت کی اس لفافہ الٹنے کی ترکیب کے مطابق لفافے اُلٹ کر پیش کیے۔ تو اس نے اس ترکیب کی بڑی تعریف لکھی کہ ہمارے مینیجر نے یہ بہت اچھی صُورت کفایت شعاری کی ایجاد کی ہے۔ اور اس کو سرکاری محکموں میں جاری کرنے کے احکام صادر کیے۔ اس پر حضرت نے فرمایا کہ :

"ہمارے بعض مسلمان بھائی تو اس پر بخل کا اعتراض کرتے ہیں۔ لیکن ایک انگریز نے اس کی اتنی قدر کی۔ لیجئے اَب تو سفید چمڑی والوں کی بھی جن کی آج کل ہر بات قابل تقلید سمجھی جاتی ہے۔ تصدیق ہو گئی کہ یہ بخل نہیں بلکہ حُسنِ انتظام اور کفایت شعاری ہے۔

معمول امانت

حضرت ہر امانت کو جُدا رکھتے تھے۔ کیونکہ مخلوط ہو جانے کی صُورت میں شرعاً احکام بدل جاتے ہیں۔ پھر امانت امانت نہیں رہتی۔ بلکہ قرض ہو جاتی ہے چنانچہ ایک دفعہ ایک پارسل تولنے کے لیے کچھ زیادہ روپوں کی ضرورت ہُوئی تو حضرت نے دو امانتوں میں سے کچھ روپے نکال کر مجذوب صاحب کے حوالے کیے۔ جن کی پہچان یہ رکھی کہ ایک امانت میں سے تو سب ملکہ کی تصویر والے روپے نکالے اور دُوسری امانت سے بادشاہ کی تصویر والے روپے نکالے۔

اسی طرح جب مختلف مدات کی رقوم بذریعہ منی آرڈر یا کسی دوسرے ذریعہ سے موصول ہوئیں تو آپ ہر مد کی رقم کو اسی مد کی تھیلی میں رکھتے جاتے اور ہر رقم کے متعلق ضروری یادداشت فی الفور لکھ لیتے۔

گویا بفضلہٖ تعالیٰ ہر معاملہ کے وقت اس کے شرعی احکام سب سے پہلے مستحضر ہو جاتے تھے۔ اور ایسی ایسی دقیق جزئیات تک فوراً نظر پہنچ جاتی تھی۔ کہ جن کی طرف آجکل عموماً کسی کو التفات نہیں ہوتا۔ الا ماشاء اللہ۔

معمولِ جواب

حضرت کا یہ بھی معمول تھا کہ سوال کا جواب تشقیق سے نہیں دیتے تھے بلکہ پہلے ضروری استفسارات کر کے کوئی شق متعین کرا لیتے تھے۔ پھر اس شق کا جواب دیتے تھے کیونکہ تشقیق کے ساتھ جواب دینے میں لوگ اس جواب کے منطبق کرنے میں غلطیاں کرتے ہیں۔ اور بعض لوگ فاسد اغراض کے لیے اس شق کے مدعی بن جاتے ہیں جو ان کی غرض کے موافق ہوتی ہے۔

اسی طرح آپ متنازع فیہ امور کا جواب ایسا تحریر فرماتے تھے کہ متنازعین میں سے کوئی اس کو اپنے نزاع کا آلہ کار نہ بنا سکے۔ مثلاً ایک سوال آیا کہ :۔

سوال : اہلِ حدیث جو اپنے آپ کو عامل بالحدیث کہتے ہیں۔ اور لباس و وضو میں احتیاط کا پہلو اختیار کرتے ہیں۔ آئمہ عظام کو عظمت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ اور آئمہ کرام کے حق میں سوء ادب اور گستاخی کو حرام سمجھتے ہیں۔ رفع یدین اور آمین بالجبر بھی کرتے ہیں۔ علمار کرام حنفیہ کی جانب سے ان پر فتوے تکفیر و تبدیع کے لگائے جاتے ہیں۔ اور ان کے رسوا کرنے کے لیے رنگا رنگ کے رسائل پھیلائے جاتے ہیں۔ حالانکہ علمار کرام دیوبند کی تصانیف میں کافی اصلاح موجود ہے۔ اور وہ وہ بہتانات و اتہامات ان پر لگائے جاتے

ہیں۔ جن کا وجود نہیں ہوتا۔ لہٰذا مسائل حسب ذیل کا جواب تحریر فرمادیں۔

۱۔ اہلِ حدیث مسلمان ہیں یا کافر۔

۲۔ اہلِ حدیث سُنی ہیں یا بدعتی۔

۳۔ اہلِ حدیث کے پیچھے نماز جائز ہے یا نہیں۔

۴۔ اہلِ حدیث کو سلام کرنا جائز ہے یا نہیں۔ بینوا توجروا حضرت نے اس کا یہ جامع و مانع جواب لکھا کہ :۔

جواب :۔ اگر حنفیہ کا وہی عمل ہے جو سوال میں مذکور ہے۔ تو حکم ظاہر ہے۔ جواب کی حاجت نہیں۔ اور اگر واقعہ بدل کر لکھا ہے۔ تو دوسرے فریق کا بھی بیان درج سوال ہونا چاہیئے۔ بدوں اس کے جواب مفید نہیں۔

ایسے اکثر کئی سوالات آتے رہتے۔ جن کا حضرت ایسا ہی جامع جواب دیا کرتے۔

معمولِ علاج

حضرت بلا طبیب کے مشورہ کے کسی کی بتائی ہوئی دوا استعمال نہیں فرماتے تھے۔ بلکہ اگر کسی طبیب کے زیرِ علاج ہوں اور کوئی دوسرا طبیب بھی کچھ تجویز کرنے لگے تو اس سے صاف فرمادیتے تھے کہ میں اپنے معالج کو یہ نسخہ دکھا کر بعد اجازت استعمال کروں گا۔ اور اگر کسی مرض کی حالت میں از راہِ محبت محبین اپنی اپنی تجویز کرتے۔ تو فرماتے کہ :۔

"بھائی فلاں حکیم میرے معالج ہیں۔ تم ان سے کہہ دو۔ انھیں سمجھا دو۔ اگر وہ جناب سمجھیں گے تو مجھے اس کے استعمال کرتے میں کوئی عذر نہ ہوگا۔ کیونکہ میری عادت ہے کہ میں جب بیمار پڑتا ہوں۔ تو کوئی ایک طبیب اپنے علاج کے لیے تجویز کرلیتا ہوں اور پھر اس کی رائے پر چلتا ہوں۔ اگر ایسا نہ کروں تو کس کس کا علاج کروں۔ کیونکہ محبت میں ہر ایک شخص کچھ نہ کچھ ضرور بتانے لگتا ہے۔" (ملتِ ابراہیم صفحہ ۳۶)

غرضیکہ اس طرح نہ آپ کسی کی دل شکنی فرماتے اور نہ اپنا اصول توڑتے تھے۔

غایتِ صحبت

لسان العصر حضرت اکبر الہ آبادی کا ارشاد ہے ؎

نہ کتابوں سے نہ کالج کے ہے در سے پیدا
دین ہوتا ہے بزرگوں کی نظر سے پیدا

اور حکیم الامت علامہ اقبال نے مثنوی "پس چہ باید کرد اے اقوامِ شرق" میں اسی مضمون کو اس مصرع میں ادا کیا ہے کہ ع

علم و حکمت از کتب ، دیں از نظر

ایک مرتبہ حکیم محمد حسن قرشی نے علامہ اقبال سے دریافت کیا کہ آپ کے اس مصرع میں "نظر" سے کیا مراد ہے۔ تو علامہ اقبال نے فرمایا "صحبت" (ملاحظہ ہو ملفوظاتِ اقبال ۲۰۶)

اہلِ اللہ کی صحبت حاصل کرنے کی اس لیے تاکید کی جاتی ہے کہ ان کے پاس رہنے سہنے سے ہر شعبۂ زندگی کے متعلق عملی تجربات و مشاہدات ہوتے رہتے ہیں۔ جن سے اصلاح و تربیت ہوتی رہتی ہے۔ چنانچہ مولانا عبد الماجد دریابادی جو حضرت تھانوی کے "زیرِ نظر" رہے۔ اپنے مشاہدات کی بنا پر لکھتے ہیں کہ :۔

"صحبت بابرکت کی ایک خاص برکت یہ تھی کہ اپنی کوتاہیاں۔ اپنے عیوب۔ اپنے گناہ مشاہدہ میں آجاتے تھے اور بغیر اس کے کہ مولانا خطاب خاص سے مخاطب فرمائیں۔ یا صراحتہً کسی کو اس کے کسی عیب کی طرف توجہ دلائیں معلوم ایسا ہوتا ہے کہ جیسے غفلت کے پردے نگاہوں سے از خود ہٹتے جاتے ہیں۔ اور عمر بھر کی عادتیں بے نقاب نظر آنے لگتی تھیں۔"

(حکیم الامت ص ۱۰۵)

مشائخ اور بزرگوں کی صحبت کا ماحصل لوگ یہی سمجھتے ہیں کہ کچھ وظیفے سیکھ

لیں یا بہت سے بہت یہ کہ کچھ ذکر و شغل کی مشقیں کرلیں۔ خانقاہ اشرفی کے متعلق دُوسروں کا تجربہ جو کچھ بھی ہو۔ اپنا تجربہ تو یہ ہُوا کہ مریض کو مرض کا احساس برابر ہو جاتا۔ اور جہل خواہ باقی رہ جائے۔ لیکن جہل مرکب سے نجات بہر حال مِل جاتی۔ مریض کو اپنے تندرست ہونے کا زعم و پندار باقی نہ رہ جاتا اور جہاں تک ذاتی زندگی کا تعلق ہے۔ دین اور دینداری کا ہر شعبہ بیدار ہو جاتا ہے۔" (حکیم الامت صہ ۱۰۶)

معیشت

سرچشمۂ معاش

اسلام معاش کا سرچشمہ حق تعالیٰ کی ذات کو قرار دیتا ہے۔ جن کا ارشاد ہے کہ زمین پر چلنے والے ہر جاندار کی روزی میرے ذمّہ ہے۔ جس کو جتنی چاہتا ہُوں دیتا ہُوں اس سلسلہ میں قناعت و توکل کی یُوں تعلیم دی کہ کتنے جانور ہیں جو اپنی روزی کندھوں پر اُٹھائے نہیں پھرتے ؟ مگر ان میں سے کوئی بھی بھوکا نہیں سوتا۔ ہر ایک کو روزی مِل جاتی ہے۔ اس لیے روزی کے معاملہ میں انسان کو اتنی فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔ جتنی حقوق اللہ و حقوق العباد کی ادائیگی کے لیے لازمی ہے۔ مگر انسان فرائض کی طرف تو دھیان نہیں دیتا اور روزی کمانے کے لیے ساری عمر حیلے بہانے کرتا رہتا ہے۔

برکتِ تولد

حضرت تھانویؒ کی پیدائش کے بعد آپ کے والد ماجد اپنے زر و مال میں زیادتی اور برکت محسوس کرنے لگے۔ چنانچہ وہ فرماتے تھے کہ :۔

"یہ لڑکا بہت خوش قسمت معلوم ہوتا ہے۔ کیونکہ اس کی ہر تقریب کے موقعہ پر مجھے اللہ تعالیٰ نے اتنا دیا کہ میں نے دل کھول کر خرچ کیا۔"

افراطِ زر کی یہ حالت تھی کہ انھوں نے آپ کی شادی کے موقع پر (پرانی مروجہ رسم کے ماتحت) خوب فراخی سے خرچ کیا۔ پیسوں کے علاوہ روپے بھی نچھاور کیے اہلِ قصبہ کی بڑی پُرتکلف اور شاندار دعوت کی، جس کے دُور دراز تک چرچے سُنے گئے۔

فکرِ معاش

حضرت تھانوی کے والد نے آپ کو دینی تعلیم کے لیے منتخب فرمایا تھا۔ اور آپ کے چھوٹے بھائی کو انگریزی تعلیم دلانے کا اہتمام کیا۔ آپ کی تائی صاحبہ کو یہ بات ناگوار گزری اور اُنھوں نے ازراہِ ہمدردی آپ کے والد ماجد سے کہا کہ :-

"بھائی تم نے چھوٹے کو تو انگریزی پڑھائی ہے۔ وُہ تو خیر کما کھائے گا۔ بڑا عربی پڑھ رہا ہے۔ وُہ کہاں سے کھائے گا؟ اس کے گذر اوقات کی کیا صورت ہوگی؟ کیونکہ جائیداد تو ورثا میں تقسیم ہو کر گزارے کے قابل نہیں رہے گی۔"

چونکہ آپ کے والد ماجد کی نظر اسباب کی بجائے مسبب الاسباب پر تھی۔ اس لیے اُنھوں نے بڑے جوش سے فرمایا :-

"بھابی صاحبہ! تم کہتی ہو۔ یہ عربی پڑھ کر کھائے گا کہاں سے، خدا کی قسم! جس کو تُم کمانے والا سمجھتی ہو۔ ایسے اس کی جوتیوں سے لگے پھریں گے۔ اور یہ ان کی جانب رُخ بھی نہ کرے گا۔"

بشارتِ آسودگی

حضرت تھانوی نے اپنے طالب علمی کے زمانہ میں خواب دیکھا کہ ایک تالاب، جس میں پانی کی بجائے چاندی فوارے کی طرح اُبل رہی ہے۔ آپ کے پیچھے پیچھے چلا آ رہا

ہے۔" اس کا آپ نے اپنے استادِ خاص حضرت مولانا محمد یعقوب سے ذکر کیا تو انھوں نے آپ کو بشارت دی کہ "انشاء اللہ تعالیٰ دنیا تمھارے پیچھے پیچھے پھرے گی۔ اور تم اس کی طرف رُخ بھی نہ کروگے۔"

شکایت برادر

آپ کے والد ماجد بھی ماشاء اللہ بڑے صاحب بصیرت تھے۔ آپ جو کچھ خرچ کے لیے مانگتے وہ فوراً دے دیتے اور اس کا کوئی حساب نہ لیتے۔ لیکن اپنے چھوٹے لڑکے منشی اکبر علی کو جو کچھ دیتے۔ اس کا باقاعدہ حساب لیتے۔ جو انھیں ناگوار گزرا۔ اور آخر کار انھوں نے اپنے والد ماجد سے شکایت کر ہی دی کہ بڑے بھائی کو تو بلا حساب خرچ دیا جاتا ہے۔ اور مجھ سے پائی پائی کا حساب لیا جاتا ہے۔ اس کی کیا وجہ ہے۔ انھوں نے جواب دیا کہ :-

"بیٹا مجھے اس (اشرف علی) پر رحم آتا ہے۔ وہ جو کچھ مجھ سے لیتا ہے۔ میری زندگی تک ہے۔ میرے بعد یاد رکھو۔ وہ میرے مال و متاع سے بالکل علیحدہ رہے گا۔"

بفضلہٖ تعالےٰ یہ سب پیش گوئیاں حرف بحرف پوری ہوئیں اور آپ کو روزی کے سلسلہ میں کبھی پریشان نہ ہونا پڑا۔

تنخواہِ ملازمت

آپ کے فارغ التحصیل ہونے کی دیر تھی کہ صفر ۱۳۰۱ھ میں آپ کو مدرسہ کانپور کی ملازمت مل گئی۔ اور پچیس روپے ماہوار تنخواہ مقرر ہوئی۔ جو اُس وقت کے لحاظ سے کچھ ایسی کم نہ تھی۔ مگر حضرت کی قابلیت کے مقابلہ میں یہ کچھ بھی نہ تھی۔ لیکن پھر بھی حضرت اسے معقول سمجھ کر فرماتے تھے کہ :-

"طالب علمی کے زمانہ میں خیال کیا کرتا تھا کہ زیادہ سے زیادہ دس روپے

کی مدرسی اپنی ضروریاتِ معاش کے لیے کافی رہے گی۔ پانچ روپے اپنے خرچ کے لیے اور پانچ روپے گھر کے خرچ کے لیے اور پانچ روپے خرچ کے لیے۔ بس اس سے زیادہ کی تنخواہ پر کبھی نظر ہی نہ جاتی تھی۔ نہ اس سے زیادہ کا اپنے کو مستحق سمجھتا تھا۔"

گویا آپ کو شروع سے ہی آپ کے خیال اور ضرورت سے زیادہ تنخواہ ملنی شروع ہو گئی۔ جو بعد ازاں پچاس روپے ماہوار تک پہنچ گئی اور اخیر ملازمت تک یہی تنخواہ وصول فرماتے رہے۔

ترکِ ترکہ

آپ کے والد ماجد نے ۱۳۰۵ھ میں وفات پائی اور کافی ترکہ چھوڑا۔ اس میں سے:-

۱۔ آپ نے موروثی اراضی چھوڑ دی اور اس میں سے کچھ حصہ نہ لیا۔

۲۔ اپنے دادا صاحب کی متروکہ اراضی کی آپ نے رقم لے لی۔ اس سے مکان بنوایا۔ جس پر پانچ ہزار روپیہ لاگت آئے۔ چونکہ آپ کی بڑی اہلیہ محترمہ کا مہر بھی پانچ ہزار تھا۔ اس لیے وہ مکان ان کو مہر میں دے دیا اور جو روپیہ بچا۔ اس سے حج پر تشریف لے گئے۔ اور اس میں سے کچھ بھی پس انداز نہ ہوا۔

۳۔ آپ کے والد ماجد صاحب کا جو روپیہ بنک میں موجود تھا اسے آپ مشتبہ سمجھتے تھے اور اپنے جدِ اعلیٰ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی طرح (جو دس حصوں میں اگر ایک حصہ مشتبہ پاتے۔ تو سب کو ترک کر دیتے تھے) اس سے حصہ لینے سے انکار کر دیا۔ مگر انکار کرنے سے قبل اس کی مزید تصدیق کرنے کے لیے حضرت مولانا گنگوہیؒ سے استفتاء بھی فرما لیا کہ اگر یہ جائیداد نہ رکھوں تو کیسا ہے؟ مولانا نے فرمایا "اگر رکھو۔ رخصت ہے نہ رکھو۔ جب بھی حق تعالیٰ روزی سے تم کو پریشان نہ کرے گا۔"

اس سلسلہ میں ایک روز مولانا گنگوہیؒ کے خادمِ خاص مولانا محمد یحییٰ نے حضرت کی

موجودگی میں مولانا سے عرض کیا کہ "حضرت ان کو اپنے والد کا متروکہ روپیہ جو بنک میں پڑا ہے۔ لینے کی اجازت کیوں نہیں دیتے؟" مولانا نے فرمایا۔ "اگر کوئی تقویٰ اختیار کرے تو کیا میں اس کو روکوں۔" جس سے حضرت کا کمال استغناء ظاہر ہے کہ فتویٰ کے باوجود تقویٰ کے پیش نظر ترکہ پر لات مار دی۔

تاکیدِ شیخ

آپ کے شیخ حضرت حاجی امداد اللہ قدس سرہ نے آپ کو اپنے مکتوب نمبر ۲۹، مورخہ ۱۶ر جمادی الاول ۱۳۱۴ھ میں ہدایت فرمائی تھی کہ :۔

"جب تک یہاں (کانپور) کا تعلق خدا کو منظور ہے۔ رکھیے۔ بعد ازاں پھر تھانہ بھون میں محض توکل بخدا۔ خدا کا نام لے کر بیٹھ جایئے۔ اور کسی نوع کا کوئی تعلق ظاہری نہ کیجئے۔ وہ خود مسبب الاسباب ہے۔ سب سامان آپ کے درست کر دے گا۔ انشاء اللہ تعالیٰ کوئی تردد نہ کرنا پڑے گا۔"

حضرت تھانوی نے اس قسم کی طبیعت پائی تھی کہ آپ نہ تو کسی کے لیے بار بننا چاہتے تھے اور نہ کسی کے زیر بار احسان ہونا چاہتے تھے۔ بلکہ خدمتِ دین کے لیے اتنے حریص تھے کہ آپ نے مدرسی کی تنخواہ لینے سے بھی بچنے کے لیے دہلی جا کر طب کی تعلیم حاصل کرنی شروع کر دی تاکہ اسے ذریعہ معاش بنایا جائے۔ لیکن جب مخلصین نے آپ کو اپنے تجربہ کی بناء پر یقین دلایا کہ اس صورت میں آپ اتنی خدمتِ دین نہ کر سکیں گے۔ جو موجودہ صورت میں کر رہے ہیں۔ تو پھر آپ کو طلوعاً وکرہاً وہاں سے واپس آنا پڑا۔ قناعت وسیر چشمی کا یہ عالم تھا کہ آپ نے اپنی کسی کتاب کا حق تصنیف نہ لیا۔ حالانکہ ایک اخبار ہی اندازہ کے مطابق اگر آپ اپنی کتابوں کا حق تصنیف لیتے۔ تو پچاس ساٹھ لاکھ روپیہ ترکہ میں چھوڑ جاتے۔ اب جبکہ یہ حکم آیا کہ ترکِ ملازمت کے بعد سیدھے تھانہ بھون پہنچیں اور کوئی ذریعہ معاش اختیار کیے بغیر محض توکلاً علی اللہ بیٹھ جائیں اور کوئی تردد نہ کریں۔ وہ مسبب الاسباب خود

سب سامان کردے گا تو اس نے حضرت تھانوی کو ورطہ حیرت میں ڈال دیا کہ حکم طبیعت کے خلاف تھا۔ انکار اتباع کے خلاف تھا۔ بلکہ توکل نہ کرنے سے تو رزاقِ مطلق کی رزاقیت کے انکار کا احتمال تھا کہ نعوذ باللہ وہ بلا سبب رزق دینے پر قادر نہیں۔

آزمائش و امتحان

اس لیے آپ بلا تردد تھانہ بھون آ کر توکلاً علی اللہ بیٹھ گئے اور افاضۂ باطنی میں مصروف ہو گئے اور ساتھ ہی مقروض بھی۔ جس سے طبیعت کے تقاضا کی تائید ہوتی تھی کہ بلا ذریعہ معاش نہیں بیٹھنا چاہیئے۔ اگر کوئی دوسرا ہوتا۔ تو یقیناً اس کے پائے ثبات میں لغزش آ جاتی۔ مگر اس کوہِ استقلال کی جبین پر بل تک نہ آیا۔ البتہ حسب دستور" اطلاع و اتباع" آپ نے حضرت حاجی صاحب و مولانا گنگوہیؒ کو اس حالت سے مطلع کر دیا۔

حضرت حاجی صاحب نے تو اس اطلاع پر یہ لکھا کہ :۔

" آپ کے استقامت اور توکل میں کامیابی کی دعا کرتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ ظاہری اور باطنی فیض میں روز افزوں ترقی فرمائے۔"

(مکتوب نمبر ۳۷۔ ۶ رجب ۱۳۱۵ھ)

مگر مولانا گنگوہیؒ نے فرمایا کہو تو تمہارے لیے مدرسہ دیوبند میں تحریک کر دوں حضرت نے نہایت ادب سے کہا :۔

" میرا تو اس وقت عرض کرنے کا مقصد صرف دعا ہے۔ باقی حضرت حاجی صاحبؒ نے بعد ترکِ تعلق کانپور کسی اور جگہ کوئی تعلق کرنے کی ممانعت فرما دی ہے۔ اگر حضرت کی یہی تجویز ہے۔ تو میں اس کو بھی حضرت حاجی صاحب ہی کی تجویز سمجھوں گا اور یہ سمجھوں گا کہ حضرت حاجی صاحب ہی نے اپنی پچھلی تجویز کو منسوخ فرما کر اب یہ تجویز فرما دی ہے۔ کیونکہ تجویز مؤخر ناسخ ہوتی ہے تجویز مقدم کی۔"

یہ سُنتے ہی مولانا گنگوہیؒ نے فوراً گھبراتے ہوئے لہجہ میں فرمایا کہ نہیں نہیں۔ اگر حضرت حاجی صاحبؒ نے ممانعت فرمائی ہے تو مَیں ہرگز اس کے خلاف مشورہ نہیں دیتا۔ مَیں دُعا کروں گا کہ اللہ تعالیٰ قرض سے سبکدوش فرمائے۔ ورنہ اگر اس پیکرِ استقلال کی جگہ کوئی اور ہوتا۔ تو وُہ یقیناً مولانا گنگوہیؒ کی تجویز منظور کر لیتا۔ غرضیکہ جب حضرت تھانوی کے پائے استقلال میں اس قرض کی پریشانی کی وجہ سے کوئی تزلزل نہ آیا۔ اور آپ توکل پر مستقل رہے۔ تو بفضلہٖ تعالیٰ قرض سے بھی جلد سبکدوشی ہو گئی۔

فراخیِ رزق

تنگیِ رزق کی آزمائش کے بعد آپ کو فراخیِ رزق کا امتحان پیش آیا۔ جو پہلے امتحان سے بھی سخت تھا۔ کیونکہ انسان تنگی کی حالت میں تو کسی نہ کسی طرح گزارہ کر لیتا ہے اور تحمل و برداشت سے کام لیتا ہے۔ مگر فراخیِ رزق کی صورت میں استقلال کے ساتھ اعتدال پر رہنا اور سیم و زر کی بارش میں لسے آفتِ جان کر اپنا دامن بچا لینا یہ کسی بڑے ہی صاحب ظرف کا کام ہے۔ ورنہ دُنیا کے اسی موڑ پر بڑے بڑے اربابِ تقدس و تقویٰ کو گرتے دیکھا۔

اب صورتِ حال یہ پیدا ہو گئی کہ آپ تو افاضہ باطنی میں مصروف تھے اور چاروں طرف سے دنیا ہدایا لا لا کر آپ کا محاصرہ کر رہی تھی۔ ادنیٰ سے لے کر اعلیٰ تک چپڑاسی سے لے کر والیانِ ریاست تک سب کی خواہش اور کوشش یہی تھی کہ حضرت کچھ قبول کر لیں۔ مگر حضرت نے کمال استغناء کے ساتھ انھیں قبول کرنے کے لیے ایسی کڑی شرطیں لگا رکھی تھیں۔ جن کی نظیر کسی دُوسری جگہ نظر نہیں آتی۔ اکثر بڑی بڑی رقمیں اور قیمتی اشیاء واپس فرماتے رہتے اور جو کچھ قبول فرماتے وُہ محض

۱۔ دینے والے کے اخلاص کی وجہ سے۔

۲۔ اس خوف کی وجہ سے کہیں حق تعالیٰ ناراض نہ ہو جائیں کہ ہم بھیجتے ہیں اور

یہ رد کر دیتا ہے اور

۲۔ اتباعِ سُنت کی وجہ سے۔

قبول فرمایا کرتے اور اس طرح جو آمدنی ہوتی۔ اس کا ایک چوتھائی تو خیرات کر دیتے اور بقایا رقم جب تک ضروری مصارف پر خرچ نہ فرما لیتے چین نہ آتا۔ جس کی تفصیل دعائے بزرگاں کے باب میں بضمن امیری و فقیری گذر چکی ہے۔ کیونکہ آپ کو طبعاً روپیہ پیسہ سے محبت نہ تھی۔ ورنہ نہ ترکہ ترک کرتے اور نہ حق تصنیف چھوڑتے۔

غرضیکہ آپ کا "یہ دورِ توکل" تین باتوں کا مظہر رہا۔

۱۔ انسان شیخ محقق کی رائے کے بغیر اسباب کو نہ چھوڑے۔

۲۔ اگر وہ خدمتِ دین کو مقصودِ حیات بنالے۔ تو حق تعالیٰ دُنیا کو اس کا خادم بنا دیتا ہے

۳۔ اس دَورِ فتن و انحطاط میں انسان اس وقت تک سکون و اطمینان سے خدمتِ دین و خلق سرانجام نہیں دے سکتا۔ جب تک کہ اُسے معاشی تفکرات سے بے فکری نہ ہو۔

خوراک

حضرت تھانوی مال مشکوک سے بہت بچتے تھے۔ اور مال حرام سے انتہائی نفرت کرتے تھے۔ یہاں تک کہ

"ادنیٰ شبہ کی صورت میں بھی احتراز فرماتے تھے۔" (خبر العبور صہ ۱۵)

ناشتہ کی آپ کو قطعاً عادت نہ تھی۔ فرماتے تھے کہ

"الحمد للہ۔ مَیں نہ پان کھاتا ہُوں۔ نہ چائے پیتا ہُوں۔ نہ ناشتہ کا عادی ہُوں تاکہ میزبان کو کوئی کلفت نہ ہونے پائے۔" (مواعظ التبلیغ صہ ۷)

رات کو آدھ سیر دُودھ پینے کا اکثر معمول تھا۔ کھانا بلا اشتہائے صادق نہ کھاتے تھے۔ ذرا بھی پیٹ میں ثقل معلوم ہوتا تو کھانا ملتوی فرما دیتے تھے۔

فرماتے تھے کہ :-

" میری یہ بھی عادت ہے کہ مجھے مختلف قسم کے کھانوں سے رغبت نہیں۔ ایک چیز جو ہاتھ آجائے۔ اس کو کھالیتا ہوں اور اس سے طبیعت خوش ہو جاتی ہے۔

نیز میری یہ بھی عادت ہے کہ مجمع کے ساتھ خواہ ایک ہی آدمی ہو۔ کھانے کی مقدار کا اندازہ نہیں رہتا۔ اور تنہا خوف بے فکری سے کھاتا ہوں۔ اور اندازہ سے زیادہ نہیں کھایا جاتا " (خیر المعبود صہ ۹۲)

آپ کے اول الذکر معمول کو سن کر مولوی ابوالحسن صاحب نے عرض کیا کہ حضرت سنت بھی یہی ہے۔ فرمایا :-

" یہ بات تو بڑوں کو نصیب نہیں ہوتی ہوگی کہ سنت سمجھ کر ایسا کریں ہاں شکر ہے کہ حق تعالےٰ کی بڑی نعمت ہے کہ طبیعت ہی ایسی دی ہے۔ کہ وہ اس طریق کو پسند کرتی ہے۔ جو موافق سنت ہو " (بحوالہ صدر)

جس کی تائید مندرجہ ذیل واقعہ سے ہوتی ہے۔ حضرت تھانوی فرماتے ہیں کہ :-

" ایک مسلمان رئیس میرے ساتھ کھانا کھا رہے تھے۔ ان کے ہاتھ سے بوٹی نیچے تختہ پر گر پڑی۔ تو انھوں نے اسے بوٹ سے بینچ کے نیچے پھینک دیا۔ یہ دیکھ کر میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے اور میں نے خواجہ (عزیز الحسن) صاحب سے کہا کہ ذرا اس بوٹی کو اٹھا کر پانی سے دھو لیجئے اور دھو کر مجھے دے دیجئے۔ اسے میں کھاؤں گا۔ خواجہ صاحب نے اسے دھویا اور دھو کر کہنے لگے کہ اگر کوئی دوسرا شخص کھالے۔ تو اجازت ہے ؟ میں نے کہا ہاں اجازت ہے تو خواجہ صاحب نے وہ خود کھالی۔ وہ رئیس بعد میں کہتے تھے کہ اس عملی تنبیہہ کا مجھ پر ایسا اثر ہوا کہ میں کٹ گیا اور اس دن سے میں

کبھی گرے ہوئے لقمہ کو زمین پر نہیں چھوڑا۔ بلکہ صاف کر کے کھا لیتا ہوں"۔
(مواعظ التبلیغ صہ ۶۸)

حج ثانی کے موقعہ پر جب آپ کا جہاز واپس بمبئی پہنچا۔ تو ایک سیٹھ نے مسافر خانہ میں تقسیم کرنے کے لیے حاجیوں کے واسطے کھانا بھیجا۔ آپ کے بعض ہمراہیوں نے وہ کھانا یہ کہہ کر کھانے سے انکار کر دیا کہ ہم محتاج نہیں۔ اس لیے اللہ واسطے کا کھانا نہیں لیتے۔ حضرت نے مزاحاً فرمایا بھائی ادھر لاؤ۔ ہم تو اللہ واسطے کا ضرور لیں گے۔ یہ لوگ شیطان کے واسطے کا لیں گے۔ اللہ واسطے کا نہیں لیتے۔ جب حضرت نے وہ کھانا لے لیا، تو دوسروں کو بھی لینا پڑا۔ حضرت نے فرمایا کہ اللہ واسطے کا یہاں یہ مطلب نہیں ہے کہ محتاج سمجھ کر دیتے ہیں۔ بلکہ مطلب یہ ہے کہ بلا عوض اور بلا غرض ہے۔ ورنہ کیا تقسیم کرنے والے یہ نہیں جانتے کہ حجاج میں اکثر غنی بھی ہوتے ہیں"۔

مہمان نوازی

حضرت تھانوئ بڑے مہمان تھے۔ مہمان کو بڑی فراخی کے ساتھ کھانا کھلاتے تھے۔ ملازمین کو حکم تھا کہ ریل گاڑیوں کے آنے کے بعد آکر پتہ لیں کہ کوئی مہمان تو نہیں آیا۔ اکثر مہمانوں کو تو خانقاہ میں ہی کھانا بھیج دیا جاتا تھا۔ بعض مہمانوں کو گھر پر بلا کر اپنے ساتھ کھانا کھلاتے۔ اگر خود کو بھوک نہ ہوتی۔ تو ہرگز تکلف نہ فرماتے اور خود عذر فرما کر ان کو کھانا کھلا دیتے۔ بعض دفعہ کھانے میں تو شریک نہ ہوتے لیکن کھانے کے وقت مہمان کے پاس بیٹھے رہتے۔ اگر مختلف مرتبہ کے مہمان ہوتے تو ملازم کو تاکید فرما دیتے کہ ہر ایک کو الگ الگ کھانا دیا جاوے۔ تاکہ اگر کوئی مہمان کسی دوسرے کے ساتھ کھانا گوارا نہ کرے تو اس کو تنگی نہ ہو۔ اگر وہ خود اکٹھا کھانا چاہتے۔ تو ان کو اختیار تھا۔

ایک مرتبہ ایک بہت بڑے نواب مہمان ہوئے۔ ان کے مرتبہ کے مطابق بہت سے کھانے پکوائے۔ ان کے احساس تکلف پر فرمایا کہ بفضلہ تعالےٰ کوئی چیز باہر سے نہیں منگوائی

پڑی۔ یہاں تک کہ گوشت بھی گھر کے مرغ کا ہے۔ نیز اس کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ میں آپ کو دکھادوں کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے بفضلہٖ کھانے پینے کو کافی دے رکھا ہے۔ تاکہ آپکو مسرت بھی ہو اور میری طرف سے بے فکری بھی رہے کہ خدا تعالیٰ نے سب سامانِ راحت عطا فرما رکھا ہے اور (میں آپ کے ہدیہ کا) حاجت مند نہیں۔"

پوشاک

آپ سادہ لباس پہننے کے زیادہ عادی تھے۔ جس کی وضاحت معمولاتِ سفر اور معمولاتِ وعظ میں کی جاچکی ہے۔

نیند

آپ اکثر عشاء کے بعد سو جاتے تھے۔ بشرطیکہ وعظ نہ کہنا ہو۔ یا ڈاک نہ بقایا ہو سونے کے سلسلہ میں آپ نے گھر میں اس بات کی تاکید کر رکھی تھی کہ عشاء کے بعد ایسی بات نہ پوچھی جائے۔ جس میں سوچنا پڑے۔ کیونکہ نیند جاتی رہتی ہے۔ یہ نہ صرف اس حدیث کے خلاف ہے جس میں عشاء کے بعد قصہ یا باتوں سے منع کیا گیا ہے۔ بلکہ جعلنا اللیل سکنا کے بھی خلاف ہے کہ کسی ایسی چیز کی طرف توجہ دلانا جو سکون و آرام کے خلاف ہو (مقالاتِ حکمت حصہ ہفتم ملفوظ ۶۸)

معاشرت

حقیقتِ معاشرت

قرآن و حدیث میں جس قدر آدابِ معاشرت بیان کیے گئے ہیں۔ بقول حضرت تھانویؒ :-

ان دلائل میں مجموعی طور پر نظر کرنے سے بہ دلالتِ واضحہ معلوم ہوتا ہے کہ

کسی شخص کی کوئی حرکت کوئی حالت دُوسرے شخص کے لیے ادنیٰ درجہ میں بھی کسی قسم کی تکلیف واذیت یا ثقل وگرانی یا ضیق وتنگی یا تکدر وانقباض یا کراہت وناگواری یا تشویش وپریشانی یا توحش وخلجان کا سبب وموجب نہ ہو۔ اور شارع علیہ السلام نے صرف قول وفعل سے ہی اس کے اہتمام کرنے پر اکتفا نہیں فرمایا۔ بلکہ خدام کو، قلت اعتنا پر، اُن کو اِن آداب کے عمل کرنے پر مجبور بھی فرمایا ہے۔ اور ان سے کام لے کر بھی بتلایا ہے۔ چنانچہ ایک صحابی ایک ہدیہ لے کر آپ کی خدمت میں بدوں سلام واستیذان داخل ہوئے۔ آپ نے فرمایا :-

"باہر واپس جاؤ۔ اور السلام علیکم۔ کیا میں حاضر ہوں؟ کہہ کر پھر واپس آؤ۔"

اور فی الحقیقت حسن اخلاق مع الناس کا راس اساس یہی ایک امر ہے کہ کسی کو کسی سے ایذا و کلفت نہ پہنچے۔ جس کو حضور پُرنور صلی اللہ علیہ وسلم نے نہایت جامع الفاظ میں ارشاد فرمایا ہے کہ

المسلم من سلم المسلمون من لسانہٖ ویدہٖ۔

(رواہ البخاری)

اور جس امر سے اذیت ہو۔ گو وُہ صورۃً خدمت مالی یا جانی ہو یا ادب وتعظیم ہو جو عرف میں حسن خلق سمجھا جاتا ہے۔ مگر اس حالت میں وُہ سب سوء خلق میں داخل ہے کیونکہ راحت کہ جانِ خلق ہے۔ مقدم ہے۔ خدمت پر اور قشر بلالت کا بیکار ہونا ظاہر ہے اور گو شعائر ہونے کے مرتبہ میں باب معاشرت وباب عقائد وعبادات کے فریضہ سے مؤخر ہے۔ لیکن اس اعتبار سے کہ عقائد وعبادات کے اخلال سے اپنا ہی ضرر ہے اور معاشرت

کے اخلال سے دُوسروں کا ضرر ہے اور دُوسروں کو ضرر پہنچانا اپنے نفس کو ضرر پہنچانے سے اشد ہے۔ اس لحاظ سے اس کو اُن دونوں پر تقدم ہے۔ آخر بات تو ہے جس کے سبب اللہ تعالیٰ نے سُورہ فرقان میں الذین یمشون علی الارض ھونا و اذا خاطبھم الجاھلون قالوا سلاما کہ جو لوگ زمین پر متواضع چلتے ہیں جب ان سے جاہل کوئی بات چیت کرتے ہیں۔ تو وہ اچھی بات کہتے ہیں کہ دال ہے حسنِ معاشرت پر۔ ذکر میں مقدم فرمایا۔ صلواۃ وخشیت و اعتدال فی الانفاق و توحید پر۔ جو کہ باب طاعات مفروضہ وعقائد سے ہیں اور یہ تقدم علی الفرائض تو محض بعض وجوہ سے ہے۔ لیکن نفل عبادت پر اس کا تقدم من کل الوجوہ۔

(آدابِ معاشرت)

عزّو شرف

حق تعالےٰ کو چونکہ حضرت تھانویؒ سے اصلاحِ اُمّت مسلمہ کا مہتم بالشان کام لینا تھا۔ اس لیے انھوں نے آپ کو خصُوصی عزّو شرف بھی بخشا۔ جس کی آپ کو زمانۂ طالب علمی میں ہی یُوں بشارت دی گئی کہ ایک رات حضرت تھانوی نے خواب میں دیکھا۔ جو حضرت نے "صدق الرویا" میں شائع بھی فرما دیا تھا کہ :۔

"ایک مردانہ مکان ہے۔ جیسا کہ حضرت استاذی مولانا محمود الحسن صاحب کا ہے۔ اس کے چبوترہ پر ایک بزرگ بہت لطیف اور نازک۔ بہت سفید کپڑے پہنے ہُوئے ایک مکلّف چارپائی اور مکلّف بستره پر تشریف رکھتے ہیں۔ انھوں نے مجھے ایک پرچہ لکھ کر اور مہر لگا کر دیا۔ یہ مہر پرچہ کے تمام جانب جا بجا لگی ہُوئی تھی۔ مَیں نے اس کو پڑھا تو اس میں لکھا تھا کہ "ہم نے تم کو عزّت دی"۔ اور مہر میں تھا "محمد" (صلی اللہ علیہ وسلم) پھر اسی خواب میں

ایک دنیادار کے مردانہ مکان میں ایک دنیوی حاکم کو میز کرسی لگائے دیکھا۔ اس نے بھی ایک پرچہ اسی طرح لکھ کر اور مہر کر کے دیا۔ اس میں بھی یہی مضمون تھا کہ "ہم نے تم کو عزت دی"۔ مگر مہر کے حروف پڑھے نہ جاتے تھے:

اس کی تعبیر حضرت کے اُستاذِ خاص حضرت مولانا محمد یعقوبؒ نے یہ فرمائی کہ:-

"انشاء اللہ تعالےٰ دین اور دُنیا دونوں کی عزت نصیب ہوگی"۔

چنانچہ بفضلہٖ تعالیٰ ایسا ہی ہُوا۔ حق تعالےٰ نے افاضۂ خلق کے لیے آپ کو مرجعِ خلائق بنا دیا جس وجہ سے بڑے بڑے مشائخ۔ علماء۔ فضلاء۔ صلحاء۔ شرفاء۔ اُمراء رؤسا حکماؔ۔ وکلاؔ ادباء اور شعراء آپ کی طرف رجوع کر کے فیض یاب ہوتے رہے۔ اور فیض یاب ہونے کے بعد دُوسروں کو بھی فیض پہنچاتے رہے۔ یہ سلسلہ فیض رسانی اَب تک جاری ہے اور انشاءاللہ اسی طرح جاری رہے گا۔

اکتسابِ فیض

چونکہ یہ فریضہ اپنی نوعیت کے لحاظ سے نہایت ہی اہم تھا۔ اس لیے حضرت نے بایں بشارت عز و شرف و تائید ایزدی بر بنائے بشریت خود کو کبھی بھی بزرگوں کی دُعا و توجہ سے مستغنی نہ سمجھا۔ حالانکہ اربابِ عزّت و ثروت کا یہ عام دستور ہے کہ وہ کسی دُوسرے کو خواہ وہ ان سے کتنے درجہ ہی فضیلت کیوں نہ رکھتا ہو، اپنے سے بڑا نہیں سمجھتے۔ مگر حضرت تھانویؒ نے اس امر کے باوجود کہ بزرگانِ دین کی خود بخود آپ پر نظر و توجہِ خاص تھی ہر ضرورت کے موقع پر یہاں تک کہ بعد تکمیل سلوک بھی بلا تامل اپنے پیر و مُرشد کے علاوہ اپنے بڑے رُتبہ کے پیر بھائیوں سے عرض حال کر کے مشورہ لیتے تھے۔ اور ان سے برابر فیض حاصل کرتے رہتے تھے۔ اور اس میں کبھی عار محسوس نہیں کرتے تھے۔ جس کی برکت سے کارِ اصلاح میں آسانی رہی۔

راحت رسانی

چونکہ حضرت تھانویؒ کو مرجع خلائق ہونے کی وجہ سے ہر وقت ہر قسم کے لوگوں سے سابقہ پڑا رہتا تھا اور ان سے مختلف قسم کے معاملات پیش آتے رہتے تھے۔ اس لیے آپ ان کی راحت رسانی کے لیے ہر ہر کوتاہی کی نہایت تدقیق کے ساتھ قولی اور عملی تعلیم فرماتے رہتے تھے۔ اور آپ کا ہر فعل متذکرہ بالا ہر قول کا آئینہ دار تھا۔ اور اس معاملہ میں اس درجہ سے اہتمام تھا کہ بلاخوف لومۃ لائم رات دن لوگوں کو نہایت اہتمام کے ساتھ اس کے متعلق روک ٹوک فرماتے رہتے تھے۔ اور اس سلسلہ میں کسی کی رو رعایت نہ کرتے تھے خواہ وُہ کتنا ہی بڑا آدمی کیوں نہ ہو۔ جس کی کئی مثالیں مختلف مقامات پر آچکی ہے۔ تعلیم و اصلاح معاشرت اور راحت رسانی خلق کی وجہ سے بعض کم فہم اور کوتاہ اندیش حضرت کو سخت گیر اور تند مزاج ظاہر کرتے رہتے تھے۔ حالانکہ حضرت کی تعلیم اصلاح معاشرت بالکل سُنت نبوی کے مطابق تھی۔ مگر چونکہ عوام و خواص شریعت کی بجائے بدعات کے عادی ہو چکے تھے اس لیے ان پر یہ گراں گزرتی تھی۔ مگر مصداق ؎

خلقے بطعن و گفتگو۔ عاشق بکارِ خویشتن

آپ نے کبھی ایسے لوگوں کی طعن و تشنیع کی پروا نہ کی اور اپنے فرضِ اصلاح میں شب و روز منہمک رہے۔

خدمتِ خلق

یہ ایک مسلّمہ حقیقت ہے کہ حضرت تھانوی طبعاً خلوت پسند تھے۔ بچپن میں ہمشیرہ کے ساتھ گھر کے اندر کھیلنا۔ زمانۂ طالب علمی میں ہم عمر۔ ہم رشتہ طلباء و رفقاء و اعزہ سے میل ملاپ نہ رکھنا۔ فارغ اوقات میں اساتذہ کی خدمت میں یا کمرہ کے اندر اکیلے بیٹھے رہنا سفر کے دوران میں لوگوں کو استقبال وغیرہ کی اجازت نہ دینا۔ مولانا گنگوہیؒ سے آبادی چھوڑ دینے کی اجازت طلب کرنا۔ آخر زمانہ تک وحشت عن الخلق رہنا اور آپ کا یہ فرمانا کہ :۔

"اب تو تعلقات سے بہت وحشت ہوتی ہے۔ جی چاہتا ہے کہ مجمع زیادہ نہ ہو۔ اپنے ہم خیال کچھ لوگ ہوں اور یادِ حق میں بقیہ زندگی گزرے۔ یہی وجہ ہے کہ میں اکثر یہ بہانہ کر کے اٹھ جاتا ہوں کہ گھر ہو آؤں۔ بات یہ ہے کہ مجمع سے جی گھبراتا ہے۔" (کمالاتِ اشرفیہ صفہ ۲)

آپ کی وحشت عن الخلق انس مع الخالق پر دال ہے اس حالت میں لوگوں کا نافہمی کی وجہ سے آپ کو غیر ضروری باتوں میں الجھانا اور ناواجب کاموں سے ستانا اور آپ کو تبخیر کا دورہ ہو جانا اور آپ کا لوگوں سے ملنا ملانا ترک کرنے کو خلافِ مروت سمجھنا اور خدمتِ خلق میں شب و روز مصروف رہنا ایک بہت بڑی کرامت ہے۔ ورنہ جب انسان خود ہی ہر وقت اپنی فکر میں مبتلا ہو۔ اسے دوسروں کی جانب توجہ کرنے کی قطعاً ہمت و فرصت ہی نہیں ہوتی۔

چنانچہ دورِ وحشت میں جبکہ مطلقاً وحشت عن الخلق ہو گئی تھی۔ آپ نے بیعت لینا اور تعلیم تلقین کرنا موقوف فرما دیا تھا۔ کیونکہ بلا توجہ خاص اثر نا ممکن ہے۔ مگر اس زمانہ میں بھی اکثر طالبین بیعت کے لیے اصرار کرتے۔ اس عالمِ دیوانگی میں بھی حضرت کو افادۂ خلق کا اتنا خیال تھا کہ آپ ازراہِ تدین ایسے طالبین سے صاف فرمایا کرتے کہ:۔

"ایسی حالت میں مجھ سے رجوع کرنا بالکل بے سود ہے۔ کیونکہ میں تو اپنے غم میں مبتلا ہوں۔"

لیکن لوگ پھر بھی اصرار کرنے سے باز نہ رہتے۔ حضرت کو ان کی دل شکنی سے سخت کوفت ہوتی چنانچہ اسی حالت میں آپ نے بریلی کے ایک صاحب کو اس کے اصرار پر ازراہِ مروت بیعت فرما لیا۔ مگر حضرت کے ارشاد کے مطابق اسے کوئی نفع اصلاح نہ ہوا۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ موافق تو بجائے خود رہے۔ ناموافق و نامساعد حالات میں بھی حضرت نے خدمتِ خلق میں کبھی کوتاہی نہ فرمائی بلکہ اسے فرضِ عین کی طرح انجام دیتے رہے۔

وسعتِ نظر

اصلاحِ اُمّت کے منصبِ جلیلہ پر فائز ہونے کے بعد آپ کی نظر میں مُسلمانوں کی قریباً ساری بدانتظامیاں روزِ روشن کی طرح واضح ہو گئیں۔ جو ان کے زوال کا باعث تھیں۔ کیونکہ بقول حضرت تھانویؒ :۔

"مُسلمانوں کے ہاتھوں سے جو سلطنت گئی ہے۔ وُہ بدنظمی ہی کی وجہ سے گئی ہے۔ سلطنت کفر کے ساتھ تو جمع ہو سکتی ہے لیکن بدانتظامی کے ساتھ ہرگز جمع نہیں ہو سکتی اس لیے بوجہ شامتِ اعمال مُسلمانوں کے اندر سے سلطنت کا مادہ ہی نکال لیا گیا ہے"

یہی وجہ ہے کہ حضرت تھانویؒ مسلمانوں کی سیاسی جدوجہد میں شریک ہونے کی بجائے ان کی اصلاحِ اخلاق و معاشرت کی طرف ہی ہمہ تن متوجہ رہے اور صُوفیاء کرام کی طرح لوگوں کو ذکر و شغل میں مشغول نہ رکھا۔ جیسا کہ آپ اکثر فرمایا کرتے تھے کہ :۔

"میری نظر ذکر و شغل پر اس قدر نہیں۔ جس قدر کہ اصلاحِ اخلاق و معاشرت پر ہے کیونکہ ان کا تعلق دُوسروں سے ہے۔"

اصلاحِ معاشرت

غرضیکہ حضرت تھانویؒ نے بحیثیت حکیم الامت اور مجدد الملت اس شعبۂ زندگی کی اصلاح کی طرف اس قدر اہتمام اور اس قدر تفصیل کے ساتھ توجہ فرمائی کہ ایسی توجہ صدیوں سے نہ ہُوئی تھی اور جب ہم آپ کے اصلاحی کارناموں پر نظر دوڑاتے ہیں تو حیران ہو کر رہ جاتے ہیں کہ وحشت عن الخلق کے باوجود اس قدر کام ایک انسان سے کس طرح ممکن تھا؟ چنانچہ حضرت کو خود بھی اس پر حیرت تھی۔ جس کی وجہ سے ایک بار فرمایا کہ :۔

"مجددِ ملت تو خیر کیا۔ لیکن مجددِ معاشرت میں ضرور ہوں۔"

حضرت تھانویؒ نے جن جن آدابِ معاشرت کی تعلیم فرمائی۔ وہ اتنے کثیر ہیں کہ ان

کا احصار ممکن نہیں۔ جنہیں شوق ہو۔ وہ حضرت کی تالیفات و تصنیفات اور مکتوبات و ملفوظات میں ملاحظہ فرما سکتے ہیں۔ البتہ عنوان کی مناسبت و تقاضا سے بمصداق مشتے نمونہ از خروارے چند واقعات درج ذیل کیے جاتے ہیں: جن سے اندازہ لگایا جا سکے گا۔ کہ جن امور کو ہم پر کاہ جتنی وقعت بھی نہیں دیتے۔ وہ حضرت کی نظر میں کتنی اہمیت رکھتے تھے۔

باریک بینی

ایک دفعہ ایک صاحب نے از راہِ خدمت قبل از نماز صبح حضرت کے وضو کے لیے پانی کا لوٹا بھر کر اور اس پر حضرت کا ذاتی مسواک رکھ کر مسجد میں رکھ دیا۔ اتفاق سے آپ باوضو آئے اور لوٹے کو اس طرح پڑا دیکھ کر پوچھا کہ یہ کس نے بھر کر اس طرح رکھا ہے۔ بڑی تفتیش کے بعد جب اس خدمت گزار کا پتہ لگا۔ تو نماز سے فارغ ہونے کے بعد اس سے فرمایا کہ تم نے محض احتمال پر کہ شاید میں وضو کروں لوٹا بھر کر رکھ دیا اور یہ احتمال نہ ہوا کہ شاید وضو ہو۔ اگر میری نظر نہ پڑتی۔ تو یہ یونہی پڑا رہتا اور اس سے کوئی فائدہ نہ اٹھاتا۔ جبکہ اس پر مسواک بھی رکھ دی گئی۔ جس کا یہ مطلب تھا کہ کسی نے اپنے لیے رکھا ہے۔ لہٰذا اسے کوئی دوسرا استعمال نہ کرے۔ اس لیے ایسی چیز کا بلاضرورت محبوس رکھنا جو مفادِ عامہ سے متعلق ہو۔ جائز نہیں۔ ثانیاً دوسرے کی چیز یعنی مسواک کو احتمالاً بلاضرورت ایک محفوظ جگہ سے اٹھا کر غیر محفوظ جگہ پر رکھ دینا۔ اور اس کی نگرانی نہ کرنا کہ بعد فراغ اسے اپنی پہلی جگہ پر رکھا جائے۔ اس کو ضیاع کے خطرہ میں ڈالنا ہے۔ اس لیے تمہاری یہ خدمت کتنے ناجائز امور اور کلفتوں کا سبب ہوئی۔ آیندہ ایسا نہ کیجیو۔ اگر شوق ہے تو اجازت لے کر کرو۔ یا جس وقت دیکھو کہ وہ وضو کے لیے آمادہ ہے۔ اس وقت مضائقہ نہیں۔ ورنہ بیقاعدہ خدمت سے بجائے راحت کے الٹا کوفت ہوتی ہے۔ ایسی خدمت کی باریک خرابیوں کا احاطہ کرنا حضرت تھانویؒ پر ہی ختم تھا۔ بس اسی طرح آپ بات بات

اور قدم قدم پر باریک بینی سے کام لیتے تھے ۔

نکتہ آفرینی

ایک مہمان نے ہدیہ کے دو روپے چپکے سے حضرت کے قلمدان پر بلا اطلاع رکھ دیئے۔ عصر کے وقت قلمدان تنہا چھوڑ کر نماز پڑھنے چلے گئے۔ نماز کے بعد کسی ضرورت کے سلسلہ میں قلمدان منگایا تو اس میں دو روپے پڑے دیکھ کر تردد سا ہوا کہ یہ کہاں سے آ گئے۔ آخر دریافت شروع ہونے پر اس صاحب نے بتلایا کہ میں نے ہدیہ کے رکھے تھے۔ اس پر آپ نے وہ روپے واپس کر دیئے اور فرمایا کہ جب تم ہدیہ دینا نہیں جانتے۔ تو ہدیہ دینا کوئی ضروری ہے؟ کیا دینے کا طریقہ یہ ہے؟ ہدیہ تو راحت و مسرت پہنچانے کے لیے دیا جاتا ہے۔ جب اس کی تحقیقات میں اتنا وقت ضائع ہوا۔ اور اس قدر پریشانی ہوئی۔ تو اس کے دینے سے فائدہ۔ اس کی غرض تو فوت ہو گئی۔ ثانیاً اگر قلمدان میں سے کوئی لے جاتا۔ جس کی نہ تمہیں خبر ہوتی اور نہ مجھے۔ تم تو اس گمان میں رہتے کہ میں نے دو روپے دیئے ہیں۔ اور میں اس سے ذرا بھی فائدہ نہ اٹھاتا اور میرے سر پر مفت کا احسان رہتا۔ ثالثاً اگر کوئی لے بھی نہ جاتا اور پھر میرے ہی ہاتھ آتے۔ تب بھی مجھے یہ کیسے معلوم ہوتا کہ یہ کس نے دیئے اور کس کو دیئے اور جب تک معلوم نہ ہوتا۔ تو چند روز امانت رکھنے کا مجھ پر بار رہتا۔ پھر لقطہ کی مد میں خرچ کر دیا جاتا۔ اور کتنی تکلیف ہوتی۔ سیدھی بات یہ ہے کہ جس کو دینا ہو۔ اس کے ہاتھ میں دے۔ اگر مجمع میں دینے سے لحاظ معلوم ہو تو تنہائی میں دے اگر تنہائی میسر نہ ہو تو کہہ دے کہ میں تنہائی میں کچھ کہنا چاہتا ہوں۔ جب تنہائی ملے تو اس وقت دے دے۔ اور مہدی الیہ کو مناسب ہے کہ اس ہدیہ کو ظاہر کر دے۔ خواہ مہدی کے ہوتے ہوئے۔ خواہ اس کے چلے جانے کے بعد جبکہ اس کے شرمانے کا خیال ہو۔

بظاہر یہ کتنی معمولی سی بات تھی۔ مگر حضرت نے نکتے کتنے اہم اور سبق آموز نکالے۔

خبرگیری

ایک دفعہ ایک صاحب حضرت کے پاس آئے۔ آپ نے فوراً دریافت فرمایا کہ کیسے تشریف لائے؟ کچھ فرمانا ہے؟ جواب دیا کہ جی نہیں۔ ویسے ہی ملاقات کے لیے حاضر ہُوا تھا۔ جب جانے لگے تو نماز مغرب کے فرض اور سُنت کے درمیان تعویذ کی فرمائش کر دی۔ اس پر حضرت نے فرمایا کہ" ہر کام کے واسطے ایک موقع اور محل ہوتا ہے۔ یہ وقت تعویذ کا نہیں ہے۔ جب آپ تشریف لائے تھے۔ تو مَیں نے استفسار کیا تھا۔ آپ نے فرمایا کہ ویسے ہی ملاقات کے واسطے آیا ہُوں۔ اَب اس وقت یہ فرمائش کیسی۔ اُسی وقت پُوچھنے کے ساتھ ہی آپ کو فرمائش کرنی چاہیئے تھی۔ لوگ اس کو ادب سمجھتے ہیں۔ میرے نزدیک یہ بڑی بے ادبی ہے۔ اس کے تو یہ معنی ہُوئے کہ دُوسرا شخص ہمارا نوکر ہے جس وقت چاہیں فرمائش کریں۔ اس کی تعمیل ہونی چاہیئے۔ اب آپ ہی ذرا غور کریں کہ مجھ کو اس وقت کِتنے کام ہیں ایک تو سنن و نوافل پڑھنا۔ پھر ذاکرین و شائقین کو کچھ کہنا۔ ان کی سُننا۔ مہمانوں کو کھانا کھلانا۔ افسوس کہ فی زمانہ دُنیا سے بالکل ادب و تہذیب مرتفع ہو گیا ہے۔ اَب تعویذ کے لیے پھر تشریف لائیے۔ یاد رکھیئے اِنسان جہاں جائے اوّل مقصود کا ذکر کر دے۔ بالخصوص پوچھنے پر۔ مَیں تو ہر شخص کے آتے ہی دریافت کر لیتا ہُوں کہ اکثر اھل حوائج آتے ہیں اور بعض اشخاص بوجہ شرم و حیا خود نہیں کہہ سکتے یا مجمع کی وجہ سے پوشیدہ بات ظاہر نہیں کر سکتے۔ پُوچھنے سے وُہ بتلا دیتے ہیں یا کہہ دیتے ہیں کہ خلوت میں کہنے کی بات ہے۔ جب مَیں موقع پاتا ہُوں۔ علیحدہ اُن کو بلا کر سُن لیتا ہُوں۔ اور جب آدمی کچھ مُنہ سے ہی نہ بولے تو خبر کیسے ہو سکتی ہے مجھے علم غیب تو ہے نہیں۔

گو بظاہر حضرت نے اس کی خوب خبر لی۔ مگر خبر لینے میں حضرت کی خبرگیری کا پہلو کتنا روشن ہو گیا اور کتنا اچھا سبق مِل گیا۔

دلسوزی

ایک طالب علم سے ایک ملازم کی نسبت دریافت کیا گیا کہ وہ کیا کر رہا ہے۔ اس نے کہا کہ سو رہا ہے۔ بعد میں معلوم ہوا کہ وہ اپنی کوٹھڑی میں جاگتا ہے۔ اس پر طالب علم کو فہمائش کی کہ "اوّل تو تخمین پر ایک بات کو تحقیقی سمجھنا غلطی ہے۔ اگر خود اس کو غیر تحقیقی سمجھتے تھے تو مخاطب پر اس کے تخمینی ہونے کو ظاہر کرنا چاہیئے تھا۔ یُوں کہتے کہ شاید سو رہے ہوں اور یہ بھی علی سبیل التنزل کہا جاتا ہے۔ ورنہ اصل جواب تو یہ تھا کہ معلوم نہیں مَیں دیکھ کر بتلاؤں گا۔ پھر تحقیق کر کے صحیح جواب دیتے۔ دُوسرے اس میں یہ خرابی ہے کہ اگر مجھ کو اس کا جاگنا بعد میں معلوم نہ ہوتا۔ اور اس خیال میں رہتا کہ وہ سوتا ہے تو بعض اوقات بلکہ مجھ کو تو بہت اوقات ایسے مواقع پر یہی خیال ہوتا ہے کہ بلا ضرورت سوتے آدمی کو جگانا۔ بے آرام کرنا۔ بے رحمی ہے۔ اور اس خیال سے نہ جگاتا اور ممکن ہے کہ اس وقت اس سے کسی ضروری کام میں حرج ہو جاتا۔ گو وہ ضرورت شدت کے درجے تک نہ ہوتی۔ مگر اس حرج کو اس لیے گوارا کر لیا جاتا کہ سوتے کو جگانا اس سے زیادہ ناگوار تھا۔ پھر جب بعد میں معلوم ہوتا کہ وہ سوتا نہ تھا۔ اب اس حرج کی ناگواری کا قلب پر اثر ہوتا۔ اور اس راوی پر غصہ آتا۔ تو یہ تمام پریشانیاں اس بات کی بدولت ہوتیں کہ بلا تحقیق ایک بات کہہ دی تھی۔ اس کی ہمیشہ احتیاط رکھنی چاہیئے۔"

جس سے ظاہر ہے کہ حضرت کتنی دلسوزی سے ذرا ذرا سی بات سے سمجھانے کے لیے کتنے اہم نکات پیدا فرماتے تھے۔

سبق آموز

ایک طالب علم نے مدرسہ ہی میں ایک رقعہ میں کپڑے کی ضرورت لکھوا کر دُوسرے طالب علم کے ہاتھ بھیجا۔ حضرت نے درخواست کنندہ کو بلا کر اس کی وجہ پوچھی تو اس نے کہا کہ کوئی کام نکل آیا تھا۔ اس لیے دُوسرے کے ہاتھ بھیجا۔ اس پر فہمائش کی کہ ایک تو

اس میں قلتِ ادب ہے کہ باوجود ہر وقت ایک جگہ رہنے کے محض بہ سبب ایک کاہل آنے کے نہ کہ بہ سبب خجلت وحیا کے (کہ وہ بھی ایک درجہ میں عذر ہوتا ہے) خود آکر استدعا نہیں کی۔ دُوسرے کے ہاتھ پیغام بھیجا۔ جو کہ مساوات کے درجہ میں ہوتا ہے۔ دُوسرے اس میں بے رغبتی کی صورت ہے کہ بیگار سی ٹال دی۔ تیسرے اس میں دُوسرے سے خدمت لینا ہے۔ ابھی سے مخدومیت سیکھتے ہو اور یہ بھی کہا کہ اس بے تمیزی کی سزا یہ ہے کہ چار روز کے لیے یہ درخواست واپس کرتا ہوں۔ پھر اپنے ہاتھ سے دینا۔ چنانچہ چوتھے روز پھر اس نے اپنے ہاتھ سے درخواست دی۔ جو حضرت نے خوشی سے منظور فرمالی۔

اس سے صاف ظاہر ہے کہ حضرت تھانویؒ اصلاحی سبق اس انداز سے دیتے تھے کہ وہ ہمیشہ کے لیے دل پر نقش ہو کر رہ جاتا تھا۔

وسعت و ندرت

مذکرہ بالا مختلف النوع مثالوں سے یہ حقیقت خود بخود واضح ہو جاتی ہے کہ حضرت تھانوی کا اصلاحِ معاشرت کا نظام کتنا وسیع اور کتنا عجیب تھا کیونکہ

الف : اس محبوبِ خلائق کو روزانہ مختلف المزاج اور مختلف الخیال لوگوں سے کسی نہ کسی سلسلہ میں ضرور واسطہ پڑتا تھا۔ ہر ایک سے کوئی نہ کوئی ایسی بات ضرور ہو جاتی جو کتاب وسُنت یا اخلاق وآداب کے معیار پر پوری نہ اُترتی۔ جس کی وجہ سے حضرت کو تنبیہہ وفہمائش کرنی پڑتی اور یہ سلسلہ اخیر وقت تک جاری رہا۔

ب : چونکہ ایسے مواقعِ اصلاح اتفاقی طور پر پیدا ہوتے تھے اور ایسے افراد کو اُسی وقت بمصداق "قصۂ زمین برسرِ زمین" تعلیم اصلاح دینی لازمی اور مفید ہوتی تھی۔ اس لیے حضرت تھانویؒ غور وفکر کے لیے وقت نکالے بغیر بلا تامل اور فی الفور انھیں ٹوکتے اور اسی وقت تنقیح قائم کر کے اس کے جملہ مضرات ومفاسد اس

انداز سے بیان فرمادیتے کہ وہ کالنقش فی الحجر ہو جاتے ۔

ج ۔ وعظ و تقریر سے اگرچہ انسان اچھا اثر لیتا ہے۔ مگر وہ اتنا دیرپا نہیں ہوتا۔ جتنا اس طریق اصلاح کا ہوتا ہے۔ کیونکہ اس طرح ہر شخص کے ظاہری و باطنی حالات عین مشاہدہ میں آجاتے ہیں۔ جس سے نہ صرف معالج کو علاج کرنے میں آسانی رہتی ہے بلکہ مریض کو بھی معتدبہ فائدہ ہوتا ہے۔ جو کسی دُوسرے طریق سے ممکن نہیں ۔

اسی لیے حضرت تھانویؒ لوگوں کو ان کی درخواست پر سفر و حضر میں دُوسرے مشائخ کی طرح فی الفور بیعت نہیں فرماتے تھے بلکہ آپ فرمایا کرتے تھے کہ :۔

"جو اعتقاد محض وعظ سن کر پیدا ہُوا ہو۔ وہ معتبر نہیں کیونکہ وعظ میں تو اچھی اچھی باتیں کہی جاتی ہیں۔ اعتقاد وہ معتبر ہے۔ جو روزمرہ کے افعال و عادات دیکھنے کے بعد پیدا ہو۔ اور ان کا کماحقہٗ مشاہدہ معتقد فیہ کے متقل جائے قیام پر ہو سکتا ہے جس کو بیعت کا شوق ہو وہ میرے وطن میں آئے تاکہ جانبین کو ایک دُوسرے کی جانچ کا اطمینان سے موقع مل سکے۔ نیز اس سے طلب کا امتحان بھی ہو جائے گا۔ غرض امر بیعت میں ہرگز عجلت نہ چاہیئے۔ یہ گاجر مُولی کی بیع نہیں کہ پیسہ ڈالا اور جھٹ خرید لی "

حُسن

تقسیمِ قدرت

حق تعالیٰ کے انعامات کی تقسیم بدوں حکمت و مصلحت نہیں ہوتی ۔ وہ جسے جس انعام کا مستحق سمجھتا ہے اسے وہی عطا کرتا ہے۔ کِسی کو علم عطا کرتا ہے۔ کِسی کو حلم۔ کِسی کو جمال دیتا ہے۔ کِسی کو جلال اور کِسی کو کمال۔ کِسی کو ان ساری خوبیوں سے محروم رکھتا ہے اور کِسی

میں یہ ساری خوبیاں جمع کر دیتا ہے ۔ ذالك فضل الله يؤتيه من يشاء
ان خوبیوں کے خالق نے مولانا اشرف علی تھانویؒ کو صرف نام کا ہی اشرف بنا کر نہ بھیجا تھا بلکہ انھیں صفاتِ حسنہ میں بھی اشرف بنا دیا تھا ۔ جن میں سے بعض کی تجلیات آپ گذشتہ اوراق میں ملاحظہ فرما چکے ہیں ۔ اور بعض اس باب کی مناسبت سے درج ذیل کی جاتی ہیں ۔

حسنِ جمال

حضرت تھانویؒ کے حُسنِ جمال کے متعلق ایک مختلف المشرب بزرگ کے مرید باتمیز نقاد و فلسفی ایڈیٹر و ڈاڑیکٹر مولانا عبدالماجد دریا بادی اپنی " پہلی مُلاقات کے تاثرات " میں لکھتے ہیں کہ :۔

" سن ۔ لیکن خوشرو ۔ نظریں نیچی ۔ چال متین ۔ نورانی چہرہ ۔ نورانی داڑھی ۔ زیادہ سفید ۔ کچھ سیاہ اور شاید اسی نورانیت کی مناسبت لباس بھی خوب سفید براق ۔ سر پر نازک سی گول اکہری ٹوپی ۔ جسم پر لمبا کرتا ۔ نازک و نفیس غالباً تن زیب کا ۔ تاریکی ابھی کچھ باقی تھی اور ذرا فاصلہ بھی تھا ۔ نگاہ سے نگاہ ملنے کا کوئی موقع نہ تھا ۔ کہنا چاہیئے کہ صرف جھلک ہی دیکھنے میں آئی تھی ۔ اس پر بھی دل کشی ۔ رعنائی ۔ زیبائی ۔ بحیثیت مجموعی ایسی محسوس ہوئی کہ زبان نہ سہی ۔ دل بے اختیار آواز دے ہی اُٹھا ؏

قربان یک نگاہِ تو عمرِ درازِ ما ،

تاریکی میں فاصلہ سے صرف ایک جھلک میں رعنائی و زیبائی دیکھنے کے بعد دوسرا قریبی مشاہدہ یوں بیان کرتے ہیں کہ :۔

" حضرت اپنی خاص سہ دری میں ۔ درمیان میں شرقی غربی دیوار سے متصل ۔ ڈسک کے سامنے ایک مسند نما فرش پر تشریف فرما ۔ ہاتھ میں تسبیح ۔ ایک چھوٹی گھڑی سامنے ڈسک پر قلمدان وغیرہ کے ساتھ رکھی ہوئی

دوسری بڑی گھڑی (دھوپ گھڑی کے حساب سے) دیوار میں لگی ہوئی۔ داخلہ والے در پر حضرت کا نظام نامہ اوقات لگا ہوا - غافل انسان کو وقت کی قیمت اور اہمیت کا سبق دینے والا - بائیں طرف مولانا (حسین احمد صاحب) بٹھائے گئے اور اس کے بعد ہم :-

" بیٹھنے بٹھانے سب کے آداب قاعدے حضرت کی مجلس میں مقرر تھے۔ ہر چیز میں ترتیب اور ڈھنگ - ہر بات میں نظم و آہنگ خوب باتیں ہوئیں مخاطب روزنامہ " ہمدرد " کا ڈائریکٹر تھا - سیاسی پہلوؤں پر گفتگو آجانا ناگزیر سا تھا - گفتگو آئی - حضرت نے اتنی معقولیت سے کی کہ ساری بدگمانیاں کافور ہوگئیں "۔

" مولانا کی مرتب و منظم زندگی کا نظارہ پہلی بار ہوا - مکالمت پر شفقت نشست باوقار - عام مہمانوں - دوستوں - ملنے جلنے والوں کے حق میں تو آپ خلق مجسم تھے خشونت و تنگی کا شائبہ تک نہ تھا - ان کی راحت و سہولت کے ایسے ایسے جزئیات تک کی رعایت رکھتے - جہاں تک خود ان کی نظر بھی نہ پہنچ سکتی "۔

" کچھ دیر بعد حضرت نے اپنے دوسرے معمولات پورے کرنے کے لیے ہم لوگوں سے رخصت چاہی - اس التجا اور لجاجت کے لہجہ میں کہ گویا وہ چھوٹے ہیں اور ہم لوگ بڑے "۔

" یہ ہنستا ہوا چہرہ اور مسکراتا ہوا بشرہ کسی خشک مزاج کا ہو سکتا ہے ؟ کم و بیش ۱۵ سال اس منظر پر گذر چکے ہیں اور معلوم ہو رہا ہے - بات کل کی ہے - دماغ پر نقش اتنا گہرا اور دل پر تاثر اتنا زبردست کم ہی ہوتا ہے "۔

(حکیم الامت)

حسنِ جلال

آپ حد درجہ شفیق و رحیم تھے۔ مگر اس شفقت و رحمت کے باوجود عوام و خواص تو بجائے خود رہے۔ بڑے بڑے اربابِ علم و فضل آپ کے رعب اور ہیبت سے ڈرتے بلکہ لرزتے تھے۔ جس کی حقیقت دو لفظوں میں صرف اتنی تھی کہ آپ ہیبتِ حق کے مظہر تھے مولانا عبدالماجد دریابادی اور مولانا سید مناظر احسن گیلانی ہندوستان کے چوٹی کے محققین میں سے ہیں۔ جو تحقیق و تدقیق۔ تنقید و تنقیص۔ تردید اور تغلیط میں اپنا ثانی نہیں رکھتے۔ مگر جب یہ حضرات بھی اس صاحبِ تعلیم و تبلیغ کے سامنے جاتے۔ تو بس تسلیم و رضا کا مجسم بن جاتے چنانچہ یہ دونوں حضرات پہلی بار جب تھانہ بھون گئے اور شرفِ اشرف سے باریاب ہوئے تو ان پر کیا گزری اس کی کہانی خود ان کی زبانی ہی لطف دے گی۔

"حضرت ہم تینوں کو لیے ہوئے صحن مسجد سے چار قدم چل کر بیٹھے۔ سہ دری کے آگے والے سائبان کے نیچے جہاں سنتیں پڑھنے کا معمول تھا۔ میں اس مصلّے سے کوئی دو قدم ہٹ کر بیٹھا۔ اب اخلاق و التفات ہم تینوں سے فرداً فرداً شروع ہوا۔ اشفاق و الطاف کی تفصیل اب کہاں یاد۔ اتنا یاد ہے کہ بار بار فرماتے تھے۔ اچھی طرح بیٹھیے"۔ "کھل کر بیٹھیے"۔ یہاں ہیبت شروع سے دل میں بیٹھی ہوئی تھی۔ لطف و کرم کا ہر فقرہ اس کیفیت کی افراط میں اعتدال پیدا کرتا جاتا تھا۔ از خود بولنے اور کسی بات کے شروع کرنے کی ہمت بھلا کیا ہوتی۔ غنیمت یہی تھی کہ سوال کا جواب کسی طرح دیئے جاتا۔ ہونٹ خشک۔ زبان میں کچھ لکنت سی۔ رعب و ہیبت کی اس کیفیت کا تجربہ اپنی یاد میں دو ہی بار ہوا۔ ان میں پہلی بار تو یہی۔ اور دوبارہ دوسرے سال مجاہدِ اعظم حضرت شیخ احمد سنوسیؒ کے مواجہہ میں

مکہ معظمہ میں۔ ہیبت حق کا لفظ مثنوی کے اس شعر بھی عمر فاروق کی ذات کے سلسلہ میں نظر سے گذر چکا تھا ؂

ہیبت حق ست ایں از خلق نیست
ہیبت ایں مرد صاحب دلق نیست

ہیبت حق کے معنی جو کچھ تھوڑے بہت روشن ہوئے۔ وہ ان ہی دونوں موقعوں پر۔" (حکیم الامت صد ۱۹)

مولانا مناظر احسن گیلانی نے اپنے تاثرات ان الفاظ میں قلمبند کیے :۔

"دیو بند و تھانہ بھون میں حاضری ہوئی۔ تھانہ بھون کا حال کیا عرض کروں رات کو ۱۱ بجے پہنچا۔ ایک دوسری مسجد میں اترا۔ صبح بعد نماز اس پیر محبوب کے آگے آیا جو بہ ابن شیخوخت اپنے ہر ہر انداز میں صرف مظہر جمال تھا۔ عنایتوں کا عجیب و غریب سلسلہ آخر تک جاری رہا۔ بڑی بڑی مہربانیاں بڑی بڑی سرفرازیاں رہیں۔ کچھ علمی و قرآنی معاملات بھی پیش پڑے۔ فرط ادب نے حافظہ خراب کر دیا۔ بولنا چاہتا تھا۔ مگر نہ بولا گیا۔ پھر بھی کچھ تو پوچھ ہی لیا۔" (حکیم الامت صد ۴۰۹)

حضرت تھانوی کی نظر سے جب ان کا یہ تاثر گزرا۔ تو آپ نے اس پر حاشیہ لکھا کہ :۔

"وہ ایک بات لکھنا بھول گئے۔ وہ سب سے زیادہ مزہ دار ہے۔ وہ یہ کہ میں نے ان سے چلتے وقت تعریضاً عرض کیا تھا۔ کہ اب امید ہے کہ بھوت کا ڈر نکل گیا ہوگا یہ اشارہ ہے۔ ان کے اس والہانہ ارشاد کی طرف کہ جاتے ہوئے ڈر لگتا ہے۔"

یہی وہ حالات تھے۔ جنہوں نے مولانا دریا بادی جیسے فلسفی کو یہ کہنے پر مجبور

کر دیا کہ :-

"مصرعہ سنا ہوا ہزار مرتبہ کا تھا۔ "شنیدہ" اور "دیدہ" کے درمیان فرق کا درجہ اب بالکل واضح ہوا۔ رعب وہیبت کی کیفیات میں اب خاصہ فرق آگیا تھا اور حاضری کے بعد معلوم ہوگیا تھا کہ مولانا محض نور کے بنے ہوئے۔ اور تقدس کے سانچہ میں ڈھلے ہوئے کروبیوں میں نہیں۔ آب و گل سے ترکیب پائے ہوئے۔ انسانی دل بشری جذبات رکھنے والے انسان ہیں۔ بالمومنین رؤف رحیم کے سچے جانشین۔ ضرورت کے وقت اور مصلحت کے ماتحت جتنے بھی سخت اور سخت گیر ہو جائیں لیکن اپنی عام طینت وخلقت کے لحاظ سے رحماء بینھم کے مصداق ہیں۔ حاضری ہوتی تھی۔ عظمت وعقیدت کے جذبۂ بے پناہ کے ساتھ۔ واپسی ہوئی تو اس ذخیرہ میں ذرہ بھر کمی کے بغیر محبت کے عنصر کی آمیزش کے ساتھ بشر مثلکم میں مثلکم کی صراحت نوید رحمت سے کتنی لبریز اور جلوۂ شفقت کی کیسی آئینہ دار ہے۔" (حکیم الامت ص۲۴)

حسنِ قرأت

حضرت تھانویؒ کلام پاک کی تلاوت کے وقت لہجہ کی طرف قطعاً التفات نہ فرماتے تھے بلکہ مخارج کی صحت پر متوجہ رہتے تھے۔ مگر اس کے باوجود لہجہ میں ایک ایسی کشش تھی کہ سننے والے بے حد متاثر اور محظوظ ہوتے تھے۔ اور اہلِ دل پھڑک اٹھتے تھے۔ اس لیے ایک ماہر فلسفی نے متاثر ہو کر تجویز پیش کی تھی کہ حضرت کی قرأت کو گراموفون میں بھر لیا جائے چونکہ یہ شرعاً ناجائز تھا۔ اس لیے روک دیا گیا۔

پانی پت کے قاری دنیا میں مشہور ہیں۔ اور انھیں اپنی قرأت پر بجا طور پر ناز ہے۔ مگر جب حضرت تھانوی پانی پت تشریف لے گئے۔ تو وہاں کے قراءنے حضرت

کی صحت مخارج کی بہت تحسین فرمائی۔

ایک دفعہ لکھنؤ میں صبح کی نماز حضرت نے خود پڑھائی۔ اتفاق سے اس جماعت میں لکھنؤ کے مشہور و معروف مدرسۂ قرأت کے بانی مولانا عین القضاۃؒ بھی کھڑے تھے۔ صبح کی نماز میں حضرت خاص طور پر طویل قرأت کرتے تھے۔ جب مولانا نے نماز میں حضرت سے کلام پاک سُنا۔ تو بس قرأت کے عاشق ہو گئے اور بعد نماز حضرت سے خاص طور پر قرآن سُنانے کی درخواست کی۔ اس پر حضرت ان کی خدمت میں تشریف لے گئے اور پورے تین رکوع سُنا دیئے۔ تاکہ ان کا جی بھر جائے جی کیا بھرنا تھا۔ شہیدِ قرأت ہو کر رہ گئے۔ کہنے لگے "آپ قرآن کیا پڑھتے ہیں۔ ذبح کرتے ہیں" یہ آواز کی دلکشی کا اثر تھا۔ کہ طویل قیام میں بھی لوگ اکتا نہ جاتے تھے۔ بلکہ بعض رقیق القلب مقتدیوں پر تو شدت کے ساتھ نماز میں گریہ طاری ہو جاتا تھا۔ اسی لیے مولانا دریا بادی لکھتے ہیں :۔

" اس عامی محض کو اپنی عمر میں اتفاق ہندوستان۔ عرب و مصر کے اچھے اچھے قاریوں کے سُننے کا ہوا ہے۔ مشہور و غیر مشہور دونوں قسم کے۔ بعض باکمالوں کی داد بھی دل کھول کر دی ہے۔ بعض سے طبیعت متاثر بھی بہت ہوئی ہے لیکن اس درجہ مؤثر لہجہ۔ اتنے خوبصورت بول۔ شاید ہی کبھی کسی کے سُننے میں آئے ہوں۔ ہر لفظ یہ معلوم ہوتا تھا کہ سانچے میں ڈھلا ہوا نکل رہا ہے اور پھر سادہ و بے تکلف۔ کہیں سے شبہ بھی نہیں ہوتا تھا۔ کہ کوئی شخص فن کے قواعد کے لحاظ سے ادا کر رہا ہے۔ صاف یہی معلوم ہوتا تھا کہ قدرتی لہجہ اور طبعی لحن ہے۔ نماز کے طویل قیام میں مَیں بڑا کچا اور بودا ہوں یہ قرأتِ اشرفی کا اعجاز تھا کہ طویل قرأت سے بھی جی اکتاتا کیسا۔ جی یہی چاہتا ہے گا کہ ابھی اور سُنتے جایئے ادھر قرأت ختم ہوتی جاتی تھی۔ اور اِدھر حسرت باقی رہتی جاتی تھی " (حکیم الامت صہ ۱۶)

ایک مقام پر جہاں اہلِ نظر جمع تھے۔ حضرت نے صبح کی نماز پڑھائی۔ تو ایک صاحب کہنے لگے کہ:۔

"موسیقی کے قاعدہ سے آپ کی قرأت میں بھیرویں کی کیفیت تھی۔ جو صبح کی ایک سہاگنی راگنی کا نام ہے۔" (آثار جامعیت از سید سلیمان ندوی)

حسنِ اخلاص

حق تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ جو کوئی میری رضا جوئی کے لیے نیک کام کرنے کی تلقین کرتا ہے۔ تو میں اسے اجرِ عظیم دیتا ہوں اور مومن کا معاون ہوتا ہوں۔ یہ اجر و امداد دُنیا میں "از دل خیزد و بر دل ریزد" کی شکل میں نمودار ہوتی ہے۔ کہ حق تعالیٰ اپنے مخلص اور مومن بندوں کے کلام میں اثر و تاثیر پیدا کر دیتا ہے۔ جس سے دُوسرے فی الفور متاثر ہوتے ہیں۔ بخلاف اس کے جو لوگ محض ذاتی اغراض کے لیے ایسے کام کرتے ہیں۔ ان کی تحریر و تقریر مدلل ہونے کے باوجود بے اثر ہوتی ہے۔ حضرت تھانوی کے مواعظ حسنہ کے نتائج کو اگر جمع کیا جائے۔ تو ایسی ہزاروں مثالیں موجود ہیں کہ بڑے بڑے منکر۔ ملحد۔ فاسق۔ فاجر ہمیشہ کے لیے طالبِ مولیٰ اور تائب و تارکِ معاصی ہو گئے۔ ان کی ہدایت کا باعث صرف اس مردِ مومن کا اخلاص تھا جس نے اپنا دستور العمل بنا رکھا تھا کہ:۔

"جب میں کسی کو کچھ نصیحت کرتا ہوں۔ تو میں دل سے چاہا کرتا ہوں کہ یہ ایسا ہی ہو جائے۔"

حسنِ استدلال

پھر جہاں اخلاص کے ساتھ قوتِ استدلال بھی موجود ہو تو وہ سونے پر سہاگہ کا اثر کرتی ہے۔ حق تعالیٰ نے حضرت تھانوی کو دولتِ اخلاص کے ساتھ قوتِ استدلال بھی بخشی تھی کہ وہ اس کے ذریعہ مخالف کو موافق بنا لیتے تھے۔ یا کم از کم وہ مخالفت سے باز آ جاتا تھا۔ یا اپنی غلطی کا احساس کر لیتا تھا یا شرمندہ ہو جاتا تھا۔

متحدہ ہندوستان میں شملہ اختیار و اقتدار اور امارت و ثروت کا مرکز رہا ہے۔ نشہ اقتدار کی وجہ سے اِن میں سے اکثر تعلیم جدید اور نشۂ اقتدار کے اثر سے علماء کرام کو نفرت و حقارت کی نظر سے دیکھنے کے عادی تھے۔ بلکہ ان کی تضحیک کرنے سے بھی باز نہ آتے تھے۔

ایک مرتبہ چند علماء دیوبند شملہ تشریف لے گئے۔ بعض مخلصین نے ان حضرات سے وعظ کی فرمائش کی۔ ان میں حضرت مولانا انور شاہ رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت تھانوی بھی موجود تھے۔ حضرت شاہ صاحب سے "اعجاز قرآن" پر تقریر کرنے کی فرمائش کی گئی۔ اُدھر علمی مضمون اِدھر شاہ صاحب کا تبحر۔ ایسے دقیق مضامین بیان فرمائے۔ جو نو تعلیم یافتہ حضرات کی سمجھ میں نہ آسکے۔ حضرت شاہ صاحب کی تقریر کے بعد ان نافہموں نے اعتراض کیا کہ :۔

"مولانا کو یہاں تشریف لانے ہی کی کیا ضرورت تھی۔ مدرسہ دیوبند ہی میں بیٹھ کر علماء کے سامنے کیوں نہ وعظ کہہ لیا۔"

ان کا یہ تبصرہ کسی طرح حضرت تھانویؒ کے کان میں بھی جا پہنچا۔ دُوسرے وقت میں حضرت تھانویؒ کی باری تھی۔ جو مخالف کے قول سے استدلال کرنے میں مہارت تامہ رکھتے تھے۔ چنانچہ اُنھوں نے اپنی تقریر میں اس اعتراض کا حوالہ دیتے ہوئے فرمایا کہ:۔

"یہ اعتراض ہی لغو ہے۔ آپ لوگ خود اس کے ذمہ دار ہیں۔ کیونکہ مضمون ہی آپ نے ایسا دیا تھا۔ جو علمی تھا اور جس کو اتنا سہل نہیں کیا جا سکتا تھا کہ سب سمجھ سکیں اور جتنا سہل کیا جا سکتا تھا۔ اتنا بھی قصداً نہیں کیا گیا۔ کیونکہ اس میں ایک بڑی مصلحت تھی۔ ہمیں یہ بھی دکھلانا تھا کہ جب آپ علماء کے اردو کلام کو بھی نہیں سمجھ سکتے تو قرآن و حدیث کو کیا سمجھ سکتے ہیں اور ان سے مسائل مستنبط کرنا تو بڑی بات ہے اَب تو آپ کی سمجھ میں آ گیا ہوگا کہ امورِ دینیہ میں رائے زنی کرنے کے آپ صاحبان ہرگز اہل نہیں۔"

حسنِ اعتدال

اس عنوان کے ماتحت سلطان القلم مولانا سیّد مناظر احسن گیلانی کا وہ مضمون تبرکاً شامل کیا جاتا ہے۔ جس کا ذکر دیباچہ میں آچکا ہے۔

"افراط و تفریط سے ہٹ کر جس مسئلہ میں بھی زندگی کے جس شعبہ میں بھی آپ اعتدالی روش اختیار کریں گے۔ اچانک معلوم ہوگا۔ کہ آپ تنہا رہ گئے۔ اور آپ کے ساتھ کوئی باقی نہ رہا۔ وجہ اس کی ظاہر ہے۔ اکثریت عموماً نقطہ اعتدال سے ہٹ کر انحرافی زندگی بسر کر رہی ہے۔ ایسی صورت میں اعتدال پر قائم رہنے والوں کے ساتھ کوئی نہ ہو یا ہوں تو تھوڑے بہت آدمی ہوں۔ تعجب کی بات نہ ہوگی۔ آج کتنے ہیں۔ جو حکیم الامت قدس سرہٗ سے عقیدت رکھتے ہیں۔ لیکن مولانا کی طبیعت کا جو رنگ تھا۔ ذیل کی چند مثالوں سے اس کا اندازہ ہو سکتا ہے۔

۱۔ عام طور پر سمجھا جاتا ہے کہ مولانا ضوابط و قوانین کی پابندی سختی کے ساتھ کرتے تھے۔ جن لوگوں کے مزاج میں سختی ہے۔ اپنی سختیوں میں ہمیشہ وہ مولانا کے اسی اصول سے تسلی حاصل کرتے ہیں۔ خیال یہ کر لیا گیا ہے کہ رد رعایت کا مولانا کی فطرت میں کوئی عنصر نہ تھا۔ مگر یہ تو لوگوں نے سمجھا ہے۔ خود مولانا کا حال یہ تھا کہ آپ کی مجلس مبارک میں کبھی اِدھر اُدھر کی خبروں کا ذکر لوگ چھیڑ دیتے۔ بعض سختی پسندوں نے عرض کیا کہ حضرت کی مجلس اس قسم کی چیزوں کا تذکرہ کچھ مناسب نہیں معلوم ہوتا۔ یہ بھی کہا کہ بعضوں کو اس پر اعتراض بھی ہے کہ مشائخ اور صوفیہ کی مجلسوں میں حقائق و معارف کے سوا ادھر ادھر کی عام خبروں کا ذکر و اذکار اچھا نہیں معلوم ہوتا۔ مولانا نے فرمایا:۔

"کوئی میرے پاس آکر بات کرے اور میں مُنہ موڑوں تو اس کو صدمہ نہ ہوگا"۔
پھر اپنی معتدلی فطرت کے فطری مذاق کا اظہار ان الفاظ میں فرمایا :۔
"زائد از کار باتوں کی بُرائی میرے نزدیک دل شکنی سے کم ہے۔"
(کمالات اشرفیہ ص۳۷۱)

یہ آخری الفاظ مولانا تھانوی کے ہو سکتے ہیں۔ میں تو خیال کرتا ہوں کہ ان کو قریب سے دیکھنے والے بھی تھوڑی دیر کے لیے سوچ میں پڑجائیں گے۔ مگر کیا کیجئے کہ یہی واقعہ ہے۔ لوگ اس کا خیال نہیں کرتے کہ خود اعدل خلق اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا طریقہ عمل اس باب میں کیا تھا معمولی بڑھیا ہاتھ پکڑ کر دیر تک اپنی غیر ضروری باتوں میں مشغول رکھتی اور آپ ہنستے رہتے۔ کیا صحیح حدیثوں میں یہ نہیں آیا ہے۔ مولانا ہی فرمایا کرتے تھے کہ حضرت مولانا محمد قاسم رحمتہ اللہ علیہ کا بھی یہ مذاق تھا کہ ملنے والے جب تک بیٹھے رہتے۔ ان سے گفتگو کرتے رہتے۔ مقصود وہی تھا۔ اگر ایسا نہ کیا جائے تو بے رخی کا احساس دلوں میں پیدا ہوتا ہے۔ جو عموماً موجب دِل شکنی بن جاتا ہے۔ مجلسِ نبوی کی خصوصیت صحابہ کرام کیا بیان کرتے تھے۔

يضحك مما يضحكون ويتعجب مما يتعجبون

لوگ جن باتوں پر ہنستے آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) ان پر ہنستے۔ جن باتوں پر لوگ تعجب کرتے۔ آپ بھی تعجب فرماتے۔

دل شکنی ہی کا خیال تو تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مصافحہ کرنے والے کا ہاتھ خود نہیں چھوڑتے جب تک کہ وہی نہ چھوڑتا۔ کسی سے رُخ نہ پھیرتے۔ جب تک وہی نہ پھیر لیتا۔ خود حکیم الامت قدس سرہ اپنا ایک خواب بیان فرماتے تھے۔ کہ ملکہ وکٹوریہ جس زمانہ میں زندہ تھی۔ آپ نے خواب میں اس کو دیکھا۔ ایک ایسی گاڑی پر جس میں نہ گھوڑے ہیں۔ اور نہ آگ نظر آتی تھی (موٹر کار اس وقت تک ایجاد نہیں ہوئی تھی)

بہر حال خواب میں معلوم ہوا کہ ملکہ مولانا سے کہہ رہی ہے کہ اسلام ہی حق مذہب مجھے معلوم ہوتا ہے ۔ البتہ ایک شبہ مجھے ہوتا ہے کہ پیغمبر اسلام مذاق لوگوں سے کیوں کرتے تھے ۔ نبوّت تو بڑی چیز ہے ۔ عام تہذیب میں بھی اس کو اچھا نہیں سمجھا جاتا خواب ہی میں حضرت فرماتے ہیں کہ میں نے ملکہ سے کہا کہ لوگوں کو مانوس بنانا مقصود تھا ۔ ورنہ آپ کے رُعب کی وجہ سے لوگ کُھل کر آپ سے دل کی باتیں نہیں کہہ سکتے تھے ۔ ملکہ یہ جواب سُن کر مُطمئن ہو گئی ۔ دیکھا آپ نے مولانا کی نظر کہاں پہنچی ۔ بیداری میں نہیں ۔ خواب میں بھی دماغ وہیں پہنچتا تھا ۔ جہاں اس کو پہنچنا چاہیئے ۔

۲ ۔ عام طور پر مولانا کے جس مذاق کو لوگوں نے مشہور کیا تھا ۔ اس کے حساب سے آپ ہی بتایئے کہ اس سوال کا جواب یعنی ایک داڑھی منڈانے والے کے ساتھ لڑکی کا رشتہ کروں یا نہ کروں ۔ ایک صاحب نے یہ لکھتے ہوئے سوال کیا کہ داڑھی والے جو مِلتے ہیں ۔ تو دال روٹی کا ان کے یہاں اطمینان نہیں اور جہاں اس کی تھوڑی بہت اُمید ہے ۔ وہاں خرابی یہ ہے کہ داڑھی منڈانے والے لڑکے مِلتے ہیں مولانا کے مذاق شناسی کے مدعی خود سوچیں کہ اس کا وہ کیا جواب دیں گے ۔ مگر سنیئے مولانا نے کیا جواب دیا :-

" میرا خیال ہے کہ اس زمانہ میں پُوری دینداری داڑھی والوں میں بھی نہیں پس ایک داڑھی منڈانے کا گناہ کر رہا ہے ۔ دُوسرا شہوت پرستی کا گناہ کر رہا ہے ۔ تو نری داڑھی لے کر کیا کریں گے ۔" (کمالات اشرفیہ ص ۲۳۹)

حقیقت یہ ہے کہ مولانا نے بڑے نکتے کی طرف اس میں اشارہ فرمایا ہے ۔ لوگوں نے خاص خاص گناہوں کو پکڑ لیا ہے ۔ گویا گنہگار ہونے یا نہ ہونے کا معیار بس صرف وہی ہے ۔ ان ہی گناہوں میں ایک داڑھی بھی ہے ۔ ایک شخص غیبت کرتا ہے ۔ بدنظر ہے امرد پرست ہے ۔ لیکن لمبی داڑھی رکھتا ہے ۔ اس پر لوگوں کو کوئی اعتراض نہیں ہوتا

اور ایک بے چارہ ان عیوب سے بری ہے صرف داڑھی منڈانے کا گناہ کرتا ہے تو سمجھا جاتا ہے کہ داڑھی والے صاحب سے اس داڑھی منڈنے کو کیا نسبت! داڑھی والوں کے گناہ کیا اس سے کم ہیں؟ پھر ایک داڑھی پر اتنا زور کیوں دیا جاتا ہے۔ مولانا نے صحیح فرمایا ہے کہ داڑھی منڈانے کے سوا اور باتیں اگر لڑکے میں اچھی ہوں تو اس کو گوارا کر لیا جائے بلکہ اس برتاؤ سے اغلب ہے کہ داڑھی کا مسئلہ بھی اس کی سمجھ میں آجاوے گا۔ ورنہ جو طریقہ لوگوں نے داڑھی کے ساتھ اختیار کر رکھا ہے۔ میں دیکھتا ہوں کہ منڈانے والوں کی جرأتوں کو اس طریقہ سے اور بڑھا دیا ہے۔

۳۔ مولانا چونکہ خود مولوی تھے۔ اس لیے مولویوں کا خیال ہوگا کہ انگریزی تعلیمیافتوں پر ضرور مولویوں کو ترجیح دیتے ہوں گے اور اس میں شک نہیں کہ عربی خواں مولویوں کا مولانا خاص طور پر احترام فرمایا کرتے تھے۔ مگر ایک دفعہ آپ نے فرمایا کہ انگریزی دانوں میں اور جتنی باتیں بھی ہوں۔ لیکن

"ان کی گفتگو میں مزہ آتا ہے۔ کیونکہ یہ سمجھ میں آنے سے مان لیتے ہیں"

(کمالاتِ اشرفیہ صـ ۳۲۹)

لیکن مولویوں کے اس طریقہ کو کہ جو بات منہ سے نکل گئی۔ اس کی پچ نکالتے چلے جاتے ہیں سخت ناپسند فرماتے تھے۔ مولوی عبدالحق صاحب کا فقرہ "اڑیل ٹٹو" بھی اس قسم کے مولویوں کے متعلق نقل فرمایا اور کہا کہ "جمود و اصرار بڑی چیز ہے"۔ پھر حکمت کی بات یہ فرمائی کہ غلطی پر اصرار آدمی کو لوگوں کی نگاہوں میں ذلیل کر دیتا ہے۔ لوگ اس شخص کی تعریف کرتے ہیں۔ جو اپنی غلطیاں مان لیتا ہے۔

۴۔ اور انگریزی خواں بے چارے تو بہر حال مسلمان ہی ہوتے ہیں۔ اسلامی گھرانے میں پیدا ہوتے ہیں۔ غیر مذاہب کے لوگوں سے ملنے جلنے کا طریقہ کیا تھا۔ اس قصے سے اس کا اندازہ ہوتا ہے کہ جب اعظم گڑھ تشریف لے گئے تھے۔ راستہ

میں کسی سکول کے سامنے سے گزر ہوا۔ جہاں زیادہ تر ہندو اساتذہ تھے۔ مولانا نے فرمایا کہ مجھے گزرتا دیکھ کر سارے ہندو اساتذہ اور طلبہ بھی تعظیماً اُٹھ کھڑے ہوئے۔ اس حال کو دیکھ کر مولانا فرماتے ہیں کہ :۔

"میں وہاں رُکا اور ان سب سے مِلا۔ لوگوں سے میں نے مصافحے کیے۔"

پھر خصوصیت کے ساتھ ارشاد ہوا کہ :۔

"ایک ایک سے مِلا حتیٰ کہ ہندوؤں سے بھی اور مزاج پُرسی کی۔"

(کمالات اشرفیہ ص۳۲۷)

آپ کو معلوم ہوا کہ مولویوں کا عام قاعدہ ہے کہ اس مدرسہ کے سامنے سے جب گزرتے ہیں۔ تو جیسے حضرت کے ساتھ مدرسہ والوں نے برتاؤ کیا تھا۔ اسی برتاؤ کے ساتھ پیش آتے ہیں۔ تو عام طور پر مولوی لوگ ان ہندوؤں کی طرف متوجہ ہونا اپنی شان کے خلاف تصور کرتے ہیں تو حضرت نے اس تنگدل ملا کا ذکر کیا۔ جس کے وعظ میں ایک غیر مذہب کا آدمی جو شاید ہندو ہی تھا۔ شریک ہو گیا تھا۔ مجلس میں ہندو کو دیکھ کر ملا صاحب آپے سے باہر ہو گئے۔ گرجنے لگے کہ نکالو۔ اس کافر مردود کو۔" (ص۳۷۷)

۵۔ بعض خاص نوعیت کے مسائل کے متعلق مشہور کر دیا گیا ہے کہ دیوبند کی طرف منسوب ہونے والے علماء کا ان مسائل میں یہ خیال ہے۔ حتیٰ کہ بے جانے بھی لوگ سمجھ جاتے ہیں کہ دیوبندی مولوی اس کا یہ جواب دے گا۔ مثلاً یہ سوال کہ یا رسول اللہ کے کہنے کا مسلمانوں میں عام رواج جو پایا جاتا ہے۔ دیوبندی مولوی اس کو کبھی جائز نہیں کہہ سکتا۔ مگر سُنیئے، دیوبندیوں کے پیشوا کا کیا خیال تھا۔ فرمایا کہ :۔

"شوقاً والتذاذاً ماذون فیہ ہے۔" (کمالات ص۰)

یعنی پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مسلمانوں کے قلوب کا جو اشتیاقی تعلق ہے۔ اس تعلق کا اظہار یا رسول اللہ سے کوئی اگر کرتا ہو۔ یا۔ یا رسول اللہ کہنے میں اس کو لذت

ملتی ہو۔ تو مولانا ایسی صورت میں "یا رسول اللہ" کہنے کی اجازت دیتے تھے۔ البتہ استعانۃ و استفاضۃ فرمایا کہ جائز نہ ہوگا۔

ایسے سینکڑوں مسائل اور امور ہیں جن کے متعلق لوگوں کے عام خیالات اور توقعات کے قطعاً مخالف چیزیں مولانا کے کلام میں ملتی ہیں۔ ضرورت ہے کہ ان چیزوں کو قابو کیا جائے غلط فہمیوں کے ازالہ کے سوا خود مولانا کے عقیدت مندوں کے بہت سے غلط خیالات کی اس سلسلہ سے جہاں تک میں سمجھتا ہوں۔ اصلاح ہو سکتی ہے۔

افسوس کہ مولانا کی زندگی کے بہت سے گوشے جب تک زندہ رہے۔ نہایت اخفار کی وجہ سے پوشیدہ رہے۔ خیال تو کیجئے۔ آج ہندوستان کے سب سے بڑے مہاتما کا یہ کمال سمجھا جاتا ہے کہ "دلی کی بھنگی بستی" میں آکر ٹھہرتے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ جس قوم میں تاریخ کے نامعلوم زمانے سے "چھوت چھات یا لامساسیت کا عارضہ پھیلا ہو۔ اس قوم کو بھنگیوں کی بستی میں بلوانا اور پوجا پاٹ میں ان کو شریک کرانا ہے بڑا کمال۔ لیکن اس کمال میں اس سے نقص پیدا ہو جاتا ہے کہ ساری دنیا میں اس کا ڈھنڈورا پیٹا جا رہا ہے۔ اور اس سے بھی گہری بات وہ ہے۔ جس کی طرف امام غزالیؒ نے لباس کی بحث میں اشارہ کیا ہے کہ نمائش صرف اچھے کپڑوں ہی کے پہننے میں نہیں ہے۔ بلکہ اس سے بھی بڑی ریاکاری یہ ہے کہ پھٹے پرانے گوڈر اور پیوند در پیوند لگے ہوئے کپڑے کے ساتھ اپنے آپ کو اتنا مقید کر دیا جائے کہ جب تک وہ نہ ملیں کپڑے ہی نہیں پہنیں گے۔ اسی طرح یہ ضد کہ اتروں گا تو بھنگیوں ہی کی بستی میں اتروں گا۔ مجھے تو اس میں بھی بجائے بڑائی کے کچھ اس قسم کی بات نظر آتی ہے۔ جو عموماً چھوٹے لوگوں میں پائی جاتی ہے۔ آخر آپ اس شخص کو کیا کہیں گے۔ جس نے التزام کر لیا ہو کہ کھاؤں گا تو جو ہی کی روٹی کھاؤں گا۔ قورمہ اور پلاؤ پر اصرار کرنے والوں میں اور اس جو کی روٹی میں اپنی غذا کو منحصر کرنے والوں میں کیا فرق ہے۔

خیر! دُوسروں سے مجھے کیا بحث!! مَیں تو مولانا کے متعلق عرض کر رہا تھا۔ خود ہی فرماتے تھے کہ میرے بھائی اکبر علی نے مجھ سے ایک دن کہا کہ اب تمہارا شمار ہندوستان کے بڑے آدمیوں میں ہے۔ اس لیے چاہیئے کہ سفر کم از کم سیکنڈ کلاس میں کیا کرو۔ حضرت فرماتے ہیں کہ ان کے اس مشورہ کو سُن کر میں نے عرض کیا:۔

"کیا کروں۔ میری طبیعت کے خلاف ہے۔ مَیں ریل میں گنواروں اور بھنگی چماروں کے ساتھ بیٹھتا ہوں۔" (کمالات ص ۳۷۵)

اسی طرح آج عام انسانی ہمدردی کا دُنیا میں کِتنا چرچا ہے۔ لیکن مولانا نے خود اپنا حصّہ جو یہ بیان کیا ہے کہ بہاولپور گیا ہوا تھا۔ گرمی سخت تھی۔ جیل خانے کے قیدیوں کو پنکھا کھینچنے کے لیے بلایا گیا۔ مولانا فرماتے ہیں کہ پہلے یہی بات مجھے ناگوار ہُوئی اور چاہا کہ ان کو واپس کر دُوں لیکن اس کے ساتھ یہ خیال بھی آیا کہ جیل کی زندگی سے ان بے چاروں کو تھوڑی دیر کے لیے اس ذریعہ سے رہائی تو مل جاتی ہے۔ یہ سوچ کر واپس کر دینے کا خیال تو دل سے نکال دیا انتظار کرتا رہا۔ جب سب لوگ چلے گئے۔ تو مَیں نے ان قیدیوں سے کہا کہ:۔

"پنکھا بند کر دو۔ پھر جی چاہے سو رہو یا بیٹھے رہو۔ کیونکہ بیگار لینا جائز نہیں۔"

فرمایا کہ:۔

"کھانا آیا تو ان قیدیوں کو کھانا دلوایا۔ پھر تو ہر قیدی اس کی خواہش کرتا تھا کہ مَیں بلایا جاؤں۔"

حُسنِ تاثیر

جہاں اخلاص۔ استدلال۔ اعتدال موجود ہو۔ وہاں اثر و تاثیر بھی لازمی ہے۔ جس کا اندازہ حضرت کے مطبوعہ مواعظ سے بخُوبی لگایا جاسکتا ہے۔ جن کو پڑھ کر لوگ اصلاح پذیر

ہو رہے تھے اور آئے دن بکثرت اس امر کے حضرت کو خطوط موصول ہوتے رہتے تھے۔ کہ مطبوعہ مواعظ کے مطالعہ سے بے حد نفع ہُوا اور بالکل کایا پلٹ گئی۔ چنانچہ خود صاحب اشرف السوانح کسی زمانہ میں بڑے "اپ ٹو ڈیٹ جنٹلمین" تھے۔ اپنے مشاہدہ کی بنا پر لکھتے ہیں کہ :-

"سینکڑوں انگریزی داں جو دین سے بالکل آزاد اور فیشن کے بے حد دلدادہ تھے مطالعہ مواعظ کی برکت سے پکے دیندار اور پُورے مُلّا بن گئے۔ نہ کوٹ پتلون رہا۔ نہ تصویر دار کمرہ رہا۔ نہ کرزن فیشن رہا۔ ایسے بہت سے حضرات کو خود احقر بھی جانتا ہے جو کسی زمانہ میں سرتاپا انگریزی فیشن میں رہتے تھے اور ملحدانہ عقائد رکھتے تھے لیکن اتفاق سے حضرت والا کے مجازِ طریقت ہو گئے۔"

حسنِ تسخیر

جس کی زبان فیض ترجمان میں حق تعالیٰ اثر و تاثیر رکھ دے اس سے قلوب کا مسخر ہونا لازمی امر ہے۔ حضرت تھانویؒ جس کسی سے بھی التفات کے ساتھ دو باتیں فرماتے اسے اپنا گرویدہ بنا لیتے۔ یہاں تک کہ غیر مذہب والوں کو بھی حضرت کی جانب بے اختیار میلان اور کشش ہوتی رہتی جس کے صدہا واقعات موجود ہیں۔ کانپور میں تو محبوبیت کا یہ عالم تھا کہ بعض ثقہ لوگوں کو بھی یہ شبہ ہو گیا تھا کہ حضرت کو کوئی تسخیر کا عمل آتا ہے۔ چنانچہ خانوادہ نقشبندیہ کے بطلِ جلیل مولانا شاہ فضل الرحمٰن صاحب گنج مرادآبادی کے ایک مرید کو اس بات پر اصرار تھا کہ مولانا گنج مرادآبادی اور حضرت تھانویؒ کے پاس کوئی تسخیر کا عمل ہے۔ جبھی تو دونوں کی طرف ایک دنیا کھنچی چلی آتی ہے۔ وہ حضرت کے زبردست سر ہوئے کہ ہمیں بھی وہ عمل بتا دیجئے۔ حضرت تھانویؒ نے ہر چند انکار کیا۔ بلکہ قسم بھی کھائی کہ مجھ کو تسخیر کا کوئی عمل نہیں آتا۔ محض خدا کا فضل ہے کہ لوگوں کے دلوں

میں میری محبت ڈال دی ہے لیکن ان کی تسلی نہ ہوئی۔

اسی کانپور میں ایک بہت بوڑھے و بنگ پٹھان ہنر برخاں نامی رہتے تھے۔ جن کو شہر میں بڑی وجاہت حاصل تھی۔ پہلے خود رئیس تھے اب ایک رئیس کے کارندہ تھے۔ مگر آن بان وہی تھی۔ ہر ایک کو ڈانٹ ڈپٹ لیتے تھے۔ ایک بار "عشرۂ محرم" میں حضرت کو "نصیحت" کرنے آئے کہ :-

"یہاں کانپور میں شاہ سلامت اللہ صاحب کا دستور تھا کہ اسی عشرہ میں شہادت نامہ پڑھا کرتے تھے۔ آپ بھی پڑھیں۔ اگر آپ نہ پڑھیں گے۔ تو لوگوں کو بدگمانی ہوگی کہ یہ اس کے منکر ہیں"

حضرت نے فرمایا :-

"یہ تشبہ بالروافض کی بناء پر ناجائز ہے"

اس پر وہ بگڑ کر کہنے لگے :-

"افسوس ہے ہم تو نفع اور مصلحت کی بات بتاتے ہیں اور اس کو بھی نہیں مانا جاتا"

حضرت نے خود جواب دیا کہ :-

"افسوس ہے جو بے علم ہیں۔ وہ بھی آج کل اہلِ علم کو مشورہ دینے لگے ہیں کہ ہم سے پوچھ پوچھ کر دین کے کام کیا کرو"

اس پر وہ خفا ہو کر چل دیئے کہ اچھا ہے نہ مانئے۔ تھوڑی دور جا کر پھر لوٹے اور کہا کہ :-

"بڑی مشکل ہے۔ ہماری بات بھی نہیں مانتے اور اب ہم جانا چاہتے ہیں۔ تو جانے بھی نہیں دیتے۔ قدم ہی نہیں اٹھتے۔ نہ جانے کیا کر دیا"

انھوں نے حضرت سے معافی چاہی۔ جب معاف کرا لیا۔ تب اطمینان کے ساتھ واپس لوٹے۔

حُسنِ تقریر

وعظ و تقریر میں حضرت تھانویؒ اپنی نظیر نہ رکھتے تھے۔ عام واعظوں کی طرح آپ پہلے سے کسی مضمون کو تیار کر کے نہ آتے تھے۔ بلکہ اس موقع پر حق تعالیٰ کی طرف سے جو کچھ القاء ہوتا۔ اس پر بدوں تیاری بولنا شروع کر دیتے اور نہ عام واعظوں کی طرح یہ حالت تھی کہ بلا لحاظ اصل مضمون جو کچھ ذہن میں آتا گیا۔ بلا ترتیب بیان کرتے چلے گئے اور جہاں چاہا ختم کر دیا۔ جبکہ آپ کی تقریر ایسی فصیح و بلیغ، شستہ و برجستہ اور جامع و مانع الفاظ کا مرقع ہوتی کہ سننے والے :۔

"ایسا محسوس کرتے جیسے کوئی زبردست محقق اور جید عالم نے نہایت فرصت میں اور نہایت غور و خوض کے ساتھ کسی ایک ہی خاص دقیق اور مفید علمی و عملی مضمون پر نہایت مبسوط اور مربوط جامع و مانع مقالہ تصنیف کیا ہے اور وہی پڑھ کر سنا رہا ہے۔"

تقریر میں اس درجہ روانی ہوتی کہ کوئی کتنا ہی زود نویس کیوں نہ ہو۔ اس کو لفظ بہ لفظ قلمبند کر ہی نہ سکتا۔ چنانچہ ایک صاحب کو فن مختصر نویسی کی تعلیم دلائی گئی تھی تاکہ مواعظ بالفاظہا ضبط کیے جا سکیں۔ لیکن وہ اس میں کامیاب نہ ہو سکے۔ اس لیے مولانا حکیم محمد مصطفےٰ جو حضرت کے شاگردانِ رشید میں سے تھے۔ حضرت کی تقاریر کے عربی میں بطور مختصر نویس نوٹ لیتے تھے اور پھر اسے اردو کا جامہ پہنا کر حضرت سے تصحیح کراتے تھے۔

پھر بڑے بڑے زبان دانوں کو جن میں ایک بڑے شاعر اور غالب کے شاگرد بھی تھے بہ حیرت یہ کہتے سنا گیا تھا کہ :۔

"یہ الفاظ مولانا کو نہ جانے کہاں سے ہل جاتے ہیں۔"

اور کانپور کے ایک وکیل صاحب سے تو نہ رہا گیا اور وہ تقریر کے بعد وفورِ جوش سے

الفاظ میں حضرت سے مخاطب ہوئے ؂

تو مکمل از کمالِ کیستی　　　تو منور از جمالِ کیستی

حضرت نے اس کو نقل کر کے فرمایا کہ :-

"میرے بھی جی میں تو آیا تھا کہ اس کے جواب میں یہ کہہ دوں ؂

من مکمل از کمالِ حاجیم　　　من منور از جمال حاجیم

لیکن شرم آئی کہ کیوں خواہ مخواہ کمال اور جمال کا دعویٰ کروں۔"

حُسنِ تحریر

حضرت تھانویؒ کو حق تعالےٰ نے ایسی قوت بیانیہ عطا فرمائی تھی کہ آپ کی نثر بھی بسا اوقات نظم کا لطف دیتی تھی۔ جس کے چند نمونے درج ذیل ہیں۔

۱۔ جن کے دُوہرے بار میرے ذمہ ہیں۔ یعنی اصلاح و تربیت وغیرہ۔ ان کا یہ فعل بار میں اضافہ کر دیتا ہے اور جن کا کوئی بار ہی نہیں۔ ان کا بار بار ایسا کرنا بھی بار نہیں اور اس لطافت کے ساتھ تو اہلِ بار کا بھی بار نہیں رہتا۔ اور آپ تو اس قاعدے سے مستثنیٰ ہیں۔"

۲۔ آپ کے اس لطف سے مجھ کو لطف ہوا اور اس لطف میں یہ دُعا کی کہ اللہ تعالیٰ آپ کے اس لطف کو باقی رکھے اور اس بقا کی شرائط میں سے عدم سوال بھی ہے۔ اسی میں علاوہ لطف کے تعب کی بھی کمی ہے۔ متکلم کو بھی مخاطب کو بھی۔

تین سطروں میں "بار" اور "لطف" کے بار بار کے استعمال نے ثقالت سے زیادہ لطافت پیدا کر دی ہے۔

۳۔ مولانا عبد الماجد دریا بادی نے اپنے ایک خواب کو سات سطروں میں ختم کیا جو اپنے جامع و مانع طرزِ تحریر میں اپنا ثانی نہیں رکھتے۔ ان سات

سطروں کا جواب حضرت نے پانچ لفظوں میں بالکل شاعرانہ انداز میں دیا کہ

"مبارک! زیارت بھی۔ استفادہ بھی۔ حیرت بھی۔ معرفت بھی۔"

بچی کی صحت کی اطلاع پر انہیں تحریر فرماتے ہیں۔

"مبارک! مجھ کو اس وقت تین خوشیاں ہیں۔ بچی کی صحت کی۔ آپ کی طمانیت کی۔ گھر بیں کی جمعیت کی۔"

۴۔ ایک اور خط کے جواب میں انہیں لکھتے ہیں:۔

"اگر یہی طرز رہا۔ تو دیکھنے والے پر زیادہ تعب ہوگا۔ جس کا شاید کوئی متحمل نہ ہو سکے۔ بعض کم فرصتی کے سبب۔ بعض کم ہمتی کے سبب۔"

اس (کام) کی واقعی سخت ضرورت ہے۔ اور یہ کام ایسا ہوگا کہ قیامت تک امت آپ کی منت کش اور یہ کوشش آپ کے لیے جنت کش ہوگی۔"

۵۔ ایک اور خط کا جواب یوں دیتے ہیں:۔

"انتظار تو اسی کا تھا۔ مگر اس سے یاس تھا۔ اس لیے اس کا پاس نہیں کیا۔"

۶۔ "مجھ کو تو خط ہوتا ہے اور بدول اتنی بیباکی کے بحث کی بیباکی کے بحث کی بیباقی نہیں ہوتی۔"

غرضیکہ حضرت کی تصنیفات و تالیفات۔ مواعظ و مضامین اور ملفوظات و مکتوبات کے بحر بے پایاں میں ایسے گہر ہائے سخن اتنی فراوانی سے بکھرے نظر آتے ہیں کہ جو بھی چاہے بلا قیمت دامن تصنیف بھر لے۔ یہی وجہ تھی کہ ایک پرانے بزرگ شاعر حضرت کے مطبوعہ مواعظ کے لطیف مضامین سن کر صاحب اشرف السوانح سے فرمانے لگے:۔

"مولانا تو نثر میں نظم کا لطف پیدا کر دیتے ہیں۔ گویا نثر میں شعر فرمانے لگے۔"

نیز حضرت کی تحریر میں ایک یہ خوبی بھی تھی کہ وہ جگہ کم گھیرتی تھی اور پھر صاف

پڑھی جاتی تھی۔ آپ نے ۲ فروری ۱۹۴۳ء کو مولانا عبدالماجد صاحب کے نام ایک جوابی کارڈ روانہ فرمایا۔ اس کارڈ کے ایک رُخ پر حسب ذیل مضمون نہایت خوبصورتی کے ساتھ سمایا ہوا تھا۔

"مکرمی دام حبہم وعرفانہم

السّلام علیکم۔ محبت نامہ نے محبت کا ممنون اور تلقیب (مرشد، محقق، مفسر، عارف) سے بے حد خجل فرمایا۔ مَیں بے تکلف اپنے لیے ایک لقب جس میں نہ تواضع ہے نہ ترفع۔ خود تجویز کرتا ہوں۔ یعنی مُولف تھانوی۔ اگر سب جگہ یہی بدل دیا جائے۔ تو اس سے بھی ممنون ہُوں۔ ورنہ ہمیشہ کے لیے آنکھ اونچی نہ ہوگی۔

صلاحِ کار کجا و منِ خراب کجا

باقی مناجات مقبول کے متعلق جو کلمات اُس کے امتیاز کے تحریر فرمائے ہیں۔ وہ ادعیہ کے مادہ اور ترتیب کے اعتبار سے بالکل صحیح ہیں۔ مگر میرا اس میں کیا دخل۔ اس کے جو دو ماخذ ہیں، حصن حصین اور حزب الاعظم یہ سب ان کے جامع کا کمال ہے۔ باقی میرا درجہ تو صرف اتنا ہے ؎

چو سوسن بر سرِ دکان روستا خرسند

مگر جب آپ کے حسنِ ظن کی دولت اس کی بدولت حاصل ہُوئی۔ اس لیے اس کو فالِ نیک سمجھوں گا اور درخواست کروں گا کہ میرے حالِ مقیم پر اس طرح ہمیشہ توجہ رہے۔ زیادہ کیا عرض کروں۔"

(حکیم الامت صہ ۵۹۸)

حُسنِ تقریظ

کسی غیر اختلافی مسئلہ کو خوش اسلوبی سے بیان کر دینا اتنی بڑی بات نہیں۔ جتنی اختلافی مسئلہ کو اس طرح بیان کرنا کہ اختلاف بھی ظاہر ہو جائے۔ تبلیغاً اس کی اہمیت بھی مخالف پر واضح ہو جائے اور مخالف کی طبیعت بار بھی محسوس نہ کرے اور حُسنِ ظن کا پہلو بھی نمایاں رہے۔ اس میں حضرت تھانوی کو خصوصیت حاصل تھی۔ اس کا اندازہ مندرجہ ذیل طریق تقریظ سے لگایا جا سکتا ہے۔ جو آپ نے ۵ رمضان المبارک ۱۳۵۳ھ کو اپنے ایک محترم پیر بھائی حضرت شیخ الاسلام مولانا انوار اللہ خاں فضیلت جنگ علیہ الرحمتہ استاد نظام دکن کی سوانح حیات مسمیٰ بہ مطلع الانوار مصنفہ علامہ مفتی محمد رکن الدینؒ پر حسب درخواست ابوالخیر نظامیہ تحریر فرمائی۔ آپ نے تحریر فرمایا کہ:۔

"جستہ جستہ مطلع الانوار سے منوّر ہوا۔ حضرت مولانا میرے پیر بھائی تھے۔ بڑے ہونے کی حیثیت سے مجھ پر ادب لازم ہے اور بھائی ہونے کی حیثیت سے بے تکلفی کی بھی اجازت ہے۔ ان ہی دو حیثیتوں کو پیشِ نظر رکھ کر یہ رائے ظاہر کرتا ہوں جو کہ جامع ہے۔ ادب و بے تکلفی کی کہ رسالہ قابلِ اسوۂ حسنہ بنانے کے ہے۔ مگر اعمال و مسائل اختلافیہ کے حصہ کا اس اتخاذ اسوہ سے استثنار رائے کے درجہ میں بعض کے لیے، اور عمل کے درجہ میں سب کے لیے، اقرب الی الاحتیاط ہے عجب نہیں۔ اگر حضرتؒ بھی اس معروضہ پر مطلع ہوتے، تو اگر مجھ کو ماجور بھی نہ خیال فرماتے تب بھی مازور بھی نہ سمجھتے، بلکہ معذور قرار دیتے۔ باقی حضرتؒ کے لیے اور حضرت کی تمام جماعت کے لیے دل سے اور خلوص سے دُعا کرتا ہوں۔ اَللّٰھُمَّ کُنْ لَھُمْ وَاجْعَلْھُمْ لَکَ اور اپنے لیے بھی اس دُعا کا طالب ہوں۔"

حُسنِ تفہیم

مولانا شاہ محمد حسینؒ الہ آبادی حضرت تھانویؒ کے پیر بھائی تھے۔ مگر وہ مسائل اجتہادیہ مثلاً سماع وغیرہ میں حضرت سے اختلاف رکھتے تھے اور حضرت تھانویؒ حق بات کہنے میں کہیں بھی نہ ٹلتے تھے، خواہ وہ کتنے درجہ کا بھی بزرگ کیوں نہ ہو۔ مگر اختلافی مسئلہ کی اہمیت کو ذہن نشین کرانے کے لیے ہمیشہ ایسا لطیف اور متواضعانہ پیرایہ اختیار کرتے تھے کہ جس سے مخالف پر گرانی نہ ہوتی تھی۔ ایک دفعہ مولانا ممدوح نے ازراہِ بے تکلفی حضرت سے فرمایا کہ آپ کبھی رودولی شریف تشریف نہیں لاتے۔ حضرت نے فوراً فرمایا کہ آپ کبھی لے ہی نہیں جاتے۔ فرمایا میں تو کہہ رہا ہوں، چلیے۔ حضرت تھانویؒ نے جواب دیا کہ :۔

"حضرت توجہ فرما کر مجھ میں اہلیت تو سماع کی پہلے پیدا فرمادیں اور اپنا سا بنادیں۔ تاکہ میں بھی شرکت کا اہل ہو جاؤں۔ درحقیقت لے چلنا تو یہ ہے"

حسنِ تدبیر

مولانا خلیل احمد سہارنپوریؒ آپ کے روحانی بزرگوں میں سے تھے جو مولانا گنگوہیؒ کے خلیفۂ اعظم تھے۔ جن کے متعلق حضرت نے ایک رسالہ "خوانِ خلیل" بھی تصنیف فرما کر شائع کیا تھا۔ جس میں ان کے خصائلِ حمیدہ درج تھے۔ انھیں حضرت تھانویؒ سے ازحد محبت تھی اور حضرت کو ان سے بے حد عقیدت تھی۔ حضرت انھیں اپنی طرف زیادہ متوجہ کرنا چاہتے تھے مگر زبانی کہنا خلافِ ادب سمجھتے تھے۔ اس لیے آپ نے اس کی ایک عجیب ترکیب نکالی۔ جس کا "خوانِ خلیل" میں خود ان الفاظ میں ذکر فرمایا ہے کہ حضرت مولانا خلیل احمد صاحبؒ :۔

"گاہ گاہ غریب خانہ کو بھی اپنے اقدام سے مشرف فرماتے تھے۔ مجھ کو یاد ہے کہ غالباً جب اوّل بار تشریف آوری ہوئی تو احقر نے جوشِ محبت میں کسی قدر تکلف بھی کیا اور اہلِ قصبہ میں سے بھی بعض عمائد کو مدعو کر

دیا۔ کہ عرفاً یہ بھی معزز ضیف کا اکرام ہے (ان بعض عمائد نے میری اس خدمت کا یہ حق ادا کیا کہ بعد جلسہ دعوت کے مجھ کو بدنام کیا کہ طالب علم ہو کر اتنا تکلف کیا۔ پانچ چھ کھانوں والوں کے سامنے بہتر یا باسٹھ برتن تھے میں عدد بھول گیا۔ کہ کونسا فرمایا تھا۔ اس روایت سے قبل مجھ کو تکلف کی مقدار کی طرف التفات بھی نہ ہوا تھا) مولانا نے مزاحاً فرمایا کہ یہ تکلف کیوں کیا گیا۔ میں نے عرض کیا کہ اس کا سبب خود حضرت ہی ہیں۔ اگر بکثرت کرم فرماتے تو ہرگز تکلف نہ کرتا۔ یہ تقلیل سبب ہے اس تکثیر کا اس کے بعد آمد کی تکثیر ہو گئی۔ اور تکلف کی تقلیل۔"

اسی طرح ایک اور موقعہ پر حضرت تھانوی بہلی میں سوار ہو کر گنگوہ تشریف لے جا رہے تھے۔ راستہ میں ان کی نظر اپنے استادِ خاص مولانا فتح محمد پر پڑی۔ جو پیدل جا رہے تھے۔ آپ مولانا کی طبیعت سے بخوبی واقف تھے کہ اگر انھیں بہلی میں بیٹھے بیٹھے سواری کی دعوت دی۔ تو قبول نہ فرمادیں گے اس لیے فوراً ادباً بہلی سے اُتر آئے اور عرض کیا کہ حضرت بہلی میں کافی جگہ ہے۔ سوار ہو جائیں۔ لیکن مولانا راضی نہ ہوئے۔ آپ اصرار کرنے کی بجائے یہ کہتے ہوئے کہ بہتر ہے جس میں راحت ہو۔ میں اصرار نہیں کرتا۔ خود بھی پیادہ پا ان کے ساتھ ہو گئے۔ مولانا نے فرمایا کہ:۔

"یہ تو اصرار سے بھی بڑھ کر ہے۔ مجھ کو تو عادت ہے۔ تم کو پیادہ پا چلنے میں تکلیف ہو گی تم سوار ہو لو۔"

حضرت نے عرض کیا کہ:۔

"حضرت یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ کہ آپ چلیں۔ اور میں سواری پر بیٹھوں میرا تو سواری پر بٹھانا آپ کے قبضہ میں ہے۔"

اس پر وہ بلا اصرار محض حضرت کی حسنِ تدبیر سے بہلی میں بیٹھنے پر مجبور ہو گئے۔

حُسنِ تطبیق

کلامِ الٰہی اور احادیث الرسول صلی اللہ علیہ وسلم میں بظاہر بہت سے متشابہات تعارضات موجود ہیں۔ ان کی تطبیق و تفہیم عام انسانوں کے بس کی بات نہیں۔ بسا اوقات بڑے بڑے عالم بھی ایسے مقامات پر آکر چکر کھا جاتے ہیں۔ مگر حضرت تھانویؒ کو ایسی مشکلات کو دفعتہً حل کر دیتے تھے۔ جس کی وجہ سے بعض اوقات بڑے بڑے عالم فاضل ان کی طرف رجوع کرتے تھے۔ ایک مرتبہ حضرت مولانا خلیل احمدؒ کو ایسا اشکال پیش آگیا۔ مولانا محترم اور حضرت تھانویؒ میں علم و فضل کے لحاظ سے جو فرق تھا۔ اس کے متعلق خود حضرت تھانویؒ کا فرمان ہے کہ :-

"میں ہر طرح چھوٹا تھا۔ عمر میں بھی۔ طبقہ میں بھی اور علم و عمل میں تو مجھ کو کوئی نسبت ہی نہ تھی"

اس کے باوجود مولانا نے حضرت سے دریافت فرمایا کہ :-

"حدیث میں لن یغلب اثنا عشر الفا عن قلتہ اور اس میں کوئی قید مذکور نہیں۔ تو کیا یہ مطلق ہے؟ اور ہر صورت کو شامل ہے؟ گو مقابلہ میں لاکھوں کافر ہوں۔ یا یہ کہ کسی اور دلیل سے مقید ہے۔ اطلاق پر یہ اشکال ہے۔ کہ بہت جگہ اس عدد سے زیادہ ہونے کی صورت میں بھی مسلمان مغلوب ہو گئے ہیں"

حضرت تھانویؒ نے فی البدیہہ فرمایا کہ :-

"ظاہر حدیث کا تو اطلاق یہی ہے۔ اور بدوں دلیل قوی کے تقیید کی کوئی وجہ نہیں۔ اور مسلمانوں کا کہیں مغلوب ہونا کوئی دلیل نہیں۔ کیونکہ جہاں مسلمان مغلوب ہوئے ہیں بسبب اس کا کوئی علت ہے نہ کہ قلت اور وہ علت خواہ کوئی امر ظاہر ہو۔ جیسے نا اتفاقی خواہ کوئی امر باطن ہو۔ جیسے

عجب ونظر الے الاسباب ونحوہما، جیسا غزوہ حنین میں مسلمان بارہ ہزار اور کفار چار ہزار تھے (کما فی الجلالین) مگر اول میں مسلمان مغلوب ہوگئے جس کا سبب عجب باکثرت تھا (کما فی القرآن المجید اذا عجبتکم کثرتکم پھر آخر میں وہی مغلوب غالب ہوگئے (کما قال اللہ تعالیٰ ثم انزل اللہ سکینتہ علی رسولہ وعلی المومنین وانزل جنودا لم تروھا) یہ انزال سکینہ مشروط ہے زوال سبب مغلوبیۃ کے ساتھ وہ عجب ہے اور یہ زوال توبہ ہے۔"

حضرت تھانوی کا یہ جواب سُن کر مولانا صرف مسرور ہی نہ ہُوئے بلکہ اس تطبیق کو پسند بھی فرمایا۔

حسنِ تحقیق

حضرت حافظ احمد حسین شاہ جہان پوریؒ شاہ جہان پور کے بڑے رئیس ہونے کے علاوہ صاحب سلسلہ بزرگ تھے اور مستجاب الدعوات تھے ایک دفعہ ان کی بدعا سے ایک شخص دفعتہً مرگیا۔ بجائے اس کے کہ وہ اپنی اس کرامت پر خوش ہُوئے۔ ان پر خوف طاری ہوگیا۔ کہ مبادا میری گرفت ہوجائے۔ اس لیے محقق دوراں حضرت تھانویؒ کی خدمت میں رقعہ لکھ کر پُوچھا کہ مجھے قتل کا گناہ تو نہیں۔ حضرت تھانویؒ نے انھیں لکھا کہ:

"اگر آپ میں قوت تصرف ہے اور بددعا کرنے کے وقت آپ نے اُس قوت سے کام لیا تھا۔ یعنی یہ خیال قصد اور قوت سے کیا تھا۔ کہ یہ شخص مرجائے۔ تب تو قتل کا گناہ ہُوا اور چونکہ یہ قتل شبہ عمد ہے۔ اس لیے دیت اور کفارہ واجب ہوگا اور اگر ایسا نہیں۔ تو قتل کا گناہ تو نہیں

ہُوا۔ لیکن اس صورت میں یہ دیکھا جائے گا کہ کس بات پر بددعا کی تھی۔ اور کیا بد دُعا کی تھی۔ اور آیا وہ بات اس درجہ کی تھی کہ اس قسم کی دعا کا آپ کو شرعاً حق حاصل تھا۔ اگر وہ دعا بحق تھی۔ تو بددعا کا بھی گناہ نہیں ہوا۔ ورنہ بددعا کا گناہ ہوا۔"

اس جواب سے ان کی پوری تشفی ہو گئی۔ حضرت تھانویؒ اس واقعہ کے سلسلہ میں فرمایا کرتے تھے کہ:۔

"اس قسم کا سوال بس عمر بھر میں ایک انھیں نے کیا تھا۔ جس سے ان کا غایت درجہ اہتمام تقویٰ ثابت ہوتا ہے۔"

حُسنِ خطاب

اِنسان کی یہ فطری کمزوری ہے کہ وہ عام طور پر حق بات سُننے کی تاب نہیں لاسکتا۔ مگر بعض طبیعتیں ایسی ہوتی ہیں کہ انھیں حق کہے بغیر چین نہیں آتا۔ جس سے لازمی طور پر کچھ تلخی پیدا ہونے کا امکان ہوتا ہے۔ اس لیے گفتگو کے دَوران میں اس انداز سے اظہارِ حق کرنا جس سے دُوسرے کی ذرا بھی دل آزاری نہ ہو۔ ہر شخص کے بس کی بات نہیں۔ حضرت تھانویؒ اس معاملہ میں ہمیشہ تہذیب سے کام لیتے اور اس طرح حق بات کہہ دیتے کہ مخاطب ناراض ہونے کی بجائے خوش ہو جاتا۔

الہ آباد کے مردِ درویش محمد شاہ ولایتیؒ مسائل اختلافیہ میں عملاً کسی قدر تسامح کرتے تھے۔ اُن کا مسلک صلح کل تھا۔ اس لیے بوجہ درویش ہونے کے احتیاط کرنے والوں سے بھی منازعت نہ کرتے تھے۔ جب حضرت تھانویؒ انھیں ملنے کے لیے گئے۔ تو انھوں نے آپ سے اعتراضاً پوچھا کہ:۔

"مولوی اس آیت کا ترجمہ کرو۔ لِكُلِّ أُمَّةٍ جَعَلْنَا مَنسَكًا

هُوَ نَاسِكُوهُ فَلَا يُنَازِعُنَّكَ فِي الْأَمْرِ"

حضرت تھانوی ان کا مطلب سمجھ گئے اور فوراً فرمایا کہ :۔

"حق تعالیٰ نے فَلَا تُنَازِعْهُمْ نہیں فرمایا۔ بلکہ فَلَا يُنَازِعُنَّكَ فرمایا ہے۔ یعنی اہلِ باطل کو چاہیئے کہ وہ بھی اہلِ حق سے منازعت نہ کریں اہلِ حق کو ممانعت نہیں فرمائی کہ وہ بھی اہلِ باطل سے منازعت نہ کریں۔ اہلِ حق کو تو چاہیئے کہ اہلِ باطل کی مخالفت کریں۔"

یہ جواب سُن کر شاہ صاحب بجائے ناخوش ہونے کے بہت خوش ہوئے۔ اور دعائیں دیں اس واقعہ کو نقل کرتے ہوئے حضرت تھانویؒ فرمایا کرتے تھے کہ :۔

"الحمد للہ میں اظہارِ حق میں کسی کے سامنے کبھی چوکا تو نہیں ہوں۔ لیکن کسی کے ساتھ بے ادبی بھی نہیں کی۔"

یہی وجہ ہے کہ آپ جب کبھی کسی مسئلہ اختلافیہ پر گفتگو فرماتے۔ تو اس طرح خطاب فرماتے کہ مخالف بھی عش عش کر اٹھتا۔

حُسنِ ظن

حضرت شاہ جہان پوری بعض فرعی اجتہادی مسائل از قسم سماع وغیرہ میں حضرت تھانویؒ سے مختلف المشرب تھے۔ اس کے باوجود وہ حضرت تھانوی کو محقق زمان سمجھتے تھے۔ اس لیے انھوں نے ایسے دقیق مسئلہ میں حضرت سے ہی تحقیق چاہی اور حضرت تھانویؒ نے بھی ان کے اختلافات پر نظر رکھے بغیر جو صحیح سمجھا لکھ بھیجا۔ جس کی کسی امید سے کم از کم توقع نہ ہو سکتی تھی۔ ورنہ مستفسر اپنے مخالف کی طرف رجوع نہ کرتا۔ اور ان کے رجوع کرنے کی وجہ صرف یہ تھی کہ حضرت تھانوی اپنے ہر مخالف سے حُسنِ ظن رکھنے کے عادی تھے۔ خواہ کوئی انھیں گالیاں ہی کیوں نہ دیتا ہو۔ حضرت فرمایا کرتے تھے کہ :۔

"اللہ کا شکر ہے کہ میرے قلب میں کسی بزرگ کی طرف سے محض فرعی اختلاف کی بناء پر بدعقیدگی پیدا نہیں ہوتی۔ بشرطیکہ ان میں بزرگی کے آثار غالب ہوں اللہ اللہ کرنے والوں سے حسنِ ظن ہی رکھتا ہوں۔ گو وہ حضرات بعض غلط فہمیوں میں مبتلا ہوں لیکن یہ ضرور نہیں کہ ان کے افعال واقوال کو شریعت پر منطبق کیا جائے۔ بلکہ مغلوب الحال بزرگوں کے اقوال وافعال کی یہ تاویل کرلیتا ہوں کہ بوجہ مغلوبیت معذور ہیں یا جو اجتہادی امور ہیں۔ ان میں اجتہادی اختلاف کی گنجائش سوءِظن سے مانع ہوجاتی ہے۔"

اس کی عملی مثال عادات کے باب میں مخالفین سے درگذر کے باب میں گذر چکی ہے۔

حُسنِ طلب

مدرسہ دیوبند کی طرف سے ایک تجارتی کمپنی قائم کی گئی تھی۔ جس کے ہر شخص پانچ سو کی مالیت کے حصے خرید سکتا تھا۔ حضرت تھانویؒ کے والد ماجد نے متمول ہونے کی وجہ سے پانچ سو کے حصے اپنے نام سے، پانچ سو کے حصے حضرت کے نام سے اور پانچ کے حصے اپنے چھوٹے صاحبزادہ منشی اکبر علی صاحب کے نام سے خریدے۔ کچھ عرصہ بعد بمصلحت یہ رقم واپس لے لی۔ یہ وہ زمانہ تھا۔ جب حضرت تھانوی دیوبند میں تعلیم حاصل کرتے تھے آپ کو جب اس رقم کی واپسی کا علم ہوا تو آپ نے اپنے والد ماجد سے بذریعہ خط وکتابت دریافت فرمایا کہ :۔

"آیا یہ پانچ سو روپیہ جو میرے نام سے آپ نے جمع کیے تھے۔ اور اب واپس لے لیے ہیں۔ میری ملک ہیں یا آپ کی ؟"

والد ماجد نے جواب بھیجا کہ :۔

"ابھی تک تو یہ رقم میری ہی ملک تھی۔ اور تمہارا نام محض مصلحۃً درج کرا

دیا گیا تھا۔ لیکن اَب مَیں اس رقم کو در اصل تمہاری ہی ملک قرار دیتا ہوں"۔

اس پر اس متبع شریعت اور پابندِ دین طالب علم نے لکھا :۔

"جب یہ رقم میری ملک ہو چکی ہے۔ تو اس رقم کی زکوٰۃ بھی میرے ذمہ واجب ہے۔ اور اَب حج بھی میرے اُوپر فرض ہو گیا ہے"۔

آپ کے والد ماجد نے خوش ہو کر زکوٰۃ ادا کرنے کے لیے تو روپیہ بھیج دیا اور حج کے متعلق لکھا کہ

"مَیں تمہاری چھوٹی بہن (والدہ صاحبہ حضرت مولانا ظفر احمد تھانوی عثمانی) کے عقد سے فارغ ہو کر آیندہ سال حج کے لیے جاؤں گا۔ اس وقت تم بھی چلے چلنا"۔

لیکن باپ سے ڈرنے اور ان کا ادب کرنے والے اس "طالب علم" نے ایک فرض کی ادائیگی میں کوتاہی کے خوف کو باپ کے ڈر اور ادب پر ترجیح دیتے ہُوئے بڑے ناز سے لکھا کہ :۔

"آپ مجھے یہ لکھ کر دے دیجئے۔ کہ تم پار سال تک زندہ رہو گے"۔

اس پر انھوں نے لکھا کہ :۔

"مَیں یہ کیسے لکھ سکتا ہُوں"۔

بس اَب میدان صاف تھا۔ فوراً لکھا کہ :۔

"حج تو میرے ذمہ فرض ہو چکا ہے اور زندگی کا کچھ اعتبار نہیں اور تاخیر بلا عذر شرعی جائز نہیں۔ اس لیے مجھے تو اسی سال حج کرنا ضروری ہے"۔

اس پر آپ کے والد ماجد کو جھکنا پڑا اور بعجلت تمام شوال میں ہی اپنی صاحبزادی کا عقد کر دیا اور اپنے فرزند کو لے کر حج پر تشریف لے گئے۔

حسنِ مساوات

ہمارے محترم کرم فرما حضرت طالوت صاحب کے والد ماجد کی بھی حضرت تھانوی
سے مکاتبت تھی۔ عمومی نہیں بلکہ خصوصی۔ اس ناز پر ہمارے صاحب نیاز بھی دیو بند
گاہے گاہے پدری تعلق کی وجہ سے تھانہ بھون پہنچ جاتے تھے۔ اور اس خصوصی تعلق
وجہ سے حضرت تھانویؒ انھیں بڑی شفقت سے اپنے قریب بٹھاتے۔ حالانکہ آپ
قرب حاصل کرنا کوئی معمولی بات نہ تھی۔ کیونکہ حق تعالیٰ کے کسی مقبول بندے کا کسی کو
قرب بخشنا عند اللہ اس کے مقرب ہونے کی دلیل ہوتی ہے۔

حضرت طالوت نے اپنا یہ چشم دید واقعہ بیان فرمایا کہ ایک روز کہیں سے حضرت
کے پاس ہدیۃً ایک خوبصورت سا کپڑا آیا۔ جسے حضرت نے بہت پسند فرمایا اور نوکر
کہا کہ اس جیسا اتنا ہی کپڑا بازار سے اور خرید لائے۔ مگر تلاش بسیار کے باوجود اس
جیسا کپڑا اور نہ مل سکا اور نوکر واپس آگیا۔ حضرت تھانویؒ نے وہی کپڑا ملازم سے لے
کر اسے دو برابر حصوں میں چیر دیا۔ اور فرمایا ہر ایک ڈیوڑھی پر ایک ایک ٹکڑا دے
اس وقت ایک صاحب سے نہ رہا گیا اور حضرت سے عرض کیا کہ یہ تو اب کسی
کام کا نہ رہا۔ اگر فقط مساوات کا ہی خیال تھا۔ تو دوسرے گھر اس کپڑے کی قیمت
دی جاتی۔ حضرت نے فرمایا۔

"آپ کا خیال صحیح نہیں اس طرح مساوات قائم نہ رہتی۔ کیونکہ مساوات
ہر نوع میں لازم ہے۔ تاکہ کسی کے دل میں عدم مساوات کا خفیف سا
شائبہ بھی پیدا نہ ہو۔"

حسنِ معاشرت

مولانا عبد الماجد صاحب دریا بادی لکھتے ہیں :-

"حضرت کی مالی و معاشی حالت اگرچہ زیادہ اچھی نہ تھی۔ تو بُری بھی نہیں

کہی جا سکتی تھی۔ بہتوں سے بہتر تھی۔ متوسط درجہ کے شرفا کا جو طرزِ معاشرت ہے۔ خصوصاً قصبات میں اور شیخ زادوں کے ہاں۔ حضرت اُسی معیار پر فراغت آسائش سے گو یقیناً بغیر اس معیار کے اسراف و آرائش کے بسر فرماتے تھے۔ اولاد کوئی نہ تھی لیکن محل دو تھے۔ جی ہاں! بزرگ ہو کر دو۔ دو محل!! معاندین خوب خوش ہو ہو کر نوٹ کر لیں۔ طنز و تعریض کے لیے کتنا زبردست حربہ ہاتھ آگیا!! دونوں کے لیے الگ مکان۔ ایک دوسرے سے فاصلہ پر۔ ملازم بھی دو تھے۔ دونوں ایک ایک ڈیوڑھی پر دونوں کے ساتھ مولانا کا برتاؤ قابلِ دید تھا۔ بجائے خود ایک درسِ حیات، کام کو جب فرماتے۔ تو خوب ٹھہر ٹھہر کر سمجھا کر۔ اکثر تکرار کے ساتھ کہ غلط فہمی کا احتمال نہ رہے۔ ملازمین جب آتے تو حکم تھا کہ زبان سے السلام علیکم کہہ کر (ہاتھ سے سلام کرنے کے عجمی دستور کی گنجائش اس عربی سادگی ماحول میں کہاں تھی؟) قریب آکر بیٹھ جائیں۔ بات چیت بیٹھ کر کریں۔ بلاضرورت کھڑے نہ رہیں۔ کام کی مشقت کبھی بہت زائد نہ ڈالتے۔ کام بگاڑتے تو حضرت غصہ بھی فرماتے اور غصہ کرنا ایسے مواقع پر تو امرِ طبعی ہے۔ لیکن اس میں بھی حدود کے اندر ہی رہتے۔ مسجد سے چھوٹے زنانہ کا فاصلہ اچھا خاصہ ہے۔ لیکن شب میں بعد عشاء جب گھر تشریف لے جاتے تو لالٹین اپنے ہاتھ میں لیے رہتے۔ کسی ملازم کو اس کیلئے نہ بلاتے۔ کبھی کوئی بات ہنسی کی بھی اُن سے فرما دیتے۔ جس سے ان کا دل کھل جاتا۔ برتاؤ ہمیشہ خشک ہی نہ رکھتے۔ اُن کے کپڑوں۔ اُن کے بیوی بچوں سب کا لحاظ رکھتے بلکہ وہ جو ایک بہت قدیم ملازم میاں نیاز نامی۔ بڑے مخلص اور سادہ دل تھے۔ ان کا ذکر تو کبھی کبھی نیم مزاجی انداز میں وعظ میں بھی کر دیا کرتے اور "دہقان" کی "کلاہ افتخار" آفتاب

تک پہنچا دیتے ہے

زقدر و شوکتِ سلطان نہ گشت چیزے کم
کلاہ گوشۂ دہقاں بہ آفتاب رسید

بزرگوں کی زیارت کا اتفاق اس سے قبل بھی ہو چکا تھا۔ لکھنؤ میں مولانا عین القضاۃؒ صاحب علم ہونے کے ساتھ ساتھ بڑے تارکِ، زاہد، مرتاض بزرگ تھے۔ صفی پور (ضلع اناؤ) کے شاہ عزیز اللہ بھی اپنے رنگ میں فرد۔ وقس علیٰ ہذا۔ لیکن یہاں کا مضمون ہی کچھ اور تھا ؎

بسیار خوبان دیدہ ام۔ لیکن تو چیزے دیگری"

حُسنِ جامعیت

اسے حق تعالےٰ کا فضلِ خاص کہیے یا حُسنِ انتظام کہ اس نے حضرت تھانوی کی انسانیت و جامعیت کی تصویر کھینچنے کے لیے اس نقاد کو مقرر فرمایا۔ جو بوجہ فلسفی ہونے کے بال کی کھال اُتارنے۔ بوجہ غیر مرید ہونے کے اشکال و اعتراض کرنے میں نڈر کتنے کے عادی ہیں۔ اور جنھوں نے ابتدائی تربیت کسی دینی ماحول میں نہیں بلکہ کفر و الحاد کی وادی میں بھٹک کر حاصل کر لی تھی۔ یعنی مولانا دریابادی جو شانِ اشرف دیکھ کر بے ساختہ کہہ اٹھے کہ :۔

"مولانا۔ عالم بے بدل اور درویش کامل تو خیر تھے ہی۔ لیکن سب سے پہلے اِنسان تھے اور جس نے اُن کے اس جوہر کو نہ پہچانا۔ اس نے ان کو ذرا بھی نہ پہچانا۔ بزرگوں کی حکایات کسی بزرگ سے پوچھیے اور ولایت کی تحقیق کسی ولی اللہ ہی سے کیجیے۔ یہ نامی تو اپنے تجربہ اور مسلسل تجربہ سے بس اتنا جانتا ہے کہ اشرف علی تھانوی نامی ایک انسان۔ بہترین دوست۔ بہترین میزبان۔ بہترین مخدوم۔ بہترین عزیز۔ بہترین ہمسایہ۔ غرض انسانی کمالات

اوصاف کے لحاظ سے ایک بہترین انسان ہوئے ہیں۔

حضرت کی شان ہی سب سے الگ، سب سے نرالی۔ نہ فقر و فاقہ۔ نہ تجرد۔ نہ بیوی بچوں کا ترک۔ اور نہ شدید قسم کے مجاہدے اور نہ رسمی درویشی اور مشیخت کے کوئی سے بھی آداب و رسوم۔ بلکہ دیکھنے میں سارا سامان دنیا داری ہی کا موجود۔ اچھے خاصے پختہ اور بلند مکان۔ نوکر چاکر۔ کھانے دو دو۔ تین تین قسم کے۔ لباس خاصہ اُجلا شفاف۔ بڑی زبردست ڈاک کی آمد و رفت غرض بہ ظاہر ہر طرف دُنیا ہی دُنیا لیکن وہ دُنیا ایسی کہ اس کے ہر جزو پر دین کی حکومت غالب۔ طبیعت و بشریت کی پوری پوری آزادیاں۔ لیکن وہی شریعت کی پابندی میں۔

بزرگی کے دعوے نہیں۔ درویشی کی تعلیاں نہیں۔ مشیخت کی شیخیاں نہیں۔ جذب کی شوخیاں نہیں۔ بلکہ اُلٹا تقصیروں کا اعلان، لغزشوں کا اشتہار، ہائے ہائے کوئی اس عبدیت کی دلاویزی لا کہاں سے سکتا ہے

لاکھوں لگاؤ اک چرانا نگاہ کا

عبدیت کا مرتبہ اور افادیت کا جو درجہ ہے۔ کون سا حال اور کون سا مقام اسے پا سکا؟ رَبَّنَا ظَلَمْنَا اَنْفُسَنَا کی آہ وزاری نے ابوالبشر کے جو مرتبے بڑھائے کس بشر کی مجال ہے کہ انھیں بھلائے؟ بڑی سے بڑی ریاضتیں۔ بڑے سے بڑے مجاہدے بھی اس ایک شکستگی۔ اس ایک افتادگی۔ اس ایک بیچارگی کے مقابلہ پر لائے جا سکتے ہیں؟ ؎

اک خونچکاں کفن میں ہزاروں بناؤ ہیں
پڑتی ہے آنکھ تیرے شہیدوں پہ حور کی

مولانا کی ذات، خود دینی حیثیت سے عجب ذات تھی۔ کوئی صرف فقیہ ہوتا

ہوتا ہے اور طریقت سے کورا۔ کوئی محض صوفی ہوتا ہے اور کلام کے مباحث سے ناآشنا یہ حضرت ایک ہی وقت میں صوفی محقق بھی۔ اور متکلم بے بدل بھی۔ رومئ عصر بھی اور رازئ وقت بھی۔ فقہ۔ اصول فقہ۔ تفسیر۔ حدیث و تصوف کے علاوہ کلام قدیم و جدید کے بھی خدا معلوم کتنے مسائل یہاں مجلسوں میں۔ واعظوں میں برابر بیاں ہوتے رہتے اور ہم جیسے کتنے بے مایہ اور کم مایہ یہیں سے خوشہ چینی کر کر کے اپنی بات بناتے۔ اپنی دکان چمکاتے !" (حکیم الامت)

عبدیّت

حقیقتِ عبدیّت

حق تعالیٰ نے کلام پاک میں انبیاء علیہم السلام کا مختلف خطابات سے ذکر فرمایا ہے مثلاً حضرت ابراہیم علیہ السلام کو خلیل اللہ۔ حضرت اسماعیل علیہ السلام کو صادق الوعد حضرت ادریس علیہ السلام کو صدیق۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو نجی اللہ۔ مخلص اور کلیم اللہ حضرت عیسےٰ علیہ السلام کو روح اللہ اور کلمۃ اللہ کا خطاب ملا۔ مگر جناب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو عبداللہ کا خطاب ہوا جو تمام خطابات میں سب سے اونچا خطاب ہے کیونکہ بارگاہِ الوہیت میں عبدیت سے بڑھ کر کوئی مقام نہیں کہ جو رفعت عبدیت سے ملتی ہے اور وہ کسی مقام سے نہیں ملتی اور جب انسان عبدیت کے آخری مقام پر پہنچ جاتا ہے تو وہ اپنے معبود حقیقی کے اتنے قریب ہو جاتا ہے کہ اس کے لیے بعد زمانی و مکانی مانع نہیں رہتا اور عبد و معبود کے درمیان جس قدر حجاب ہائے ارض و سما حائل

نظر آتے ہیں وہ سب اٹھ جاتے ہیں۔ اور وہ اس مقامِ بلند و بالا پر پہنچ کر اس صانعِ حقیقی کے کارخانۂ قدرت کی ہر چیز کا بچشمِ خود مشاہدہ کرنے لگتا ہے۔ یہ مقام حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اور کسی کو نصیب نہیں ہوا۔"

مقامِ عبدیت

سلوک کا اعلیٰ ترین مقام وہ مقامِ عبدیت ہے۔ جس تک پہنچنے کے لیے طالبین و سالکین کو بسا اوقات قبض کے بحرِ ظلمات کی تیز و تند موجوں۔ غم و اندوہ کی دشوار گزار وادیوں۔ عظمت و جلال کے پرہیبت پہاڑوں اور خوف و خشیت کی گھنگور گھٹاؤں سے بھی گزرنا پڑتا ہے۔ جسے طے کرتے وقت بعض شدائد کی تاب نہ لا کر خودکشی کر بیٹھتے ہیں بعض ہمت ہار کر یہ راستہ ہی چھوڑ دیتے ہیں۔ اور بعض خوش نصیب بعون اللہ تعالیٰ قبض کے اس شدید و مدید دور سے نکل کر منزلِ مقصود پر پہنچنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں اور ان کو اپنا ہیچ اندر ہیچ اور لاشئے محض ہونا روشن کی طرح مشاہد ہو جاتا ہے۔ یہ مقام صرف اولیاء اللہ کو نصیب ہوتا ہے۔ اس کا ادنیٰ درجہ وہ مقامِ عبدیت ہے جس میں احکامِ الٰہی انسان کی اپنی ذات کے احکام بن جائیں۔ یعنی بقول علامہ اقبالؒ :

"وہ یہ نہ سمجھے کہ میں کسی حاکم یا آقا کے حکم و تسلط کے ماتحت فضائلِ اخلاق و عبادات پر کاربند اور رذائم قبائح نفس سے مجتنب ہوں بلکہ یہ چیزیں اس کی اپنی تمنا بن کر اس کے عمقِ روح سے ابھلیں۔ قرآن اس کے حق میں تلخ اور شافی دوا نہ رہے۔ بلکہ ایک لذید اور زندگی بخش غذا بن جائے۔"

(ملفوظاتِ اقبال صنہ)

یہ مقام مومنین کو حاصل ہوتا ہے۔

احساسِ حقیقت

اولیاء اللہ کو چونکہ خلق اللہ کی اصلاح و تربیت کا فریضہ ادا کرنا ہوتا ہے۔ اس لیے

مسندِ ارشاد پر متمکن ہونے سے پہلے نظامِ تکوینی کے ماتحت انھیں خود بھی تربیتِ سلوک حاصل کرنی پڑتی ہے۔ اس تربیت کی بدولت جب سالک پر اپنا لاشئے محض ہونا مشاہد ہو جاتا ہے۔ تو بقول صاحبِ اشرف السوانح :-

"اس مشاہدۂ عجز کی بدولت وہ بفضلہٖ تعالیٰ نزولِ کامل سے جو ترقیاتِ باطنیہ کی انتہائی منزل ہے، مشرف و ممتاز اور سربلند و سرفراز ہو جاتا ہے۔ نیز چونکہ تغیراتِ احوالِ قلب کا اس کو خوب اچھی طرح اور ذاتی طور پر تجربہ ہو چکا ہوتا ہے۔ اس لیے عدمِ غلبۂ ہیبت کی حالت میں بھی وہ عظمت و جلالِ خداوندی اور شوکت و ہیبت قضا و قدرِ الٰہی سے ہمیشہ ترساں و لرزاں ہی رہتا ہے۔ اور اچھی سے اچھی باطنی حالت کو بھی اپنے اندر محسوس کرتے ہوئے اس کو کبھی عجب و ناز کا واہمہ بھی نہیں ہوتا۔ کیونکہ بربنارِ تجربہ سابقہ وہ اس حالت کو حدوثاً محض محبتِ خدا اور بقاءً ہر وقت زیرِ تصرف رب العلا یقین کیے ہوئے ہوتا ہے۔ غرض استحضارِ عظمتِ حق اس کا حال دائمی اور تفویض کامل و فنار تام اس کا شعار زندگی ہو جاتا ہے۔ یعنی عبدیتِ محضہ اس کی صفتِ لازمہ و بندگی و سرافگندگی اس کی طبیعت ثانیہ بن جاتی ہے۔"

یہ اوصافِ جلیلہ حضرت تھانویؒ کی ذات والاصفات میں بدرجہ اتم موجود تھے۔ جو روزانہ دربارِ اشرفیہ میں زیرِ مشاہدہ آتے رہتے تھے۔ اور آپ کی تالیفات وارشادات میں بھی قدم قدم پر ان کا رنگ نمایاں نظر آتا ہے مثلاً

کسرِ نفسی

آپ بارہا قسم کھا کر فرمایا کرتے تھے کہ :-

"میں اپنے آپ کو کسی مسلمان سے حتیٰ کہ ان مسلمانوں سے بھی جن کو لوگ فساق و فجار سمجھتے ہیں فی الحال اور کفار سے بھی احتمالاً فی المآل افضل نہیں سمجھتا اور آخرت

میں درجات حاصل ہونے کا کبھی مجھے وسوسہ بھی نہیں ہوتا۔ کیونکہ درجات تو بڑے لوگوں کو حاصل ہوں گے۔ مجھے تو جنتیوں کی جوتیوں میں بھی جگہ مِل جائے تو اللہ تعالیٰ کی بڑی رحمت ہو۔ اس سے زیادہ کی ہوس ہی نہیں ہوتی۔ اور اتنی ہوس بھی بربنا، استحقاق نہیں بلکہ اس لیے کہ دوزخ کے عذاب کا تحمل نہیں اور یہ جو میں بضرورتِ اصلاح زجر و توبیخ کیا کرتا ہُوں تو اس وقت یہ مثال پیش نظر رہتی ہے۔ جیسے کسی شہزادے نے جُرم کیا ہو۔ اور بھنگی جلاد کو حکم شاہی ہُوا ہو کہ اس شہزادے کو دُرّے لگائے۔ تو کیا اس بھنگی جلاد کے دل میں درّے مارتے وقت کہیں یہ بھی وسوسہ ہو سکتا ہے کہ میں اس شہزادے سے افضل ہُوں۔ غرض کوئی مومن کیسا ہی بداعمال ہو۔ میں اس کو حقیر نہیں سمجھتا۔ بلکہ فوراً یہ مثال پیشِ نظر ہو جاتی ہے کہ اگر کوئی حسین اپنے مُنہ پر کالک مل لے تو اس کو جاننے والا کالک کو بُرا سمجھے گا اور اس حسین کو حسین ہی سمجھے گا۔ اور دل میں کہے گا کہ یہ جب کبھی بھی صابون سے مُنہ دھولے گا پھر اس کا وہی چاند سا مُنہ نکل آئے گا۔ غرض مجھ کو صرف فعل سے نفرت ہوتی ہے۔ فاعل سے نفرت نہیں ہوتی"

آثارِ خجالت

صاحب "اشرف السوانح" کا بیان ہے کہ "ایک بار احقر نے حضرت والا کے ایک ذی فضل معتقد کا یہ قول نقل کیا کہ میں آخرت میں اپنا کوئی عمل ایسا نہ پیش کر سکوں گا۔ جو خالص ہو۔ اس کو سُن کر حضرت والا جو اس وقت کسی خط کا جواب لکھ رہے تھے۔ لکھتے لکھتے بے اختیار رُک گئے۔ اور چہرہ مبارک پر آثار سخت خجلت و ندامت کے ظاہر ہونے لگے۔ غلبۂ عبدیت سے بیٹھے بیٹھے کسی قدر جُھک بھی گئے اور پھر تھوڑی دیر تک اسی ہیبت سے ساکت بیٹھے رہنے کے بعد نہایت حسرت کے لہجہ میں فرمایا کہ :-

"جی ہاں ! اللہ تعالیٰ کی بارگاہ کے لائق کیا کوئی عمل پیش کیا جا سکتا ہے"۔

اور پھر لیلۃ اللّبن والی حکایت بیان فرمائی۔

خوفِ مواخذہ

ایک بار فرمایا کہ جب مَیں کسی کے ہدیہ کو ردّ کرتا ہوں۔ تو گو وجہ کے ساتھ ہو لیکن پھر بھی ڈرتا ہُوں۔ کیونکہ غور کرنے سے کسی قدر شک کبر کا ہوتا ہے جس سے نہایت خوف ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ معاف فرمادیں۔ استغناء اور کبر میں فرق نہایت دشوار ہے دونوں بہت متشابہ ہیں کبھی اس میں دھوکا ہو جاتا ہے کہ جس کو ہم استغناء سمجھ رہے ہیں۔ وُہ در اصل کبر ہی ہوتا ہے۔ خدا ہی محفوظ رکھے۔ تو انسان محفوظ رہ سکتا ہے۔ ورنہ ہمارا ہر قول و فعل حال و قال سب ہی پر از خطر ہے۔ کوئی حالت خطرہ سے خالی نہیں۔ مجھے تو اب وُہ شعر اکثر یاد آیا کرتا ہے کہ جو کبھی بچپن میں پڑھا تھا ؎

من نگویم کہ طاعتم بہ پذیر
قلمِ عفو برگناہم کش

بلکہ برگناہم تو کیا۔ حق تعالےٰ خود ہماری طاعات کو معاف فرماوے اور طاعات تو خیر کیا قابلِ معافی ہوتیں۔ مطلب یہ ہے کہ ان میں جو کوتاہی ہے۔ وُہ معاف فرمائے۔ کیونکہ جن کو ہم اپنی طاعات سمجھ رہے ہیں۔ وُہ درحقیقت طاعات ہی کب ہیں ؟ جس طرح کوئی بے ڈھنگے طور پر پنکھا جھل رہا ہو۔ یا کوئی خدمت کر رہا ہو۔ تو وُہ اپنے جی میں بڑا خوش ہوتا ہے کہ مَیں خدمت کر رہا ہُوں حالانکہ بعضوں کی خدمت سے سخت اذیت ہوتی ہے لیکن محض دل شکنی کی وجہ سے ان کو منع نہیں کیا جاتا۔ اسی طرح ہماری طاعات میں کبھی کوئی یہ خیال نہ کرے کہ ہم نے گھنٹہ بھر اللہ اللہ کیا ہے۔ یہ خبر نہیں کہ وہاں کچھ پُوچھ تک نہیں ہوتی ایسی طاعات پر مَیں کہتا ہُوں کہ ہم لوگوں پر اگر مواخذہ نہ ہو تو غنیمت ہے۔

(حسن العزیز جلد ا ملفوظ ۹۸)

عجز و نیاز

ایک سلسلۂ کلام میں نہایت پُر اثر اور بہت ہی پستی اور شکستگی کے لہجہ میں فرمایا کہ " نہ علم کا اعتبار - نہ عمل کا اعتبار - نہ حال کا اعتبار - نہ مقام کا اعتبار کسی شے کا اعتبار نہیں - یہاں تک کہ جو سب سے زیادہ ضروری چیز ہے یعنی ایمان - اس کے بقار کا بھی کیا اعتبار - کیونکہ قضا و قدر سب جکڑ بند ہیں - کیا معلوم ! کس کے لیے کیا مقدر ہو چکا ہے - بارہا ایسا ہوتا ہے کہ آدمی جانتا ہے کہ یہ گناہ ہے اور یہ بھی جانتا ہے کہ اس سے بچنا بھی اختیاری ہے لیکن پھر اس میں مبتلا ہو جاتا ہے اور اپنے اختیار سے اپنے آپ کو اس میں مبتلا کرتا ہے آخر وُہ کون ہے - جو اس کو کشاں کشاں لے جا رہا ہے - اور پھر دلائل سمعیہ و عقلیہ سے یہ بھی واجب ہے کہ جبر کا بھی عقیدہ نہ رکھو اور واقع میں بھی جبر نہیں - بہت ہی نازک بات ہے اور بہت ہی ڈرنے کا مقام ہے - اپنی کیسی ہی حالت اچھی ہو - ناز نہ کرے اور دُوسرے کی کیسی ہی بُری حالت ہو - اس پر ہرگز طعن نہ کرے - کیا خبر ! کہ اپنی حالت اس سے بھی بدتر ہو جائے - ما یفتح اللہ للناس من رحمۃ فلا ممسک لہا و ما یمسک فلا مرسل لہ من بعدہ اللہ تعالیٰ جس رحمت کو کشادہ کرنا چاہیں - کوئی اس کو روکنے والا نہیں اور جس رحمت کو روکنا چاہیں کوئی اس کا کشادہ کرنے والا نہیں - غرضیکہ کوئی چیز انسان کے مستقل اختیار میں نہیں " اکثر گمراہ فرقوں کے عقائد واہیہ کے تذکروں میں بے اختیار ہاتھ جوڑ جوڑ کر اللہ تعالےٰ سے نہایت عجز و نیاز کے لہجہ میں عرض کرتے لگتے کہ اے اللہ اپنے قہر سے بچائیو ! اور فرماتے کہ :-

" جب تک اللہ تعالےٰ کا قہر ہوتا ہے - تو باطل چیزیں بھی حق نظر آنے لگتی ہیں اور اوہام باطلہ بھی حقائق کی صورت اختیار کر جاتے ہیں "

نفیٔ کمال

بارہا فرمایا کہ یہ جو اصلاحِ نفس کی سہل سہل اور نافع تدابیر اللہ تعالےٰ ذہن میں ڈال دیتے ہیں۔ یہ سب طالبین کی برکت ہے۔ میرا کوئی کمال نہیں۔ اللہ تعالیٰ کو منظور ہے کہ میرے بندوں کی اصلاح ہو اور نفع پہنچے۔ لہٰذا ایک ناکارہ سے خدمت لے رہے ہیں اور جس کو اپنے علوم و معارف پر ناز ہو۔ طالبین سے الگ ہو کر تو ذرا دیکھے۔ واللہ جو بالکل ہی پٹ نہ جائے۔ کیونکہ اللہ تعالےٰ اوروں ہی کے نفع کے لیے اس کو یہ علوم و معارف عطا فرما رہے ہیں ع

خاص کند بندہ مصلحتِ عام را

ماں یہ ناز نہ کرے کہ میں بچہ کو دودھ پلاتی ہوں۔ بلکہ اللہ تعالےٰ ہی کو منظور ہے کہ بچہ کی پرورش ہو۔ اس لیے اس نے گوشت میں بھی دودھ پیدا کر دیا ہے۔ یہ جو دودھ چھاتیوں سے اُبل رہا ہے۔ یہ بچہ کے جذب کی ہی برکت ہے۔ اگر ماں بچہ کو دودھ پلانا چھوڑ دے۔ تو پھر دودھ ہی خشک ہو جائے۔ اسی طرح اگر کنوئیں میں ڈول نہ ڈالا جائے اور پانی نہ نکالا جائے تو نیا پانی آنا بند ہو جائے۔ غرضیکہ اگر شیخ القار چھوڑ دے۔ تو تلقی بھی بند ہو جائے۔"

ایک اور موقع پر فرمایا کہ :-

"میرے اندر علم ہے۔ نہ عمل ہے۔ نہ کوئی کمال ہے۔ لیکن الحمد للہ اپنے خلو کا اعتقاد ہے۔ اللہ تعالیٰ بس اس پر فضل فرما دے گا۔"

اس طرح جب ایک طالب علم حضرت کی تدبیر سے ایک نفسانی مرض سے شفایاب ہوا تو اس نے عرض کیا کہ حضرت والا کی تعلیم میں تو کھلی ہوئی برکت ہے۔ فرمایا کہ "میری تعلیم میں کیا رکھا ہے۔ حقیقت میں اللہ تعالےٰ کی تائید ہے۔ وہی کارساز ہیں۔ میں کیا چیز ہوں۔ چمارٹ کو سڑک کوٹنا نہیں آتا۔ مگر جب انجنیئر اپنا ہاتھ اس کے درمٹ پر رکھ کر اس سے

درمٹ چلواتا ہے۔ تو مٹرک کٹ جاتی ہے۔ امر اصلاح میں نہ میرے علم کو دخل ہے۔ نہ ہم کو۔ خدا نے ایک کام میرے سپرد کیا ہے۔ وہ میری مدد کرتے ہیں۔ میرا کچھ بھی کمال نہیں۔"

حقیقتِ نفی

آپ کی طرح حضرت مولانا گنگوہیؒ رحمۃ اللہ علیہ بھی بقسم فرمایا کرتے تھے کہ میرے اندر کوئی کمال نہیں۔ اس پر ایک معتقد نے حضرت تھانویؒ کے سامنے اپنا اشکال پیش کیا کہ اگر یہ قسم سچی ہے۔ تو مولانا کے کمالات کی نفی ہوتی ہے۔ اور اگر سچی نہیں تو مولانا نے خلافِ واقعہ قسم کیوں کھائی؟ ایسی حالت میں کیا عقیدہ رکھنا چاہیئے؟ آپ نے فرمایا کہ مولانا کو اپنی قسم میں بھی سچا سمجھا جائے اور ان کے کمالات کا بھی اعتقاد رکھا جائے کیونکہ مولانا کمالاتِ متوقعہ کی نفی فرما رہے ہیں اور ہم کمالاتِ واقعیہ کا اعتقاد رکھتے ہیں۔ اس لیے کوئی تعارض موجود نہیں۔"

یہی کیفیت حضرت تھانوی کی نفی کمال کی ہے۔ جس کی مزید تائید اس اشکال کے جواب سے ہوتی ہے کہ جب حضرت خود کو واقعی بزرگ نہیں سمجھتے تو دُوسروں کو مصافحہ کی سہولت کیوں بہم پہنچاتے ہیں؟ اس کا جواب خود حضرت تھانوی کے الفاظ میں موجود ہے کہ:۔

"میں مصافحہ کو اپنے لیے ایک بڑی سعادت سمجھتا ہوں کہ ایک ناکارہ شخص کے اتنے مسلمان محبت کرنے والے ہیں۔ اور اس نیت سے مصافحہ کی اجازت دیتا ہوں کہ اتنے محبت کرنے والوں میں کوئی تو خدا کا مقبول و مرحوم بندہ ہو گا۔ جو مجھے تکلیف میں دیکھ کر حق تعالیٰ سے میری سفارش کرے گا۔"

چونکہ حق تعالےٰ کی تجلیات لامتناہی ہوتی ہیں۔ اس لیے سالکِ عرفان سلوک کے ہر بلند مقام پر پہنچنے کے بعد بھی خود کو ابتدائی منزل میں پاتا ہے۔ اور جب اس راہ کو لامتناہی دیکھتا ہے تو پھر تھک کر عبدیت کی طرف لوٹ آتا ہے اور

نظر بر فضل

اپنے کمالاتِ ظاہری و باطنی کو نظر انداز کر کے فضلِ الٰہی پر نگاہ رکھتا ہے اسی لیے

حضرت تھانویؒ اکثر فرمایا کرتے تھے کہ گو مَیں اعمال میں بہت کوتاہ ہُوں ۔لیکن الحمدللہ اپنی اصلاح سے غافل نہیں ۔ہمیشہ یہی ادھیڑ بن لگی رہتی ہے کہ فلاں حالت کی یہ اصلاح کرنی چاہیئے ۔فلاں حالت میں یہ تغیر کرنا چاہیئے ۔غرض کسی حالت پر قناعت نہیں اور گو میں نجات کو اعمال پر منحصر نہیں سمجھتا ۔محض فضل پر سمجھتا ہُوں ۔لیکن بندہ کے ذمہ پر اللہ تعالیٰ کا حق ہے کہ اس کے اوامر کو بجا لائے اور نواہی سے اجتناب کرے ۔اس لیے مجھ کو اپنے اعمال کی کوتاہی پر سخت ندامت ہے اور ہمیشہ اپنی اصلاح کی فکر رہتی ہے ؎

عفو و دُعا

یہ بھی فرمایا کرتے تھے کہ اللہ تعالےٰ کو چونکہ میرا نیک نام کرنا منظور ہے اس لیے جو پہلے نیک ہیں ۔انھیں کو میرے پاس بھیج دیتے ہیں اور مَیں مُفت میں نیک نام ہو جاتا ہُوں ؎

نے دام خوش نہ دانہ خوش اما ز اتفاق

ہر بار شاہباز در افتد بہ دام ما

مجھ میں تو سراسر عیوب ہی عیوب بھرے پڑے ہیں ۔میری اگر کوئی بُرائی کرتا ہے تو یقین جانیئے مجھے کبھی بھی وسوسہ نہیں ہوتا کہ مَیں بُرائی کا مستحق نہیں بلکہ اگر کوئی تعریف کرتا ہے تو واللہ تعجب ہوتا ہے کہ مجھ میں بھلا کونسی تعریف کے قابل بات ہے جو اس کا یہ خیال ہے ۔اس کو دھوکا ہُوا ہے ۔حق تعالیٰ نے ستاری کی ہے کہ میرے عیوب کو پوشیدہ کر رکھا ہے ۔اس لیے مجھ کو کسی کا بُرا کہنا مطلق ناگوار نہیں ہوتا ۔اور اگر کوئی میری نیک تعریف کرتا ہے تو اسی وقت دس عیب سامنے آجاتے ہیں ۔بُرا بھلا کہنے والے کو عدم واقفیت کی وجہ سے معذور سمجھتا ہُوں اور دُعا کرتا ہُوں کہ اے اللہ میری وجہ سے اپنی کسی مخلوق پر مواخذہ نہ کیجیو ۔جو کچھ کسی نے میرے ساتھ بُرائی کی ہو یا آئندہ کرے ۔وہ سب مَیں نے دل سے معاف کی اگر میری وجہ سے کسی کو عذاب ہوگا ۔تو اس سے مجھے کیا فائدہ پہنچے

غرضیکہ حضرت تھانویؒ کے مقامِ عبدیت کی کیفیت بعینہٖ ایسی تھی جیسے
"عارف کی جتنی بصیرت بڑھتی جاتی ہے۔ عظمتِ حق کا انکشاف روز افزوں
ہوتا چلا جاتا ہے۔ اور آدابِ عبودیت کے روز بروز نئے نئے دقائق پیشِ نظر
ہوتے چلے جاتے ہیں جس کا یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ وہ اپنی عبادات وطاعات کو
خواہ کتنی ہی کامل ہوں حقوقِ عظمتِ حق کے لحاظ سے ہیچ در ہیچ سمجھتا
ہے اور اس کا ایسا سمجھنا حق بجانب ہوتا ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کی عظمت کا
حق کسی طرح ادا ہو نہیں سکتا۔ اس لیے عارف کو اپنے کسی درجہ پر قناعت
نہیں ہوتی اور کسی درجہ کی بھی اصلاح پر اطمینان نہیں ہوتا جس کی وجہ سے
وہ قسمیں کھا کھا کر اپنے کمالات کی نفی کرتا رہتا ہے۔

علم وادب

تصنیف و تالیف

کتابیں پڑھنا جس قدر آسان ہے کتابیں لکھنا اسی قدر مشکل۔ محنت کرنے والا ہی بیچارہ جانتا ہے کہ اس راہ میں اس کو کن کن مشکلات اور مشقتوں سے دوچار ہونا پڑتا ہے تصنیف و تالیف کے لیے علاوہ دیگر امور کے کسی نہ کسی حد تک جمعیتِ خاطر کی بھی ضرورت ہوتی ہے مگر جو صبح شام اصلاحِ اُمّت کے گوناگوں افکار و ہموم کے ہجوم میں گھرے ہوئے ہوں انھیں تصنیف و تالیف کے لیے فرصت و انشرح کی گھڑیاں میسر آنا اور سینکڑوں کی تعداد میں کتابیں لکھ ڈالنا کسی حالت میں بھی کرامت سے کم نہیں اور بدوں امدادِ غیبی ایسا ہونا ناممکن ہے۔

حضرت تھانویؒ کے تصنیفی مشاغل و معمولات پر نظر دوڑانے سے دو باتیں بالکل واضح طور پر نظر آنے لگتی ہیں۔

۱۔ مخلصانہ جدّ و جہد۔

۲۔ غیبی دستگیری۔

مخلصانہ جدّ و جہد

مخلصانہ جدّ و جہد کی کیفیت تو یہ تھی کہ :۔

۱۔ جب آپ کوئی کام شروع کر بیٹھتے تو جب تک اس سے بالکل فارغ نہ ہو جاتے۔ چین ہی نہ آتا۔ رات دن۔ وقت بے وقت اس کی تکمیل کی دھن میں لگے رہتے چنانچہ جب کلید مثنوی ختم ہونے کے قریب آئی۔ تو اس سے فراغت حاصل کرنے کا اس شدت سے تقاضا پیدا ہوا کہ آخر دن میں جو اسے لکھنے بیٹھے تو دوسری صبح کر دی اور رات بھر ایک منٹ نہ سوئے۔ حالانکہ رات بھر جاگنے کا پہلے کبھی اتفاق ہی نہ ہوا تھا۔ جس کی وجہ سے بخار ہو گیا مگر اس بخار میں بھی اطمینان کی کیفیت تھی کہ "کام سے تو فارغ ہو گیا ہوں۔"

۲۔ اتنا تعب برداشت کرنے کے علاوہ آپ کی عادت تھی کہ اکثر کاغذ پنسل اپنے ساتھ رکھتے تھے۔ جس وقت کوئی مضمون ذہن میں آتا اسے فوراً لکھ لیتے۔ بلکہ بسا اوقات رات کو بھی کاغذ پنسل تکیہ کے نیچے رکھ لیتے۔ تاکہ اگر رات کو بھی کوئی مضمون ذہن میں آجائے تو روشنی کر کے اس کے متعلق یادداشت لکھ لی جائے اسی طرح سفر و حضر میں کہیں کوئی بات قابل اصلاح دیکھتے تو اسے بھی نوٹ فرما لیا کرتے تاکہ مناسب موقع پر اس کے تدارک کی تجویز کر دی جائے۔ کیونکہ آپ کوئی کام دوسرے وقت پر ملتوی کرنے میں بہت بوجھ محسوس کرتے تھے اور فرماتے تھے کہ

"جس وقت جو کام پیش آتا ہے۔ مَیں اس کو فوراً کر ڈالتا ہوں۔ دُوسرے وقت پر نہیں ٹالتا۔ گو اس میں اس وقت تو تھوڑی سی تکلیف ہوتی ہے لیکن بعد فراغ بس بالکل بے فکری ہو جاتی ہے اور بڑی راحت ہوتی ہے۔ ورنہ ٹالنے سے اکثر کام نہیں ہوتے اور اگر ہوتے بھی ہیں۔ تو جتنی دیر فکر دامن گیر رہتی ہے۔ اتنی دیر کلفت بھی رہتی ہے۔"

۳۔ علاوہ ازیں جب بھی تصنیف کا کام شروع فرماتے شرحِ صدر کے لیے دُعا مانگتے اور اگر کبھی وقت کسی وجہ سے کسی امر میں شرحِ صدر نہ ہوتا تو صاف لکھ دیتے کہ اس سے بہتر بات اگر کہیں مِل جائے تو اسی کو اختیار کیا جائے۔ جیسا کہ تفسیر بیان القرآن لکھنے کے دَوران میں سورۃ برأت اور سورۃ حشر کے مقام پر ہُوا اور آپ نے وہاں صاف لکھ دیا کہ اس سے بہتر تفسیر اگر کہیں مِل جائے تو اس کو ترجیح دی جائے جس کی مثال اہلِ علم میں چراغ لے کر ڈھونڈنے سے بھی نہیں ملے گی۔

۴۔ تصنیف کے دَوران میں تحقیق کا اتنا اہتمام فرماتے کہ بہت ہی مختصر سی بات معلوم کرنے کے لیے بعض کتب دُوسرے مقامات سے بڑے اہتمام اور خرچ سے منگواتے اور ان کی مدد سے ذرا سی عبارت لکھ کر فوراً واپس فرماتے۔ چنانچہ احیاء السنن کی تالیف میں آپ نے ہزاروں روپے لگا دیئے۔

۵۔ پھر ہر کتاب کو جامع و مانع اور سلیس و واضح بنانے میں بڑا تعب فرماتے۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کی مختصر عبارت بھی اظہارِ مدعا کے لیے بالکل کافی ووافی ہوتی۔ اور پھر اس میں یہ احتیاط بھی لازماً فرماتے کہ میری کسی تحریر سے کسی زمانہ میں کسی کو کسی قسم کا ضرر نہ پہنچنے پائے۔ جس کی بہترین مثال آپ کی کتاب "حیات المسلمین" ہے۔

غیبی دستگیری

اس جدوجہد کے ساتھ ساتھ غیبی دستگیری کی یہ کیفیت تھی کہ :-

۱۔ حق تعالےٰ نے آپ کو شروع سے ہی تصنیف کا ملکہ عطا فرما رکھا تھا جس کی وجہ سے آپ نے طالب علمی کے زمانہ میں ہی "مثنوی زیروبم" لکھی۔

۲۔ دُوسری صُورت امدادِ غیبی کی یہ تھی کہ حضرت کو کسی مضمون کے سوچنے کی زیادہ ضرورت نہ پڑتی۔ مضامین خود بخود ذہن میں اُترنے لگتے اور آپ اکثر بڑے بڑے غامض مضامین کو بھی قلم برداشتہ ہی لکھتے چلے جاتے۔ گو اس میں بشرطِ ضرورت بعد میں اضافہ و ترمیم بھی فرماتے۔ ممکن ہے بعض کے نزدیک یہ نقص کی علامت ہو مگر اس بارہ میں ایک ماہر کی رائے یہ ہے کہ :۔

"یہ نقص نہیں بلکہ کمال ہے۔ کیونکہ یہ ذہن کی جولانی کی علامت ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ذہن خوب چلتا ہے اور کسی مقام پر رُکتا نہیں۔ بلکہ ترقی کرکے آگے کو بڑھتا رہتا ہے۔"

۳۔ تیسری غیبی امداد وقت کی برکت تھی۔ جس کا سبب انضباطِ اوقات تھا کہ جب تصنیف کا وقت آتا۔ طبیعت دُوسرے مشاغل سے فرصت حاصل کرنے کے لیے بے قرار ہو جاتی خواہ اس وقت کوئی بزرگ یا اُستاد ہی کیوں نہ بیٹھا ہو۔ جس کی تفصیل "عادات" کے باب میں بضمن "عمل میں مداومت" گذر چکی ہے۔ اور آپ اس وقت خود کو فارغ کرکے تصنیف کے کام میں مصروف ہونے پر مجبور ہو جاتے۔

۴۔ چوتھی غیبی امداد یہ تھی کہ موانعات پیش نہ آتے۔ چنانچہ آپ فرماتے تھے کہ :۔
"تفسیر بیان القرآن لکھنے کے زمانہ میں جو اڑھائی سال کے عرصہ میں مکمل ہوئی میرا کبھی کان بھی گرم نہیں ہوا۔ حالانکہ اس زمانہ میں یہاں طاعون کی بہت کثرت رہی۔"

۵۔ پانچویں غیبی امداد یہ تھی کہ ضرورت کا سامان بلا تعب خود بخود ہو جاتا تھا۔ مثلاً کسی

حوالے کی ضرورت درپیش ہوتی۔ تو ذہن میں فی الفور اس کتاب اور اس کے صفحات کی تصویر کھینچ جاتی۔ اور اگر کوئی بات کتاب سے معلوم ہونے والی نہ ہوتی تو جس سے معلوم کرنی ہوتی۔ قدرت اسے اسی وقت آپ کے پاس بھیج دیتی چنانچہ ایک بار مثنوی شریف کی شرح لکھتے وقت کبوتر بازوں کی کسی اصطلاح یا عام عادت کے معلوم کرنے کی ضرورت پڑی تو حضرت کو تشویش ہوئی کہ اب کبوتر باز کہاں سے تلاش کیا جائے۔ بس اس تشویش کا پیدا ہونا تھا کہ اس وقت ایک کبوتر باز آیا اور اس نے ایک تعویز کی درخواست کی۔ حضرت اسے جانتے تھے۔ اس لیے آپ نے اس سے وہ دریافت طلب امر پوچھ لیا۔ جس سے مثنوی شریف کا وہ مقام فوراً حل ہو گیا اور اس واقعہ کا بھی اس مقام پر ذکر فرما دیا۔

شعر و شاعری

چونکہ آپ کے تصنیفی کام کا آغاز شعر و شاعری سے ہوا اس لیے اس کا ذکر پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے۔ آپ کو نظم کا ملکہ اور سلیقہ تو بفضل تعالےٰ خوب تھا۔ مگر آپ نے اسے دوسرے شعرا کی طرح مقصود زندگی نہ بنایا تھا۔ اس سلسلہ کی تفصیلات صرف اتنی ہیں کہ :-

۱۔ طالب علمی کے زمانہ میں آپ نے نفس انسانی کی بصیرت افروز حکایت ایک بیوقوف عاشق اور چالاک معشوق کے قصہ کے طور پر "مثنوی زیر و بم" کے نام سے فارسی میں لکھی۔

۲۔ قیام مکہ کے دوران میں آپ نے حضرت حاجی امداد اللہ قدس سرہٗ کے ایما پر حضرت ابن عطاء سکندری کی کتاب تنویر کا اردو ترجمہ "اکسیر فی اثبات التقدیر" کے نام سے اس طرح کیا کہ نثر کا ترجمہ نثر میں اور عربی نظم کا ترجمہ اردو نظم میں۔

۳۔ بچوں کو تجوید کے عام مسائل ذہن نشین کرانے کے لیے تجوید القرآن کے نام سے

ایک مختصر منظوم رسالہ تصنیف فرمایا۔

۴۔ آپ نے ایک شجرہ بھی نظم فرمایا۔

۵۔ مکہ معظمہ کے قیام کے دَوران میں آپ نے غلبۂ توحید میں ایک نہایت ہی پُرکیف غزل اردو میں لکھی جو سرتاسر توحید وجودی کے مضامین کی حامل تھی۔ چونکہ حالتِ استغراق کی وجہ سے اس غزل کا عنوان خلافِ ظاہر تھا۔ اس لیے آپ نے اس سے رجُوع فرمایا اور اسے شائع کرنے کی اجازت نہ دی۔ آپ کے شیخ حضرت حاجی صاحب کو یہ اتنی پسند آئی کہ بعض مشائخ جو انہیں ملنے آئے۔ تو حاجی صاحب نے فرمائش کر کے خاص طور پر وُہ نظم ان کو حضرت کی زبانی سُنائی اور فرمایا "یہ محض قال نہیں۔ ان کا حال ہے۔" اس غزل کے صرف مندرجہ ذیل دو شعر آپ نے صاحب اشرف السوانح کو نقل کرنے کی اجازت دی :۔

خودی جب تک رہی اس کو نہ پایا ۔۔۔ جب اس کو ڈھونڈ پایا خود عدم تھے
حقیقت کیا تمھاری تھی میاں آہ ۔۔۔ یہ سب امداد کے لطف و کرم تھے

آہ آپ کا تخلص تھا اور امداد حضرت حاجی صاحب کا۔ جن کا نعتیہ کلام "گلزار معرفت" کے نام سے شائع ہوا ہے۔

ایک مرتبہ مولوی مسعُود علی صاحب ندوی تھانہ بھون میں مقیم تھے۔ مولانا سلیمان ندوی نے انہیں اپنے حاضر ہونے کے اطلاع نامہ میں ریاض مرحوم کا یہ مصرعہ بھی لکھ دیا ؎

زندگی ہے تو فقیروں کا بھی پھیرا ہوگا

جو اُنھوں نے حضرت کو بھی سُنا دیا۔ آپ نے سُنتے ہی اسے فی الفور بدل کر فرمایا ؎

زندگی ہے تو سلیمان کا بھی پھیرا ہوگا

ایک مرتبہ حضرت نے سید صاحب موصوف کو ایک تسبیح عنایت فرمائی۔ جس پر

سید صاحب موصوف نے یہ شعر موزوں کیا ؎

خواجہ بخشید مرا سبحۂ صد دانہ بلطف
دانہ انداخت و در حلقہ مرا کرد اسیر

وصل بلگرامی نے موقعہ پاکر یہ شعر حضرت کو بھی سُنا دیا۔ تو آپ نے فرمایا کہ بھئی مجھے بھی اس کا جواب لکھنا پڑے گا۔ چنانچہ جس وقت سید صاحب نے حضرت کی تحریک و اشارہ کیے بغیر اپنے ذاتی احساس سے مجبور ہو کر سیرۃ النبیؐ کے بعض مقامات سے رجوع و اعتراف کا اعلان "معارف" میں شائع فرمایا تو اس کی اطلاع پاکر حضرت بڑے مسرور ہوئے اور مثنوی کے وزن پر یہ دس شعر لکھ کر سید صاحب کو بھیج دیئے جن کا عنوان تھا :-

اعتراف (یعنی اخذ اعلان)   از اعتراف (یعنی سید سلیمان)

لمثل هذا فليعمل العاملون   وفی ذالك فيتنافس المتنافسون

(اقتباس ترغیب دلپذیر۔ از مثنوی رومی بتصرف یسیر)

از سلیمان گیر اخلاصِ عمل   واں تو ندوی را منزہ از دغل
اے دلت معمور از اسرارِ حق   اے دلت مخمور از آثارِ حق
اے دلت پر نور از انوار حق   اے دلت مسرور از اخبارِ حق
صد مبارک باد ایں اظہارِ حق   صد مبارک باد ایں اقرارِ حق
لیک باشد ایں طریق نفع خاص   کہ بہ اہلِ علم دارد اختصاص
سعی نفع عام اینجا واجب است   آنکہ نافع بہر ہر طالب است
در کلامِ خود نظر خود کردنی   یا کہ نقادے بدست آوردنی
ہمچناں کردم بہ تالیفات خویش   صرف ہم کردم پئے او نقد بیش
گرچہ ناظم نیستم ابیات را   نثر کردم لیک ایں جذبات را

مقصدِ من خیر خواہی ہست و بس
بو کہ بار غبت فتد در گوش کس

(اشرف علی ۲۷ محرم ۱۳۶۱ھ)

یہ آپ کی آخری نظم تھی۔ مگر وفات سے چند روز قبل ایک آخری شعر اور ہُوا جس کی تفصیل یہ ہے۔ کہ ہندوستان کے مشہور شاعر جگر مرادآبادی نے اپنی ایک فارسی غزل جو انہیں بہت ہی پسند تھی۔ عقیدۃً حضرت کی خدمت میں لکھ بھیجی جس کا ایک مصرعہ یہ تھا ؏

نہ بہ مطربے نہ بہ شاہد ے۔ نہ بہ حاصل غنی خوشم

آپ نے اس کے جواب میں لکھا کہ آپ کے تر اور رنگین جذبات نے میرے ایک خشک جذبہ کو حرکت دیکر مجھ سے بھی ایک شعر کہلوایا۔ جس کو اہلِ کمال کے سامنے پیش کرنا اس لیے مناسب نہیں کہ ایک صورت دعویٰ کی سی ہے لیکن بہ اُمید نفع پیش کرتا ہوں۔ گو وہ شعر رنگین نہیں مگر سنگین ضرور ہے ؎

نہ بہ نظم شاعر خوش غزل۔ نہ بہ نثر ناثر بے بدل
بہ غلامی شہ عز وجل و بعاشقی نبیؐ خوشم

(حیات اشرف ص ۱۱۵)

اس امر کی تصدیق محترم اسد ملتانی کے مکتوب گرامی مورخہ ۳ مارچ ۵۵ء سے بھی ہوتی ہے۔ جس میں آپ لکھتے ہیں کہ :۔

" مولانا تھانویؒ کی شاعری کا مجھے علم ہے۔ ایک دفعہ جگر مرادآبادی نے انہیں اپنی فارسی غزل بعنوان " بہ تشنہ لبی خوشم " لکھ کر بھیجی تھی۔ مولانا نے اس پر ایک شعر بعنوان " بہ عشقِ نبی خوشم " کا اضافہ فرما دیا۔ مدت ہُوئی۔ دہلی میں جگر صاحب نے وہ اصل خط مجھے دکھایا تھا۔"

حضرت تھانویؒ اپنی ہر چھوٹی بڑی تصنیف یا وعظ یا تحریر کا نام بڑے اہتمام سے رکھتے تھے اور ان ناموں کی اپنے پاس یادداشت رکھتے تھے اور وقتاً فوقتاً شائع فرماتے رہتے تھے۔ تاکہ ناموں کا تکرار نہ ہو اور فہرست محفوظ رہنے کی صورت میں کوئی تصنیف غلط طور پر آپ کی طرف منسوب نہ کی جا سکے۔ مگر نام اکثر عربی ہوتے تھے جنھیں اب عام فہم بنانے کی یہ بہتر صورت ہے کہ ان کا مترادف اُردو نام سرخی سے اور اصلی نام خفی سرخی سے سرورق پر لکھ دیا جائے۔ جیسے ہم نے "نشر الطیب فی ذکر الحبیب" کا نام "حبیب خدا" رکھا۔ اور حل الاشتباہات کا نام "اسلام اور عقلیات تجویز ہوا۔

اُردو نوازی

حضرت تھانویؒ نے دین کی خدمت اور اصلاح کے مہتم بالشان کام کے لیے زبان اُردو کو ہی انتخاب کیا۔ وہی اُردو۔

۱۔ جس نے شاہ جہان کے زیرِ سایہ نشو و نما پائی۔

۲۔ جس میں سب سے پہلے ایک مذہبی خیالات رکھنے والے شہنشاہ عالمگیر نے شعر کہے۔

۳۔ جس میں سب سے پہلے مولانا شاہ عبدالقادرؒ اور مولانا شاہ رفیع الدینؒ نے کلام الٰہی کا ترجمہ کیا۔ اوّل الذکر کا ترجمہ کلام اللہ کے اُردو لغات کے لیے ایک بڑی سند اور موخر الذکر کا ترجمہ تراکیب نحوی کے لیے ایک بہت عمدہ دستاویز ثابت ہُوا۔

۴۔ جو آج رُوس۔ یورپ اور امریکہ کی یونیورسٹیوں میں بڑے اہتمام کے ساتھ پڑھائی جاتی ہے اور

۵۔ انگریزی کے بعد عالمگیر حیثیت حاصل کر رہی ہے۔

چنانچہ حضرت تھانویؒ ایسے درویشِ کامل کی نظرِ انتخاب بھی اسی زبان پر پڑی۔

اور آپ نے اسی کو وعظ و تبلیغ اور تالیف و تصنیف کا ذریعہ بنایا۔ جہاں ارباب ندوہ علم کو اُردو کا جامہ پہنانے میں مصروف تھے اور وقت کے ایک بہت بڑے تقاضا کو پورا کرنے میں کوشاں تھے۔ وہاں یہ گوشہ نشین سرمایہ دین کو اُردو میں ذخیرہ کرنے میں پیش پیش تھے اور یہ زبان اردو کی بہت بڑی خوش قسمتی تھی کہ اسے ایسے یگانۂ روزگار مربی مل گئے تھے۔

ذخیرہ اُردو

یوں تو اُردو میں اہلِ قلم کی بہت سی تصانیف و تالیفات موجود ہیں۔ مگر سب سے زیادہ اُردو میں ذخیرہ کس کی کتابوں کا موجود ہے؟ اس سوال کا جواب مورخ اسلام سید سلیمان ندوی کے الفاظ میں یہ ہے کہ :۔

"علمائے اسلام میں ایسے بزرگوں کی کمی نہیں۔ جن کی تصانیف کے اوراق اگر ان کی زندگی کے ایام پر بانٹ دیئے جائیں تو اوراق کی تعداد زندگی کے ایام پر فوقیت لے جائے۔ امام جریری۔ حافظ خطیب بغدادی۔ امام رازی۔ حافظ ابن جوزی۔ حافظ سیوطی وغیرہ متعدد نام اس سلسلہ میں لیے جا سکتے ہیں۔ ہندوستان میں مولانا ابو الحسنات عبد الحی فرنگی محلی اور نواب صدیق حسن خاں مرحوم کے نام بھی اس سلسلہ میں داخل ہیں۔ اس سلسلہ کا آخری نام مولانا تھانوی رحمتہ اللہ علیہ کا ہے۔"

چنانچہ ۱۳۵۴ھ میں مولوی محمد عبد الحق صاحب فتحپوری نے بڑی تقطیع کے ۸۶ صفحات کی جو فہرست "تالیفاتِ اشرفیہ" کے نام سے شائع کی تھی۔ اس کی رُو سے آپ کی چھوٹی بڑی سب تصانیف کی تعداد آٹھ سو کے قریب ہے اور اگر اس فہرست میں ان کتابوں کو بھی شامل کر لیا جائے۔ جن کے ذریعہ اہلِ علم نے کسی دینی غرض سے توجہ و تصرف فرمایا۔ یعنی تسہیل مضامین کی یا مختلف مقامات سے مضامین منتخب کر کے یکجا جمع کیے

حضرت کے مضامین کا خلاصہ شائع کیا تو یہ تعداد نو سو سے اوپر جا پہنچتی ہے۔

یہ ساری کتابیں ماسوائے "تجوید القرآن" "مثنوی زیروبم" نثر میں ہیں ان میں سے صرف تیرہ یا چودہ رسائل و کتب عربی زبان میں ہیں۔ تین فارسی زبان میں ہیں اور باقی سب اردو میں ہیں۔

مولانا سید سلیمان ندوی لکھتے ہیں کہ :۔

"یہ صدی جو مطبوعات و منشورات کے کمالات سے مملو ہے اور جس کا اہم کارنامہ خواہ حق کے اثبات و اظہار میں ہو یا باطل کی نشر و اشاعت میں۔ پریس اور مطبع ہی کی برکات ہیں۔ زبان و قلم اس صدی کے مبلغ ہیں اور رسائل و منشورات دعوی کے صحیفے ہیں۔"

اور اس صدی میں ہی زبانِ اردو کو عالمگیر حیثیت حاصل ہوئی اردو انگریزی کی طرح بین الاقوامی زبان بننے لگی۔ اس لیے اس صدی کے مجدد نے بھی اپنے کمالاتِ علمیہ کے لیے اسی زبانِ اردو کا انتخاب فرمایا۔ علوم قرآن۔ علوم حدیث۔ کلام۔ عقائد۔ فقہ۔ فتویٰ۔ سلوک۔ تصوف اور مواعظ کثیرہ کا سب سے زیادہ ذخیرہ حضرت تھانوی نے ہی اردو زبان میں جمع کیا۔ یہاں تک کہ صنفِ نازک کے متعلق بھی سب سے پہلے آپ نے ہی اردو زبان میں اپنا دینی لٹریچر پھیلایا۔ اس سے پہلے ان کے لیے کوئی ایسی کتاب موجود نہ تھی۔ جو زندگی کے ہر شعبہ میں ان کی رہنمائی کر سکتی اور وہ گھر بیٹھے بلا استاد علوم دین سے بہرہ ور ہو سکتیں۔

ترجمۂ قرآن

اسلام میں علم کا اولین سفینہ وصحیفہ قرآن پاک ہے۔ جس کے اردو میں اولین ترجمے حضرت شاہ عبدالقادرؒ اور حضرت شاہ رفیع الدینؒ نے شائع کیے تھے۔ مگر بعد ازاں زمانہ کے بدلتے ہوئے رجحانات اور اپنے جدید عقائد کے تحت سرسید احمد خاں نے بضمن تفسیر اردو میں ترجمہ کیا اور چوتھا اردو ترجمہ شمس العلماء ڈپٹی نذیر احمد نے بھی ایسے ہی حالات

میں کیا۔ ان ہر دو حضرات نے زبان پر تو زیادہ توجہ دی۔ مگر سلف کے طریق و اسلوب کو بالکل نظر انداز کر دیا۔ زمانہ کے تقاضوں اور اپنے اعتقادات کی بنیادوں پر قرآن کریم کے ترجمہ کرنے سے جماعت علماء میں اضطراب کی لہر دوڑ گئی۔ یہاں تک کہ دہلی کے مشہور اخبار نویس مرزا حیرت بھی ڈپٹی صاحب کا ترجمہ دیکھ کر حیرت میں آ گئے اور انھوں نے اس پر اعتراضات کرنے شروع کر دیئے اور جواب میں کسی عالم سے پانچواں اُردو ترجمہ لکھوا کر اپنے نام سے شائع کر دیا حالانکہ وہ عربی سے بالکل نابلد تھے۔

ان حالات نے حضرت تھانویؒ کو اس میدان میں بھی عوام کی رہنمائی کے لیے مجبور کیا اور آپ نے ڈپٹی نذیر احمد کے ترجمہ کی اصلاح کے لیے رسالہ "اصلاح ترجمہ دہلویہ" اور مرزا حیرت کے ترجمہ کی اصلاح کے لیے رسالہ" اصلاح ترجمہ حیرت" کے نام سے شائع کیا۔ آپ نے صرف اسی پر اکتفا نہ کیا۔ بلکہ خود سارے قرآن مجید کا ترجمہ کر دیا جسے اُردو میں بہترین ترجمہ کہنا چاہیئے۔ اس کے متعلق مؤرخ اسلام سید سلیمان ندوی لکھتے ہیں کہ :۔

"قرآن کریم کا سلیس و با محاورہ اُردو ترجمہ جس میں زبان کی سلاست کے ساتھ بیان کی صحت کی احتیاط ایسی کی گئی ہے۔ جس سے بڑے بڑے تراجم خالی ہیں قرآن پاک کا سب سے صحیح ترجمہ حضرت مولانا شاہ رفیع الدین دہلوی کا ہے۔ لیکن وہ بہت ہی لفظی ہے۔ اس لیے عام اُردو خوانوں کے فہم سے باہر ہے۔ مولانا تھانویؒ کے اس ترجمہ میں دونوں خوبیاں یکجا ہیں۔ یعنی ترجمہ صحیح اور زبان فصیح ہے۔ اس ترجمہ میں ایک خاص بات اور ملحوظ رکھی گئی ہے کہ اس زمانہ میں کم فہمی یا ترجموں کی عدم احتیاط کی وجہ سے جو شکوک قرآن پاک کی آیات میں عام پڑھنے والوں کو معلوم ہوتے ہیں۔ ان کا ترجمہ ہی اس میں ایسا کیا گیا ہے کہ کسی تاویل کے بغیر وہ شکوک ہی ان ترجموں کے پڑھنے سے پیش نہ آئیں اور پھر قرآن پاک کے لفظوں سے عدول بھی نہ ہونے پائے۔ اسی لیے

کہیں کہیں مزید تفہیم کی غرض سے قوسین میں ضروری تفسیری الفاظ بھی بڑھا دیے گئے ہیں۔ یہ مولانا کی عظیم الشان خدمت ہے۔" (آثار جامعیت)

یہ صرف مسلمان اور قرآن کی ہی خدمت نہیں بلکہ اُردو زبان کی بھی خدمت ہے۔ جسے حضرت تھانوی کے طفیل ایسا صحیح۔ فصیح اور نادر سرمایہ دستیاب ہو گیا۔

تفسیر بیان القرآن

ترجموں کی طرح حضرت کے بعض ہم عصر علماء نے اُردو میں قرآن شریف پر بعض ایسے حواشی بھی لکھے۔ جن میں ربط آیات کے اظہار کے اہتمام کے ساتھ ساتھ آیات کو تاویل د اعتبار سیاسی مسائل پر منطبق کر دیا۔ جس سے بعض مقامات پر ان کا قلم اعتدال کی حدود سے نکل گیا۔ اس سے حضرت تھانویؒ کو بہت صدمہ پہنچا۔ اور آپ نے ان تاویلات بعیدہ پر "التقصیر فی التفسیر" کے نام سے تنبیہات لکھیں اور اُردو میں اپنی طرف سے ایک ایسی تفسیر بیان القرآن لکھی۔ جس سے صرف عوام ہی نہیں بلکہ علماء بھی مستفید ہوتے رہے اور ہو رہے ہیں کیونکہ کسی عربی کتاب کو اُردو میں بدلنے کا عام طور پر یہی مطلب سمجھا جاتا ہے کہ یہ اُردو خوان طبقہ کی رعایت و سہولت کے لیے لکھی گئی ہے۔ اس میں عربی جاننے والے علماء کو قطعاً لطف نہیں آتا۔ اور حضرت کی تفسیر کے متعلق بھی ایسا ہی خیال آپ کے ہمعصر علماء کو تھا۔ مگر شنیدہ کے بود مانندِ دیدہ جب علومِ قرآن کے ماہر حضرت مولانا انور شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ (جن کا تبحر علمی مسلّم و مشہور تھا) کی اس تفسیر اُردو پر نظر پڑی۔ تو بس وجد میں آ گئے اور فرمایا :-

"بیان القرآن کو دیکھ کر تو مجھے اُردو کتابوں کے پڑھنے کا شوق پیدا ہوا۔ ورنہ میں سمجھتا تھا کہ اُردو کی کتابوں میں علومِ عالیہ کہاں۔ نیز میں سمجھتا تھا کہ اُردو میں یہ تفسیر عوام کے لیے ہو گی۔ مگر یہ تو علماء کے دیکھنے کے قابل ہے۔"

اس سے ظاہر ہے کہ حضرت تھانویؒ نے اُردو ادب میں ایسا بیش بہا اضافہ فرمایا کہ اس زبان سے التفات نہ کرنے والا طبقہ بھی اس کی طرف متوجہ ہونے کے لیے مجبور ہو گیا۔ یہ

تفسیر حضرت نے اڑھائی سال کے عرصہ میں مکمل فرمائی۔ جو بارہ جلدوں پر پھیلی ہوئی ہے۔ مؤرخ سید سلیمان ندوی اس کی حسب ذیل خصوصیات تحریر فرماتے ہیں :۔

"سلیس و بامحاورہ حتی الوسع تحت اللفظ ترجمہ۔ نیچے "ف" کے اشارہ فائدہ سے آیت کی تفسیر۔ تفسیر ہی روایات صحیحہ اور اقوال سلف صالحین کا التزام کیا گیا ہے۔ فقہی اور کلامی مسائل کی توضیح کی گئی ہے۔ لغات اور نحوی ترکیبوں کی تحقیق فرمائی گئی ہے۔ شبہات اور شکوک کا ازالہ کیا گیا ہے۔ صوفیانہ اور ذوقی معارف بھی درج کیے گئے ہیں۔ تمام کتب تفسیر کو سامنے رکھ کر ان میں سے کسی قول کو دلائل سے ترجیح دی گئی ہے۔ ذیل میں اہل علم کے لیے عربی لغات اور نحوی تراکیب کے مشکلات حل لکھے گئے ہیں اور حاشیہ پر عربی میں اعتبارات وحقائق ومعارف الگ لکھے گئے ہیں۔ ماخذوں میں غالباً سب سے زیادہ آلوسی بغدادی حنفی کی تفسیر "روح المعانی" پر اعتبار فرمایا گیا ہے۔ یہ تفسیر اس لحاظ سے حقیقتہً مفید ہے کہ تیرھویں صدی کے وسط میں لکھی گئی ہے۔ اس لیے تمام قدما کی تصانیف کا خلاصہ ہے اور مختلف ومنتشر تحقیقات اس میں یکجا ملتی ہیں۔" (بحوالہ صدر)

یہ عام مشاہدہ کی بات ہے کہ بڑے بڑے ادیب اور اہل قلم سلیس عبارت لکھنے پر قطعاً قادر نہیں ہوتے۔ کیونکہ کچھ علم کا تفوق انہیں نیچے نہیں اترنے دیتا۔ اور کچھ علم کی وسعت انہیں "عامیانہ" زبان استعمال نہیں کرنے دیتی۔ علاوہ ازیں زبان کو سلیس وعام فہم بنانے کے لیے ذرا زیادہ غور و فکر اور تعب ومشقت کی ضرورت ہوتی ہے۔ جس کے وہ عادی نہیں ہوتے۔ مگر حضرت تھانوی مشکل تحریر کو آسان کرنے کے بادشاہ تھے۔ اس لیے آپ نے ترجمہ وتفسیر میں ایسا سادہ اور عام فہم انداز بیان اختیار فرمایا تاکہ اس سے عوام فائدہ اٹھا سکیں۔ طبقۂ علماء میں دینی علوم کو اردو ادب میں آسان اور سلیس زبان میں داخل کرنے کا

شرف حضرت تھانویؒ کو ہی حاصل ہے۔

تجوید و قرائت

آپ نے صرف ترجمہ و تفسیر پر ہی اکتفانہ فرمایا بلکہ اردو ادب میں ایسی کتابوں کا بھی اضافہ فرمایا۔ جن میں

۱۔ قرآن کریم کی تلاوت کرنے والوں کے لیے آداب و ہدایات درج تھیں۔ ملاحظہ ہو آداب القرآن۔

۲۔ قرآن کریم کو ترتیل و تجوید سے پڑھنے کے مسائل درج تھے۔ ملاحظہ ہو۔ جمال القرآن

۳۔ بچوں کے ذہن نشین کرانے کے لیے تجوید کے عام مسائل منظوم کیے گئے تھے۔ ملاحظہ ہو۔ تجوید القرآن۔

۴۔ اوقافِ قرآنی کے بارہ میں قاریوں کے اختلافات کی توجیہ و تطبیق کی گئی تھی۔ ملاحظہ ہو۔ رفع الخلاف فی حکم الاوقاف۔

۵۔ قرائتِ سبع اور اس فن کی تفصیل بتائی گئی تھی۔ ملاحظہ ہو۔ تنشیط الطبع فی اجراء السبع

۶۔ حفاظِ قرآن کو قرآن سنانے میں جو متشابہات پیش آتے ہیں۔ ان سے بچنے کے گر بتلائے گئے تھے۔ ملاحظہ ہو۔ متشابہات القرآن فی التراویح رمضان۔

تاکہ لوگوں میں خود قرآن فہمی کی استعداد پیدا ہو۔

حدیث و تصوّف

اس زمانہ کے فتنوں میں ایک اضافہ تصوف کے غلط تصور نے بھی کیا ہے۔ کہیں قولی و عملی بے قاعدگی کو تصوف سمجھا جاتا ہے۔ کہیں رسوم و بدعات کو تصوف تصور کیا جاتا ہے کہیں کثرتِ اوراد و وظائف کو ہی تصوف قرار دیا جاتا ہے۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ

۱۔ بعضوں کے عقائد خراب ہو گئے ہیں۔

۲۔ بعض شرک میں مبتلا ہو گئے ہیں۔

۳۔ بعض اس سے اتنے متنفر ہو گئے ہیں کہ انھوں نے اسے خلافِ شریعت قرار دے دیا ہے اور بزرگوں کی شان میں گستاخیاں کرنے لگے ہیں۔

۴۔ بعض نے طریقت کو شریعت سے الگ کر دیا ہے کہ یہ اور چیز ہے اور وہ اور چیز چونکہ اِن باتوں کی بنیاد بالعموم ضعیف و موضوع احادیث پر رکھی گئی ہے۔ اس لیے ان سے ایک طرف تو منکرینِ حدیث کو اپنے فتنہ کو ہوا دینے میں مدد ملی ہے۔ اور دوسرے عام طور پر یہ خیال پیدا ہو گیا ہے کہ فنِ سلوک اور اس کے مسائل احادیثِ نبوی سے ثابت نہیں۔

ان حالات و مفاسد سے متاثر ہو کر حضرت تھانوی نے اس کام کی طرف بھی پوری توجہ فرمائی اور اس سلسلہ میں آپ نے یہ گرانقدر کتابیں اردو میں لکھیں :۔

۱۔ **التکشف** :۔ یہ کتاب پانچ جلدوں پر مشتمل ہے۔ اس میں تصوف کی حقیقت کو کتاب و سنت سے ثابت کیا گیا ہے اور حقیقتِ طریقت۔ حقوقِ طریقت۔ تحقیقِ کرامت تحقیقِ مسمریزم۔ تحقیق فری میشن وساوس۔ انوار و تجلیات۔ احکامِ روح۔ وحدۃ الوجود وحدۃ الشہود۔ عینیت و غیریت۔ اخلاق احوال۔ اشغال۔ تعلیمات۔ علامات۔ فضائل۔ عادات رسوم۔ مسائل۔ اقوال۔ توجیہات۔ اصطلاحات وغیرہ کے متعلق ایسی روشنی ڈالی گئی ہے کہ تصوفِ لطیف و تصوف کثیف کی راہیں صاف صاف نظر آنے لگتی ہیں۔

۲۔ **التشرف** :۔ یہ مذکورۃ الصدر کتاب کا عربی حصہ ہے جو نافعیت کے خیال سے عربی میں لکھا گیا۔ جیسا کہ حضرت تھانویؒ کے اس ارشاد سے ظاہر ہے :۔

"اگرچہ افادۂ عام کا تقاضا تھا کہ یہ اردو میں ہوتا۔ مگر یہ عربی عبارت میں اس لیے رکھا گیا کہ اس کے حصہ اوّل و دوم کی اکثر احادیث کی تخریج عراقی و مقاصد حسنہ سے نقل کی گئی ہے۔ اور برکت کی خاطر ان کی عبارت کو نہیں بدلا گیا۔"

اس کے بعد تقریر مسئلہ کے متعلق جو اپنی عبارت ہوتی تھی۔ اس کو بھی اس کے تابع رکھا گیا اور حصہ سوم اسی کی موافقت میں شروع ہو گیا۔ اور افادۂ عام کی

مصلحت اردو ترجمہ سے پوری کردی گئی۔ مگر حرف الف کے اختتام کے بعد دفعۃً یہ بات خیال میں آئی۔ کہ وہ داعی تو رہا نہیں اور بلاضرورت کام زیادہ کرنا پڑتا ہے۔ اور اگر اصل اردو میں لکھا جائے۔ تو بجائے کام زیادہ ہونے کے نفع زیادہ ہو" (ملاحظہ ہو تمہید التشرف حصہ چہارم)

اس سے ظاہر ہے کہ آپ کے پیشِ نظر ہمیشہ نفع رسانی رہی اور وہ بھی اردو کی زبانی رہی غرض کہ اس کتاب کو بھی اردو جامہ پہنا دیا گیا۔ اس میں احادیث کی تحقیق ہے۔ جو کتب تصوف میں یا صوفیائے کرام کے کلام میں آئی ہیں اور یہ دکھلا دیا گیا ہے کہ یہ حدیث کس درجہ کی ہے اور جو روایات دراصل حدیث نہ تھیں۔ بلکہ غلطی سے عوام نے اس کو حدیث مشہور کر رکھا تھا۔ ان کی اصلیت ظاہر فرمانے کے ساتھ ساتھ یہ بھی ظاہر کر دیا گیا کہ بزرگوں کا یہ قول فلاں دلیل شرعی سے ثابت ہے۔ آپ کے مواعظ و ملفوظات میں بھی اس قسم کے ہزاروں مضمون ملتے ہیں۔

۳۔ **اعلاء السنن** :۔ اس کی اس وقت تک بارہ جلدیں شائع ہو چکی ہیں۔ ۹ جلدوں کی اشاعت ہنوز باقی ہے۔ چونکہ غالی اہلِ حدیث حضرات حنفیہ کو یہ طعن دیتے ہیں کہ حنفی مسائل کی تائید میں احادیث بہت کم ہیں اور چونکہ کتبِ احادیث زیادہ تر محدثین اور حضرات شوافع کی لکھی ہوئی ہیں۔ اس لیے ان میں حنفیہ کی مؤید حدیثیں یکجا نہیں ہیں۔ اس لیے اس میں مذہب حنفی کی مؤید حدیثوں کو بڑے استیعاب کے ساتھ جمع کیا گیا اور محدثین اور اہلِ فن کی تحقیقات اس کے شرح و حواشی میں یکجا کیے گئے۔ اور افادۂ عام کے لیے اصل احادیث کا حاشیہ پر اردو میں ترجمہ بھی کر دیا گیا۔

۴۔ **قصد السبیل** :۔ اس میں فن سلوک کے وہ تمام حقائق و معارف جو سالہا سال میں معلوم ہو سکے اور جن کے نہ جاننے سے سالکین و طالبین غلط راستوں پر پڑ کر منزلِ مقصود تک نہ پہنچ سکتے تھے۔ اس طرح لکھ دیئے کہ کوزہ میں دریا بند کر دیا۔

۵۔ **تربیت السالک** :۔ یہ کتاب بڑی تقطیع کی بارہ سو بہتر ۱۲۷۲ صفحات پر مشتمل ہے۔ اور اس میں سالکین کی مشکلاتِ راہ اور شاغلین و ذاکرین کے شبہات و خطراتِ راہ کے لیے ہدایات درج ہیں۔ اس کے متعلق مولانا سیّد سلیمان ندوی لکھتے ہیں کہ :۔

" علومِ مکاشفہ و معاملہ کے متعلق کلیات و جزئیات اور احوال شخصی پر ایسی حاوی کتاب کی نظیر تصوّف کے سارے دفتر میں موجود نہیں۔"

(آثارِ جامعیّت)

اس سے استفادہ کو آسان کرنے کے لیے آپ نے اپنے خلیفہ مجاز حضرت مولانا خیر محمّد صاحب جالندہری سے اس کی تبویب کرائی تاکہ ہر ہر روحانی مرض کے متعدی معالجات یکجا مِل سکیں۔

۶۔ **بلوادر النوادر** : آپ کی آخری تصنیف ہے۔ جو بڑی تقطیع کے ایک ہزار صفحات پر پھیلی ہوئی ہے۔ یہ سفرِ آخرت سے چند روز پہلے شائع ہوئی۔ اس میں قرآن۔ حدیث۔ فقہ اور تصوّف کے ادق مسائل پر آپ کے تین سو ایسے عجیب و غریب نادر اور تحقیقی مضامین درج ہیں۔ جو مختلف تصانیف میں منتشر تھے۔ مگر کسی مستقل تصنیف کا حصّہ نہیں تھے۔ چونکہ وقتاً فوقتاً حوالہ کے لیے ان مضامین کی تلاش و تفحص میں کافی وقت ضائع ہوتا تھا اور بے حد پریشان ہونا پڑتا تھا۔ اس لیے ان تمام نوادرِ علمیہ کو بوادر النوادر میں یکجا کر دیا گیا۔

اس کی اہمیت و افادیت کا اندازہ صرف اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ اس میں بعض ایسے اہم ترین مسائل پر بھی تحقیقات موجود ہیں۔ جن پر حضرت سے قبل کسی نے روشنی نہیں ڈالی۔ ان کے علاوہ دورِ حاضرہ کے پیدا شدہ مسائل مثلاً ہوائی جہاز میں نماز پڑھنا۔ روزہ کی حالت میں انجکشن لگوانا۔ نظم میں قرآن مجید کا ترجمہ کرنا۔ منی آرڈر یا کرنسی نوٹ کے ذریعہ زکوٰۃ ادا کرنا۔ رویتِ ہلال کے متعلق تار کی خبر پر اعتبار کرنا۔ لاوڈ سپیکر وغیرہ کا نماز میں استعمال کرنا۔ سرکاری شرائض

کی ادائیگی کے لیے خفیہ پولیس والوں کا بہروپیا بننا۔ حج کی فلم بنانا اور فلم دیکھنا۔ اخبار نویسی اور اخبار بینی وغیرہ ایسے امور پر تحقیقاتِ شرعیہ درج ہیں۔

۷۔ **احکام القرآن** :۔ یہ حضرت کی وہ غیر مطبوعہ تصنیف ہے جو آپ نے اپنی ہدایات اور نگرانی میں آخری ایام زندگی میں لکھوانی شروع کی تھی۔ مگر افسوس کہ اس کام کی تکمیل حضرت کی حیات میں مقدر نہ تھی۔ آپ کی وفات کے بعد اس کتاب کی تکمیل کا کام مولانا مفتی محمد شفیع صاحب دیوبندی۔ مولانا ظفر احمد عثمانی۔ مولانا جمیل احمد صاحب تھانویؒ اور مولانا محمد ادریس صاحب کاندھلوی نے سنبھال لیا۔ جو حضرت کے بتلائے ہوئے خاکہ پر اس کی تیاری میں مصروف ہو گئے۔ مگر یہ کام ابھی تک پایۂ تکمیل کو نہیں پہنچ سکا۔

اس کی وجۂ تالیف یہ تھی کہ حضرت تھانویؒ کو اس بات کا بڑا اہتمام تھا کہ مذہب حنفی کا موافق کتاب وسُنّت ہونا واضح کیا جائے اور اس بدنامی کا جواب دیا جائے جو غیر مقلدین کی طرف سے شائع کی جاتی ہے کہ مذہب حنفی میں قیاس سے زیادہ کام لیا گیا ہے اور حدیث کی مخالفت کی گئی ہے۔ چنانچہ اس مقصد کو کتاب اعلاء السنن سے پورا کیا گیا اور اس کتاب میں ان فرعی احکام کو جمع کرنا مقصود تھا۔ جو حنفیہ نے قرآن سے اخذ کیے ہیں تاکہ دُنیا پر واضح ہو جائے کہ مذہب حنفیہ میں قیاس سے بہت کم کام لیا گیا ہے۔ چونکہ دُوسروں کی نظر وہاں تک نہیں پہنچتی جہاں حنفیہ کی پہنچتی ہے۔ اس لیے وہ ان مسائل کو بھی جو کتاب وسُنّت سے ماخوذ ہیں۔ قیاس سمجھتے ہیں۔ اس امر کی مزید وضاحت کے لیے آپ ایسے اجتماعی مسائل بھی ایک کتاب میں جمع کر دینا چاہتے تھے۔ جن پر تمام فقہاء کا اتفاق ہے۔ مگر یہ کام صرف خیال کی حد تک رہا۔

۸۔ **ملفوظات** :۔ حضرت تھانویؒ کے ملفوظات کا سلسلہ قریباً ساٹھ مجلدات و رسائل میں مدون ہوا ہے۔ جو آپ کی نظر سے گزار کر چھاپا گیا ہے۔ سید سلیمان ندوی لکھتے ہیں کہ:۔

> ”ان ملفوظات میں بزرگوں کے قصے سنجیدہ لطیفے۔ قرآن وحدیث کی تشریحات مسائل فقہیہ کے بیانات۔ سلوک کے نکتے۔ اکابر کے حالات۔ طالبوں کی ہدایات وتنبیہات

آداب واخلاق کے نکات۔ اصلاحِ نفس وتزکیہ کے مجربات وغیرہ اس خوبی و دلچسپی سے درج ہیں کہ اہلِ شوق کے دل و دماغ دونواس آبِ زلال سے سیراب ہوجاتے ہیں۔" (بحوالہ صدر)

غرضیکہ آپ نے علومِ حدیث وتصوف پر اردو ادب میں ایسی نادر کتابوں کا اضافہ فرمایا ہے کہ سالکین وطالبین کے لیے اہلِ طریق کا کوئی گوشہ اندھیرے میں نہیں رہا۔ اس لیے یہ زبانِ اُردو کے لیے قابلِ فخر سرمایہ سے کم نہیں۔

علومِ فقہ

حضرت تھانویؒ کو مسائلِ فقہ میں تحقیق وتدقیق کا خاص ذوق تھا، جس کی وجہ سے آپ کے استاذِ خاص مولانا محمد یعقوبؒ نے آپ سے طالب علمی کے زمانہ میں ہی افتاء کا کام لینا شروع کر دیا تھا۔ ویسے آپ نے اپنے طور پر باقاعدہ طور پر ۱۳۰۱ھ سے فتویٰ کا کام شروع فرمایا تھا اور پورے ساٹھ سال یعنی ۱۳۶۲ھ تک فقہی خدمات انجام دیتے رہے۔ مگر آپ علومِ فقہ میں مقلد جامد نہ تھے۔ بلکہ آپ نے اس سلسلہ میں نئی نئی راہیں نکالیں اور ایسی ایسی تحقیقات فرمائیں کہ اکابر علماء بھی داد دیے بغیر نہ رہ سکے۔ اس ساٹھ برس کے عرصہ میں آپ نے ہزاروں مسئلوں کے جواب لکھے۔ ہزاروں فتوے دیے۔ سینکڑوں چھوٹے بڑے فقہی رسالے لکھے جو امداد الفتاویٰ کے نام سے متعدد ضخیم جلدوں میں موجود ہیں اور کم از کم ہندوستان میں اپنی نظیر نہیں رکھتے۔

چونکہ آپ کے زمانہ میں نئے نئے دینی اور دنیوی مسائل پیدا ہوگئے تھے۔ جن کے متعلق سابقہ کتب فتاویٰ قریباً خاموش تھیں۔ اس لیے آپ نے ان کے متعلق بھی نہایت بالغ نظری سے فتوے دیے جو حوادث الفتاویٰ اور فتاویٰ اشرفیہ کے نام سے شائع ہوئے اور اس سلسلہ میں عورتوں کے لیے بہشتی زیور کی دس جلدیں اور مردوں کے لیے بہشتی گوہر کی ایک جلد بھی مرتب فرمائی۔ علاوہ ازیں پردہ۔ سُود۔ رشوت۔ بنک۔ بیمہ۔ سینما۔ فلم۔ ریڈیو وغیرہ

ایسے امور پر بھی متعدد فقہی تحقیقاتی رسالے تالیف فرمائے۔

اس سلسلہ کی بے نظیر کتاب ترجیح الراجح ہے۔ اس میں حضرت تھانویؒ نے اپنے اُن مسائل کو جمع فرمایا۔ جن میں از خود یا کسی دُوسرے کے توجہ دلانے سے کوئی تسامح نظر آیا۔ تو اس سے رجُوع فرما کر مسئلہ کی مزید تحقیق فرما کر تصحیح کر دی۔ یہ سلسلہ آپ کی تواضع۔ انصاف پسندی اور شرافت نفس کا مظہر ہے۔ اس طرح آپ نے اس دورِ فتن میں اُردو ادب میں ایک ایسی نظیر قائم فرمائی جس کی متاخرین میں بھی کوئی مثال نہیں ملتی۔ البتہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم تابعین و تبع تابعین اور سلف صالحین میں یہ طریق رائج تھا۔

غرضیکہ اس باب میں بھی آپ نے اُردو ادب میں قابلِ رشک اضافہ فرمایا۔ جس سے نہ صرف عوام بلکہ اہلِ علم بھی مستفید و مستفیض ہو رہے ہیں۔

عِلم الکلام

علم کلام، عقائد اور توحید پر آپ نے متعدد کتابیں اُردو میں لکھیں۔

۱۔ المصالح العقلیہ للاحکام جو تین حصوں پر مشتمل ہے۔ اس میں اسلامی احکام و مسائل کے مصالح و حکم درج ہیں۔

۲۔ الانتباہات المفیدہ عن الاشتباہات الجدیدہ میں جدید تعلیم یافتہ حضرات کے مذہبی وساوس و خدشات کا تسلی بخش جواب لکھا۔ جواب "اسلام اور عقلیات" کے نام سے شائع ہوئی ہے۔

۳۔ اس سلسلہ کی مفید کتاب (رسالہ حمیدیہ مصنفہ شیخ حسین بن محمد جسر طرابلسی متوفی ۱۳۲۷ھ کا اُردو ترجمہ) مولانا محمد اسحاق صاحب سے کرا کر اسلام اور سائنس کے نام سے شائع کرایا۔

ان کے علاوہ چھوٹے چھوٹے کئی رسائل وقتاً فوقتاً حسبِ ضرورت تحریر فرمائے۔ تاکہ عوام تہذیب جدیدہ کے فریب خوردگان کے فتنوں سے بچ سکیں۔ دراصل ایسے لوگوں کے

پیدا کردہ اشکالات و وساوس کا اردو ادب میں توڑ حضرت کی ایسی کتابوں کے سوا اور کہیں تسلّی بخش انداز میں موجود ہی نہیں نہ ہی کسی دوسرے طبقہ کی طرف سے اس طرف اتنی توجہ دی گئی ہے۔ جس کا یہ مستحق ہے۔ اگر اس سلسلہ میں ایک جماعت نے قدم بڑھایا بھی ہے تو وہ چند قدم ہی چل کر اغراض کی دلدل میں ایسی پھنسی ہے کہ اصل مقصد یعنی افادۂ خلق کو بھی بھول گئی ہے۔

اصلاحِ حیات

حضرت تھانوی کا مقصدِ حیات ہی چونکہ اصلاحِ اُمت تھا۔ اس لیے آپ نے ہر شعبۂ حیات کی اصلاح کی طرف توجہ فرمائی۔ عوام کے لیے مواعظ کا سلسلہ شروع فرمایا۔ جن میں سے اکثر ضبطِ تحریر میں لائے گئے۔ ان سے قبل صرف ابن بناقہ اور حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کے چند مواعظ ملتے ہیں۔ مگر ان کے سوا پونے چودہ سو سال کے اندر جن بزرگوں نے وعظ فرمائے۔ ان کا کوئی مستند اور مفید ذخیرہ موجود نہیں ہے اور حضرت تھانویؒ کے چار سو مواعظ مطبوعہ شکل میں موجود ہیں۔ جو احکام اسلامی۔ ردِ بدعات۔ نصائح دلپذیر اور مسلمانوں کے لیے مفید تدابیر و تجاویز پر مشتمل ہیں اور یہ سب کے سب بوقت وعظ لفظ بلفظ قلمبند ہوئے اور حضرت کی نظر سے گزار کر ہی شائع کیے گئے۔

اس سلسلہ کی اہم کتاب حیات المسلمین بھی ہے۔ جس میں قرآن و حدیث کی روشنی میں مسلمانوں کے لیے دینی و دنیوی ترقی و فلاح کا پروگرام پیش کیا گیا ہے۔ اس کتاب کی اہمیت حضرت کے اس ارشاد سے ظاہر ہے کہ "اپنی ساری کتابوں سے اس کتاب کو ذریعہ نجات گمان کرتا ہوں۔" اس کتاب کے مرتب کرنے میں حضرت نے جس قدر محنت فرمائی ویسی کسی اور کتاب کے لیے نہ اٹھائی۔

اس کے علاوہ بھی آپ نے مسلمانوں کی اخلاقی۔ اجتماعی۔ معاشرتی زندگی کی اصلاح اسے اسلامی طریق اور شرعی نہج پر گزارنے کے لیے دیگر بہت سی کتابیں اور رسالے لکھے۔

جن سے نہ صرف صراطِ مستقیم کی طرف راہنمائی ہوتی ہے۔ بلکہ وہ انسان کو منزلِ ہدایت پر پہنچانے کی بھی ضامن ہیں۔ ایسی کتابوں میں اصلاحِ الرسوم۔ اصلاحِ امت۔ اصلاحِ انقلاب۔ اصلاحِ خیال اور صفائی معاملات خاص طور پر مشہور ہیں۔

آپ کی نظرِ توجہ سے محراب و منبر بھی محروم نہیں رہے تھے اور آئمہ مساجد اور خطیبوں کے لیے آپ نے۔

۱۔ **خطبات الاحکام** کے نام سے ایک کتاب مرتب فرمائی۔ جو پچاس خطبات پر مشتمل ہے جن میں اخلاق و عقائد اور ترغیب و ترہیب کے زیادہ مضامین ہیں اس سلسلہ کی دوسری کتاب

۲۔ **الخطب الماثورہ من الآثار المشہورہ** ہے۔ جس میں حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم کے خطبات کو احادیث صحیحہ سے منتخب فرما کر اردو میں منتقل کیا ہے۔ تاکہ جمعہ و عیدین کے موقعہ پر مسنون خطبات پڑھے جائیں۔ اور غیر مستند خطبات پڑھنے سے آئمہ مساجد کو بچایا جائے۔

چونکہ یہ افراط و تفریط کا دور ہے۔ اس لیے ہر معاملہ میں اس کو دخل ہے۔ جس کی وجہ سے بعض ایسے اوراد شائع و مروج ہو گئے ہیں۔ جو غیر شعوری طور پر انسان کو شرک کی حدود میں داخل کر دیتے ہیں۔ مسلمانوں کو اس گناہ سے بچانے کے لیے آپ نے مناجاتِ مقبول مرتب فرمائی۔ جس میں قرآن و حدیث میں وارد دعائیں جمع کر دی گئیں ہیں اور پورے ہفتہ پر ان کو پھیلا کر سات منزلیں مقرر کر دی ہیں۔ تاکہ ہر شخص کو ہر روز پڑھنے میں آسانی رہے اور دیگر مواقع کی دعائیں بھی ساتھ درج ہیں۔ عربی حصہ قربات عند اللہ وعند الرسول کے نام سے موسوم ہے۔ اور اردو حصہ جو نظم پر مشتمل ہے۔ مناجاتِ مقبول کے نام سے یہ کتاب صرف عوام میں ہی مقبول نہ ہوئی بلکہ دربارِ رسالت میں بھی اسے شرفِ قبولیت حاصل ہوا۔ اور حضورؐ نے عزیز الرحمٰن صاحب زمیندار بنچولی ضلع میرٹھ کو عالمِ خواب میں فرمایا

کہ "تم مناجات مقبول جو اشرف علی صاحب نے لکھی ہے۔ پڑھا کرو"۔ بلکہ شریف احمد کنجپورسی ضلع کرنال کو تو خواب میں آپ نے یہ فرمایا کہ :۔

"مولانا اشرف علی صاحب کی کتابوں پر عمل کرتے رہنا اور دوسروں کے کہنے سے مت رُکنا"

تفصیل کے لیے دیکھئے باب منامیات۔ اشرف السوانح جلد سوم۔

عوام کو جاہل پیروں اور دکاندار صوفیوں کے غیر شرعی تعویذ گنڈوں سے بچانے کے لیے اردو میں اعمالِ قرآنی و آثار تبیانی کے نام سے رسالے لکھے۔ جن میں قرآن مجید کی بعض آیات کے ایسے فوائد و خواص درج فرمائے۔ جو بزرگوں کے تجربہ میں آچکے ہیں۔

نوادر علمیہ

غرضیکہ حضرت تھانویؒ نے اردو ادب میں کثیر تعداد میں سنجیدہ۔ پاکیزہ۔ دینی لٹریچر کا اضافہ کر کے اُمتِ مسلمہ کو گمراہی و بے راہ روی سے بچانے اور کتاب و سنت پر چلانے کا اتنا سامان کر دیا ہے۔ جو قیام قیامت تک کے لیے کافی ہے۔ چنانچہ ایک مُوقر جریدہ لکھتا ہے کہ :۔

"آپ نے چالیس پچاس کے قریب وہ مستند دینی کتب تصنیف فرمائی ہیں جن کا جواب اس وقت اسلامی لٹریچر میں موجود نہیں۔ مولانا اس دُنیا سے چلے گئے ہیں لیکن اپنے پیچھے مسلمان قوم کے لیے ایک زبردست علمی اور مذہبی سرمایہ چھوڑ گئے ہیں جو قیامت تک مُسلمانانِ ہند کی رہنمائی کرے گا۔"

ایک دُوسرا جریدہ لکھتا ہے :۔

"مولانا نے متعدد کتابیں تو ایسی تصنیف کی ہیں۔ کہ جن کی نظیر سلف میں بھی نہیں پائی جاتی۔"

کمالِ انشاء

ایک اہلِ علم و اہلِ فضل اور ماہر نفسیات و سیاسیات نے اپنے مشاہدہ کی بنا پر ایک مقالہ "الفیض الجاری" صاحب اشرف السوانح کی استدعا پر لکھا تھا جو اشرف السوانح حصہ سوم ص ۲۲۸ پر درج ہے۔ اس میں وہ لکھتے ہیں :-

"حضرت کی خدمت میں حاضری کے بعد جب سے حضرت کے علوم و معارف کا کچھ اندازہ ہوا۔ اب تو بلا مبالغہ یہ حال ہے۔ "چشم بد بیں نکند بر کس نگاہے"۔ جتنا علم جتنا عمق اور جتنا ذوق و اثر حضرت کی تحریروں میں ملتا ہے کہیں نصیب نہیں۔ حیرت ہوتی ہے کہ اتنی کثیر تصانیف کے باوجود حضرت کا طرزِ تحریر اتنا قلیل الالفاظ، کثیر المعانی کیسے ہے۔ پھر اکثر دیکھیے گا کہ جس معنی و مفہوم کو جس لفظ و عبارت سے ادا فرمایا گیا ہے جو صحت و جامعیت اس میں ہے۔ وہ اس کی جگہ کسی دوسری تعبیر سے نہیں حاصل ہوتی۔ سچ پوچھئے تو انشاء کا کمال یہی ہے۔

باقی مضمون و معانی کے لحاظ سے تو معمولی خطوں سے لے کر ضخیم مجلدات تک میں شاید ہی کوئی لفظ حضرت کے قلم سے خالی تحسین کلام یا عبارت آرائی کے لیے نکلا ہو۔ ہر لفظ اور ہر فقرہ کسی نہ کسی معنوی افادہ کا حامل ہوتا ہے طبیعت میں مضمون و معنی طلب ہو تو پھر حضرت کی تحریر ایسی جاذب و دلچسپ معلوم ہونے لگتی ہے کہ کوئی حرف چھوڑنے کو جی نہیں چاہتا اور آج کل کی کثیر اللفظ و قلیل المعنی انشاء پردازی سے تو سخت توحش و ملال ہونے لگتا ہے"۔

چونکہ صاحب اشرف السوانح نے کسی وجہ سے ان کے نام کو پردہ اخفا میں رکھا ہے اس لیے ہم بھی اس پر سے پردہ اٹھانا مناسب نہیں سمجھتے۔ البتہ اہلِ فہم حضرات اندازِ بیان سے سمجھ جائیں گے۔ کہ یہ کون صاحب ہیں۔

اعجازِ بیان

حضرت تھانوی جب بھی کسی موضوع پر قلم اُٹھاتے تو پھر اس کا کوئی ضروری پہلو نظر انداز نہ ہونے دیتے۔ چنانچہ ایک جریدہ لکھتا ہے کہ حضرت کی :-

"تصنیفات میں بلکہ ہر تحریر میں اہلِ نظر کو یہ معلوم ہوگا کہ مصنف کے سامنے سارے مسائل و مواد یکجا ہیں اور وہ سب کو اپنی اپنی جگہ احتیاط سے رکھتا جاتا ہے عام طور سے یہ ہوتا ہے کہ مصنف جس موضوع پر قلم اُٹھاتا ہے۔ اس کو اس میں ایسا غلو ہو جاتا ہے کہ دُوسرے گوشوں سے اس کو ذہول ہو جاتا ہے۔ حضرت کی تصانیف کی خاص بات یہ ہے کہ قلم ہر ایک کی احتیاط اور رعایت کر کے اور غلو سے بچ کر اس طرح نکلتا ہے کہ جاننے والوں پر حیرت چھا جاتی ہے"۔

علاوہ ازیں ایسے غیر دلآزارانہ، مشفقانہ اور محبوبانہ انداز میں مکمل، مدلل اور مؤثر بحث فرماتے کہ کسی کے لیے گنجائش اعتراض و انکار باقی نہ رہتی۔ کیونکہ دل میں پیدا ہونے والے ہر اشکال کا جواب ساتھ ساتھ مِلتا جاتا۔ جس کی وجہ سے مضامین خود بخود دل نشین ہوتے چلے جاتے اور چھوٹے چھوٹے فقروں میں اس طرح حقائق و معارف کے دریا بند کر دیتے کہ بڑے بڑے اہلِ زبان اور اہلِ قلم دنگ رہ جاتے۔ جس کی کچھ مثالیں "حسنِ تحریر" میں گزر چکی ہیں اور کچھ آئندہ "لطافت و ظرافت" کے باب میں آویں گی۔ چنانچہ البرہان دہلی اپنی اگست ۴۳ء کی اشاعت میں لکھتا ہے :-

"مولانا کی تحریروں میں اسرار و نکات کے علاوہ ایسا عجیب و غریب منطقی اور عقلی استدلال ہوتا ہے کہ بڑے سے بڑا حریف بھی تصدیق و تائید سے کوئی مفر نہیں دیکھتا۔ جس بات کو بیان کرتے ہیں۔ نہایت وثوق اور یقین کے ساتھ بیان کرتے ہیں۔ حضرت مرحوم کی تحریریں اور گفتگوئیں غیر معمولی ذکاوت و فطانت کی آئینہ دار ہوتی تھیں۔ بات سے بات پیدا کرنا اور ہر معاملہ کی

اصل حقیقت کو پہچاننا اُن کی ذہانت کا خاص جوہر تھا۔"

حقِ تصنیف

حضرت تھانوی چونکہ تصنیف و تالیف کا کام اشاعت و خدمتِ دین کی خاطر خالصاً لوجہ اللہ کرتے تھے۔ اس لیے آپ اپنی کسی کتاب کا حقِ تصنیف نہیں لیتے تھے یہاں تک کہ مطبوعہ کتاب مانگنے کے بھی روادار نہ تھے۔ از خود کوئی بھیج دیتا۔ تو قبول فرما لیتے۔ اسی لیے آپ نے اپنی کوئی کتاب نہ خود رجسٹری کرائی۔ نہ کبھی دُوسرے کو رجسٹری کرانے کی اجازت دی۔ بلکہ آپ نے اس سلسلہ میں باقاعدہ طور پر اعلان شائع فرمایا تھا کہ:۔

"چونکہ یہاں کی تصانیف پر کسی سے کچھ حقِ تصنیف وغیرہ نہیں لیا جاتا۔ اس لیے ان کی رجسٹری کرانے کا کسی کو حق حاصل نہیں۔" (یکم جمادی الاولیٰ ۱۳۳۵ھ)

مگر اس کے باوجود دہلی کے ایک مشہور ناشر نے تفسیر بیان القرآن اپنے مطبع کے نام رجسٹری کرالی۔ جسے بالآخر مقدمہ کے ذریعہ اس خود غرضانہ حرکت سے باز رکھا گیا۔

اشاعتِ علم و دین کی خاطر حقِ تصنیف ترک کرنے کے متعلق "البرہان" دہلی اپنی مذکور الصدر اشاعت میں لکھتا ہے کہ:۔

"مولانا کی تصنیفات جو اب تک طبع ہو چکی ہیں۔ ان کی مجموعی قیمت چالیس لاکھ سے کم نہیں ہے۔ مولانا کی سیر چشمی اور فیاضی۔ خلوص اور للّٰہیت کی دلیل اس سے بڑھ کر اور کیا ہو سکتی ہے کہ تصنیفات کی اس غیر معمولی مقبولیت کے باوصف آپ نے کبھی کسی کتاب کا حقِ اشاعت و طبع اپنے لیے محفوظ نہیں رکھا۔ ہر شخص کو ان کے چھاپنے اور طبع کرانے کا اذنِ عام تھا حقیقت یہ ہے۔ کہ اس مادی دُنیا میں مولانا کا صرف یہ ایک عمل ہی ایسا ہے۔ جو آج کل بڑے بڑے نامور علماء کے لیے سرمایہ عبرت اور درسِ موعظت ہو سکتا ہے۔"

مقبولیت عامہ

یہی رسالہ آگے چل کر لکھتا ہے کہ حضرت تھانوی کی :۔

"تصانیف کسی خاص طبقہ کے لیے مخصوص نہیں۔ علماء، فضلا ارباب شریعت اور اصحاب طریقت، مرد اور عورتیں۔ اعلیٰ تعلیم یافتہ اور معمولی اُردو خواں ہر ایک ان سے استفادہ کرسکتا ہے۔ اور اپنے لیے اصلاح ظاہر و باطن کا سامان بنا سکتا ہے۔" اسی لیے آپ کی کتابیں لاکھوں کی تعداد میں ہر زمانہ میں شائع ہوتی رہتی ہیں اور اس معاملہ میں ہندو پاکستان میں یہ شرفِ اولیت صرف حضرت تھانوی کو ہی حاصل ہے اور کسی مصنّف کی اس قدر کتابیں آج تک شائع نہیں ہوئیں۔ اسی لیے ایک موقر جریدہ لکھتا ہے کہ :۔

"مولانا کے ترجمۂ قرآن پاک اور کتب کی مقبولیت اور ہر دلعزیزی کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ آج ہندوستانی مسلمانوں کا ایک گھر بھی ایسا نہیں ہے۔ جس میں مولانا مرحوم کا مترجم قرآن مجید اور دینی کُتب موجود نہ ہوں۔"

اُردو کے محسنِ اعظم

ایسے حالات میں جبکہ حضرت تھانوی نے

۱۔ اُردو لٹریچر میں بے نظیر۔ دل پذیر اور کثیر اسلامی لٹریچر کا اضافہ کیا ہو۔

۲۔ خلق اللہ کو اس سے کثیر دینی اور دنیوی فائدہ پہنچایا ہو۔

۳۔ لاکھوں روپے کا حق تصنیف چھوڑ کر اُردو ادب کی نشر و اشاعت کرنے والوں کے لیے معقول روزگار مہیا کیا ہو۔

تو کوئی وجہ نہیں کہ اُردو ادب کی تاریخ لکھنے والا حضرت تھانویؒ کو اردو کا محسن اعظم قرار دیتے ہوئے محسنانِ اُردو ادب کی فہرست میں آپ کا نامِ نامی سرِ فہرست نہ رکھے۔

ظرافت و لطافت

حقیقتِ مزاح

صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین مجلس نبویؐ کی ایک خصوصیت یہ بھی بیان فرماتے تھے کہ جن باتوں پر لوگ ہنستے تھے۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم بھی ان کے ساتھ ہنسنے میں شریک ہو جاتے تھے۔ اور جن باتوں پر لوگ متعجب ہوتے تھے۔ حضورؐ بھی ان کے ساتھ اظہارِ تعجب فرماتے تھے اور جب کوئی مزاح کا موقع پیدا ہو جاتا تو بڑی بے تکلفی سے نہایت ہی لطیف و پاکیزہ مزاح بھی فرماتے تھے۔ جسے بعض ظاہر بین حضرات شانِ نبوت کے خلاف سمجھتے ہیں۔ بلکہ ایک مرتبہ ملکہ وکٹوریہ نے بھی حضرت تھانویؒ سے خواب میں یہی سوال کیا کہ :-

"مجھے اسلام حق مذہب معلوم ہوتا ہے مگر یہ بات سمجھ میں نہیں آئی کہ پیغمبر اسلام لوگوں سے مذاق کیوں کرتے تھے۔ نبوت تو بڑی چیز ہے۔ عام تہذیب میں بھی اس کو اچھا نہیں سمجھا جاتا"۔

حضرت تھانویؒ کا دماغ جس طرح عالمِ بیداری میں کام کرتا تھا۔ اسی طرح عالمِ خواب میں بھی مصروفِ کار رہتا تھا۔ آپ ماشاء اللہ حاضر جواب تو تھے ہی۔ فوراً ملکہ کو حالتِ خواب میں جواب دیا کہ :-

"اس سے لوگوں کو مانوس بنانا مقصود تھا۔ ورنہ حضورؐ کے رعب سے لوگ کھل کر دل کی بات نہ کہہ سکتے"۔

اس جواب سے ملکہ مطمئن ہو گئی اور اس کا اشکال رفع ہو گیا۔

اسی طرح بعض کم فہم ظرافت کو شانِ درویشی یا علم وفضل کے منافی سمجھتے ہیں۔ حالانکہ متین ولطیف ظرافت شگفتہ مزاجی کی دلیل ہوتی ہے۔

حقیقتِ بدخلقی

حضرت تھانویؒ کو ان کے نادان دوستوں اور غالی عقیدت مندوں نے تندمزاج اور خشک مشہور کر رکھا تھا۔ مگر مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی نے اپنے تعلقات کے دوران میں اُلٹ پایا۔ اس لیے اُنھوں نے حضرت تھانوی کے حُسنِ اخلاق اور آپ کی ذاتی عنایتوں اور شفقتوں سے متاثر ہو کر ایک دفعہ آپ کو لکھا کہ :-

"وہ کتنے ظالم اور بے درد لوگ ہیں جو ایسے سرچشمۂ لینت کو خشک مزاج کہتے ہیں۔"

حضرت تھانویؒ نے اس کی حقیقت بیان کرتے ہوئے تحریر فرمایا کہ :-

"مجھ کو خشک مزاج کہنے والے ایسے ہی معذور ہیں جیسے کوئی غریق شناور کو نسبتاً خشک کہے اور اصل تو یہ ہے کہ جو شخص ان لوگوں کا تابع نہ ہو وہ خشک و بدخلق ہے۔" (حکیم الامت ص ۳۷)

ظرافتِ طبع

حضرت تھانوی لطیفہ گوئی۔ بذلہ سنجی اور مزاج لطیف کے بادشاہ تھے۔ اور اپنے ملنے والوں سے اکثر باپں شیخوخت وخشونت نہایت لطیف وپاکیزہ مزاح فرمایا کرتے تھے۔ جس سے چہروں پر بشاشت کھیلنے لگتی تھی اور مرغوب طبائع زیادہ مانوس ہو جاتی تھیں۔ مندرجہ ذیل چند مثالوں سے اس کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے :-

۱۔ ایک مرتبہ منصب افتاء کی ذمہ داریوں کا ذکر ہو رہا تھا۔ فرمانے لگے کہ مفتی ہونا بھی قیمتی کا کام ہے۔ مفتی کا نہیں۔

۲۔ عرض کیا گیا کہ فلاں صاحب کو اپنے ابدال ہونے کا خیال ہو گیا ہے۔ فرمایا۔ ہاں!

پہلے گوشت تھے۔ اب دال ہو گئے ہیں۔

۳۔ ایک مرتبہ حضرت مولانا خیر محمد صاحب اپنے چند دوستوں کے ساتھ خانقاہ میں حاضر ہوئے۔ انھیں آتا دیکھ کر فرمانے لگے۔ انجن تو چھوٹا سا ہے۔ مگر گاڑیاں بہت سی کھینچے لا رہا ہے۔

۴۔ شملہ کے سفر کے بعد وہاں کی غالب برائیوں کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ ہم تو سنا کرتے تھے کہ شملہ بمقدار علم ہو گا۔ لیکن وہاں پہنچ کر معلوم ہوا کہ شملہ بمقدار جہل ہے۔

۵۔ نئی تہذیب کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ یہ تہذیب نہیں۔ تعذیب ہے اور آج کل کی ہمدردی نہیں ہمہ دردی ہے۔

۶۔ خواجہ عزیز الحسن مجذوبؒ نے آپ کو طویل خط لکھنے کی معذرت چاہی۔ تو فرمایا کہیں طول زلفِ محبوب بھی کسی کو ناگوار گزرتا ہے۔

۷۔ ایک بار مولانا عبد الماجد صاحب نے آپ کو لکھا کہ انگریزی ترجمہ قرآن کا انشاء اللہ رمضان سے کروں گا تو آپ نے جواب میں تحریر فرمایا کہ اس خبر سے تو میری رمضان میں ہی عید ہو گئی۔

۸۔ ایک مرتبہ ایک صاحب سے تحریکِ خلافت پر گفتگو فرما رہے تھے تو آپ نے فرمایا کہ بلا امیر المومنین کچھ نہیں ہو سکتا۔ انھوں نے کہا کہ ہم آپ کو امیر المومنین بناتے ہیں۔ فرمایا جب تک امیر المومنین میں قوتِ قہریہ نہ ہو۔ وہ امیر المومنین ہی نہیں۔ میں ایسا امیر المومنین نہیں بننا چاہتا کہ آج تو امیر المومنین بنوں اور کل کو اسیر الکافرین ہو جاؤں۔

۹۔ مولانا عبد الماجد صاحب دریا بادی نے اپنے ہم نام مولانا عبد الماجد بدایونی کی وفات پر حضرت کو دعا کے لیے لکھا۔ حالانکہ ان کا دل حضرت سے قطعاً صاف نہ تھا حضرت

نے جواباً تحریر فرمایا کہ میں نے دُعا کر دی ہے کہ :۔

" اے اللہ میں نے سب کچھ ان کو معاف کیا۔ آپ بھی معاف فرما دیں اور ان کو تو ایک خاص امتیاز حاصل تھا کہ وہ بدایوں کے متوطن تھے۔ جو ہمارے شیخ المشائخ حضرت سُلطان جی کا وطن ہے۔ میں تو اکثر اہل بدایوں کے لیے یہ سمجھ کر ایسے اُمور گوارا کرتا ہوں کہ بدا۔ یوں۔ ہی تھا"

اس پر مولانا عبدالماجد صاحب تبصرہ کرتے ہُوئے لکھتے ہیں کہ :۔

مولانا (وہی خشک مزاجی کے لیے بدنام مولانا) رعایتِ لفظی کے اُستاد ماہر تھے۔ بدایوں کی مناسبت سے پُورا فقرہ بدا۔ یوں۔ ہی تھا۔ کیا خُوب کہا

(حکیم الامت صـ۲۲۰)

۱۰۔ مولانا عبدالماجد دریابادی نے آپ کو ایک خط میں لکھا کہ :۔

اَب تو یہ تجربہ بار بار ہو چکا ہے کہ اِدھر دُعا کے لیے عریضہ روانہ ہُوا۔ اُدھر قبولِ دُعاء کے آثار نمایاں ہو گئے اور حضرت رُومیؒ کے قول کی تصدیق ہو گئی ؎

تو چنیں خواہی خدا خواہد چنیں

می دھد یزداں مرادِ متقین

جس کے جواب میں آپ نے تحریر فرمایا کہ :۔

" جب تک میرے پاس خط نہ پہنچے۔ اس وقت تک تو چنیں خواہی کا مصداق آپ ہوں گے۔ الحمد للہ تواضع کے بعد ایک کمال کا تو اقرار کیا"

مولانا جس لطیف انداز سے مزاح فرماتے رہتے اس کی مثالیں تو اُوپر بھی جابجا گذر چکی ہیں۔ باقی یہ تو چنیں خواہی کے تحت میں لطیفہ تو بھُولنے والی چیز نہیں

(حکیم الامت صـ۲۲۴)

۱۱۔ ماسٹر محمد شریف صاحب نے لکھا کہ حضرت اَب کھانسی کا کیا حال ہے تو تحریر

فرمایا کہ کھانسی کو جانسی بھیج دیا ہے۔

۱۲۔ ماسٹر صاحب موصوف نے ایک اور خط میں گھر کے لیے تعویذ مانگا کہ اللہ تعالےٰ دردِزہ سے محفوظ رکھے۔ تحریر فرمایا کہ جب درد ہی نہ ہوگا تو بچہ کیسے پیدا ہوگا۔ کسی دائی مائی سے پوچھو۔

لطافت طبع

حضرت تھانوی کی زبان فیض ترجمان اور قلم حقیقت رقم سے اکثر ایسے چھوٹے چھوٹے فقرے نکلا کرتے تھے۔ جن کے ذریعہ آپ کثافت کو لطافت میں بدل دیتے تھے۔ جیسا کہ مندرجہ ذیل مثالوں سے ظاہر ہے۔

۱۔ ایک طالب علم نے لکھا ہے کہ میں نے اپنے قلب کو آپ کی تنبیہ کے بعد ایسا پایا جیسے اس کے اندر گوہ در گوہ ہو رہا ہو۔ آپ نے جواب بھیجا کہ :۔
"مبارک ہو۔ یہ گوہ خاکساری کی خاک سے مل کر کھاد کا کام دے گا اور ایسی اجناس پیدا ہوں گی کہ روحانی غذا ہو جاویں گی"۔

۲۔ ایک طالب علم نے شکایت کی کہ میں تو بالکل کورا ہو گیا ہوں۔ فرمایا کورا ہونا بُرا نہیں کور ہونا بُرا ہے۔ بلا سے کورا ہو۔ کور نہ ہو۔

۳۔ ایک طالب علم نے غلبہ خشیت میں لکھا کہ مجھے سخت خطرہ درپیش ہے۔ آپ نے تحریر فرمایا کہ یہ خطرہ تو بحرِ معرفت کا خطرہ ہے۔ اللہ تعالیٰ اس کو بڑھا کر دریا کر دے۔

۴۔ اس سلسلہ میں ایک اور نے لکھا کہ سخت اُلجھن ہے۔ تحریر فرمایا کہ یہ اُلجھن تو مقدمہ ہے۔ سُلجھن کا اِنَّ مَعَ الْعُسْرِ یُسْرًا۔

۵۔ ایک مرتبہ فرمایا کہ اس طریق میں خود رائی نہ کرے، بلکہ خود کو رائی کرے یعنی اپنے کو حقیر و ذلیل سمجھے۔ بس دُھن اور دھیان میں رہے۔

۶۔ فرمایا آج کل لوگوں کی نظر مال پر تو ہے۔ مآل پر نہیں۔

۷۔ ایک طالب نے عبادت میں کسل اور سستی کا علاج پوچھا۔ تحریر فرمایا کہ سستی کا علاج چستی۔

۸۔ اسی طرح کسی نے درشتی کی شکایت کی۔ فرمایا درشتی ہی سے تو درستی ہوتی ہے۔

۹۔ ماسٹر محمد شریف صاحب نے ایک مرتبہ ایک امر کے متعلق لکھا کہ اس میں پریشانی مذموم تو نہیں تو تحریر فرمایا کہ اس سے بعض اوقات پرے کی شان مل جاتی ہے۔

اختصار و جامعیت

حضرت تھانوی کی زبان فیض ترجمان اور قلم ہدایت رقم سے ایسے چھوٹے چھوٹے فقرے بھی بکثرت نکلتے رہتے تھے جو علم و معرفت کے دریا کو کوزہ میں بند کرنے کے مصداق ہوتے تھے۔ جیسا کہ "حکیم الامت" کے مندرجہ ذیل اقتباسات سے ظاہر ہے:۔

۱۔ ایک مرتبہ السٹرٹیڈ ویکلی آف انڈیا (بمبئی) میں حضرت خالد بن ولید کے متعلق ایک نہایت ہی بیہودہ افسانہ شائع ہوا۔ جس کا جواب دارالمصنّفین اعظم گڑھ کے رفیق مولانا شاہ معین الدین احمد نے "معارف" میں شائع کیا۔ اسے پڑھ کر لکھا کہ:۔

"بہت کافی بلکہ شافی وافی اور شبہات کا کافی جواب لکھا ہے۔"

۲۔ مولانا دریابادی نے ایک مرتبہ زیادہ کھانا بھیج دیا جو دونوں گھروں میں بھیجنے کے بعد بچ رہا۔ اس پر انہیں رسید "لکھا کہ:۔

"حقیقت تو اس کی تالف تھی مگر صورت اس کی تکلف کی ہو گئی۔"

۳۔ ایک دفعہ دو شادیوں پر جو گفتگو چلی تو فرمایا کہ:۔

"دو بیویوں کا نبھانا سلطنت کے چلانے سے زیادہ مشکل کام ہے۔"

۴۔ مولانا موصوف نے لکھا کہ گو جتنی محنت کو دل چاہتا ہے ابھی اس کا نصف بھی

لیے بھی اور اس کے لیے بھی جو ولی سے اس کا طالب ہو۔ ولی کے لیے تو یہ ضرور ہے۔ کہ اس میں مشاہدہ حق سے مشاہدۂ خلق کی طرف اُتر پڑتا ہے اور یہ بالا مقام سے پستی کی طرف انحطاط ہے اور طالب کا ضرر یہ ہے کہ کشف و کرامات کا طالب وہی ہوتا ہے جس کی محبت حقیقی نہیں ہوتی ۔"

(تبریز ترجمہ ابریز صـ ۲۹)

مگر بقول حضرت تھانویؒ :۔

آجکل لوگ اپنے شیخ کی ہر عجیب بات کو کرامت میں داخل کر لیتے ہیں۔ حالانکہ ہر عجیب بات کرامت نہیں ہو سکتی بلکہ کرامت وہ خارق عادت ہے کہ جس کے اندر یہ تاویل ہی نہ ہو سکے کہ اس واقعہ کا سبب اسباب طبیعہ میں سے کوئی سبب ہے۔ حتیٰ کہ اس میں خود اُن بزرگ کے تصرّف کا بھی احتمال نہ ہو ۔"

واقعاتِ کرامت

واقعات تبلاتے ہیں کہ

۱۔ آپ کی برادری کی ایک عورت پر جن کا اثر ہوا۔ اس نے آپ سے تعویذ کی درخواست کی۔ آپ نے بفراست یہ تو معلوم کر لیا کہ یہ جن کی شرارت ہے مگر چونکہ آپ عامل نہ تھے۔ اس لیے تعویذ دینے میں عذر فرمایا۔ جب اس کا اصرار بڑھا تو آپ نے بھی اپنے جد اعلیٰ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی طرح جنھوں نے دریائے نیل کے نام خط لکھا تھا۔ اس جن کے نام ایک خط تحریر فرمایا کہ :۔

" اگر تم مسلمان ہو تو میں تم کو قرآن و حدیث کی وہ وعیدیں یاد دلاتا ہوں جو کسی کو ستانے پر وارد ہوتی ہیں اور اگر تم کافر ہو، تو اوّل ہم صُلح کی تحریک

کرتے ہیں۔ اگر تم نہیں ہٹتے تو یاد رکھو کہ ہم میں بعض ایسے بھی ہیں۔ جو
تمہارا پورا پورا استیصال کر سکتے ہیں۔"

جب یہ خط اس جن کو سنایا گیا۔ تو اس نے کہا کہ :۔
"یہ ایسے شخص کا خط نہیں کہ اس کا کہنا نہ مانا جائے۔ اچھا لو میں جاتا ہوں۔"

۲۔ ایک داروغہ صاحب کا ۹-۱۰ برس کا لڑکا بڑا ہی غبی تھا۔ وہ اسے حضرت کی خدمت میں لائے کہ اس کے ذہین ہونے کی کوئی تدبیر فرمائی جاوے تو حضرت نے تفریحاً یا مزاحاً اس کا سر پکڑ کر اپنے سر سے لگا لیا۔ اس کے بعد اُس کا ذہن بہت تیز ہو گیا اور وہ خوب اچھی طرح پڑھنے لگا اور جلد قرآن شریف ختم کر لیا۔

غرضیکہ ایسے سینکڑوں مصدقہ واقعات کو پیش کرتے ہوئے بعض طالبین نے حضرت سے عرض کی یہ تو کرامات سے بھی بڑھ کر ہیں۔ اس پر حضرت نے فرمایا کہ :۔

"پھر تم میں بھی ایک ایسی چیز موجود ہے۔ جو کرامت سے بھی بڑھ کر ہے یعنی ایمان تو اس کو اپنے فضائل میں کیوں شمار نہیں کرتے۔ ہاں انعاماتِ الٰہیہ میں شمار کرتے ہو تو ان کو انعاماتِ الٰہیہ میں شمار کرنے کی میں بھی اجازت دیتا ہوں۔"

گو حضرت نے ایسے واقعات کو کرامت کی بجائے انعاماتِ الٰہیہ قرار دیا ہے مگر انعامات بلا وجہ نہیں دیئے جاتے۔ کسی صفت یا خوبی کی بناء پر ہی عام طور پر ملا کرتے ہیں اور یہ صفت یا خوبی حضرت کا انتہائی اتباعِ سُنت تھا جس کی برکت سے ان واقعات کا ظہور ہوتا تھا کیونکہ صوفیائے ربانی کا قول ہے کہ الاستقامۃ فوق الکرامات شریعت پر استقامت ساری کرامات سے افضل چیز ہے۔

اِنکارِ کرامات

اسی لیے حضرت تھانوی واضح طور پر فرمایا کرتے تھے کہ :۔

" اگر واقع میں مَیں صاحبِ کشف و کرامت ہوتا تو مَیں خود اس کا اقرار کر لیتا کہ یہ چیزیں کمالاتِ مقصودہ میں سے نہیں۔ نہ کوئی فضیلت کی چیز ہے کرامت کا درجہ تو ذکر لسانی سے بھی متاخر ہے۔"

ایک دوسرے موقع پر بحلف فرمایا کہ :-

" مجھ کو اپنا ایک واقعہ بھی ایسا معلوم نہیں کہ جس کو کشف یا کرامت کہہ سکیں"

حقیقی کرامت

جیسا کہ کرامت کے لغوی معنوں سے ظاہر ہے۔ آپ کو خدمت خلق و دین کے لیے پیدا فرمایا اور اس کے بعد بقول صاحب اشرف السوانح آپ کی سب سے نمایاں کرامات معنویہ خدمات دینیہ ہیں جو کرامات حسیہ سے کہیں بڑھ کر ہیں اور کہیں زیادہ نافع ہیں اور جن کا نافع ہونا دو طرح سے ہے۔ دوسروں کے لیے نافع ہونا یہ ہے کہ آپ سے مخلوق کثیر کو فائدہ پہنچتا رہا اور پہنچ رہا ہے اور انشاء اللہ پہنچتا رہے گا۔ حضرت کے اپنے لیے نافع ہونے کی صورت یہ ہے کہ یہ موجب اجر و قرب ہیں۔ برخلاف کرامات حسیہ کے کہ قرب کا ان پر ترتب نہیں۔

حقیقتِ فراست

حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشادِ گرامی ہے کہ :-

اتقوا فراسۃ المومن فانہ ینظر بنور اللہ۔	مومن کی فراست سے ڈرو کہ وہ اللہ کے نور سے دیکھتا ہے۔

یہ عزو شرف صرف اتباعِ کتاب وسنت کا نتیجہ ہوتا ہے۔ جس قدر اتباع میں ترقی ہوتی جائے گی۔ اسی قدر یہ نور الٰہی بڑھتا جائے گا اور پیروی نفس کی صورت میں کم ہونا شروع ہو جائے گا جیسا کہ امام شافعیؒ فرماتے ہیں ؎

فان العلم نور من الہٖ   ونور اللہ لا یعطی لعاصی

کہ علم حق تعالیٰ کا ایک نور ہے اور حق تعالیٰ کا نور کسی گنہگار کو عطا نہیں ہوتا۔ چنانچہ یہ نورِ ربّانی بدرجہ اتم انبیاء علیہم السّلام کو عطا ہوا تھا اور اسی سے حسب مراتب اولیاء کرام کو بھی حصّہ ملتا ہے۔ اس کے مقابلہ میں کشف و کرامات کی کوئی حقیقت نہیں۔ حضرت تھانوی فرماتے تھے کہ :-

"فراست جس سے طالب کے امراض باطنی معلوم ہو جاتے ہیں۔ وہ کشف نہیں۔ کشف تو یہ ہے کہ جیسے راستہ میں کوئی شخص آ رہا ہے۔ اس کو وہیں بیٹھے دیکھ لیا پھر بعد میں وہ آ بھی گیا۔ بخلاف اس کے فراست دل کی گواہی دینے کو کہتے ہیں جسے الہام کہنا زیادہ مناسب ہے۔ فراست اور عقل باہم مشابہ ہیں۔ عقلاء کو بھی عقل کے ذریعہ باتیں معلوم ہو جاتی ہیں لیکن عقل و فراست میں یہ فرق ہے کہ عقل تو اسبابِ ظاہری سے استدلال کرتی ہے اور فراست محض وجداناً محسوس کرتی ہے۔" (کمالاتِ اشرفیہ ص۲۱۹)

فقدانِ مجاہدہ

داناؤں کا قول ہے کہ

"عظمت ایک فیصدی ودیعت کی جاتی ہے اور ۹۹ فیصدی محنتِ شاقہ سے حاصل ہوتی ہے۔"

حضرت تھانوی اس ایک فی صدی والے گروہ سے تعلق رکھتے تھے۔ کیونکہ آپ ریاضت و مجاہدہ کے قطعاً عادی نہ تھے۔ مشقت سے سخت گریز تھا یہاں تک کہ آپ فرماتے تھے کہ :-

زیادہ غور و خوض کی مشقت بھی مجھ سے برداشت نہیں ہوتی۔ اس لیے اد... تحریروں سے مستفید ہونے سے محروم رہتا ہوں اور اپنے دل کو یوں سمجھا لیتا ہوں کہ ضروریات کا علم حاصل کرنے کے لیے اور سہل سہل کتابیں موجود ہیں

پھر کیوں شقت اٹھائی جائے۔ میری عادت ہے کہ میں کسی مضمون کے سمجھنے میں زیادہ تعب نہیں اٹھاتا بس جو سرسری توجہ سے سمجھ میں آگیا آگیا۔ ورنہ چھوڑ دیتا ہوں۔ کاوش نہیں کرتا۔ بس اس پر عمل ہے۔ اذ لم نستطع شیئا فدعہ نیز دشوار طریق کو چھوڑ کر سہل طریق کو اختیار کرنے میں اس حدیث پر عمل ہے۔ ماخیر صلی اللہ علیہ وسلم فی امرین الا فتاء ایسرھما

قلت مطالعہ

آپ زیادہ مطالعہ کے بھی عادی نہ تھے جیسے اہل علم کا دستور ہے۔ بلکہ بقول مولانا عبدالماجد دریابادی :۔

حضرت کی نظر کتابوں پر زیادہ نہ رہتی تھی۔ علوم و معارف کے چشمے تو اندر ہی سے اُبلتے رہتے تھے۔ " فی الحقیقت خود تو تھی ام الکتاب "۔ تفسیر۔ حدیث فقہ۔ کلام۔ تصوف سب کا کتابی مطالعہ بس بقدر ضرورت و کفایت ہی رہتا تھا اور آخر زمانہ میں تو اور بھی کم ہو گیا تھا یا بالکل نہ تھا کہ کتب بینی کی ہوس ہو۔ نئی نئی مطبوعات کی آمد برابر جاری رہے اور تاریخ۔ سیاحت مناظرہ۔ محاضرہ کسی فن کی جو چھپی ہوئی کتاب بھی سامنے آجائے پڑھ ضرور لی جائے۔ ضائع کرنے کو حضرت کے پاس اتنا وقت کہاں تھا۔ وہاں تو

صد کتاب و صد ورق در نار کن
سینہ را از نورِ حق گلزار کن

کا گلزار ہر وقت کھلا رہتا تھا " (حکیم الامت صہ ۲۹۹)

یہ رائے حضرت تھانوی ؒ کے حالات کا برسوں مشاہدہ کرنے والے اس فلسفی کی ہے۔ جواب بھی بصد ناز لکھتے ہیں کہ :۔

" حضرت تھانوی سے اعتقاد کامل رکھنے کے باوجود میں مقلد جامد نہ تھا۔ فقہیات و کلامیات دونوں میں کبھی کبھی اپنی کم نظری سے اپنی ہی بات پر قائم رہتا تھا۔ حضرت نے بھی اس ڈھٹائی کی خوب اجازت دے رکھی تھی "

(حکیم الامت ص ۲۶۹)

ایک دُوسری جگہ تحریر فرماتے ہیں کہ :۔

" ایک شبہ جو مجھ کو حضرت کی ذات پر بحیثیت شیخ کے پیدا ہو رہا تھا۔ اس کو بھی حضرت کی خدمت میں نقل کر دیا تھا اور یہی وُہ مقام ہے۔ جہاں اس نامہ سیاہ کے حدود حضرت کے عام مریدین۔ معتقدین مسترشدین سے بالکل الگ ہو جاتے ہیں۔ یہ حضرات ایسی چیزیں زبان پہ لانا ہی (دُوسروں کی نیابت و ترجمانی میں بھی) سوءِ ادب میں داخل سمجھتے تھے۔ یہ عاجز ایک غیر معصوم بزرگ پر خود ایسے شبہات کے ایراد میں کوئی مضائقہ نہیں پاتا۔"

(حکیم الامت ص ۳۵۳)

ملکۂ فراست

عدم مجاہدہ و قلتِ مطالعہ کے باوجود امراض نفس کی تشخیص میں تو حق تعالیٰ نے حضرت کو وہ ملکۂ تامہ عطا فرمایا ہُوا تھا اور وُہ فراستِ صحیحہ بخشی ہُوئی تھی کہ فنِ تربیت میں یگانۂ روزگار تھے اور اس لیے حکیم الامت کے لقب سے یاد کیے جاتے تھے چنانچہ آپ نے خود فرمایا تھا کہ :۔

" جب کوئی طالبِ اصلاح آتا ہے تو بفضلہٖ تعالیٰ اس سے سابقہ پڑتے ہی اجمالی طور پر فوراً یہ ادراک ہو جاتا ہے کہ یہ فلاں مرض لے کر آیا ہے اور اس کو فلاں تدبیر نافع ہو گی۔"

اور یہ اسی فراست کا نتیجہ تھا کہ آپ فرماتے تھے کہ

"مجھ سے کسی کا اپنے نفس کی چوریاں چھپانا بہت دشوار ہے۔"

چنانچہ یہ امر بارہا مشاہدہ اور تجربہ میں آچکا ہے۔ جس کی بیسیوں مثالیں اشرف السوانح میں موجود ہیں کہ حضرت تھانویؒ نے جس وقت کسی کے ساتھ جو معاملہ فرمایا۔ بعد میں وہ اکثر اس معاملہ کا اہل ثابت ہُوا۔ گو دیکھنے والوں کو اس معاملہ کے وقت ایک گونہ استعجاب ہوتا تھا کیونکہ ان کی نظر وہاں تک نہ پہنچ سکتی تھی۔ جہاں حضرت کی نظر کی رسائی تھی۔ اسی لیے آپ فرمایا کرتے تھے کہ

"میں چاہتا ہوں کہ میں جس کے ساتھ جیسا معاملہ کروں۔ میرے احباب اس میں مزاحمت نہ کریں۔ کیونکہ جب اللہ تعالےٰ کسی سے کوئی کام لیتے ہیں۔ تو اس کو اس کی سمجھ بھی عطا فرما دیتے ہیں۔ اس میں میرا کچھ کمال نہیں۔"

لمحۂ فکریہ

تیل اور پانی کے مکالمہ میں آپ ابھی پڑھ چکے ہیں کہ مجاہد کا ثمرہ اونچا رہتا ہے اور ناز و نعم کا ثمرہ نیچا رہتا ہے۔ اب آپ نے دیکھ لیا کہ حق تعالیٰ کی نوازشاتِ خاص الخاص کے باوجود حضرت تھانویؒ نے اہلِ خوارق کی طرح اس پر فخر و تکبر کا اظہار نہیں فرمایا، بلکہ انتہائی تواضع و انکساری سے فرمایا ہے کہ "اس میں میرا کچھ کمال نہیں"۔ اور یہیں سے اِنسانیت و عبدیت کی سرحد شروع ہوتی ہے۔ جوں جوں نوازشیں اور عنایتیں بڑھتی جاتی ہیں۔ وُہ عجز و اعتراف سے گڑتا جاتا ہے۔ جیسا کہ باب "عبدیت" میں آپ ملاحظہ فرما چکے ہیں۔ درحقیقت تو انہی نوازشاتِ خاص کے حصُول کے بعد خود کو عجز و اعتراف کے مقام فنا در فنا میں اتارنا ہی انسانیت کا سب سے بڑا مجاہدہ ہے، اسی لیے حضرت فرمایا کرتے تھے کہ :-

"آدمی زاہد بن سکتا ہے۔ شیخ بن سکتا ہے مگر انسان بننا مشکل ہے۔"

(افاضات الیومیہ صہ ۲۸۹)

کیونکہ جب تک عبدیت پیدا نہ ہو۔ انسانیت کی تکمیل نہیں ہوتی۔

مجدّدیت

ولایت

حضرت تھانوی لکھتے ہیں کہ :۔

" ولایت ایک مخفی امر ہے۔ اس کے معلوم ہونے کی ضرورت ہی کیا ہے اور اگر معلوم کرنے سے یہ مقصود ہے کہ ہم اُن سے مستفید ہوں تو ان کی سب سے بڑی شناخت یہ ہے کہ وہ شریعت پر مستقیم ہوں اور طالبانِ حق کی استعداد معلوم کر کے اس کے موافق ان کی تربیت کریں۔ جس کی تصدیق کا سب سے آسان طریق یہ ہے کہ جن کو شریعت پر مستقیم دیکھو۔ ان کی صحبت و تعلیم سے شرف حاصل کرو۔ جب اپنی حالت روز بروز متغیر پاؤ گے تو خود ہی معلوم ہو جائے گا کہ یہ شخص صاحب تاثیر ہے۔" (تعلیم الدین صہ ۹۶)

اس سے ظاہر ہے کہ جو شخص خود دین پر مستقیم ہو گا۔ اس کے دل میں لازمی طور پر دُنیا اور دنیاداروں کی محبت کم اور دین اور دینداروں کی محبت زیادہ ہو گی۔ اس لیے طالبانِ دُنیا کی بجائے اس کے ہاں طالبانِ دین کا ہی ہجوم ہو گا۔ یا اس کے ہاں وہی ٹھہر سکیں گے۔ جن کو اپنے دین کی درستی مطلوب ہو گی۔

اولیاء اللہ میں سب سے بڑا درجہ قطب ارشاد کا ہے جو لوگوں کو اپنی تعلیم و تربیت سے خدا اور رسُول کے راستہ پر گھیر کر لانے کے لیے مامور من اللہ ہوتا ہے۔ مگر قطب الارشاد کو قطب التکوین کی طرح اپنی قطبیت کا علم نہیں ہوتا۔ اور نہ ہی قطب التکوین کی طرح قطب الارشاد متعدد ہوتے ہیں بلکہ وُہ ایک ہوتا ہے۔

تائیدی مشاہدہ

جب ایک انگریزی خواں اور وہ بھی فلسفی اور ایک دوسرے شیخ کا مرید اور حضرت تھانوی سے اہم امور میں اختلاف بلکہ تکرار کرنے والا خانقاہ امدادیہ شریفہ میں پہنچتا ہے اور دیکھتا ہے کہ :-

"جس کو دیکھیے ثقہ صورت ۔ متشرع لباس ۔ کوئی تلاوت کر رہا ہے کوئی نماز پڑھ رہا ہے ۔ کوئی ذکر میں مشغول ہے ۔ کوئی مراقبہ میں محو ہے ۔ کوئی درس دے رہا ہے ۔ کوئی تصنیف کر رہا ہے ۔ کوئی مطالعہ کتب میں لگا ہوا ہے بالخصوص پچھلی رات کو تو عجیب سماں ہوتا ہے کہ دوران ذکر میں کوئی آہیں بھر رہا ہے کسی پر گریہ طاری ہے کوئی بے تاب ہو کر تڑپ رہا ہے ۔ کوئی غایت ذوق وشوق میں ہاتھ پاؤں ٹپک رہا ہے کوئی چیخ رہا ہے ۔ کوئی کیف میں اشعار پڑھ رہا ہے ۔ کوئی رو رو کر دعائیں مانگ رہا ہے اور لطف یہ ہے کہ اندھیرے میں ایک کو دوسرے کی خبر نہیں کہ کس پر کون سی کیفیت طاری ہے ۔ غرضیکہ ہر ذاکر ریاء سے مطمئن ہو کر اور خوب جی کھول کر اپنے دل کی بھڑاس نکال رہا ہے ۔

تائیدِ مخالف

اور جب وہ ایک غیر مقلد یعنی اہل حدیث کا یہ تاثر سنتا ہے کہ :-

"یہاں تو بڑا لطف ہے ۔ اٹھتے ۔ بیٹھتے ، چلتے پھرتے ، سوتے جاگتے ہر وقت اور ہر حال میں ذکر اور تلاوت ہی کی آوازیں کانوں میں پڑتی رہتی ہیں ۔ تو میں جہاں چاہتا ہوں ۔ لیٹ جاتا ہوں اور پڑا ہوا سنا کرتا ہوں اور مزے

لیا کرتا ہوں اسی کیف میں سو بھی جاتا ہوں اور جب آنکھ کھلتی ہے تو پھر وہی دلکش صدائیں کانوں میں پڑنے لگتی ہیں "

ذاتی تجربہ

اور اپنے ذاتی تجربہ کی بنا پر صاحب خانقاہ یعنی حضرت تھانوی کو :-

" ایک بہترین دوست - بہترین میزبان - بہترین مخدوم - بہترین عزیز - بہترین ہمسایہ - غرض انسانی کمالات و اوصاف کے لحاظ سے (اس دور کا) ایک بہترین انسان " پاتا ہے تو وہ مجبور ہو جاتا ہے کہ

قطب ارشاد

" قطب ارشاد " کی اصطلاح تصوّف کی کتابوں میں بارہا پڑھی تھی - علامتیں بھی پڑھ لی تھیں - دل نے کہا کہ اس دور کے " قطب الارشاد " تو یہی معلوم ہوتے ہیں اس کی تحقیق خود اُن ہی سے کیوں نہ کر لی جائے - استفسار ان الفاظ میں لکھا :-

" میرا اپنا وطن اور قیاس اس وقت کے قطب ارشاد ہونے کے متعلق ان ہی بزرگ کی جانب ہے - جن کی خدمت میں یہ عریضہ لکھ رہا ہوں - اگر یہ گمان غلط ہے تو اس کی تردید فرما دی جائے اور یہ بھی ارشاد فرما دیا جائے کہ کن علامات سے اسے شناخت کیا جا سکتا ہے ؟

جواب سُننے کے قابل ہے - احتیاط میں ڈوبا ہُوا کہ

" قطب ارشاد کو بھی اپنے قطب ارشاد ہونے کا علم ضروری نہیں - اس لیے میں اس سوال کا جازم جواب نہیں دے سکتا - علامات تو ہیں مگر ان علامات کا تحقق خود ظنی ہے - " (حکیم الامت صفحہ ۵۳-۵۴)

تائید مزید

اس دور میں چونکہ دین کے طالب بہت کم ہیں - اس لیے اہل اللہ کی طرف رجوع کرنے

والے زیادہ تر وہ لوگ ہوتے ہیں۔ جو دنیوی اغراض لے کر جاتے ہیں مگر حضرت تھانوی نے اپنا طریقِ تعلیم و تربیت ہی ایسا رکھا تھا کہ وہاں سوائے طالب دین کے اور طالب دین بھی وہ جو طالب صادق ہو اور کوئی ٹھہر ہی نہ سکتا تھا۔ چنانچہ ایک بار آپ نے خود فرمایا کہ :-

"میرے یہاں کوئی ایسا ویسا تو ٹھہر ہی نہیں سکتا۔ صرف طالب صادق ہی ٹھہر سکتا ہے۔ جیسے بلاتشبیہہ مدینہ طیبہ کی صفت میں حضور سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ ارشاد فرمایا ہے کہ کالکیر ینفی الخبث یعنی بھٹی کی مانند ہے جو میل کچیل کو دُور کر دیتی ہے۔"

مجدّد

مجدّد کا درجہ قطب الارشاد۔ قطب التکوین اور قطب الاقطاب سب سے اُوپر ہوتا ہے اور وُہ کتاب وسُنّت کی تعلیم کا مظہرِ اتم ہوتا ہے۔ کیونکہ اسے کتاب وسُنّت کا عملی نمونہ بنا کر اُمتِ مسلمہ کی اصلاح کرنے اور اس کو خدا اور رسُول کے راستہ پر لانے کے لیے مبعوث کیا جاتا ہے چونکہ نبوت کا دروازہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے بند ہو چکا ہے۔ اس لیے کارِ نبوّت کو جاری رکھنے کے لیے اور اس کے راستہ سے مفاسد و بدعات کو ہٹانے کے لیے حق تعالےٰ نے ہر صدی کے بعد مجدد دین بھیجنے کا سلسلہ جاری فرمایا اور اگر نبوّت جاری رہتی۔ تو ممکن ہے انھیں یہ منصبِ جلیلہ بخشا جاتا۔ غرضیکہ مجدّد کا درجہ بعد از نبوّت ولایت میں سب سے آخری درجہ ہوتا ہے۔ نبی کو اپنا نبی ہونا یقینی اور قطعی طور پر معلوم ہوتا ہے اور جس کے لیے اسے دلیل کی ضرورت نہیں ہوتی مگر مجدد کو اپنا مجدّد ہونا ظن و تخمین سے زیادہ معلوم نہیں ہوتا۔ اہلِ کشف کو البتہ اس کا علم ہو جاتا ہے۔

خبرِ مخبرِ صادقؐ

عن ابی ھریرہ ما اعلم عن رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان اللہ یبعث فی امتی علی راس کل مائۃ من یجدد لھا دینھا۔

(ابوداؤد کتاب الملاحم)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ بے شبہ اللہ تعالیٰ میری اُمت میں ہر صدی کے سرے پر ایسے کو پیدا کرے گا جو اس کے لیے اس کے دین کو نیا کر دے گا۔

اسی حدیث کے متعلق حاکم نے مستدرک، کتاب الفتن میں اور بیہقی نے مدخل میں دوسری روایتیں بھی کی ہیں۔

اشکال و جواب

مورخِ اسلام سید سلیمان ندوی لکھتے ہیں کہ :۔

"بعض محدثین نے گو اس حدیث کی سند میں کلام کیا ہے۔ خود اسی ابوداؤد کی روایت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تک رفع میں راوی کو تردّد ہے مگر ایسی بہت سی حدیثیں ہیں۔ جن کی سند میں کلام کیا گیا ہے مگر واقعہ نے اُن کی صداقت کی توثیق کر دی ہے۔ یہی حال اس حدیث کا بھی ہے اور تاریخِ اسلام اس کی صداقت کی شاہد ہے۔

اس موقع پر ایک شبہ کا رفع کرنا ضروری ہے عام طور سے سمجھا جاتا ہے کہ ہر صدی کے سرے پر ایک ہی مجدد پیدا ہوتا ہے لیکن لفظ مَنْ جیسا کہ محققین نے اصُول فقہ میں ثابت کیا ہے۔ کسی خاص کے لیے ہونا اس کا ضروری نہیں بلکہ عموم بھی اس سے سمجھا جاتا ہے یعنی اس سے ایک دو اور چند بھی سمجھے جا سکتے ہیں۔ جیسے من الناس من یقول امنا باللہ وبالیوم الاخر وما ھو بمومنین کی آیت میں امنا اور ھو کی جمعیت سے ظاہر ہو رہا ہے۔ کہ مَن کے لیے ایک کا ہونا ضروری نہیں۔ اس لیے بالکل ممکن ہے کہ مختلف ملکوں میں یا مختلف اصلاحوں اور مختلف مفاسد کے مقابلہ میں تجدیدِ دین کے لحاظ سے ایک ہی وقت میں کئی مجدد ظہور کر سکتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ علماء نے بعض دفعہ ایک ہی وقت میں

کئی بزرگوں کو مجدد مانا ہے۔

حدیث میں علیٰ راس کل مائۃ آتا ہے۔ یعنی ہر صدی کے سر پر۔ سرا ابتدا اور انتہا دونوں پر بولا جاتا ہے چنانچہ بعض شارحین ابوداؤد نے لغت سے دونوں استعمال کو ثابت کیا ہے۔ اس لیے راس کل مائۃ کا صحیح ترجمہ صدی کے سرے پر کے بجائے تخصیص کے ساتھ ابتدا اور انتہا پر نہیں آنا چاہیئے۔

ایک اور بات بھی ذہن میں رہنی چاہیئے کہ صدی کے سرے پر مجدد کی پیدائش ہونا ضروری نہیں بلکہ اس وقت اس کے تجدیدی مشن کا آغاز ہوتا ہے جس کو حدیث میں بعثت کے لفظ سے ادا کیا گیا ہے۔ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنی پیدائش کے چالیس برس کے بعد مبعوث ہوئے۔

ایک اور نکتہ کو بھی کھول دینا ضروری ہے۔ حدیث کے لفظ یہ ہیں کہ مجدد دین کو نیا کر دے گا۔ یعنی رسوم و بدعات و فسادات کی کہنگی کو دور کر کے اصل دین کو ظاہر کرے گا۔ اس لیے مجدد کی بڑی پہچان جس سے خواص اس کو پہچان اور عوام جان سکتے ہیں کہ اس کی تعلیم و تلقین اور جد وجہد اور دعوت و تبلیغ سے زمانہ کی ظلمتیں اور خیالات کی بدعتیں اور اعمال کے مفاسد دور ہو کر وہ اصل دین نمودار ہو جائے جس کی صحیح تصویر نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کے نگار خانہ کتاب و سنت میں محفوظ ہے۔

چونکہ اس حدیث کا سہارا لے کر بعض دفعہ مدعیان باطل نے نئے نئے دعوے کیے ہیں یہاں تک کہ نبوت کے حدود حرم تک پہنچنے کی کوشش کی ہے اور اسلام میں نئے نئے فرقوں بلکہ اُمتوں کی بنیاد ڈالنی چاہی ہے۔ اس لیے یہ لغزش گاہ بھی ہے اور اس مقام پر قلم اور قدم کو بہت پھونک پھونک کر چلنا چاہیے۔ اس لیے ضرورت ہے کہ بتا دیا جائے کہ نبی کی ضرورت اصل احکام کے من جانب اللہ انسانوں تک پہنچانے کے لیے ہے۔ یعنی نبی اللہ تعالیٰ سے پاکر بندوں تک پہنچانے میں واسطہ ہے وہ عقل و قیاس اور علم و فہم سے نہیں

کہتا۔ بلکہ جو کہتا ہے وحی سے کہتا ہے اور خدا سے پاکر کہتا ہے۔ اس کی وحی و تعلیم ہر خطا سے پاک اور وہ ہر غلطی سے معصوم ہے مگر مجددؒ کا یہ حال نہیں بلکہ وہ کتاب و سنت اور وحی رسالت کے احکام و پیغام کو سمجھ کر اور اپنی فراست ایمانی۔ صفائے ذہن و عقل مستقیم اور قیاس صحیح اور رائے صواب سے صحیح غلط میں تمیز کرتا ہے۔ دین کو غیر دین سے ارشادات الٰہی کو ایجادات انسانی سے سنت کو بدعت سے ممتاز کرتا ہے اور اپنی علمی۔ عملی زندگی کی طہارت و نزاہت اور ثبات و استقامت اور نبی کی اتباع کمال اور اقتدائے تام سے محبوبیت و مقبولیت کی شان پیدا کرتا ہے۔" (مقدمہ جامع المجددین)

مندرجہ بالا طویل اقتباس میں مخالفین۔ معاندین اور متذبذبین سب کے اشکالات کا صرف جواب آگیا ہے بلکہ مجدد کی شناخت کے آثار بھی تبلا دیئے گئے ہیں۔ جس کے گذشتہ اوراق شاہد عدل ہیں اور ان کا بغرض اثبات یہاں اعادہ کرنا محض تکرار و طوالت کا باعث ہوگا۔ البتہ ان کے علاوہ چند دیگر شواہد پیش کرنے بے جا نہ ہوں گے۔

واقعاتی تائید

جب ہم حضرت تھانوی کی زندگی پر نظر دوڑاتے ہیں تو صاف دکھائی دیتا ہے کہ حضرت تھانوی تیرھویں صدی کے اختتام کے قریب یعنی ۱۲۸۰ھ میں پیدا ہوئے۔ اس صدی کے اختتام یعنی ۱۳۰۰ھ میں تحصیل علوم ظاہری سے فارغ ہوئے۔ عین چودھویں صدی کے آغاز یعنی ۱۳۰۱ھ میں آپ کانپور میں بیٹھ کر بذریعہ درس و تدریس۔ وعظ و تبلیغ اور تصنیف و تالیف فیض رسانی خلق میں مصروف ہوئے اور اسی سال فریضہ حج سے مشرف ہوئے اور شیخ العرب والعجم حضرت مولانا حاجی امداد اللہ قدس سرہٗ مہاجر مکیؒ سے بیعت ہو کر فیض گوناگوں سے بہرہ اندوز ہوئے اور ۱۳۰۲ھ میں واپس آکر اسی افادۂ خلق میں مشغول ہوگئے۔ بقول مورخ اسلام مولانا سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ :-

"اصلاح امت کی کوشش میں علمی و عملی زندگی کے ہر گوشہ پر ان کی نظر تھی

بچوں سے لے کر بوڑھوں تک ۔ عورتوں سے لے کر مردوں تک ۔ غریبوں سے لے کر عالموں تک ۔ فاسقوں سے لے کر صوفیوں ۔ درویشوں اور زاہدوں تک غریبوں سے لے کر امیروں ، اُستادوں اور مدرسوں تک ۔ غرض ہر صنف اُمت اور ہر جماعت کے کاموں تک ان کی نظر دوڑی ۔ پیدائش ، شادی بیاہ غمی اور دُوسری تقریبوں اور اجتماعوں تک کے احوال پر ان کی نگاہ پڑی اور شریعت کے معیار پر جانچ کر ہر ایک کا کھرا اور کھوٹا الگ کیا اور رسوم و بدعات اور مفاسد کے ہر روڑے اور پتھر کو صراطِ مستقیم سے ہٹادیا ۔ تبلیغ ۔ تعلیم ۔ سیاست ۔ معاشرت ۔ معاملات ۔ اخلاق ۔ عبادات اور عقائد میں دین خالص کی نظر میں جہاں کوتاہی نظر آئی ۔ اس کی اصلاح کی ۔ فقہ کے نئے نئے مسائل اور مُسلمان کی زندگی کی نئی نئی ضرورتوں کے متعلق بھی اپنے جانتے پورا سامان کر دیا ۔" (جامع المجددین ص۲۷ کز)

تائید بزرگاں

حضرت تھانوی کے مجدد ہونے کی تائید حسب ذیل واقعات سے بھی ہوتی ہے ۔

۱۔ حضرت مولانا محمد روشن خان مراد آبادی حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کے خلیفہ مجاز اور بڑے صاحبِ سوز و گداز بزرگ تھے ۔ ان کے مرض وفات میں حضرت تھانوی مع خواجہ عزیز الحسن صاحب "اشرف السوانح" ان کے پاس بغرض عیادت تشریف لے گئے ۔ انھوں نے حالات مرض بیان کرنے کے بعد حضرت تھانوی سے نہایت جوش کے ساتھ اور آبدیدہ ہو کر متغیر لہجہ میں فرمایا کہ :۔

"خیر یہ تو مرض کے حالات ہیں ۔ اب آپ میرے لیے دُعا کیجئے کہ اللہ تعالیٰ میرا خاتمہ ایمان پر کرے ۔ اللہ تعالےٰ نے آپ کو اس صدی کا مجدد بنایا ہے اللہ تعالےٰ آپ کے فیوض و برکات سے عالم کو منور کرے اور آپ کے ذریعہ

رسوم و بدعات کا قلع قمع کرے۔"

حضرت تھانوی گردن جھکاتے ہوئے اور نہایت عجز و انکسار کے ساتھ یہ سنتے رہے اور پھر ہاتھ اٹھا کر عفو و عافیت کی دعا مانگی۔

۲۔ ممدوح الذکر کے ایک ثقہ مرید نے "صاحب اشرف السوانح" سے ذکر کیا کہ :-

"مولانا رحمۃ اللہ علیہ کو حضرت تھانوی کے مجدد ہونے کا پورا وثوق تھا۔ یہاں تک کہ مجھ کو خاص طور پر مولانا تھانوی کی خدمت میں یہ ارشاد فرما کر بھیجا تھا کہ ان کے پاس ضرور حاضر ہو۔ وہ اس صدی کے مجدد ہیں۔"

۳۔ ایک اور موقع پر حضرت مولانا گنگوہی کے خادم خاص مولانا محمد یحییٰ کاندھلوی نے بھی ایسا ہی صاحب اشرف السوانح سے فرمایا کہ :-

"اب تک میرا گمان یہ تھا کہ اس صدی کے مجدد حضرت مولانا گنگوہی قدس سرہ العزیز تھے لیکن اب میرا خیال یہ ہے کہ ہمارے مولانا کا فیض تو خاص تھا اور زیادہ تر آپ سے علماء فیض یاب ہوتے لیکن میں اب دیکھ رہا ہوں کہ مسلمانوں کو اس وقت عام نفع مولانا تھانوی سے بہت پہنچ رہا ہے۔ اس لیے مجددیت کی شان ان میں زیادہ پائی جاتی ہے۔ گو ممکن بلکہ مظنون ہے کہ حضرت تھانوی کا درجہ مجددیت سے بھی عالی ہو۔"

چونکہ آپ کے مجدد ہونے کا حال آپ کے اساتذہ کرام۔ ہمعصر بزرگان دین اور اولیاء اللہ پر منکشف ہو چکا تھا اس لیے وہ سب آپ کا حد سے زیادہ ادب و احترام کرتے تھے۔ جس کی تفصیل متعلقہ ابواب میں گزر چکی ہے۔

تائید منامیہ

سنت اللہ یوں بھی جاری ہے کہ حق تعالیٰ اپنے بندگان خاص کی اطلاع جو کسی خاص منصب کے لیے مبعوث ہوتے ہیں۔ اپنے نیک بندوں کو بھی مختلف طریق سے کر دیتے ہیں

کام نہیں کرتا۔ لکھا کہ :۔

"دل کے چاہنے پر عمل نہ کیا جائے۔ عقل کے فتویٰ پر عمل کیا جائے"۔

۵۔ مولانا موصوف کی درخواستِ دُعا کے جواب میں لکھا :۔

"آپ کے لیے بھی خوب دُعا کی۔ تحصیل کی بھی۔ تعدیل کی بھی۔ تسہیل کی بھی و من اللہ التوفیق"۔

۶۔ مولانا نے لکھا کہ گیہوں کے ساتھ گھن کا پسنا تو سنتا تھا۔ یہ گھن کے ساتھ گیہوں پِسا جا رہا ہے۔ جواب میں تحریر فرمایا۔

"تو ضرر کیا ہُوا۔ اس کو تو اور قابلِ انتفاع بنا دیا۔ پسنے کے قبل تو وہ روٹی نہیں سکتا ہے۔ پِسنے سے روٹی بن گیا"۔

۷۔ ایک سوال کے جواب میں لکھا :۔

"یہ ایک مجاہدہ ہے اور مجاہدہ ایک معالجہ ہے اور معالجہ کے لیے منقول یا ماثور ہونا ضروری نہیں۔ ہاں منہی عنہ نہ ہونا ضروری ہے"۔

۸۔ فرمایا کہ :۔

"تقویٰ تو ایک کمال ہے۔ اس کا دعویٰ خود ایک نقص ہے"۔

۹۔ ایک سوال کے جواب میں لکھا کہ :۔

"اگر حق تعالیٰ سے تعلق قوی کیا جائے تو اس سے سب تعلقات ضعیف ہو جائیں گے اور کلفت کا احتمال ہی نہ رہے گا"۔

۱۰۔ فرمایا

"بعضی بے تمیزی جب اس کا منشا صحیح ہو۔ تمیز سے محبوب ہوتی ہے"۔

۱۱۔ ایک مرتبہ ماسٹر محمد شریف صاحب نے لکھا کہ حضرت بیقراری سے بھی کسی طرح طبیعت کو قرار آ سکتا ہے۔ تحریر فرمایا کہ

"میں معصیت کا علاج بتلاتا ہوں نہ کہ مصیبت کا"۔

خشونت

خاصۂ فطرت

فطرتِ انسانی کا یہ خاصہ ہے کہ

(الف) جب انسان کی عقل و فہم کسی بات کی اصلیت و حقیقت تک نہیں پہنچ سکتی۔ تو وہ اس کے متعلق ظن و تخمین سے کام لینا شروع کر دیتا ہے اور جب اس کا نفس تاویل کرنے پر تل جاتا ہے تو پھر کوئی قطعی دلیل اسے مطمئن نہیں کر سکتی۔

(ب) جب اس کے کسی محسن۔ مخلص۔ مربی۔ دوست یا رشتہ دار سے کوئی ایسی بات صادر ہوتی ہے۔ جو اس کی خواہش و توقع کے خلاف ہوتی ہے۔ تو وہ اس بات کے اسباب و علل پر غور کیے بغیر اور اپنے تمام سابقہ اچھے تعلقات کو نظر انداز کرتے ہوئے فی الفور غیظ و غضب میں آجاتا ہے اور اسے جلی کٹی سنانے لگ جاتا ہے۔

(ج) بعض عقیدت مند اپنے مصلح یا مرشد کی ہر بات کو حرفِ آخر سمجھنے کے عادی ہوتے ہیں حالانکہ اس کا ہر فعل موقع و محل کے تابع ہوتا ہے اور موقع و محل کے بدل جانے سے نوعیتِ اصلاح بھی بدل جاتی ہے مگر وہ اس پر غور کیے بغیر لکیر کے فقیر ہی رہتے ہیں۔

حضرت تھانویؒ کو بدنام کرنے والے زیادہ تر انہی طبقوں سے تعلق رکھتے ہیں۔

رازِ شہرت

حضرت تھانویؒ کی شہرت دید سے زیادہ شنید پر مبنی تھی۔ کیونکہ ملک کے گوشہ گوشہ سے روزانہ جو مختلف الخیال اور مختلف المزاج طالبین و سالکین حضرت کی خدمت میں آتے رہتے تھے۔ وہ جب اپنے اغراض و مقاصد میں کامیاب یا ناکام ہو کر واپس

لوٹتے اور سامعین سے اپنا تاثر بیان کرتے تو اس تاثر کی بنا پر مخالفین و موافقین اپنے اپنے ظرف اور اپنی اپنی خواہش کے مطابق حضرتؒ کے متعلق اپنے نظریات کی نشر و اشاعت شروع کر دیتے جس سے حضرت کی شہرت روز بروز دُور دُور تک پھیلتی گئی۔

حقیقتِ تاثر

حضرت تھانویؒ کی خشونت و درشتی کی تمام داستانیں اور حکایتیں شخصی شنید اور وقتی دید پر مبنی ہیں حضرت تھانویؒ جیسی جامع صفات و کمالات شخصیت کے متعلق سُنی سُنائی باتوں پر اعتماد کر لینا یا کسی مجلس۔ کسی ملاقات یا کسی خط کے جواب کی بناء پر کوئی فتویٰ صادر کر دینا صریحاً بے انصافی ہے۔ اس کی مثال ایسی ہے۔ جیسے ہاتھی کو ٹٹولنے والے چار اندھوں کے بیانات کی تھی۔ اُنھوں نے گو ہاتھی کے مختلف اعضاء کا جائزہ لینے کے بعد اپنی عقل و فہم کے مطابق صحیح صورتِ حال بیان کی تھی۔ مگر فی الحقیقت ان کا تاثر خلافِ حقیقت تھا۔ اس سلسلہ میں تاثر انہی لوگوں کا معتبر ہو سکتا ہے۔ جنھیں کافی عرصہ حضرت کی صحبت میں رہنے اور آپ سے خط و کتابت کرنے کا اتفاق ہوا ہو۔

دفترِ شکایت

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق اس امر کا عام چرچا تھا کہ آپ :-

الف - "بڑے بدعقیدہ اور پکے وہابی تھے"۔

ب - "بڑے خشک مزاج اور تند خو تھے"۔

ج - "بڑے آدم بیزار اور تارک الدنیا تھے"۔

د - "سختی اور خشکی میں اپنی مثال نہ رکھتے تھے"۔

اس میں گو آپ کے نافہم عقیدت مندوں کا بھی حصہ تھا۔ مگر زیادہ تر یہ پروپیگنڈہ آپ کے حاسد اور مخالف کر رہے تھے تاکہ کسی طرح لوگوں کو [illegible]

[illegible]

لیکن جونہی لوگوں پر اس کی حقیقت واضح ہو جاتی۔ ان کے دل میں حضرت کی محبت و عقیدت اور عزت و عظمت پہلے سے زیادہ بڑھ جاتی اور مخالفوں کا پروپیگنڈہ نہ صرف ناکام ہو جاتا بلکہ خود ان کی اپنی رسوائی کا باعث بنتا۔

صورتِ حال

بات دراصل یہ ہے کہ

الف۔ حضرت تھانویؒ بڑے خود دار اور باغیرت واقع ہوئے تھے اور حتی الوسع معاملات کو وسعت دینے کے عادی نہ تھے۔ اسی لیے فرمایا کرتے تھے کہ:۔

"میری عادت نہیں کہ خود کسی معاملہ میں دخل دوں۔ میرے اوپر غیرت کا غلبہ زیادہ ہے۔ اس لیے خود کسی معاملہ میں دخل دینے کو جی نہیں چاہتا یہ خیال ہوتا ہے کہ میرا تو کام نہیں۔ میں کیوں دخل دوں۔ کسی کو لاکھ دفعہ غرض پڑے۔ اپنی اصلاح کا طریقہ دریافت کرے۔ ورنہ میری جوتی کو غرض پڑی ہے کہ اپنے آپ تو کسی کو اپنی اصلاح کا قصد نہ ہو اور میں اس کے پیچھے پڑا پھروں۔ اگر کسی وقت شفقت کا غلبہ ہوتا ہے۔ تو میں خود بھی نرمی سے کہہ دیتا ہوں۔" (الحج المبرور ص۱۹)

ب۔ حضرت تھانویؒ کو اپنے مصلح اور عالم ہونے کا دعویٰ بھی نہ تھا۔ ان کی تو تمام کائنات توفیق و افتقار پر قائم تھی۔ آپ خود کو لاشئے محض سمجھتے تھے۔ اسی لیے جب پانی پت کے بعض لوگ اپنی کوتاہ اندیشی سے آپ سے ناراض ہو گئے تو کہنے لگے کہ بس آج سے ہم انھیں مولوی ہی نہ سمجھیں گے۔ اس امر کی اطلاع جب دربار اشرفیہ میں پہنچی تو آپ نے فرمایا کہ:۔

"بھلا میں نے کب کہا ہے کہ مجھے مولوی کہو۔ میں تو بقسم کہتا ہوں کہ میں خود بھی اپنے علم کا قائل نہیں۔ یہاں تک کہ جب کوئی طالب علم آجاتا ہے

تو واللہ مجھے ڈر لگتا ہے کہ کہیں میری قلعی نہ کھل جائے ۔"

(اشرف المعمولات صـ ۵۵)

ج - آپ کو دوسروں کی طرح مرید بڑھانے کا بھی شوق نہیں تھا۔ چنانچہ جب پانی پت میں آپ کے متعلق یہ کہا گیا کہ ہم انھیں آج سے مولوی ہی نہ کہیں گے۔ تو اسی وقت پانی پت والوں سے ہی ایک نے جواب دیا کہ :-

" وہ تو خود اس سے خوش ہوتے ہیں کہ کوئی ان کو مولوی نہ کہے اور وہ تو ایسا شخص ہے کہ جب اس کو معلوم ہو جائے کہ ایک مرید کم ہو گیا ہے تو خوش ہوتا ہے اور جب اسے معلوم ہو کہ دو کم ہو گئے ہیں تو زیادہ خوش ہوتا ہے ۔ (بحوالہ صدر)

د - آپ کے پیش نظر کوئی ذاتی غرض یا منفعت بھی نہیں تھی کہ ہر قیمت پر دوسرں کو خوش کرنے کی کوشش کرتے اور کسی کو ناراض نہ ہونے دیتے بلکہ آپ کی ہمیشہ یہ کوشش ہوتی کہ دوسرے پر حق واضح ہو جائے ۔ اسی لیے فرمایا کرتے تھے :-

" میرا یہ کبھی قصد نہیں ہوتا کہ اپنے مقابل کو گفتگو میں مغلوب کر دوں یا وہ میری موافقت کرے ، بلکہ قصد یہ ہوتا ہے کہ خدا کرے یہ بھی سمجھیں اور میں بھی سمجھوں اور حق بات معلوم ہو جائے ۔"

اور یہی حق کوشی انسان کو دوسروں کی نظروں میں بُرا بنا دیتی ہے ۔ ایک مرتبہ ایک شخص نے آ کر حضرت تھانویؒ سے ایک تعویذ کی درخواست ایسے مبہم الفاظ میں کی کہ حضرت اس کا مطلب نہ سمجھ سکے ۔ آپ نے کئی مرتبہ اپنا مطلب واضح کرنے کے لیے کہا مگر اس نے ہر بار اُلجھا ہوا اور نامکمل جواب دیا جس کے سمجھنے میں آپ کو بڑا تعب ہوا ۔ یہ واقعہ بیان کرنے کے بعد آپ نے حاضرین سے فرمایا کہ :-

" جو لوگ سال دو سال میں صرف ایک ہی دفعہ کسی کے پاس ہو آئیں ان

کے اخلاق کی درستی کیا ہو سکتی ہے۔ افسوس ہے کہ آج کل بزرگوں نے بھی ان امور میں لوگوں کو روک ٹوک کرنا بالکل ترک کر دیا ہے۔ کیونکہ دُوسروں کی اصلاح میں اپنے آپ کو کچھ نہ کچھ بد اخلاق بنانا ہی پڑتا ہے۔ بدوں اس کے دوسروں کی اصلاح نہیں ہوتی۔ اکثر حضرت کہتے ہیں کہ ہم کیوں بڑے نہیں۔"

مقالات حکمت ملفوظ ص ۱۷۷

ان لوگوں نے جو مصلح کے طریق کے مطابق اپنی اصلاح کے متمنی نہ تھے۔ حضرت تھانویؒ کی اصلاحی مساعی کو خشونت۔ درشتی۔ مردم بیزاری۔ خشک مزاجی۔ تند خوئی وغیرہ سے منسوب کرنا شروع کر دیا۔

حضرت تھانویؒ ان روایتوں۔ حکایتوں۔ افسانوں اور داستانوں کی حقیقت خود ہی بیان فرما گئے ہیں۔ جن کی وضاحت آپ کے مندرجہ ذیل ملفوظات سے ہوتی ہے۔

حقیقتِ شکایت

ایک دفعہ فرمایا کہ ایک خط آیا ہے۔ اس صاحب نے پہلے تو گالیاں دے لیں۔ اب بہلا پھسلا کر فیض حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ مَیں انتقام نہیں لیتا، مگر رنج کی بات سے رنج تو ہوتا ہی ہے اور ہم لوگوں کی تو حقیقت ہی کیا ہے کہ رنج نہ ہو۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت وحشیؓ کے ساتھ کیا معاملہ کیا؟ یہ فرمایا کہ

"ساری عمر صورت نہ دکھانا۔"

مگر ہم کو کہا جاتا ہے کہ صاحب معاف کر دینا چاہیئے۔ ہم کوئی ان کے باوا کے غلام ہیں کہ گالیاں بھی کھائیں اور چاپلوسی بھی کریں۔ ہاں اس حالت میں بھی اس کی ضروریات کا انتظام کر سکتے ہیں۔ مثلاً ایک شخص سے ناراضگی ہو گئی اور اس سے کہہ دیا کہ صورت مت دکھانا لیکن ساتھ ہی ساتھ یہ بھی کہہ دیا جاتا ہے کہ فلاں جگہ یا فلاں شخص سے اپنی اصلاح کراؤ۔"

الافاضات الیومیہ ص ۵۴ ج ۲

حقیقتِ ناراضی

مزید المجید کے ملفوظ ۵۶ میں درج ہے کہ :-

" حضرت کے ہاں ایک لیٹر بکس رکھا ہے ۔ جن لوگوں کو کچھ کہنا سننا ہوتا ہے خط میں لکھ کر اس لیٹر بکس میں ڈال دیتے ہیں ۔ حضرت والا سہولت سے جواب لکھ کر بذریعہ خادم ان کے پاس پہنچا دیتے ہیں ۔ ایک شخص نے کچھ بے ہودہ اور بے جوڑ باتیں لکھ کر بکس میں ڈال دیں ۔ حضرت نے دیکھ کر اس پرچہ پر لکھ دیا کہ ظہر کے بعد اس پرچہ کو میرے ہاتھ میں دینا ۔

بعد ظہر کے اس صاحب نے وہ پرچہ پیش کیا ۔ اس میں یہ لکھا کہ میں سلام سے محروم رہا ۔ مصافحہ سے محروم رہا ۔ اس کا کیا مطلب ہے ؟ آیا آپ نے سلام کیا تھا ۔ میں نے دھکیل دیا ؟ یا آپ نے خود نہ کیا یا میں نے آپ کو ممانعت کر دی ۔ اس پر وہ صاحب بیٹھے رہے دوبارہ استفسار پر بولے کہ جی مجھ سے خطا ہو گئی ہے ۔ اس پر فرمایا کہ خطا ہو گئی میں یہ نہیں پوچھتا ۔ میری غرض تو یہ ہے کہ آپ کا اسکے لکھنے سے کیا مطلب تھا ۔ اس پر انھوں نے کہا کہ میرا یہ مطلب تھا کہ اصلاح ہو جائے تو فرمایا کہ آپ نے اس واسطے خطا کی تھی کہ میری اصلاح ہو جائے یہ تو ایسی بات ہوئی کہ جیسے کوئی چوری کرے اور حاکم کے دریافت کرنے پر یوں کہے کہ چوری اس واسطے کی تھی کہ میری اصلاح ہو جائے یا کوئی اپنے کپڑے کو گندگی لگا لیوے اب اس سے کوئی کہے ایسا کیوں کر رکھا ہے ۔ تو وہ اس کے جواب میں کہے کہ جی کپڑا دُھل جائے گا ۔ یعنی بغیر گندگی لگائے ہوئے کپڑا پاک نہیں ہوگا اور حاضرین کی طرف مخاطب ہو کر فرمایا کہ اس پر لوگ مجھے سخت کہتے ہیں ۔ اب تبلایئے کہ مجھ کمبخت کو تو اتنے کام ہیں کہ بعد نماز قرآن سُنتا ہوں ۔ خطوط کے جواب

لکھتا ہوں بعض روز چالیس چالیس، پچاس پچاس خطوط آجاتے ہیں۔ آخر میں بھی تو انسان ہوں۔ میرا بھی راحت و آرام کو جی چاہتا ہے۔ بعض کام ایسے ہوتے ہیں کہ بدون تخلیہ کے نہیں ہو سکتے۔ اس لیے تھوڑا بہت وقت ان کاموں کے لیے بھی چاہیئے۔ پھر میں تو اس پر بھی دو ڈھائی گھنٹے دے دیتا ہوں۔ ہاں مجھے تلوے سہلانے نہیں آتے۔"

(اشرف المعمولات ص۵۰)

حقیقتِ بے مروتی

ایک خط کے جواب کے سلسلے میں فرمایا کہ منجملہ میری اور بے مروتیوں کے ایک بے مروتی یہ بھی ہے کہ میں جواب میں سائل کی خواہش کی رعایت نہیں کرتا بلکہ حدود اور رسائل کے مصالح کی رعایت کرتا ہوں۔ ایک صاحب نے عرض کیا کہ حضرت عام پیروں کے ہاں تو یہ معاملات اور اصول نہیں ہیں۔ صرف آپ کے ہاں ہیں۔ اس لیے کہا جاتا ہے کہ آپ کے مزاج میں درشتی ہے۔ تبسم فرماتے ہو مزاحاً فرمایا کہ درشتی کے تین نقطے الگ کر دیئے جائیں۔ تو حقیقت خود بخود واضح ہو جاتی ہے کہ درشتی کے پردہ میں درستی ہوئی ہے۔

(الافاضات الیومیہ جلد ۱ ص۳۲)

حقیقتِ بدمزاجی

قنوج کے ایک صاحب حضرت کی خدمت میں تشریف لائے اور ایک رسالہ پیش کیا کہ یہ حضرت کی نگاہ سے گذرا ہے یا نہیں؟ حضرت نے دریافت فرمایا کہ اس کے دکھلانے سے آپ کا کیا مطلب ہے؟ اس پر وہ خاموش رہے۔ اس پر فرمایا کہ دیکھیے لوگوں کی یہ حالت ہے کہ خواہ مخواہ مجھے پریشان کرنے کے لیے تشریف لاتے ہیں۔ جب دریافت کرتا ہوں کہ کیا مطلب ہے تو بولتے نہیں۔ اب تبلایئے میری کیا خطا ہے؟ اس پر لوگ مجھے بدمزاج کہتے ہیں۔ آپ انصاف کیجیے کہ میں بدمزاج ہوں یا یہ۔ میں نے یہی تو پوچھا

تھا کہ آپ کا مطلب کیا ہے۔ تبلائیے اس میں گناہ کی کیا بات ہے۔ اس پر وہ صاحب اُٹھ کر چلے گئے تو فرمایا کہ یہ مجھے سب میں بدنام تو کریں گے مگر الحمد للہ ان کا علاج خوب ہو گیا ہے۔ اب ایسی حرکت کبھی نہ کریں گے اور ساری عمر یہ بات یاد رہے گی۔"

(ایضاً نمبر ۸ مزید المجید)

حقیقتِ بد خلقی

ایک مرتبہ فرمایا کہ آجکل تو یہ دستور ہو گیا ہے کہ ایک کام مشورہ سے طے ہوتا ہے پھر اس کے خلاف بلا مشورہ اس میں تصرف کر لیا جاتا ہے اب ان سے پوچھیے کہ جو بات مشورہ سے طے ہوئی تھی وہ مشورہ کے خلاف اکیلے کیوں کی۔ اگر خلاف ہی کرنا تھا تو اس میں بھی مشورہ کر لیتے۔ یہی تو خرابی ہے جس شخص کو کام دے دیتا ہوں وہ اپنے آپ کو مجتہد اور مستقل سمجھنے لگتا ہے۔ اسی واسطے میں کسی کے کام سپرد نہیں کرتا۔ مجھے ان باتوں سے سخت تکلیف ہوتی ہے اور پھر لوگ مجھے تو بد اخلاق کہتے ہیں اور ان کو کچھ نہیں کہتے۔"

(اشرف المعمولات صہ ۱۴۹)

حقیقتِ توحش

ایک دن لوگ حضرت کی مجلس میں دور دور تک بیٹھے ہوئے تھے اور آنے جانے والوں کو تکلیف ہو رہی تھی۔ اس پر فرمایا کہ "سب قریب قریب مل کر بیٹھیے افسوس کہ میں روز کہتا ہوں مگر کوئی اس کا خیال نہیں کرتا۔ کیا یہ بھی میرے ہی ذمہ ضروری ہے کہ روز کہا کروں۔ اگر کوئی نیا آدمی دیکھے تو یہی کہے گا کہ یہ شخص بھیڑیا معلوم ہوتا ہے جو لوگ اس قدر خائف ہیں کہ پاس آنے کی ہمت نہیں ہوتی۔ نیز فرمایا کہ اس قدر تعظیم کرنا بدعت ہے۔ (ایضاً صہ ۱۵۵)

حقیقتِ خفگی

فرمایا کہ ایک صاحب نے لکھا تھا کہ "کافر سے سود لینا کیوں حرام ہے؟ میں نے لکھا کہ

کافر عورت سے زنا کرنا کیوں حرام ہے ؟ اس کا تو جواب نہ دیا ۔ شکایت کا خط آ گیا ۔ کہ علماء کو اتنی خشکی نہ چاہیے ۔ جواب کے لیے ٹکٹ نہ تھا ۔ اس لیے جواب نہ دیا گیا ۔ اگر ٹکٹ ہوتا تو جواب دیتا کہ جہلاء کو بھی اتنی تری نہ چاہیے کہ اس میں ڈوب ہی جائیں ۔ پھر اتفاقاً ان سے رامپور میں ملاقات ہو گئی ۔ وہ وہاں سب انسپکٹر پولیس تھے ۔ کہنے لگے کہ آپ نے تو مجھ کو نہ پہچانا ہوگا ۔ میں نے کہا کہ نہیں ۔ کہا کہ میں فلاں شخص ہوں جس نے یہ سوال کیا تھا ۔ میں نے کہا کہ آہا آپ سے تو پرانی دوستی نکل آئی ۔ کہنے لگے کہ آپ نے ایسا خشک جواب کیوں دیا تھا ۔ میں نے کہا کہ تم تھانیدار ہو ۔ کیا مخصوصین اور عوام سب سے برتاؤ برابر ہے یا فرق ہے ۔ انھوں نے کہا کہ نہیں بلکہ فرق ہے میں نے کہا یہی حق ہم کو ہے آپ سے پہلے تعلق خاص نہ تھا ۔ اس لیے ایسا لکھا ۔ اب تعلق ہو گیا ہے ۔ ایسا نہ لکھوں گا لیکن جب تعلق کا اثر مجھ پر ہے اور میں ایسا جواب نہ دوں گا ۔ ایسا ہی اثر آپ پر ہوگا کہ آپ بھی ایسا سوال نہ کریں گے ۔ میں نے سوچا کہ جب میں بندھ رہا ہوں ان کو کیوں نہ باندھوں تاکہ پھر ایسا بیہودہ سوال ہی نہ کیا کریں ۔" (الافاضات الیومیہ صہ ۱۸۹ ج ۲)

حقیقتِ درشتی

فرماتے تھے کہ "بعض لوگوں کو بدوں سختی شفا نہیں ہوتی ۔ یہ میرا بارہا کا مشاہدہ ہے ۔ اب لوگ مجھے سخت کہتے ہیں ۔ تبلایئے ۔ جب مجھے پورا یقین ہو جائے کہ بدوں سختی کے فلاں شخص کا مرض نہیں جائے گا ۔ تو میں سختی نہ کروں تو یہ خیانت ہے یا نہیں ۔" چنانچہ ایک شخص حضرت والا کے پاس آیا کہ حضرت میرا جی عیسائی ہونے کو چاہتا ہے ۔ حضرت نے اسے ایک ایسی چپت رسید کی کہ منہ پھر گیا اور ایک دوسری طرف بھی لگا دی اور فرمایا کہ آپ کا خدا ہونے کو دل کیوں نہیں چاہتا ۔ کمبخت عیسائی ہو کر تو خود غلام رہے گا ۔ خود عیسےٰ ہی کیوں نہیں بن جاتا ۔ اور عیسےٰ ہونے پر بھی خدا کی غلامی کرنی پڑے گی ۔ خدائی کا دعویٰ کیوں نہیں کرتا اور پھر ایک لات رسید کی کہ جا دور ہو ۔ یہاں سے وہ خانقاہ سے

نکل کر بھاگنے لگا تو ڈانٹ کر فرمایا کہ باہر کیوں جاتے ہو مسجد کو کیوں نہیں جاتے وہ شخص خوف زدہ ہو کر مسجد میں جا بیٹھا۔ تھوڑی سی دیر کے بعد خود آ کر کہا کہ میرے کل شبہے جاتے رہے ہیں اور تسکین ہو گئی ہے۔ (اشرف المعمولات صد ۱۹۱)

اسی لیے آپ فرمایا کرتے تھے کہ:۔

"میری بد خلقی ان لوگوں کے ساتھ ہے جو لوگ مجھ سے تربیت کا تعلق رکھتے ہیں اگر کوئی اس تعلق کو نہ رکھے تو میرے خلق کو دیکھے۔" (ایضاً صد ۵۲)

اعترافِ حقیقت

دہلی کے گیسو دراز خواجہ حسن نظامی مرحوم جیسے مدعی علم و فہم بھی حضرت تھانوی کے مقالاتِ حکمت پر بعض اوقات نافہمی کی وجہ سے اعتراض کر بیٹھتے تھے۔ مگر ان کی یہ خوبی قابلِ داد ہے کہ جب کوئی بات ان کی سمجھ میں آجاتی تھی تو وہ فوراً اس کی حقیقت کا اعتراف بھی کر لیتے تھے۔ چنانچہ وہ حضرت تھانوی کے متعلق اپنے بعض شبہات کے سلسلہ میں رسالہ "درویش" نمبر ۱ جلد ۶ میں لکھتے ہیں کہ:۔

"جو اعتراضات میں نے (مولانا پر) کیے ہیں اب میں ان سے معذرت کرتا ہوں میرا ایک اعتراض یہ تھا کہ "آپ نے قرآن مجید کے ترجمہ میں فحش تعویذ درج کیے ہیں"۔ مگر بعد میں معلوم ہوا کہ وہ چھاپہ خانہ والے نے درج کیے تھے۔ آپ کے نہیں تھے۔

دوسرا اعتراض یہ تھا کہ "بہشتی زیور میں فحش باتیں لکھی ہیں"۔ مگر منصفانہ غور کے بعد معلوم ہوا کہ فقہ ایک قانون ہے اور قانون میں مخفی چیزوں کے احکام بیان کرنے ضروری ہوتے ہیں۔ ان پر فحش نویسی صادق نہیں آتی۔ مولانا اشرف علی صاحب نے جس قدر دین کی خدمات سر انجام دی ہیں۔ وہ ایسی نہیں ہیں کہ ان سے چشم پوشی کی جاوے۔ ہم سب کو ان کی خدمات

کی قدر کرنی چاہیے۔"
اہلِ علم کو پھر بھی کبھی نہ کبھی غور و خوض کی توفیق نصیب نہ ہو جاتی ہے اور سلیم الفطرت طبائع حق بات کو تسلیم کرنے میں گریز نہیں کرتے مگر سقیم الفطرت لوگ حقیقت واضح ہو جانے کے بعد بھی محض حسدِ فضیلت کی وجہ سے اس کی فضیحت کرتے رہتے تھے اور عوام کی حالت بالکل اس کی مصداق ہوتی ہے کہ ؎

نہ دیدند حقیقت رہ افسانہ زدند

سختی یا مضبوطی

متذکرہ بالا تمام تصریحات کے باوجود اس سلسلہ میں حضرت کا یہ ارشاد قول فیصل کی حیثیت رکھتا ہے کہ :-

"اگر اصول تو نرم ہوں لیکن ان کی پابندی سختی سے کرائی جائے تو وہ سختی نہیں ہوتی بلکہ مضبوطی ہوتی ہے جیسے ریشم کا رسہ نرم تو ایسا ہوتا ہے کہ چاہے گرہ لگا لو لیکن ساتھ ہی مضبوط اتنا ہوتا ہے کہ اگر اس سے ہاتھی کو بھی باندھ دیا جائے تو وہ بھی اس کو نہیں توڑ سکتا۔ لہٰذا ریشم کو سخت نہ کہا جائے گا بلکہ مضبوط کہا جائے گا البتہ لوہے کی زنجیر کو سخت کہا جائے گا۔ کیونکہ لوہا اپنی ذات میں سخت ہے اگر اس کی زنجیر کسی کے پاؤں میں ڈال دی جائے تو وہ پاؤں کو زخمی کر دے۔ بخلاف ریشم کے رسہ کے۔ کہ پابند رکھنے کی صفت میں تو وہ لوہے کی زنجیر سے بھی بڑھ کر ہے لیکن اس سے پاؤں زخمی نہیں ہوتے بلکہ بہت آرام میں رہتے ہیں اور اگر کوئی اپنے کو بلا رد وکد اس کا پابند رکھے اور خواہ مخواہ اس کی پابندی سے اپنے آپ کو نکالنے کی فضول جدّ وجہد نہ کرے تو کشاکشی کی دکھن تک بھی نہ ہو اسی طرح اگر میرے ہاں آکر اصولِ صحیحہ کا پابند رہے تو اس کو کبھی کسی ناگواری کا موقع

عمر بھر میری طرف سے پیش نہ آئے۔ لوگ خود اصولِ صحیحہ کو توڑ کر اور بے اصول باتیں کرکر کے مجھے بھی تکلیف دیتے ہیں اور خود بھی مصیبت میں پڑتے ہیں۔ جس کے وہ خود ذمہ دار ہیں نہ کہ میں یا میرے ہاں کے اصول! مجھے تو اس بات پر رنج آتا ہے کہ میں تو ان کی اتنی رعایت کرتا ہوں کہ ان کی نظر بھی وقائقِ رعایت تک نہیں پہنچ سکتی اور میرے ساتھ وہ ایسی بے فکری کا معاملہ کرتے ہیں۔ وہ خود جو چپکے سے سوئی چبھو دیتے ہیں۔ اسے تو کوئی نہیں دیکھتا اور اس تکلیف سے میں جو آہ کرتا ہوں اس کو سب سنتے ہیں۔ اس لیے ظالم تو مظلوم سمجھا جاتا ہے اور مظلوم ظالم۔

غرضیکہ میں تو بدنام ہو جاتا ہوں اور ستانے والے صاحب سرخرو بنے بیٹھے رہتے ہیں۔

محبوبیّت

شانِ محبوبیت

محبت ایک فطری جذبہ ہے۔ اس سے ہی خالق و مخلوق کے تعلقات استوار ہوتے ہیں۔ انسان جوں جوں طاعات میں ترقی کرتا ہے۔ اس کے درجات میں ترقی ہوتی جاتی ہے اور حق تعالیٰ اس کی طاعات سے خوش ہو کر اپنے بندوں کے دلوں میں اس کی محبت و عظمت پیدا کر دیتے ہیں جس کی وجہ سے لوگوں کو خود بخود اس کی طرف کشش ہونے لگتی ہے۔

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی محبوبیت کا یہ عالم تھا کہ بچپن میں دیوالی کی رات کو اپنے چھوٹے بھائی منشی اکبر علی کے ساتھ مل کر دیوالی کے چراغ بجھاتے چلے جاتے اور

کوئی اُف تک نہ کرتا بلکہ سب مُسکرا دیتے۔

طالب علمی کے زمانہ میں آپ شروع سے اخیر تک حلقہ اساتذہ میں اتنے محبوب رہے کہ اکثر وُہ خود چل کر آپ کو ملنے آتے تھے اور سب سے زیادہ آپ پر عنایت و شفقت فرماتے تھے یہاں تک کہ عالمِ برزخ سے بھی توجہ فرماتے رہے۔

اہلِ اللہ کی نظر میں اتنے محبُوب تھے کہ وُہ آپ کے نادیدہ گرویدہ تھے بعض فرمایا کرتے تھے کہ ہمیں اشرف سے اس وقت سے محبت ہے جبکہ اس کو خبر بھی نہ تھی۔ بعض عالمِ بالا سے آکر خواب میں تسلّی دیتے تھے کہ ہم کو جو توجہ تمہارے ساتھ عالمِ حیات میں تھی۔ وُہ اَب بھی ہے۔ مختلف المشرب بزرگ آپ کا اپنے اکابر جیسا احترام کرتے تھے اور شیخ العرب والعجم حاجی امداد اللہ صاحب نے تو آپ کو مکہ معظمہ سے بلوا بھیجا تھا۔

ان تمام واقعات کی تفصیل اوراقِ ماسبق میں گذر چکی ہے۔ ذیل میں آپ کے محبُوبِ خلائق ہونے کے چند دیگر شواہد پیش کیے جاتے ہیں۔

سلامِ رسُولِ اکرمؐ

ایک رات کو بنگلہ دیش (سابق مشرقی پاکستان) کے دارالخلافہ ڈھاکہ کے ایک بزرگ کو حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت نصیب ہُوئی۔ حضورؐ نے ان سے فرمایا کہ

"اشرف علی کو میرا سلام پہنچانا"

وہ حضرت تھانوی کے شناسا نہ تھے۔ اس لیے عرض کی کہ حضور میں تو ان سے ناواقف ہُوں ارشاد ہوا "ظفر کے ذریعہ" جو ان کے واقف تھے۔ یعنی حضرت مولانا ظفر احمد عثمانی مدظلہٗ جو حضرت کے حقیقی بھانجے ہیں اور اس وقت ڈھاکہ میں رہائش پذیر تھے چنانچہ صبح ہوتے ہی اُنھوں نے اس واقعہ کی مولانا ظفر احمد صاحب کو خبر کی جو انھوں نے حضرت تھانویؒ تک پہنچائی جب حضرت تھانوی کو یہ مژدہ جانفزا پہنچا تو آپ پر فرطِ ادب و مسرت سے ایک خاص کیفیت طاری ہو گئی اور زبان سے بے ساختہ نکلا۔

وعلیك السلام یا نبی اللہ"

اور اس دن کے تمام معمولات موقوف کر کے سارا دن درود شریف پڑھنے میں مشغول رہے۔

فخرِ شیخ الہند

حضرت مولانا محمود الحسن دیوبندی رحمۃ اللہ علیہ کا سیاسی مسلک حضرت تھانوی کے مسلک کے بالکل خلاف تھا اور اتنا خلاف تھا کہ مولانا جسے حیات سمجھتے حضرتِ تھانوی اسے موت سے تعبیر کرتے تھے اور علماء ہند کی اکثریت مولانا کے ساتھ تھی مگر حضرت تھانوی سخت مخالفتوں اور شورشوں کے باوجود اپنے مسلک پر چٹان کی طرح جمے رہے۔ حضرت تھانوی کی اس جرأت و ہمت پر فخر کرتے ہوئے حضرت شیخ الہند فرمایا کرتے تھے کہ:۔

"ہمیں فخر اور خوشی ہے کہ ان تحریکاتِ حاضرہ سے جو بالکل کنارہ کش ہے وہ بھی ہمیں میں سے ہے۔"

کیونکہ حضرت تھانوی آپ کے شاگرد تھے۔

رشکِ عالم

حضرت مولانا خلیل احمد رحمۃ اللہ علیہ اپنے وقت کے عالم باعمل اور درویش کامل تھے۔ گو حضرت سے علم و فضل سن و سال میں بڑے تھے مگر آپ سے بعض اوقات ایسا برتاؤ کرتے تھے جیسے چھوٹے بڑوں کے ساتھ تواضع سے پیش آتے ہیں۔ وہ آپ کو مدایا سے بھی مشرف فرماتے تھے اور بڑے شوق سے حضرت کا وعظ بھی سنتے تھے اور بے اختیار ہو کر فرماتے تھے کہ:۔

"اس کے بیان میں کہیں انگلی رکھنے کی گنجائش نہیں ہوتی۔"

تاثر ثواب

ایک مرتبہ نواب رامپور نے قادیانیوں سے مناظرہ کے لیے بہت سے علماء بلائے ہوئے

تھے۔ ان سے روزانہ نواب صاحب ملاقات کرتے۔ حضرت تھانوی بھی دیگر علمائ کے ساتھ چلے جاتے۔ مگر بہت فاصلے پر نظریں نیچی کر کے خاموشی کے ساتھ بیٹھے رہتے۔ جس سے نواب صاحب بہت متاثر ہوئے۔ جب نواب صاحب کے ایک مصاحب حضرت سے ملنے آئے تو انھوں نے حضرت سے نواب صاحب کا قول نقل کرتے ہوئے کہا کہ :-

"نواب صاحب مجھ سے پوچھتے تھے کہ یہ کون صاحب تھے جو گردن جھکائے بیٹھے رہتے تھے۔ یہ کوئی صاحب اثر شخص معلوم ہوتے ہیں۔ کیونکہ ان کی طرف قلب کو خواہ مخواہ کشش ہوتی تھی۔"

اعتقادِ استاد

حکیم عبدالمجید خان دہلوی بہت بڑے مشہور حکیم اور مستغنی المزاج رئیس تھے حضرت تھانوی نے اُن سے صرف پندرہ دِن طب پڑھی تھی۔ حکیم صاحب کے دل میں ان چند دنوں کی صحبت سے ایسی محبت پیدا ہوئی کہ جب حضرت تھانوی تھانہ بھون میں آکر مقیم ہوئے تو حکیم صاحب نے تھانہ بھون آکر حضرت سے ملنے کا قصد فرمایا۔ اور دہلی میں رہنے والے تھانہ بھون کے ایک صاحب سے پوچھا کہ تھانہ بھون حاضر ہونے کے کیا قواعد ہیں؟ انھوں نے کہا کہ وہ تو آپ کے شاگرد ہیں۔ آپ کے لیے قواعد کیا ہوں گے؟ حکیم صاحب نے فرمایا :-

"نہیں بھائی! اُستادی شاگردی الگ چیز ہے اور یہ راستہ الگ چیز ہے میں تو وہاں اُسی طرح جاؤں گا جیسے معتقدین جاتے ہیں۔"

مگر قضا نے یہ ارادہ پورا نہ ہونے دیا۔ جب حضرت تھانوی کو اس بات کا علم ہوا تو آپ نے انتہائی افسوس کے ساتھ فرمایا :-

"اگر مجھ کو ان کا یہ خیال قبل از انتقال معلوم ہوتا تو مَیں خود ہی پہنچ کر ان

سے عرض کرتا کہ بھئے حضرت ! آپ کے لیے میرے پاس آنے کے بس یہ قواعد ہیں کہ میں خود حاضر ہو گیا ہوں۔

اشتیاقِ افغان

ایک مرتبہ حضرت تھانوی دیوبند کے سالانہ جلسہ کے موقعہ پر وعظ فرما رہے تھے اس وقت حضرت خواجہ عزیز الحسن مجذوبؒ صاحب "اشرف السوانح" کے پاس ہی ایک سرحدی پٹھان بیٹھا وعظ سُن رہا تھا اور بڑے مزے لے لے کر کہہ رہا تھا کہ :۔

ارے مولوی ! خدا تجھے سلامت رکھے۔ ہم تو بس اتنی دُور سے یہ تیری صورت ہی دیکھنے آتے ہیں "

اعترافِ غیر مسلم

ایک سفر کے دوران میں چند ہندو بھی آپ کے ہم سفر تھے اور حضرت کی قیل وقال بڑے غور سے سُنتے جاتے تھے ۔ ان میں سے ایک نے ہمراہی سے کہا کہ ان باتوں کی طرف دل کو کشش ہوتی ہے ۔ دُوسرے نے کہا کہ "یہ حق ہونے کی دلیل ہے ۔ چونکہ یہ لوگ سچے ہوتے ہیں ۔ اس لیے ان کی باتوں میں اثر ہوتا ہے۔"

حسرتِ ہندی

ایک اور موقعہ پر ایک معزز ہندو حضرت کے ڈبّہ میں سفر کر رہا تھا ۔ ڈبّہ چھوٹا تھا ۔ راستہ میں ایک فراخ ڈبّہ کی اطلاع ملنے پر جب حضرت تھانوی اس ڈبّہ سے تشریف لے جانے لگے ۔ تو اس ہندو نے بصد حسرت کہا کہ :۔

" اجی آپ ہی کی وجہ سے تو یہاں نور ہی نور تھا ۔ آپ اپنے ساتھ نُور کو بھی لے چلے "

محبُوبیتِ عامہ

حضرتِ تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کو طبعاً ہجومِ خلق سے وحشت ہوتی تھی ۔ مزید براں وہ

استقبالِ عامہ کو بھی تضیع اوقات پر محمول فرما کر اس کی اجازت نہ دیتے تھے ۔ جیسے نواب ڈھاکہ کو عمال و احکام ریاست کے ساتھ استقبال کرنے سے روک دیا تھا مگر پھر بھی لوگ آپ کی آمد کی خبر پاکر نواب صاحب کی تحریک کے بغیر خود بخود اسٹیشن پر پہنچ گئے تھے ۔ اسی طرح ہر جگہ حضرت کی آمد پر مشتاقانِ دید کے جمِ غفیر لگے رہتے ۔ حضرت مولانا عبدالماجد دریابادی حضرت کی آمدِ لکھنؤ کے سلسلہ میں اپنے مشاہدہ کی بنا پر لکھتے ہیں :-

" حضرت کا آنا کسی لیڈر کا آنا نہ تھا ۔ نہ پوسٹر چھپے ۔ نہ اشتہارات تقسیم ہوئے ۔ نہ ڈگی ٹپی ۔ نہ رضا کاروں نے نعرے لگائے ۔ نہ مقامی اخبارات میں آمد کا غلغلہ بلند ہوا ۔ اس کے باوجود خلقت کا ایک میلہ صبح اور سہ پہر دونوں وقت لگا رہتا تھا کوئی ملفوظات مبارک سے استفادہ کو آتا ۔ کوئی مصافحہ اور دست بوسی پر ٹوٹ پڑتا اور کسی کو محض شوقِ زیارت کھینچ لاتا ۔ اولیاء اللہ میں جو ایک خاص قسم کی کشش ۔ محبوبیت و مرجعیت ہوتی ہے ۔ اس کا نمونہ اپنی آنکھوں سے دیکھا اور بار بار دیکھا ۔"

(حکیم الامت صہ ۵۷۱)

مقبولیّت

دستورِ دُنیا

بازارِ دُنیا کے ہر دکاندار کی یہ طبعی خواہش ہوتی ہے کہ اس کا خریدار دوسری دکان پر نہ جائے ۔ بلکہ اس کی انتہائی کوشش ہوتی ہے کہ دُوسری دکانوں کے خریدار بھی وہاں سے ہٹ کر اس کی دکان پر آنے لگیں ۔ اس غرض کے لیے بسا اوقات وُہ غلط بیانی کرنے یا گاہک کو فریب دینے سے بھی گریز نہیں کرتا ۔

بازارِ معرفت میں اس کے بالکل برعکس رواج ہے۔ چونکہ ہر عارف کے پیشِ نظر ذاتی مفاد سے زیادہ مفادِ عامہ ہوتا ہے۔ اس لیے اس کی نظر و تحقیق میں جو بھی اس سے زیادہ ماہر کامل ہوتا ہے۔ وہ ترغیباً اعترافاً اس کے کمالات کا ذکر اپنے حلقۂ مریدین میں اکثر کرتا رہتا ہے اور اسے اس بات کا قطعاً اندیشہ نہیں ہوتا کہ میرا مرید کسی دوسرے بزرگ کی معرفت گاہ میں چلا جائے گا۔

وجۂ مقبولیت

جس طرح حق تعالیٰ نے عوام و خواص کے دلوں میں حضرت تھانویؒ کی محبت و کشش پیدا کر دی تھی۔ اس طرح اسی کے فضل سے مقربانِ الٰہی پر حضرت تھانویؒ کے مجدد ہونے کی حقیقت بھی منکشف ہو چکی تھی۔ اس لیے حضرت تھانویؒ کے ہم عصر اولیاء و صلحا اور علماء و فضلا اپنی اپنی مجلسوں میں بلا خوف لومۃ لائم حضرت تھانوی کی فضیلت بیان فرماتے رہتے تھے حالانکہ ان میں بعض ایسے بزرگ بھی تھے۔ جو بلحاظ سن و صال۔ علم و فضل اور زہد و تقویٰ حضرت تھانویؒ پر فضیلت رکھتے تھے۔ اور جن کا صاحبِ فضیلت ہونا خود حضرت تھانویؒ کو تسلیم تھا۔ ایسے بزرگوں کا اعترافِ فضیلت حضرت تھانویؒ کی مقبولیت کی بین دلیل ہے اگرچہ اوراق ماسبق میں ایسے کئی واقعات گذر چکے ہیں جن سے حضرت تھانویؒ کے مقبول عام ہونے کی تائید ہوتی ہے۔ مگر ذیل میں آپ کی مقبولیتِ عامہ کی تائید میں چند مزید حقائق پیش کیے جاتے ہیں۔

اعترافِ حقانیت

قطب الارشاد حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ سے ایک دفعہ کچھ لوگوں نے بعض اختلافیات کے متعلق حضرت تھانویؒ کی شکایت کرنا چاہی۔ تو مولانا نے انھیں یہ فرما کر روک دیا کہ :۔

"میں ان کی کوئی شکایت نہیں سننا چاہتا۔ کیونکہ وہ جو کام کرتے ہیں۔

نفسانیت سے نہیں کرتے ۔"

اعترافِ فضیلت

ایک مرتبہ حضرت تھانوی گنگوہ میں وعظ فرما رہے تھے ۔ اس وقت جو کوئی حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کی خدمت میں حاضر ہوتا ۔ وہ اس سے فرماتے کہ :۔

" ایک عالمِ حقانی کا وعظ ہو رہا ہے ۔ وہاں جاؤ ۔ میرے پاس کیوں آئے ہو ۔"

اعترافِ اختیار

ایک مرتبہ ایک تقریب کے موقعہ پر حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت تھانویؒ دونوں مدعو تھے ۔ اس تقریب میں کوئی رسم بدعت تو نہ ہوئی تھی ۔ البتہ صاحب تقریب نے عالم برادری کو مدعو کر رکھا تھا ۔ جسے حضرت تھانویؒ رسومِ تفاخر میں سے سمجھتے تھے اس لیے آپ وہاں جاکر یہ حالت دیکھتے ہی واپس آگئے ۔ ایک صاحب نے اس کے متعلق حضرت شیخ الہند سے سوال کیا تو آپ نے فرمایا :۔

" واقعی بات یہ ہے کہ عوام کے مفاسد کی جس قدر انھیں اطلاع ہے ۔ ہم کو اطلاع نہیں اس لیے انھوں نے احتیاط کی ہے ۔"

اعترافِ تقویٰ

اتفاق سے اسی تقریب میں حضرت مولانا خلیل احمد سہارنپوریؒ خلیفہ حضرت مولانا گنگوہیؒ بھی موجود تھے ۔ جب ان سے اس بارہ میں سوال کیا گیا تو اُنھوں نے فرمایا کہ :۔

" ہم نے فتویٰ پر عمل کیا ہے اور اس نے تقویٰ پر عمل کیا ہے ۔"

اعترافِ اصُول

حضرت مولانا گنگوہیؒ کے خلیفہ حضرت مولانا شاہ عبدالرحیم رائپوری رحمۃ اللہ علیہ اپنی بیماری کے زمانہ میں عیادت کرنے والوں کے وقت بے وقت ہجوم سے پریشان ہو کر فرماتے تھے کہ :۔

"مولانا تھانوی کے اصُول بڑی راحت کے ہیں"۔

کیونکہ حضرت تھانوی کے ہاں ہر بات اور ہر کام ضابطہ سے ہوتا تھا اور ہر کس و ناکس کو ان کے اصُولوں کی پابندی کرنی پڑتی تھی، جس سے سب کو آرام ملتا تھا۔

اعترافِ تہذیب

حفیظ جونپوری اپنے وقت کے مشہور شعرا میں سے تھے اور بڑے آزاد طبع اور "مہذب" لوگوں میں اُٹھنے بیٹھنے والے تھے۔ خوش بختی انھیں دربارِ اشرفیہ میں کھینچ لائی یہاں پہنچنے کے بعد تہذیبِ اسلام کی حقیقت معلوم ہونے پر انھوں نے اپنے رسالہ "مآل" میں "تہذیبِ جدید" جسے تہذیبِ افرنگ کہنا زیادہ موزوں ہوگا۔ کے متعلق لکھا کہ :-

"جس تہذیب کو ہم نے مدت العمر امراء اور بڑے بڑے مہذبین کی صحبتوں میں رہ کر حاصل کیا تھا۔ تھانہ بھون آکر معلوم ہُوا کہ وُہ سراسر بدتمیزی تھی"۔

اعترافِ علم

مولانا صادق الیقین رحمۃ اللہ علیہ حضرت گنگوہیؒ کے مرید اور حضرت تھانوی کے شاگرد ہونے کی وجہ سے اپنے والد سراج الیقین سے جو کرُسی کے ایک خوش وقت سجادہ نشین تھے۔ بعض اُمور پر اس قدر اختلاف رکھتے تھے کہ تعلقات سخت کشیدہ ہو گئے تھے۔ یہاں تک کہ قطع تعلق ہو چکا تھا۔ حضرت تھانوی پر یہ امر ناگوار گذرا کہ میرے شاگرد کی اپنے والد سے منازعت ہو۔ اس لیئے آپ نے ایسے مسائل اختلافیہ کے متعلق جنھوں نے باپ بیٹے کو ایک دُوسرے سے جُدا کر رکھا تھا۔ مولانا سراج الیقین کو نہایت لطیف پیرایہ اور نرم عنوان سے ایک خطؔ لکھا۔ جس میں ان مسائل پر روشنی ڈالی گئی۔ اس خط کا پڑھنا تھا کہ مخالف موافق ہو گیا۔ یعنی باپ نے بیٹے کے مسلک کی صحت کو تسلیم کر لیا۔ اختلاف المشرب

ؔ مکتوب محبوب القلوب

کے باوجود حضرت تھانوی کے ایک ہی خط سے اتنے اثر پذیر ہوئے کہ آپ سے ملاقات کرنے کے بعد قبر پر چادر چڑھانے کی بدعت ترک کر دی۔ صرف خود ہی یہ بدعت ترک نہ کی، بلکہ اپنے ایک ہم مشرب اور معتقد فیہ عالم سے اس مسئلہ پر اختلاف کرتے ہوئے فرمایا:-

"حضرت تھانوی موجود ہیں۔ ہندوستان میں جس عالم کا جی چاہے ان سے گفتگو کرے۔ میں ان کے برابر کسی کو عالم نہیں سمجھتا۔"

اعترافِ محبت

حضرت مولانا تاج محمود امروٹی سندھ کے مشہور مشائخ میں سے تھے سفرِ سندھ کے دوران میں حضرت تھانویؒ سے ان کا تعارف ہوا۔ پہلی ملاقات کے بعد حضرت تھانویؒ سے اتنے متاثر ہوئے کہ ان کے دورہ میں شریک رہے اور اپنے مریدوں سے وصیتاً حضرت تھانویؒ کا ان الفاظ میں تعارف کرایا کہ:-

"حضرت مولانا تھانویؒ چونکہ اہلِ حق سے ہیں۔ اس لیے ان کی محبت حق تعالےٰ جل شانہٗ کی محبت ہے۔"

جس کی وجہ سے ان کے اکثر مرید حضرت تھانوی سے مستدعی دعا رہتے تھے۔

اعترافِ طریقت

پیر جھنڈا صاحب سندھ کے مشہور شیخ گزرے ہیں۔ ان کے مریدوں کا حلقہ بہت وسیع تھا۔ حضرت تھانویؒ کے دورہ سندھ میں ان کی حضرت سے واقفیت ہوئی۔ حضرت کی بہت تعظیم و تکریم فرمائی۔ خرقہ عطا فرمایا اور آپ کے طریق کا اعتراف کرتے ہوئے مریدوں سے کہا کہ:-

"جس بات کے پوچھنے کی ضرورت ہو۔ یا تم لوگوں کے درمیان کسی امر میں اختلاف ہو تو مولانا (حضرت تھانویؒ) سے رجوع کرنا۔"

اعترافِ صداقت

کانپور میں یہ عام دستور تھا کہ لوگ مولود شریف کے درمیان میں قیام کرتے تھے۔ حضرت تھانویؒ کو نووارد ہونے کی وجہ سے اس رسم کا ابھی علم نہیں ہوا تھا کہ ایک روز آپ کو ایک جگہ مولود شریف میں شرکت کا اتفاق ہوا مگر اس دوران میں جب لوگوں نے قیام کیا تو آپ نے قیام نہ کیا اور نہایت بے فکری سے بیٹھے رہے۔ کیونکہ اپنے حضرات کا یہ معمول نہ تھا حضرت کے ایک شاگرد نے آپ سے عربی میں کہا کہ اس وقت بیٹھا رہنا مناسب نہیں۔ آپ نے فوراً فرمایا کہ لاطاعۃ للمخلوق بمعصیت الخالق خدا کی نافرمانی سے مخلوق کی اتباع نہ کرنا ہزار درجہ بہتر ہے۔ اس پر وہ شاگرد بھی بیٹھے رہے۔ لوگوں کو اس معاملہ میں اتنا غلو تھا کہ مجلس مولود میں اگر کوئی قیام نہ کرتا تو اسے اسی وقت پیٹ دیتے مگر حضرت تھانوی کی عظمت و محبت کی وجہ سے سب انہیں کنکھیوں سے دیکھتے رہے کسی کو ہاتھ اُٹھانا تو ایک طرف رہا۔ زبان کھولنے کی بھی ہمت نہ ہوئی۔

بانی مدرسہ عبدالرحمٰن خاں کے صاحبزادے اور دیگر مقتدر حضرات بھی باوجودیکہ اسی عقیدہ کے قائل تھے مگر کہنے لگے کہ اگر ہمیں خبر ہوتی کہ مولانا کھڑے نہیں ہوتے تو ہم بھی کھڑے نہ ہوتے۔

اعترافِ عظمت

حضرت کے قیام کانپور کے ابتدائی زمانہ میں چند عورتیں نیاز دلانے کے لیے جامع مسجد میں جلیبیاں لائیں۔ طلباء وہیں رہتے تھے۔ اُنھوں نے بلا نیاز دیے وہ کھالیں کیونکہ بقول حضرت تھانوی ان کو ناز تھا۔ نیاز کیا دیتے۔ اس پر عورتیں بڑی بگڑیں اور اپنے مردوں کو بلا لائیں۔ جس پر بڑا ہنگامہ ہونے لگا۔ ایک طالب علم دوڑ کر حضرت کو بلا لایا۔ آپ نے آتے ہی ایک دو کو دھپڑ مارے۔ ایک دو سے خفا ہوئے کہ بلا اذن کسی کی چیز کھالینا کہاں جائز ہے؟ بوجہ عظمت و محبت حضرت کی خفگی ان لوگوں سے نہ دیکھی گئی

اور انھوں نے فوراً حضرت کی خفگی دُور کرنے کے لیے طلباء کو بچانے کی خاطر ان کی حمایت شروع کر دی مگر حضرت نے جلیبیاں کھانے والوں سے ایک ایک پیسہ وصُول کر کے ان کو جلیبیوں کی قیمت ادا کر کے فرمایا کہ :۔

"بھائی ! یہاں وہابی رہتے ہیں - یہاں فاتحہ نیاز کے لیے چیزیں مت لایا کرو۔"

اس واضح ہدایت کے باوجود لوگ یہ کہتے ہوئے چلے گئے کہ حضرت یہ طلباء وہابی ہیں - آپ ہرگز وہابی نہیں -

اعتراف حکمت

ضلع کانپور کے قصبہ گجنیر میں آریہ سماجیوں کی تحریک ارتداد کی خبر سُن کر آپ چند ہمراہیوں کے ساتھ وہاں پہنچے - سامان خورد و نوش - ڈیرہ خیمہ وغیرہ سب کچھ ہمراہ تھا - آریہ کی ریشہ دوانیوں سے وہاں مُسلمانوں کی یہ حالت تھی کہ سر پر ہندوؤں کی طرح چوٹی رکھتے تھے - نکاح کے وقت پھیرے دیتے تھے اور مسلمانوں کے ہاتھ سے کھانا پینا پاپ سمجھتے تھے اور اپنے اسلامی ناموں کو بھی ہندوانہ طریق پر بدل رکھا تھا حضرت نے وہاں کے سرداروں کو بلایا - جن کے نام سرکاری کاغذات میں نتھو خاں اور ادھار خاں تھے - مگر وہ نتھو سنگھ اور ادھار سنگھ کہلاتے تھے - حضرت نے شربت پیش کیا تو انھوں نے عذر کر دیا کہ ہم مسلمان کے ہاتھ سے کچھ نہیں کھاتے - حضرت نے پُوچھا کیا آپ ہندو ہیں ؟ کہا نہیں - دریافت فرمایا مُسلمان ہو کہا نہیں ؟ کہا گیا آخر کون ہو ؟ کہنے لگے نومُسلم ! اس کی تائید میں نتھو خاں نے تو یہ خیال ظاہر کیا کہ نیوگ کی خرابی کی وجہ سے آریہ مذہب کون شریف اختیار کر سکتا ہے ادھار خاں نے کہا کہ ہم تو تعزیہ نکالنے میں ہم ہندو کیوں بننے لگے - حکیم الامت نے کفر کے حملہ کی شدت کے پیش نظر ادھار سنگھ کو تعزیہ نکالنے کی بدعت جاری رکھنے کی اجازت دے دی - ہمراہیوں کے اشکال پر فرمایا کہ " ان کے لیے بدعت دوا یہ ہے

کفر ہے"۔ اس لیے ان کو اس سے منع کرنا مصلحت نہیں"۔ اس کے بعد حضرت نے وعظ کا اعلان وہاں کے حالات کی مصلحت سے ان الفاظ میں کر دیا کہ مسلمانوں کی کتھا ہوگی۔ کتھا سن کر لوگ جمع ہوئے۔ حضرت تھانوی اپنے ہمراہ پہلے سے ہی کچھ میلاد خواں لے گئے تھے۔ چنانچہ اس "کتھا" میں ان سے میلاد شریف پڑھوایا گیا۔ گو حضرت خود اس مجلس میں شریک نہ ہوئے۔ بعد ازاں اس تبلیغی وفد کی اطلاع پا کر قصبہ بارہ پرگنہ۔ اکبر پورہ کے رؤسا بھی آگئے۔ حضرت نے مجمع عام میں بیان فرمائے جو لوگوں نے صبر و تحمل سے سُنے۔ کئی دن کی تبلیغ کے بعد جب انھوں نے پختہ وعدہ کر لیا کہ ہم مرتد نہ ہوں گے تو حضرت نے واپسی کی تیاری فرمالی۔ جب آپ واپس آنے لگے تو انھوں نے وفد سے یہ بھی کہہ دیا کہ "ہم تمہارے جیسے مسلمان بھی نہ ہوں گے بلکہ ایسے ہی نو مسلم رہیں گے"۔ غرضیکہ ایسے ناموافق ماحول اور نامساعد حالات میں ان لوگوں نے حضرت تھانویؒ کے بیان تو صبر و شکر سے سن لیے۔ مگر جب حضرت نے اپنے ہمراہی مولوی سعید احمد تھانوی مرحوم کو بعض دیہات میں اسی زمانہ میں تبلیغ کے لیے بھیجا تو لوگوں نے اتنی بے اتفاقی کی کہ انھیں گرمی کے موسم میں دوپہر کو سستانے کی جگہ بھی نہ دی۔ لُو کی شدت سے آپ کو بہت تکلیف میں دیکھ کر آخر ایک برہمن نے انھیں ٹھکانا دیا۔ مولوی صاحب کھانے کے لیے ستو ہمراہ لے گئے تھے مگر کسی نے ستو گھولنے کے لیے برتن تک نہ دیا اور انھوں نے تنگ آکر رومال میں پانی ڈال کر ستو بھگو کر گزارہ کیا اور بالآخر تنگ ہو کر واپس آگئے۔ مگر حضرت تھانوی کی حکمتِ عملی کے سامنے ان کی کوئی پیش نہ گئی اور وہ بطیبِ خاطر سب کچھ سنتے رہے۔

غرضیکہ حضرت تھانوی اپنی کسی نہ کسی خوبی کی کمال کی وجہ سے ہر طبقہ اور ہر حلقہ میں مقبول رہے۔

عزّ وشرّف

لازمۂ بزرگی

آج کل یہ ایک دستور سا ہوگیا ہے کہ جب تک کسی سے کشف و کرامات کا صدور نہ ہو اسے بزرگ نہیں سمجھا جاتا۔ خواہ وہ کتنا متبع شریعت ہو اور جسے اُمور شرعیہ کی پابندی کا قطعاً کوئی خیال یا اہتمام نہ ہو۔ اور اس سے خوارق کا صدور ہو تو بس لوگ اس کے گرد پروانوں کی طرح جمع رہتے ہیں۔ حالانکہ جن باتوں کو آجکل لازمۂ بزرگی سمجھا جاتا ہے۔ فی الحقیقت وہ مانع بزرگی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ خانقاہ اشرفیہ میں ایسی باتوں کی طرف کبھی دھیان نہیں دیا جاتا تھا۔ اگر بعض واقعات کی بناء پر کوئی ایسا خیال بھی کرتا تھا تو حضرت فوراً اس کی تردید فرما دیتے تھے اور کسی کو ان باتوں کی طرف التفات نہیں کرنے دیتے تھے۔ حالانکہ دُوسرے آستانوں میں ان ہی چیزوں کو اصل مقصود سمجھا جاتا تھا۔

حقیقتِ خوارق

حضرت تھانوی لکھتے ہیں کہ :-

"خرق عادت کئی قسم پر ہے۔ ایک قسم کشف ہے جس کی دو قسمیں ہیں۔ کشف کونی اور کشف الٰہی۔ کشف کونی یہ کہ بعد مکانی یا زمانی اس کے لیے حجاب نہ رہے کسی چیز کا حال معلوم ہو جائے۔ کشفِ الٰہی یہ کہ ذات وصفات یا سلوک کے متعلق علوم و اسرار و معارف اس کے قلب پر وارد ہوں یا عالمِ مثال میں یہ چیزیں متمثل ہو کر مکشوف ہوں۔

دوسری قسم الہام ہے کہ مومن کے قلب پر اطمینان کے ساتھ کوئی علم القاء ہو۔ یا کبھی ہاتفِ غیبی کی آواز سُن لیتا ہو۔

تیسری قسم تصرّف و تاثیر ہے ۔ یہ بھی دو طرح کی ہوتی ہے ۔ باطن مرید میں تاثیر کرنا جس سے اس کو حق تعالٰے کی طرف کشش پیدا ہو اور ہمّت یا دُعا سے دُوسری اشیاء عالم میں تاثیر کرنا ۔ جس کی بے شمار حکایتیں اس باب میں اولیاء اللہ سے منقول ہیں ۔

مگر خوارق کا ہونا ولایت کے لیے ضروری نہیں ۔ صحابہ کرام اولیاء اللہ سے افضل تھے مگر بعض صحابہ سے عمر بھر میں ایک خرق عادت بھی واقع نہیں ہوا ۔ فضیلت کا مدار قربِ الٰہی اور اخلاص عبادت پر ہے ۔ خوارق پر نہیں ۔ خوارق تو اکثر جوگیوں سے واقع ہوتے ہیں جو ریاضت کا ثمرہ ہوتے ہیں ۔" (تعلیم الدین صہ ۹۵)

اس لیے غیر متبع شریعت اہلِ خوارق کی اہمیت عوام کی نظروں میں متبع شریعت حضرات سے زیادہ ہوتی ہے ۔ خوارق کا صدور چونکہ کبھی کبھی ہوتا ہے ۔ اس لیے بمصداق کل "جدید لذیذ" عوام کے لیے ان میں کشش زیادہ ہوتی ہے ۔ اتباع شریعت چونکہ روزمرّہ کا معمول ہو جاتا ہے اس لیے عوام کی نظروں میں وہ قابل التفات نہیں رہتا اس کی مثال بالکل ایسی ہے جیسے :-

" ایک گلاس میں پڑے ہُوئے پانی نے اس تیل سے شکایت کی جو گلاس کے اندر اس پانی کے اُوپر تیر رہا تھا کہ یہ کیا بات ہے کہ میں نیچے رہتا ہوں اور تو اُوپر ۔ حالانکہ میں پانی ہُوں اور پانی کی یہ صفت ہے کہ وہ صاف شفاف ۔ خود طاہر مطہر ۔ روشن ۔ خوبصورت خُوب سیرت ہے غرض ساری صفتیں موجود ہیں اور تُو (یعنی تیل) خود بھی میلا ہے ۔ جس پر گرے ۔ اسے بھی میلا کر دے ۔ کوئی چیز تجھ سے دھوئی نہیں جا سکتی ۔ چاہیئے تو یہ تھا کہ تو نیچے ہوتا اور میں اُوپر مگر معاملہ برعکس ہے ۔ تیل نے جواب دیا کہ ہاں یہ سب کچھ ہے ۔ لیکن تم نے کوئی مجاہدہ نہیں کیا ہمیشہ ناز و نعم ہی میں رہے ۔ بچپن میں فرشتے تمھیں آسمان سے بڑے اکرام کے ساتھ اتار لائے ۔ پھر جس نے دیکھا ۔ عزت کے ساتھ برتنوں میں لیا ۔

بڑی رغبت سے نوش کیا۔ تمہاری دھوپ سے حفاظت کی جاتی ہے۔ میل کچیل گرد و غبار سے بچایا جاتا ہے۔ گو اپنے مطلب کو سہی۔ غرض ہمیشہ عزت ہی عزت اور ناز ہی ناز دیکھا اور ہم نے جب سے ہماری ابتدا ہوئی ہے۔ ہمیشہ مصیبتیں ہی مصیبتیں جھیلی ہیں۔ اوّل سرسوں یا تل کا تخم تھا۔ پہلی مصیبت یہ آئی کہ سینکڑوں من مٹی اوپر ڈال دی گئی۔ سینہ پر پتھر رکھا۔ پھر جگر شق ہوا جو دوسری مصیبت تھی۔ تیسری مصیبت یہ پڑی کہ زمین کو توڑ کر باہر نکلے۔ چوتھی یہ کہ جب باہر نکلے تو آفتاب کی تمازت نے جگر بھون لیا۔ پانچویں مصیبت یہ جھیلنی پڑی کہ جب کچھ بڑے ہو گئے تو درانتی سے کاٹے گئے۔ چھٹی مصیبت یہ کہ زیر و زبر کیا گیا اور بیلوں کے گھروں میں روندا گیا اس طرح ہماری ہستی عمر بھر مجاہدہ میں گذری۔ سو مجاہدہ کا ثمرہ یہ اونچا رہنا ہے اور ناز و نعم کا ثمرہ یہ نیچا رہنا ہے۔

(کمالات اشرفیہ صـ۳۵۳)

پانی کے مقابلہ میں تیل ان لوازمات زندگی سے نہیں۔ جن پر زیست کا دار و مدار ہو مگر تیل کے مقابلہ میں پانی جیسی نعمت کی قطعاً قدر نہیں کی جاتی۔ یہی معاملہ متبع شریعت کے ساتھ کیا جاتا ہے اور اس کے شریعت پر مستقیم رہنے کو کوئی وقعت نہیں دی جاتی۔

تائید خرق عادت

حضرت تھانویؒ کے ایک معتقد نے علی گڑھ کی نمائش میں دکان لگائی ہوئی تھی۔ ایک روز عین فروخت کے وقت ان کے دل میں وحشت سی پیدا ہوئی۔ جس کے باعث اُنھوں نے نقصان کا خیال کیے بغیر اپنا سامان قبل از وقت صندوق میں بند کرنا شروع کر دیا۔ جونہی صندوق بھرے گئے نمائش میں آگ لگ گئی۔ جس سے ان کی پریشانی میں اور اضافہ ہو گیا اور گھبرانے لگے کہ اتنے وزنی صندوق کو اکیلے کس طرح اٹھائے جائیں۔ اس پریشانی کے عالم میں وہ دیکھتے ہیں کہ حضرت تھانوی بہ نفس نفیس تشریف لے آئے ہیں اور فرما رہے ہیں کہ "جلدی کرو"۔ چنانچہ ایک طرف سے وہ صاحب دکان اور دوسری

طرف صاحب سیرت یعنی حضرت تھانوی نے ایک ایک صندوق پکڑ کر باہر نکالا اور جب سارا سامان اُٹھ چکا تو حضرت غائب ہو گئے۔ اس پر وہ سخت حیران ہوا۔ اِدھر اُدھر سب دیکھا مگر آپ کا کہیں پتہ نہ چلا۔ کیونکہ واقعہ عالمِ خواب کا تو تھا نہیں۔ عالم بیداری کا تھا اور اس افراتفری میں سوائے حضرت کے اور کوئی دستگیری کو نہ بڑھا۔ جب اس واقعہ کی حضرت سے تحقیق کی گئی تو انھوں نے فرمایا کہ اس وقت تو مَیں تھانہ بھون میں تھا۔ سامعین اس واقعہ کو خرق عادت پر محمول کرنے لگے تو آپ نے رفع اشتباہ کے لیے فرمایا کہ :-

انکارِ خرق عادات

" مجھ کو اس واقعہ کی کچھ خبر نہیں۔ البتہ بعض اوقات حق تعالیٰ کسی کی دستگیری اور اعانت اس صورت میں فرماتے ہیں کہ کسی لطیفہ غیبیہ کو کسی مانوس شکل میں ظاہر فرما دیا اور اس کے ذریعہ اس کا کام بنوا دیا اور خود اس شکل والے کو کچھ خبر نہیں ہوتی "

چنانچہ اس نوع کے کئی واقعات ہُوئے اور آپ سب کو یہی جواب دیتے اور مزید فرماتے کہ الحمدللہ کہ مَیں اس مقامِ خرقِ عادت سے معرا ہوں۔

حقیقتِ کشف

حضرت تھانوی فرماتے کہ

" لوگ کشف کو بڑا کمال سمجھتے ہیں۔ حالانکہ یہ کوئی چیز نہیں۔ کیونکہ اس کو قرب میں کچھ بھی دخل نہیں۔ بعضوں کو کشف سے فطری مناسبت ہوتی ہے۔ بعضوں کو نہیں جیسے بعض کی نظر پیدائشی طور پر دُوربین ہوتی ہے۔ بعض کی نزدیک بین۔ پھر مسجد کے سقادہ کی طرف اشارہ کر کے فرمایا کہ فرض کیجئے ایک شخص کی نظر تو صرف سقادہ ہی تک پہنچتی ہے اور ایک کی باہر سڑک تک تو کیا

جس کی نظر سڑک تک پہنچتی ہے وُہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک زیادہ مقرب ہوگیا؟ یہ تو محض نظر کی ایک قسم ہے اس کو قرب سے کیا علاقہ۔ اس طرح طبائع مختلف ہوتی ہیں بعضوں کو کشف سے فطرۃً ہی مناسبت نہیں ہوتی وُہ لاکھ ریاضت و مجاہدہ کریں۔ انھیں عمر بھر بھی کشف نہیں ہوتا۔ بھلا کشف کو بزرگی سے کیا تعلق۔ اصل چیز تو عبدیت ہے۔ واللہ اگر کسی کو لاکھ کشف ہوں اور وُہ پھر اپنے وجدان کی طرف رجُوع کرے تو وُہ محسوس کرے گا کہ میرے قرب میں ذرّہ برابر بھی ترقی نہیں ہوئی۔ برخلاف اس کے اگر دو چار مرتبہ بھی سبُحان اللہ سبُحان اللہ پڑھ کر اپنے وجدان کو دیکھے تو اس کو صاف محسوس ہوگا کہ کچھ نہ کچھ اللہ تعالےٰ کے ساتھ قرب بڑھ گیا۔ اہلِ ذوق جب چاہیں اس کا تجربہ کرلیں۔"

اس سلسلہ میں آپ نے امیر عبدالرحمٰن خان مرحوم والیٔ کابل کا قول نقل فرمایا کہ جو بات کشف سے معلوم ہوتی ہے۔ وہی عقل سے بھی معلوم ہو سکتی ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ کشف کی مثال ٹیلیفون کی سی ہے۔ جس میں بعینہٖ الفاظ سُنے جاتے ہیں اور عقل کی مثال ایسی ہے جیسے ٹیلیگراف جس میں قوتِ فکریہ اور استدلال سے کام لینا پڑتا ہے۔ کیونکہ بعینہٖ الفاظ نہیں سُنے جاتے، بلکہ کھٹکوں کے ذریعہ سے اشارات میں گفتگو ہوتی ہے۔

تائیدی واقعات

اس امر کی بارہا تصدیق ہوئی کہ جو بات دِل میں لے کر آئے۔ یا جو اشکال قلب میں پیدا ہُوا۔ قبل اظہار ہی حضرت کی زبان فیض ترجمان سے اس کا جواب مِل گیا۔ یا کسی باطنی پریشانی میں حاضر ہوئے تو خطاب خاص یا خطاب عام میں کوئی ایسی بات فرمادی جس سے تسلّی ہوگئی اور وُہ پکار اُٹھتے ؎

اے لقائے تو جواب ہر سوال   مشکل از تو حل شود بے قیل و قال

اور فوراً فیصلہ دیتے کہ آپ کو یہ بات کشف سے معلوم ہوگئی ہے مگر حضرت فرماتے کہ

نفی کشف

"اس کی حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کو تو علم ہے کہ فلاں شخص کی زبان سے اس کا جواب ہوجانے سے صاحب شبہ کو تسلی ہوجائے گی۔ اس لیے مجیب کے قلب میں اُس جواب کا داعیہ القاء فرما دیتے ہیں اور وہ اس کی زبان سے ظاہر ہوجاتا ہے۔ سو یہ وہ کشف نہیں جس میں کلام ہو رہا ہے وہ کشف تو اس وقت ہوتا کہ جب مجیب کو بھی اطلاع ہوتی کہ اس سائل کے قلب میں فلاں شبہ ہے۔ سو اُس کا مجھ کو علم نہیں ہوتا۔ اس لیے یہ کشف نہیں۔"

عوام تو ایک طرف رہے خواص کو بھی ایسا ہی گمان ہوتا تھا خود مولانا عبدالماجد دریا بادی جیسے فلسفی بھی ایسا یقین کرنے لگے جس پر حضرت نے انھیں لکھا کہ :۔

"مَیں نے دو واسطہ کی سند سے سُنا ہے کہ جناب کو مجھ پر صاحب کشف ہونے کا گمان ہے۔ سو اس کی نسبت عرض ہے کہ مَیں ایسا بے تکلف ہوں کہ اگر صحیح بات ہوتی ہے تو فوراً اس کا اقرار بلکہ دعویٰ کرنے میں بھی تکلف نہیں کرتا۔ اب بے تکلف عرض کرتا ہوں کہ یہ امر بالکل خلاف واقعہ ہے۔ اگر آپ اجازت دیں تو میں حلف کے لیے آمادہ ہوں۔ میرے پاس تو بڑا ذخیرہ اہلِ دل کی محبت کا ہے۔ اور دونوں طرف سے۔" (حکیم الامت صہ ۳۸)

حالانکہ جب مولانا عبدالماجد صاحب کی حضرت تھانوی سے پہلی مُلاقات ہُوئی تو ان کا تاثر یہ تھا :۔

"گفتگو کا غالب حصہ قدرتہً دین و تصوف ہی سے متعلق تھا۔ بعض بزرگوں کے حالات حضرت اپنی زبان سے اس طرح ارشاد فرماتے کہ" درحدیث دیگراں" بعینہٖ ہم لوگوں کے خیالات و جذبات کی ترجمانی ہو رہی ہے۔ دل نے کہا

کہ دیکھو روشن ضمیر ہیں نہ۔ سارے ہمارے مخفیات ان پر آئینہ ہوتے جارہے ہیں۔ صاحبِ کشف و کرامات ان سے بڑھ کر کون ہوگا۔"

بالآخر انھیں بھی تسلیم کرنا پڑا کہ :۔

"بعد کو۔ برسوں کو اور وہ بھی اسی صحبت بابرکت کے فیض سے کھلا کہ مومن کی بصیرت و فراست کے سامنے یہ کشفِ تکوینی۔ یہ جوگیوں اور مسمریزم والوں کا کشف بھی بھلا کوئی کرامت ہے۔ اُس علوی کے سامنے۔ اس سفلی کی کیا حقیقت۔ اس حقیقت کے سامنے اس ملمع کی کیا ہستی۔ خیر اس وقت تو بڑا گہرا اثر اس غیب دانی اور کشف صدر کا لے کر اُٹھا۔" (حکیم الامت صہ۲۳)

حقیقتِ کرامت

کرامت کے لغوی معنی ہیں عزت افزائی اور کرامت کو کرامت اسی لیے کہتے ہیں کہ اس کے ذریعہ حق تعالیٰ اپنے کسی مقبول بندہ کی عزت افزائی فرماتے ہیں اور یہیں سے تواضع و تکبر کی سرحدیں پھوٹتی ہیں چنانچہ حضرت تھانوی فرماتے ہیں کہ :۔

"اگر کسی خارق کے بعد قلب میں زیادہ تعلق مع اللہ محسوس ہو۔ تب وہ کرامت ہے اور اگر اس میں زیادت محسوس نہ ہو تو نا قابلِ اعتبار ہے اور کرامت و استدراج میں ایک ظاہر فرق یہ ہے کہ صاحبِ کرامت متصف بالایمان و العبادۃ وغیرہ ہوگا اور صاحبِ استدراج افعال منکرہ میں مبتلا ہوگا (جیسے جوگی وغیرہ) اور دوسرا فرق اثر کے اعتبار سے ہوگا کہ صاحبِ کرامت پر انکسار کا غلبہ ہوگا اور صاحبِ استدراج پر ظہورِ خارق پر تکبر کا۔"

(کراماتِ اشرفیہ صہ۲۹۹)

اسی لیے عارف باللہ حضرت عبدالعزیز دباغ قدس سرہٗ فرماتے ہیں :۔

"کشف کو لوگ پسند کرتے ہیں۔ حالانکہ اس میں بڑی مضرت ہے۔ خود ولی کے

کبھی کشف کے ذریعہ اور کبھی عالم رویا میں تاکہ طالبین ان سے استفادہ کر سکیں اور سچے خوابوں کی بشارت ہونا حدیث شریف سے ثابت ہے۔ ذیل میں دو بزرگوں کے خواب درج کیے جاتے ہیں۔ جن سے آپ کے منجانب اللہ مقام ارشاد پر فائز ہونے اور اپنے وقت کے مجدّد ہونے کی بشارت ملتی ہے۔

۱۔ مشہور نعت گو شاعر محسن کاکورویؒ کے فرزند مولانا انوار الحسن کاکورویؒ اپنا ایک خواب یوں بیان کرتے ہیں کہ :۔

"میں نے سفرِ حج میں بمقام مدینہ طیبہ حضرت مولانا تھانوی مدظلہ، کے متعلق ایک خواب دیکھا حالانکہ اس زمانہ میں مجھ کو حضرت مولانا سے کوئی عقیدت بھی نہ تھی۔ البتہ ایک بڑا عالم سمجھتا تھا اور میرا خاندان بھی علمائے حق کا کچھ زیادہ معتقد نہ تھا۔ غرض حضرت مولانا کا مجھ کو مدینہ طیبہ میں کوئی بعید سے بعید خیال بھی نہ تھا کہ ایک شب خواب میں کیا دیکھتا ہوں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ایک چارپائی پر بیمار پڑے ہوئے ہیں اور حضرت مولانا تھانوی تیمار داری فرما رہے ہیں اور ایک بزرگ دُور بیٹھے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ جن کے متعلق خواب ہی میں معلوم ہُوا کہ یہ طبیب ہیں۔ آنکھ کھُلنے پر فوراً میرے ذہن میں یہ تعبیر آئی کہ حضورؐ تو کیا بیمار ہیں۔ حضورؐ کی اُمت بیمار ہے اور حضرت مولانا اس کی تیمار داری یعنی اصلاح فرما رہے ہیں۔ لیکن وہ بزرگ طبیب جو دُور بیٹھے نظر آتے تھے۔ وہ سمجھ میں نہ آتے کہ کون تھے۔ واپسی ہندوستان پر میں نے حضرت مولانا (تھانوی) کی خدمت میں یہ خواب لکھ کر بھیجا اور جتنی تعبیر میری سمجھ میں آئی۔ وہ بھی لکھ دی اور یہ بھی لکھ دیا کہ میری سمجھ میں یہ نہیں آیا کہ وہ بزرگ طبیب کون تھے۔ جو دُور بیٹھے ہوئے تھے۔ حضرت مولانا نے تحریر فرمایا کہ وہ حضرت امام مہدی علیہ السّلام ہیں اور وہ چونکہ ابھی زماناً بعید ہیں۔ اس

لیے خواب میں مکاناً بعید دکھائی دے۔"

اس خواب سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حضرت تھانویؒ اور امام مہدی علیہ السلام کے درمیان اور کوئی مجدد پیدا نہ ہوگا۔

۲۔ قطب زماں۔ شیخ دوراں حضرت مولانا مفتی محمد حسن صاحب امرتسری مدظلہ العالی رئیس الخلفاء، دربارِ اشرفیہ۔ مہتمم جامعہ اشرفیہ لاہور نے بھی اس سلسلہ میں ایک خواب دیکھا تھا۔ آپ نے لکھا کہ :۔

کچھ عرصہ ہوا (یہ تقریباً ۱۳۵۰ھ کا ذکر ہے) خانقاہ شریف کی مسجد کے وسط میں بیت اللہ شریف اور حضور پُرنور صلی اللہ علیہ وسلم کے روضہ پاک کو دیکھا کہ دیکھا کہ دونوں بالکل قریب ہیں اور بیت اللہ شریف غالباً حضرت والا کی سہ دری کی طرف ہے لیکن روضہ پاک بھی بیت اللہ شریف ہی کی شکل کا ہے۔ یعنی اس پر گنبد نہیں ہے اور بیت اللہ شریف اور روضہ پاک دونوں پر اس قدر سبز اور خوبصورت غلاف ہیں کہ دُنیا میں ان کی نظیر نہ ہوگی اور دونوں پر شعاعیں اور انوار معلوم ہوتے ہیں۔ حضرت والا بیت اللہ شریف کے پاس کھڑے ہوئے ہیں اور اس قدر خوش ہیں کہ ایسا ہشاش بشاش مَیں نے حضرت والا کو کبھی نہیں دیکھا۔ نیز ایک کھجور کی ٹہنی بطور جھاڑو کے دستِ مبارک میں لیے ہوئے ہیں۔ جس کی ڈنڈی میں دستہ چھوڑ کر اِدھر اُدھر شاخیں نکلی ہوئی ہیں اور یہ ارادہ فرما رہے ہیں کہ بیت اللہ شریف اور روضہ پاک کے ارد گرد جو غبار ہے۔ اس کو دور فرمائیں۔"

جو آپ کے مصلح اُمت محمدیہ علی صاحبہا الصلوٰۃ والتحیہ اور مجدِدِ سنت ہونے کی واضح اور بین دلیل ہے۔

احتمال اشرف

چونکہ حضرت تھانوی کا مجدد ہونا ظاہر و باہر تھا۔ اس لیے بعض متذبذبین اس بارہ میں خود حضرت تھانوی سے بھی سوال کر بیٹھتے تھے کہ "حضرت مجددِ وقت ہیں؟ ایک مولوی صاحب کے سوال کے جواب میں آپ نے فرمایا کہ :۔

"احتمال تو مجھ کو بھی ہے۔ مگر اس سے زائد نہیں۔ جزم اوروں کو بھی نہیں کرنا چاہیئے ظن کے درجہ میں گنجائش ہے۔ باقی قطعی یقین تو کسی مجدد کا نہیں ہوا۔ جس پر جتنا اور جس درجہ کا فضل ہو جائے۔ ذالك فضل الله یوتیه من یشاء والله ذوالفضل العظیم"

(الافاضات الیومیہ)

ایک دوسرے مولوی صاحب کے سوال کے جواب میں آپ نے اس سے بھی زیادہ واضح جواب دیا کہ

"چونکہ نفی کی بھی کوئی دلیل نہیں۔ اس لیے اس کا احتمال مجھ کو بھی ہے مگر اس سے زائد جزم نہ کرنا چاہیئے۔ محض ظن ہے اور یقینی تعین تو کسی مجدد کا نہیں۔"

(کمالاتِ اشرفیہ صفحہ ۳۸۰)

حقیقتِ احتمال

متذکرہ بالا ملفوظات میں حضرت نے جو ظن یا احتمال کا لفظ استعمال کیا ہے۔ اسے اس کی نفی پر محمول نہ کیا جائے۔ کیونکہ ظن یا احتمال دو قسم کے ہوتے ہیں۔

ایک وہ جو شرعاً معتبر قرار نہیں دیا جاتا۔ اسے غیر ناشی عن الدلیل کہتے ہیں۔

دوسرا وہ جو شرعاً معتبر قرار دیا جاتا ہے۔ اسے ناشی عن الدلیل کہتے ہیں۔

چنانچہ صاحب "آثارِ رحمت" لکھتے ہیں کہ :۔

"وہ ظن جو ناشی عن الدلیل ہے وہ عند اللہ تعالیٰ و عند الشرع معتبر ہے،

اور یہاں (حضرت کے متذکرہ بالا ملفوظات میں) ظن واحتمال سے وہی مراد ہے جو ناشی عن الدلیل ہے۔ کیونکہ کسی مجدّد کا ہونا نہ تو قطعیات پر موقوف ہے اور نہ اس کا منشا محض رائے اور تخمین ہے بلکہ کسی مجدد کے مجدّد ہونے کا مدار دلائل اور علامات پر ہے۔" (صلا۲)

اس کی تائید حضرت کے مندرجہ ذیل ملفوظ ۳۷۱ (مندرجہ ملفوظات حصہ ہفتم ص۴۸ رسالہ المبلغ ج۱۲ ج۱۳ بابت ماہ رمضان المبارک ۱۳۶۱ھ سے ہوتی ہے:۔

"ایک صاحب نے دریافت کیا کہ کیا مجدّد ہونا کسی دلیل قطعی سے معلوم ہوتا ہے۔ فرمایا نہیں بلکہ دلائل ظنیہ سے۔ چنانچہ اب تک جتنے مجدد ہوئے ہیں ان کے مجدد ہونے کا علم دلائل ظنیہ یعنی علامات و آثار سے حاصل ہوا ہے۔"

علاماتِ مجدّد

اب دیکھنا یہ ہے کہ وہ کون سے آثار و علامات ہیں جن کی موجودگی میں کسی کے مجدد ہونے کے متعلق فتویٰ دیا جا سکے۔ اس کا جواب بھی بحمداللہ حضرت کے ہی ایک ملفوظ میں موجود ہے جو خود خسرو دربارِ اشرفیہ خواجہ عزیز الحسن مجذوبؒ کا نقل کیا ہوا ہے کہ

"ایک بار احقر نے عرض کیا کہ کسی کا مجدّد ہونا رائے سے معلوم ہو جاتا ہے؟ فرمایا کہ جی رائے سے کیا معلوم ہوتا ہے۔ اس کی علامات ہیں۔

۱۔ مجدّد شروع صدی میں ہوتا ہے۔ مطلب یہ کہ فیض اتم اس کا صدی کے شروع میں ظاہر ہو۔ گو وہ پہلی صدی میں پیدا ہوا ہو۔

۲۔ اس کے کلام میں اثر ہوتا ہے۔

۳۔ اس کو وہ بات سوجھتی ہے جو اس کے بڑے بڑوں کو نہیں سوجھتی۔

۴۔ وہ ہر جزو دین میں اصلاح کے لیے دخل دیتا ہے۔

۵۔ مجدّد کی شان انبیاء کی سی ہوتی ہے اس سے جو بد اعتقاد ہوتا ہے۔ وہ برکت

باطنی سے محروم رہتا ہے۔

پس مجدد کا منصب صرف اتنا ہے کہ لوگوں نے جو دین میں گڑبڑ اور کمی بیشی کی ہو۔ اس کو دُور کر کے یہ دکھا دے کہ دین کی اصلی صورت یہ ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ اس سے خواہ مخواہ سب کی اصلاح ہی جائے۔

(ملفوظات۔ مقالات حسنہ سوم دعوات عبدیت)

اشکال و جواب

یہاں پر پھر ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب یہ تمام آثار و علامات حضرت تھانوی میں بدرجہ اتم پائے جاتے ہیں۔ جس پر حضرت کی سوانح شاہد عدل ہے تو پھر حضرت تھانوی نے ظن اور احتمال کے الفاظ کیوں استعمال فرمائے۔ صاف کیوں نہ کہہ دیا کہ میں اس صدی کا مجدد ہوں؟ اس کا جواب صاحب "آثارِ رحمت" نے یہ دیا ہے کہ :۔

" اگر کوئی یوں دعویٰ کرے کہ مجھ کو حضرت امام ابو حنیفہؒ کے جنتی ہونے میں کوئی شک نہیں اور حضرت غوث اعظمؒ کے ولی ہونے میں کوئی شک و شبہ نہیں تو اس پر کوئی نکیر نہیں۔ اسی طرح اگر کوئی یوں دعویٰ کرے کہ مجھ کو حضرت محی السنت حکیم الامت کے مجدد ہونے میں کوئی شک و شبہ نہیں تو اس پر بھی شرعاً کسی کو حق نہ ہوگا کہ وہ نکیر کر سکے۔ کیونکہ ظن کی حیثیت سے تینوں مسائل ایک ہی صف میں نظر آرہے ہیں اور راز ایسے الفاظ و عنوانات کا یہ ہے کہ عارفین جب مقام نزول میں ہوتے ہیں جو حسب ارشاد محققین مقامِ عروج سے افضل ہے تو بوجہ غلبہ عبدیت اور فنا ان کی زبان سے اپنی ذات کے متعلق ایسے ایسے الفاظ و تعبیرات نکلتے ہیں کہ جو سرتاسر عبدیت و فنا میں غرق ہوتے ہیں بلکہ سچ پوچھئے تو جب تک ان کو ایسے الفاظ نکالنے کا امر نہیں ہوتا۔ تو ایسے الفاظ کا بھی ان کو اپنی زبان سے

نکالنا ناگوار گزرتا ہے۔ ان کا تو یہ مذاق ہوتا ہے کہ ؎

باوجودت زمن آواز نیامد کہ منم

بلکہ محبوب کے سامنے اپنے وجود کا ذکر بھی نہیں کرتے۔ اور یوں کہتے ہیں کہ ؎

بگفتا مبر نام من پیش دوست

کہ حیف ست نام من آنجا کہ اوست

بلکہ بعض اوقات اپنی تعریف تو درکنار اپنے محبوب حقیقی کی تعریف کو بھی خلاف ادب تصور کر کے خاموش ہو جاتے ہیں۔ کذا قال العارف الرومی ؎

خود ثنا گفتن زمن ترک ثناست

کہ ایں دلیل ہستی و ہستی خطاست

مادح خورشید مداح خود است

کہ دو چشم روشن و نامردہ است

بس ان حضرات کے کلام کے اندر کمال کا دعویٰ ڈھونڈنا ایسا ہی ہے۔ جیسے کشتہ طلاء کے اندر سونے کے ذرات کی تلاش۔" (ص۲۳)

حبیب خدا — از مولانا اشرف علی تھانوی

جناب رسول مقبول آنحضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ طیبہ پر لکھی گئی ایک لاجواب کتاب جس میں حضور اکرمؐ کی دسیرت سیرۃ کا کوئی گوشہ تشنۂ طلب باقی رہ گیا ہے، بلکہ آپ صلعم کے تمام شمائل معجزات واقعات غزوات وغیرہ بھی بالتصریح نہایت آسان اور عام فہم زبان میں بیان کیے گئے ہیں۔

آج کے خستہ حال مسلمانوں کی دینی و اخلاقی رہنمائی کے لیے ایک لاجواب اور نایاب تحفہ۔

حسین گرد پوش، مضبوط جلد بندی، اعلیٰ کتابت و طباعت سے مزین۔

تذکرہ — مولانا ابو الکلام آزاد

حضرت مولانا ابو الکلام آزاد مرحوم کے اپنے اور اپنے خاندان کے حالات پر مشتمل ایک بہترین کتاب جس میں اُس زمانے کے سیاسی و تمدنی حالات و واقعات بالتصریح موجود ہیں۔

مدحت — از عاصی کرنالی

جناب عاصی کرنالی جو نظم اور غزل کے میدان کے شہسوار ہیں ان کی نعتوں کا حسین مجموعہ جو اپنی آب و تاب اعلیٰ کاغذ، حسین گرد پوش بہترین کتابت و طباعت اور مضبوط جلد بندی سے آراستہ و پیراستہ پہلی بار منظر عام پر آیا ہے۔

ہمارے حضورؐ

عابد نظامی کی آسان اور عام فہم زبان میں سیرۃ رسول پر بہترین کتاب جو چھوٹوں اور بڑوں کے لیے یکساں مفید ہے۔

ہمارے پیارے نبیؐ — ادارہ

بسلسلہ سیرۃ النبی آنحضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی قبل از ولادت سے لیکر نبوت تک کے واقعات کا حسین مجموعہ — اپنی طرز کی واحد کتاب

مشعل نبوت — ایاز احمد

بسلسلہ سیرۃ النبی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت سے وفات تک کے حالات پر مشتمل مفصل مجموعہ جس میں کوئی پہلو تشنۂ طلب نہیں چھوڑا گیا۔

عورت انسانیت کے آئینہ میں — از منشی عبد الرحمان خان

- کیا نظام عالم کی بقاء بنی نوع انسان کی بقاء سے وابستہ ہے اور بنی نوع انسان کی بقاء زن و مرد کے باہمی تعاون و اشتراک پر مبنی ہے ؟
- کیا مرد کامل العقل و مضبوط اور عورتیں ناقص العقل و کمزور ہوتی ہیں ؟
- موجودہ معاشرہ میں عورت کا کیا مقام ہے ، ماضی میں اس کا مقام کیا تھا ؟
- عورت کے جبلی اوصاف بلند فطرتی ، علمی فضیلت شجاعت و بہادری اور تدین و تدبر کیا ہیں ؟
- عورت کے حقوق کیا ہیں ، نیز حقوق زوجیت ، طلاق ، پردہ وغیرہ کیا ہیں ؟
- کیا زمانہ حال کی عورت بے راہ روی اور ننگ انسانیت کا مظاہرہ کر رہی ہے ؟

اس کتاب میں عورت کی نسائیت کی بجائے اُس کی انسانیت پر علم القرآن ، علم التاریخ ، علم التشریح اور علم النفس کی مدد سے روشنی ڈالی گئی ہے۔ فطرت نے عورت کو انسانیت کے کس بلند و بالا مقام پر پہنچایا ہے اور مرد نے ماضی میں عورت کو کس طرح اس مقام رفیع سے گرایا اور اسلام نے کس طرح اُسے قعرِ مذلت سے نکالا نیز عورت کی زمانہ حال میں بے راہ روی اور ننگ انسانیت کے مظاہرے کے اسباب و عمل پر صاحب نظر، روشناس قلم "منشی عبد الرحمان خان" کا تحقیقی اور علمی جہاد جس میں عورت کو نہ صرف "صراط مستقیم" دکھلایا گیا ہے بلکہ اس کو اس کا صحیح مقام اور حقوق بھی بتلائے گئے ہیں۔

اپنے موضوع پر لاجواب تحقیقی شاہکار، بہترین کتابت و طباعت اور حسین گرد پوش سے آراستہ

تذکرۃ الاولیاء — از شیخ فرید الدین عطار

یک زمانہ صحبت با اولیاء
بہتر از صد سالہ طاعت بے ریا

تذکرۃ الاولیاء حضرت شیخ فرید الدین عطار کی وہ مشہور و معروف کتاب ہے جس میں عراق و عرب اور اسکے متصل ممالک کے برگزیدہ صلحاء و اولیاء کے حالات، کرامات اور کلمات و ارشادات کا حسین ذکر ہے اور جسکے مطالعے سے خدا کی محبت بڑھتی ہے، گناہ سے نفرت اور عمل صالح کی رغبت پیدا ہوتی ہے زمانہ حال کی تمام برائیوں کے خاتمہ کیلئے ایک اشد ضرورت — بہترین ٹائیٹل، کتابت و طباعت سے آراستہ

حقیقتوں کے چراغ — از منشی عبد الرحمان خان

۱۔ انسان کا مقصدِ حیات کیا ہے اور کیا آج کا انسان ترقی کر رہا ہے ؟

۲۔ اسلامی عقائد اور خدا، سائنس کی نظر میں کیا ہیں ؟

۳۔ حب رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا تقاضا کیا ہے نیز معراج کا پس منظر و پیش منظر کیا ہے ؟

۴۔ نظریۂ پاکستان کا پس منظر کیا ہے ، نیز قائدِ اعظم کی ترقی کا کیا راز ہے ؟

دنیوی اور دینی معاملات پر مبنی یہ کتاب روشناس قلم منشی عبد الرحمان خان صاحب کے اپنے فکری مقالات کا ایک ایسا حسین مجموعہ ہے جس میں منشی صاحب نے اپنے فکر و نظر کی بدولت ہزار ہا راز و رموز سے پردہ اٹھایا ہے۔ اپنے موضوع پر منفرد کتاب جو بہترین کتابت و طباعت، حسین گرد پوش اور مضبوط جلد بندی سے آراستہ ہے۔

بصائر قرآنی (منشی عبد الرحمان خان)

۱۔ "صراط مستقیم" کونسا راستہ ہے ؟

۲۔ قرآن پاک کن باتوں کی تلقین کرتا ہے اور کن باتوں سے روکتا ہے ؟

قرآن پاک کے چیدہ چیدہ احکام اور نصیحت آموز بصائر پر مشتمل ایک حسین و دلکش مجموعہ۔ جس میں آیات قرآنی کا آسان اور عام فہم زبان میں ترجمہ بھی دیا گیا ہے۔ جا بجا ضروری حواشی سے مزین منشی عبد الرحمان خانصاحب روشناس قلم کا ایک علمی شاہکار۔

ہماری مطبوعات

ماآثر عالمگیری	محمد ساقی مستعد خان ترجمہ مولوی محمد فدا علی طالب
سیرت اشرف حصہ اول	منشی عبدالرحمٰن خان
" " دوم	"
معماران پاکستان	"
کردار قائداعظم	"
نقوش قائداعظم	پروفیسر رحیم بخش شاہین
تعمیر پاکستان اور علماء ربانی	منشی عبدالرحمٰن خان
تلاش حق	محمد بخش بلوچ
کشف المحجوب	داتا گنج بخشؒ ترجمہ ابوالحسنات قادری
حدیث دل	جسٹس ایس اے رحمان
تعارف قرآنی	منشی عبدالرحمٰن خان
بصائر قرآنی	"
احکام قرآنی	"
تذکرۃ الاولیاء	فریدالدین عطار
یہ تیرے مومن بندے	محمد اقبال قادری
نشان حیدر	محمد مسعود الزمان
حبیب خداؐ	مولانا اشرف علی تھانوی
ابن الوقت	ڈپٹی نذیر احمد
بنات النعش	"
توبۃ النصوح	"
مراۃ العروس	"
فسانہ مبتلا	"
حقیقتوں کے چراغ	منشی عبدالرحمٰن خان
تذکرہ	ابوالکلام آزاد
ذوالقرنین	"
مساجد اسلامیہ	"
فضائل رمضان المبارک	"
عورت انسانیت کے آئینہ میں	منشی عبدالرحمٰن خان
جہاد کی طرف ایک قدم	محمد اقبال

مواعظ اشرفیہ (تیس جلدوں میں)

از: مولانا اشرف علی تھانوی

ترتیب نو: منشی عبدالرحمٰن خان

۱- دنیا و آخرت	۲- علم و عمل	۳- دین و دنیا
۴- حقوق و فرائض	۵- عید میلادالنبیؐ	۶- نظام شریعت
۷- حقیقت عبادت	۸- حقیقت مال و جاہ	۹- فضائل صبر و شکر
۱۰- فضائل صوم و صلوٰۃ	۱۱- تصوف و تقویٰ	۱۲- تسلیم و رضا
۱۳- اصلاح اعمال	۱۴- برکات رمضان	۱۵- محاسن اسلام
۱۶- حدود و قیود	۱۷- اصلاح باطن	۱۸- موت و حیات
۱۹- جزا و سزا	۲۰- آداب انسانیت	۲۱- سنت ابراہیم
۲۲- ذکر و فکر	۲۳- آداب دین	۲۴- فضائل علم
۲۵- تدبیر و توکل	۲۶- حقوق الزوجین	۲۷- مفاسد گناہ
۲۸- راہ نجات	۲۹- زیر ترتیب	۳۰- زیر ترتیب

مدحت	عاصی کرنالی
اصحاب بدر	محمد سلیمان منصور پوری
ولادت نبویؐ	ابوالکلام آزاد
آداب علم و اخلاق	منشی عبدالرحمٰن خان
آداب حقوق العبادات	"
عورتوں کی آزادی و فرائض	ابوالکلام آزاد
کاروان خیال	"
میں کون ہوں	امام غزالیؒ
معجزات انبیاء	امام ابن حلبیؒ
حکایات و اقوال گنج بخشؒ	محمد جاوید
مقدمۃ القرآن	عزیز الحسن بقائی
مسدس حالی	خواجہ الطاف حسین حالی
شکوہ جواب شکوہ	علامہ محمد اقبال
شعل نبوت	ایاز احمد